مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ
اور ان کے معاصرین

حکیم محمود احمد ظفر

Marfat.com

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ
اور
اُن کے معاصرین

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور جلیل القدر ہم عصر علماء کے حالات وواقعات اور خدمات پر
ایک مستند تاریخی دستاویز جنہوں نے برطانیہ کے اقتدار کے باوجود برصغیر میں عیسائیت کے پاؤں نہیں جمنے دیئے

حکیم محمود احمد ظفر

تخلیقات
علی پلازہ، 3-مزنگ روڈ لاہور فون: 042-7238014
Web site: http://www.takhleeeqat.com
E-mail: takhleeqat@yahoo.con

۳۹۷۶۹۹۴
55
۹۴۵۹۶
۲

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب .... مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور اُن کے معاصرین

نام مصنف .... حکیم محمود احمد ظفر

باہتمام .... حافظ زاہد علی

کمپوزر .... محمود فرید 0333-4331105

طبع اول 1428ھ/2007ء

ناشر .... تخلیقات
علی پلازہ، 3-مزنگ روڈ لاہور فون: 042-7238014

کل صفحات 562

قیمت .... -/350 روپے

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ

اور

اُن کے معاصرین

Marfat.com

فہرست

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور اُن کے معاصرین

- پیش آہنگ ______ 13
- حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ ______ 22
  - پیدائش........ 32
  - نسب........ 33
  - کیرانہ میں سکونت........ 53
  - سرزمین پاک وہند میں عثمانیوں کی آمد........ 56
  - تعلیم وتربیت........ 57
  - درس وتدریس........ 59
  - شادی........ 61
  - ہندوستان میں عیسائیت کی یلغار........ 75
  - انگریزی استعمار اور فروغ عیسائیت........ 88
- عیسائیت کی یلغار ______ 95
  - مولانا رحمت اللہ کے دور میں عیسائیت کی سرگرمیاں 97
  - حکومت کی طرف عیسائیت کے لیے سرگرمیاں 101
  - 1-انگریزی زبان کی ترویج........ 102
  - مسلم اوقاف پر قبضہ........ 106
  - علماء پر سختی........ 108
  - معاون تحریکیں........ 111

Marfat.com

- عیسائی مبلغین کا طریقہ تبلیغ 154
- پادری فنڈر اور اس کا حدود اربعہ 156

حضرت مولانا رحمت اللہؒ عیسائیت کے مقابلہ میں ______ 167

- مولانا رحمت اللہؒ کی ردِ نصاریٰ میں تصنیفات 175
- 1-ازالۃ الاوہام 176
- 2-ازالۃ الشکوک 185
- 3-اعجازی عیسوی 206
- 4- احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث 227
- 5-البروق اللامعہ 227
- 6-معدل اعوجاج المیزان 227
- 7- تقلیب المطاعن 228
- 8-معیار التحقیق 228
- 9-البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف 228
- 10-اظہار الحق 228
- 11-التنبیہات 231
- 12- آداب المریدین 233
- مناظرہ کے لیے لوگوں کا تقاضا 236

حضرت مولانا رحمت اللہ میدان مناظرہ میں ______ 238

پادری فنڈر سے مناظرہ ______ 246

مناظرہ کا انعقاد ______ 252

تحریف بائبل پر مناظرہ ______ 278

مناظرے کا دوسرا روز ______ 292

- تحریری بحث 311
  - پادری فنڈر سے مزید خط و کتابت 322
  - روئیداد اور مناظرہ کی تدوین 330
  - اثرات مناظرہ 339
- دو متقابل شخصیتیں 343
- حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ایک مناظر کی حیثیت سے 347
  - قوت حافظہ اور ذہانت 348
  - بیدار مغزی اور حاضر جوابی 351
  - حریف کے ساتھ ملاطفت 352
  - جرأت و شجاعت 353
- مولانا کیرانویؒ اور جنگ آزادی 356
  - علمائے کرام کے نظریات 377
  - فوج میں بغاوت 379
  - شہر کا رخ 389
  - انقلابی فوجوں کا استقبال 390
  - انقلابی فوجوں کا کردار 391
  - علماء کی اس جہاد میں شمولیت 396
  - دہلی کی اہمیت 397
  - جنگ شاملی 422
  - مولانا کیرانویؒ مکہ معظمہ میں 447
  - مولانا رحمت اللہؒ قسطنطنیہ میں 458
  - مدرسہ صولتیہ کا قیام 463
  - صولت النساء بیگم صاحبہؒ 469

- مدرسہ کے قیام میں مشکلات 480
- مدرسۂ صولتیہ کا نصاب تعلیم 481
- ردّ نصاریٰ کی تعلیم 483
- مولانا کیرانویؒ کا دوسرا سفر قسطنطنیہ 486
- مدرسہ صولتیہ کا انتظام و انصرام 490
- مکہ مکرمہ میں مولانا کیرانویؒ کی اصلاحات 498
- حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی سرپرستی 500
- بیماری 504
- مسجد کی تعمیر 510
- بیت اللہ کی مرمت میں شرکت 514
- سیاسی بصیرت 514
- مولانا کیرانویؒ کے مشہور تلامذہ 517
- مدرسہ صولتیہ کا نصاب تعلیم 520
- خدمت خلق 523
- وفات: 527
- مدرسہ صولتیہ کے مہتممین 528
- حضرت مولانا محمد سلیم کیرانویؒ 552
- 1- شعبہ عالی وثانوی 554
- 2- مدرسہ ابتدائی 555
- 3- مدرسہ تحضیری 555
- 4- شعبۂ زراعت 555
- 5- شعبۂ صنعت 555
- 6- شعبۂ تعلیم بنات 555
- 7- شعبہ حفظ و تجوید 555

8-مدرسہ دارالفائزین 556

9-دارالشفاء 556

10-شعبۂ لیلہ (شبینہ) 556

11-مرکزی دفتر مکہ مکرمہ 556

12- کتب خانہ مدرسہ 556

13-دارالاقامۃ 556

14-ملازمین ماتحت 556

صدر دفتر کراچی 556

(1) مسائل حج 558

(2) ڈاک 559

(3) امانت 559

(4) طبی خدمات 560

(5) زائرین کے قیام کا انتظام 560

Marfat.com

Marfat.com

پیش آہنگ

قدرت حق کی کرشمہ کاریوں کا دستور بھی نرالا ہے کہ حق اگرچہ اس کے ہاں مطلوب ومقصود کائنات ہے اور باطل مردودومطرود ہے، لیکن حق و باطل کی کشمکش میں جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی، بارہا ایسا ہوا ہے کہ وہ باطل کو خوب کھیل کھیلنے کے مواقع فراہم کرتا ہے اور اُسے اس درجہ عروج بخشتا ہے کہ حق کی مظلومیت اور بے چارگی اور اہل حق کی بے بسی اور محرومی نقطۂ انتہاء تک پہنچ جاتی ہے اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے گویا باطل کبھی سرنگوں نہیں ہوگا اور حق کبھی سرفراز و سربلند نہیں ہو پائے گا، لیکن حق کی ابتلاء و آزمائش کا یہ سلسلہ جس شدت کے ساتھ ظہور میں آتا ہے، دیکھتی آنکھوں اس قدر سرعت کے ساتھ یوں ختم ہو جاتا ہے جیسے یہ سب کچھ فریب نظر کے سوا کچھ نہ تھا۔

﴿کسراب بقیعة یحسبه الظمأن ماءً﴾

اور پھر حق اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور لوح ابد پر ہمیشہ کے لیے اپنا نقش دوام ثبت کر جاتا ہے۔ حق و باطل کی اس کشمکش اور آویزش سے زندگی کا حسن قائم ہے اور ہنگامۂ حیات کی تمام رعنائیاں سواد صبح ازل سے لے کر آج تک اس کشمکش کی رہین منت ہیں

ستیزہ کار ازل سے ہے لے کے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

حق و باطل کا یہ تصادم، خیروشر کا یہ ٹکراو، نور وظلمت کی یہ آویزش، حسن وقبح کا

Marfat.com

یہ تضاد اور سپید و سیاہ کی یہ کشمکش فطرت کائنات کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔

لیکن کائنات ارضی و سماوی میں ایک انسان اللہ کی ایسی مخلوق ہے جسے شعور و آ گہی کی نعمت سے نوازا گیا تا کہ وہ اس کشمکش و تضاد کے ہنگامۂ کارزار میں باطل کے مقابلہ میں حق کو، شر کے مقابلہ مین خیر کو، ظلمت کے مقابلہ میں نور کو، قبح کے مقابلہ میں حسن کو اور سیاہ کے مقابلہ میں سفید کو پہچان سکے اور پھر ان میں امتیاز پیدا کر کے اپنے لیے وہ راہ منتخب کرے جو اس کے لیے فوز و فلاح اور سعادت و کرامت کی کفیل ہو۔

حق و باطل اور خیر و شر کی یہ آویزش اگر عرصۂ دہر سے معدوم ہو جائے تو زندگی کا سارا حسن غارت ہو کر رہ جائے اور خود انسانی زندگی کی قدر و قیمت ختم ہو جائے۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور آسمانی وحی کا نزول اسی کشمکش و آویزش ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور ہدایت خداوندی کی نمود کا مقصد وحید بھی یہی رہا ہے کہ لوگ باطل کے مقابلہ میں حق کی حمایت کریں اور شر کے بدلے خیر کو اختیار کریں۔

اگر تمام نسل انسانی کے افراد ایک ہی راہ پر گامزن ہوتے اور ایک ہی ڈگر پر چلتے رہتے تو نیک و بد کی تمیز کیوں کر ہوتی اور بُرے بھلے کا فرق کیسے ملحوظ رکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس کشمکش کا وجود ناگزیر تھا۔

اسلام کی چہاردہ صد سالہ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں اور تمام صحف سماوی اس بات پر شاہد ہیں کہ تخلیق عالم سے لے کر آج تک خیر و شر اور حق و باطل اور نور و ظلمت کے درمیان تصادم کی یہ کیفیت ہر دور میں رونما ہوتی رہی اور یوں حق تعالیٰ شانہ انسانوں کے درمیان امتیاز کی ایک لکیر کھینچتا رہا اور خیر و شر کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرتا رہا تا کہ جزا و سزا کا ابدی قانون بروئے کار آئے اور اہل حق اپنی جزاء لے جائیں اور باطل پرست اپنی سزا کو پہنچیں۔

حق و باطل کی ایسی ہی ایک کشمکش وہ تھی جس کا ظہور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کے عہد میں ہوا۔ باطل اپنی پوری قہرمانیوں کے ساتھ ان کے دور میں پرافشاں ہوا اور اس کی تیرہ کاریوں نے برصغیر پاک و ہند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حق اور اہل حق پر ذلت و ادبار کی پرچھائیں پڑنے لگیں اور باطل کی ظلمت عرصۂ دہر پر یوں محیط ہو

Marfat.com

گئی کہ "ظلمات بعضها فوق بعض" کا مہیب نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

ایسے پر آشوب اور تیرہ و تار دور میں توفیق الٰہی کی دستگیری نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کو حق کا پشتیبان بنا کر کھڑا کیا اور حق کی پاسبانی کی گراں قدر خدمات ان کے سپرد کی گئیں۔ انہوں نے ظلمت باطل کے اس گھٹا ٹوپ اندھیارے میں اپنے نفس گرم و آہ سرد کی تاثیر سے ایک چراغ جو بڑھتے بڑھتے وقت کی نامساعدت اور آب و ہوا کی ناموافقت کے باوجود ایک مینار نور بن گیا اور اس کی ضیاء باریوں سے نہ صرف اس برصغیر کے اطراف و اکناف میں دلوں کی دنیا روشن ہوئی بلکہ ایک عالم اس کی جہاں تابیوں سے منور ہوا ؎

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ نے چودھویں صدی ہجری کے ابتداء میں علم وعرفان کی جو شمع روشن کی اور حق وصداقت کا جو چراغ فروزاں کیا، حالات کی کوئی آندھی اور گردش زمانہ کی کوئی رفتار اس کو بجھا نہ سکی۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے طاغوتی طاقت کے خلاف اور اعلاء کلمۃ الحق کے لیے بالخصوص جو گراں بہا خدمات سرانجام دیں، ان کی صحیح قدر و منزلت کا اندازہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ برصغیر کی پوری سیاسی اور دینی تاریخ پیش نظر ہو، اس لیے کہ عجمی آب و ہوا میں کسی ایسے شخص کا ابھرنا جو صدیوں کی سرشاری کا اثاثہ لے کر آیا تھا، اس کی داستانِ حیات کی قرار واقعی عظمت و اہمیت کا اس وقت تک اندازہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس پس منظر سے بخوبی آشنائی حاصل نہ ہو۔ جس میں انہوں نے انگریزوں کی طاغوتی طاقت کے خلاف اور عیسائیت کی یلغار کے مدمقابل اسلام کی تبلیغ و دفاع کا بیڑا اٹھایا تھا۔

بدقسمتی سے ہمارے تذکرہ نگاروں کا یہ عام انداز ہو گیا ہے کہ وہ جب کبھی کسی شخصیت کی بابت قلم اٹھاتے ہیں تو وہ شخصیتوں کے تقابل میں تقدم و تاخر زمانی کے چکر میں پڑ کر اس شخصیت کی صحیح قدر و منزلت کو خراج تحسین پیش کرنے سے گریز کرتے ہیں

Marfat.com

کہ مبادا اس سے کسی ایسی شخصیت پر اس کو ترجیح حاصل ہو جائے جو چند سال یا چند سو سال پہلے گزری ہے۔ اس ترجیح بلا مرجح ہی کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر پاک وہند میں بہت سی ایسی شخصیتیں بے نام ہو کر رہ گئیں جو اپنی دینی خدمات، اپنی علمی وسعت، اپنی فکری رفعت، اپنی تحقیقی قابلیت اور اپنی تجدیدی صلاحیت کی بنا پر اس قابل تھیں کہ انہیں قرون اولیٰ کے ائمہ اعلام کی فہرست میں شمار کیا جاتا، لیکن برا ہو اس تقدم وتاخر زمانی کے غلط تصور کا کہ اس نے نسبتاً کم درجہ کے لوگوں کو بالا و بلند کر دیا اور بالا و بلند لوگوں کو کم تر قرار دیا، حالانکہ یہ تصور خود اسلام کے مزاج اور اس کی روح کے سراسر منافی ہے۔

واقعہ یہ ہے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ باوجودیکہ کہ چودھویں صدی کی شخصیت تھے، مگر انہوں نے باطل اور خصوصی طور پر عیسائیت کے مقابلہ میں فکر و نظر کے جو زاویے پیش کیے اور علم وتحقیق کا جو ڈول ڈالا اور اسلام کے علوم وافکار کی تعبیر کا جو اسلوب جدید انہوں نے اختیار کیا اس کی نظیر پچھلی صدیوں میں دور دور تک نہیں ملتی۔

مضت الدھور وما اتین بمثلہ

ولقد اتیٰ فعجزن عن نظرائہ

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا زمانہ طوائف الملوکی اور افراتفری کا پر آشوب دور تھا۔ وہ جب جوان اور شعور سے بہرہ ور ہوئے تو مغلیہ سلطنت کا دیوالیہ نکل چکا تھا۔ مغلیہ حکومت قلعہ معلیٰ میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس سے کچھ عرصہ قبل مرہٹوں کی ترکتازیوں، جاٹوں کی یورش اور سکھوں کی دہشت گردی نے مسلمان قوم کا جینا دوبھر کر دیا تھا، رہی سہی کسر نادر شاہ کے حملہ نے پوری کر دی تھی۔ خود ان کے اپنے زمانہ میں پورے ہندو پاک پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور ان کی چیرہ دستیوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ پھر کرسی پر بیٹھے انگریز نے عیسائی مشنریوں کو ملک کے گلی کوچوں میں لوگوں کے شجر ایمان کی بیخ کنی کے لیے آوارہ کتوں کی طرح پھیلا دیا تھا۔ اس دور میں آپ نے ان تمام ہنگاموں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہوئے اور ایک ایسے مقام پر رہتے ہوئے جو برائے نام سہی لیکن ہندوستان کا یہ پایۂ تخت اور ملکی سیاست کی تمام ہنگامہ آرائیوں کا مرکز ومحور تھا، علم وعمل کی وہ قندیل روشن کی اور فکر ونظر کا وہ گلشن آراستہ

Marfat.com

کیا کہ آج جب کہ ان کے وصال پر ایک صدی بیت چکی ہے، اس قندیل کی جگمگاہٹ سے نظریں خیرہ ہو رہی ہیں اور آج بھی اس گلشن کے غنچہ ہائے نو دمیدہ کی بوئے خوشگوار سے مشام جان معطر ہے۔

کسے کہ محرم باد صبات می داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی است

ہم ہندوستانی مسلمانوں کا مزاج ہندو تہذیب کے غلبہ و تسلط کے اثرات بد سے کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ ہماری نظر میں اس گوشہ گیر فقیر کی قدر و قیمت زیادہ ہے جو دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں بیٹھ کر اپنا ایک مخصوص حلقۂ ارادت استوار کرتا ہے اور اپنی شدنی اور ناشدنی کرامات اور گفتی و ناگفتی تصرفات کے بل بوتے پر لوگوں کو دنیا سے بے رغبتی کا کچھ اس انداز میں سبق دیتا ہے اور زخارف دنیا سے بے تعلقی کی ایسی پٹی پڑھاتا ہے کہ وہ قنوطیت کا شکار ہو کر اس آستانۂ عقیدت پر اپنا سب کچھ تیاگ دیتے ہیں اور یوں ایک نیا بت کدہ تیار ہو جاتا ہے جہاں پوجا پاٹ کے تمام مراسم بڑے خشوع و خضوع سے سرانجام دیئے جاتے ہیں اور فقیر بوریا نشیں کی آئندہ نسل کے لیے عیش و عشرت کا ہر سامان فراہم ہونے لگتا ہے۔ قوالی کی محفلیں برپا ہوتی ہیں۔ گانے بجانے کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ نذر و نیاز کے چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں اور راگ رنگ کی خوش فعلیاں دلوں کو لبھاتی اور نظروں کو گرماتی ہیں۔

اس کے برعکس جو شخص اپنے جگر کو خون کر کے، اپنی نیندیں حرام کر کے اور اپنے راحت و آرام سے بے نیاز ہو کر خلق خدا کی بہبود کے لیے اپنے اوقات عزیز کا ایک ایک لمحہ صرف کرتا ہے۔ جو کبھی منبر و محراب کے ہنگاموں کو اپنی دل سوزیوں سے آباد کرتا ہے۔ کہیں انجمن در خلوت کے مزے لوٹتا ہے اور کبھی خلوت در انجمن کے عالم استغراق میں قال اللہ اور قال الرسول کی مسند پر بیٹھ کر درس و تدریس کا مشغلہ جاری کرتا ہے۔ کبھی دعائے نیم شبی میں مصروف ہوتا ہے تو کبھی آہ سحر گاہی میں مشغول رہتا ہے۔ کبھی تبلیغ اور اشاعت دین کے جوکھم میں اپنی جان کو ڈالتا ہے۔ کبھی اسٹیج پر اہل باطل سے بحث و تمحیص کا ڈول ڈالتا ہے اور کبھی دار و رسن کی آزمائش کے مرحلہ کو سر کرتا ہے

Marfat.com

اس راہ میں سب پر جو گزرتی وہ گزری
تنہا پس زنداں کبھی رسوا سر بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرگوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہل حکم برسر دربار
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت

ان بے پناہ تکلیفوں اور مصیبتوں کا ہنستے اور مسکراتے ہوئے استقبال کرنا اور اس پر بھی جادۂ استقامت سے منحرف نہ ہونا اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دینا معمولی بات نہیں ہے ع

جگر خوں ہو تو خون دل سے ہوتی ہے نظر پیدا

مگر زمانہ اور اہل زمانہ کی قدر ناشناسی کا حال یہ ہے کہ وہ اس قسم کے ارباب عزیمت کو طاق نسیان کی نذر کر دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ اپنی حیات ملی کے ایک پیش بہا اثاثہ کو نذر تغافل کر رہے ہیں۔ زندہ قومیں اہل علم کی قدر افزائی کا جس قدر اہتمام کرتی ہیں اور ان کی عزت و احترام کی پاسداری کے لیے جو اقدامات بروئے کار لاتی ہیں، ہم نام کے مسلمان اگر اپنے واجب الاحترام اصحاب علم و فضل کے لیے اگر وہ کچھ نہیں کر سکتے تو ہمیں اس نسبت سے دست کش ہو جانا چاہیے۔ جس نسبت پر ہم اقوام عالم کی مجلسوں میں فخر و ناز کا اظہار کرتے ہیں۔

تعجب بھی ہوتا ہے اور دکھ بھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری نئی نسل ماضی کے ورثہ سے اپنا رشتہ بڑی تیزی سے منقطع کرتی چلی جا رہی ہے، اور اپنی کوتاہ نظری اور کم سوادی کی بدولت اسلام کی میراث سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔

یہ کتاب دراصل اسلاف کے ورثہ علمی و عملی ہی کی جانب مسلمان قوم کی توجہ مبذول کرانے کی غرض سے لکھی گئی ہے اور اس کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے۔

1991ء میں احقر فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے مکۃ المکرّمہ حاضر ہوا۔

Marfat.com

وہاں حضرت مولانا شمیم صاحب قدس سرہ مہتمم مدرسہ صولتیہ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت مولانا کی مرنجان مرنج شخصیت نے بہت متاثر کیا۔ مولانا مرحوم کی کرم فرمائی اور اخلاق کریمانہ کی وجہ سے آپ سے روز ملاقات ہوتی۔ ایک روز دوران ملاقات مولانا مرحوم نے میری توجہ بانیٔ مدرسہ صولتیہ حضرت مولانا کیرانویؒ کی طرف دلائی۔ مولانا شمیم صاحب قدس سرہ کی خواہش تھی کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوای صاحب قدس سرہ پر ایک ایسی کتاب تالیف کی جائے جو ضخیم بھی ہو اور مولانا کیرانویؒ کی زندگی کے سب گوشوں پر محیط بھی۔ کتاب ایسی ہو جس کو پڑھ کر حضرت مولانا کیرانویؒ کی پوری شخصیت اور ان کے زمانہ کے پرآشوب حالات سے آشنائی حاصل ہو۔ حضرت مولانا مرحوم نے اس کے لیے مجھے کچھ مواد بھی فراہم فرمایا۔ اس مواد سے بہت فائدہ بھی حاصل کیا گیا۔ کافی اقتباسات اس میں سے اس کتاب میں نقل کیے گئے، لیکن افسوس کہ یہ کتاب مولانا مرحومؒ کی حیات مستعار میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی جس کی بہت سی وجوہات ہیں۔

مختلف کتابوں کے مطالعہ سے جو پتہ چلا وہ یہ کہ عیسائیت کے مقابلہ میں اور انگریزی سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے جو کردار ادا کیا اس کو لوگوں کے اذہان میں کسی شخص نے بھی اس طرح نہیں اتارا جس طرح سے اس کا حق تھا۔ حضرت مولانا شمیم صاحبؒ کے دل میں یہی خواہش اٹھکیلیاں لے رہی تھی کہ مولانا کیرانویؒ کو نئی نسل کے سامنے ان کی دینی، ملی، علمی اور جہادی خدمات کے ساتھ متعارف کرایا جائے۔ ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ کتاب تالیف کی گئی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ میری یہ تالیف حضرت مولانا کیرانویؒ کے بارے میں دوسری تمام کتابوں سے قاری کو بے نیاز کر دے گی کیونکہ ان کتابوں کا تمام مواد اس میں سمو دیا گیا ہے۔

اس کتاب کی تالیف کا ایک مقصد جہاں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کی قرار واقعی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنا ہے، وہاں ساتھ ہی اس مغرب زدہ طبقہ کو جو مغربی تہذیب کی مادی ترقی سے بری طرح مرعوب ہو کر شدید قسم کے احساس

Marfat.com

کمتری میں مبتلا ہو چکا ہے، یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرانا ہے کہ مغرب کے پاس اگر ہیگل ہے، کانٹ ہے، نطشے ہے، ڈارون ہے، فرائڈ ہے، مارکس ہے، اینگلز ہے تو ان کے مقابلہ میں ان سے بدرجہا بہتر شخصیتیں مسلمانوں کے اوراق تاریخ میں بھی ایسی موجود ہیں جو اپنے افکار ونظریات میں مثالی شخصیتیں قرار دی جاسکتی ہیں اور جن کا جواب آج تک مغرب پیش نہیں کر سکا اور اس سائینٹفک ترقی کے حیرت انگیز اور حیرت خیز مظاہرے کے باوجود نہ آئندہ کبھی پیش کر سکے گا

اولئک آبائی فجئنا بمثلھم

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

لوگ اگر ابن رشد کو بھول گئے ہیں، اگر ابن حزم اندلسی انھیں یاد نہیں رہا، اگر ذکریا رازی، اور ابوالحسن اور ابوالقاسم اندلسی، فخر الدین رازی، بوعلی سینا اور ان سے بھی پہلے ابن حیان کے نام ان کے حافظہ سے فراموش ہو گئے ہیں۔ اور اگر ابن عربی، غزالی، رومی، عمر خیام اور ابوالعلاء معری کے اجتہادی تصورات پر ان کی نظر نہیں رہی، اور انہیں اگر ابن تیمیہ، ابن قیم اور جلال الدین سیوطیؒ کے کارناموں کا علم نہیں، اور اگر وہ ابن حوقل، البیرونی اور ابن خلدون کے ناموں سے آشنا نہیں ہیں تو چلئے چھوڑیئے کہ یہ لوگ اس دیس کے رہنے والے نہیں تھے، لیکن وہ عظیم وجلیل شخصیتیں جو اسی برصغیر کی عجمی آب و ہوا میں پروان چڑھیں اور جو اسی دھرتی کے باشندے اور اسی سرزمین کے باسی تھے، ان کی کارگزاریوں اور ان کے علمی اور عملی عظیم کارناموں کو تو خود فراموشی کے گڑھے میں نہ گرایئے کیونکہ اگر آپ نے انہیں بھی نظر انداز کر دیا تو آپ کا ماضی سنسان ہو کر رہ جائے گا اور آپ کے قومی تشخص کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ گرے گی اور آپ محسوس کریں گے کہ آپ ہوا میں معلق ہو کر رہ گئے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند نے ایسی بہت سی شخصیتوں کو جنم دیا ہے جنہیں دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ اور متمدن ومہذب قوم کے نامور لوگوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے اور بدیہی شواہد کے ذریعے ان کی برتری کو نہ صرف ثابت کیا جا سکتا ہے بلکہ دوسری قوموں کے مشاہیر کو ان کی عظمت کے سامنے سرنگوں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایسی ہی عظیم

الشان شخصیتوں میں سے ایک نمایاں نام مجاہد اسلام حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کا ہے جنہوں نے اپنی تالیفات اور مدرسہ صولتیہ کی شکل میں اپنے کارناموں کے نقوش جریدۂ عالم پر ثبت فرمائے اور اپنی شخصیت کے ہمہ جہتی پہلوؤں کو دوام بخشا۔

حضرت مولانا کیرانویؒ کی شخصیت پر بحث کے دوران ان کے مختلف معاصرین کے نام بھی آئے ہیں۔ان سے متعارف کرانے کے لیے فٹ نوٹس میں اجمالی طور پر ان کے حالات بھی لکھ دیئے گئے ہیں، کیونکہ معاصرین بھی کسی عظیم شخصیت کو اجاگر کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مقصد میں کامیاب فرمائے جس مقصد کے لیے میں نے یہ کتاب تالیف کی ہے اور حضرت مولانا شمیم صاحبؒ کو کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے جو اس نابغۂ روزگار شخصیت کی زندگی اور اس کے کارناموں پر مشتمل اس کتاب کے لکھوانے کا باعث بنے۔

نیاز آگین: حکیم محمود احمد ظفر۔ سیالکوٹ

27 اکتوبر 1992ء

Marfat.com

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ

سرزمین پاک و ہند میں فرنگی حکمرانوں کی جلوہ آفرینیاں لیل و نہار کے دامن سے ابھی جنم لے رہی تھیں اور ہندوستان کے در و دیوار غیر ملکی حملہ آوروں کے تشدد کی صدائے بازگشت سے کبھی کبھار کپکپی محسوس کرنے لگتے تھے، غلامی کی زنجیریں سرزمین پاک و ہند کا مقدر بننے والی تھیں اور ہندوستان کا بخت فرنگی اقتدار کے سامنے نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ اس بحرانی دور میں حق تعالیٰ شانہ نے ایک ایسی شخصیت کو صفحۂ تاریخ پر اجاگر کیا جس نے مغربی قوت و اقتدار اور عیسائیت کے غلبۂ تسلط دونوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر تاریخ کے دھارے کو تبدیل کر دیا۔

گزشتہ صدی کا ماہ رجب 1270ھ مسلمانان پاک و ہند کی دینی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کو امت مسلمہ کی نصرت اور معاونت پر مقرر فرمایا جو آرائش کائنات میں ایسے چراغ کی طرح روشن رہا جس کی لو میں آسمان کے ستاروں نے اپنی راہیں تلاش کیں۔ اور گم کردہ راہ انسانوں نے انہیں راہ انسانیت کا سنگ میل جانا۔ اس شخص نے فرنگی اور عیسائی قمار خانوں کی دیواروں پر کھڑے ہو کر توحید کا وہ نغمہ چھیڑا کہ صراحی و جام ٹکرا کر رہ گئے اور ساقی اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اس نے تثلیث و صلیب کی وہ دھجیاں اڑائیں کہ اس کے بچاری دم بخود ہو کر رہ گئے۔ اس نے ان فرنگی استعمار اور صلیبی اقتدار کے دروازوں پر دستک دی جن کے دل خون سے تہی، آنکھیں بینائی سے محروم اور کان صدائے توحید اور نوائے حق سے ناآشنا تھے۔

۹۴۵۹۶

Marfat.com

اس نے آگرہ کے پلیٹ فارم اور شاملی کے میدان میں فرنگی سلطنت کے در و دیوار متزلزل کر دیئے بلکہ آگرہ میں تو عیسائی مشنری فنڈر کو ایسی شکست فاش دی کہ اسلامی دنیا اس بارے میں اسے سالار کارواں سمجھنے لگی اور غبار کارواں اس کے قدم چومنے لگا۔

ہندوستان غلامی کی زنجیروں سے سو سال کے بعد اب آزاد بھی ہو چکا ہے زمانہ بدل چکا ہے، خیالات و رجحانات میں غیر معمولی انقلاب رونما ہو چکا ہے، سیاسی پیچیدگیاں، معاشی مشکلات اور اقتصادی ہنگامہ آرائیوں کے اس دور میں شاید کوئی اس افسانۂ کہن کی قدر دانی سے گریز کرے اور اسے سازِ کہن کہہ کر گلدستۂ طاق نسیان بنا دے۔ باہمی تفریق و اختلاف کے اس دور میں اس فرسودہ بیانی کو بظاہر بے وقت کی راگنی سمجھے کیونکہ زمانہ کی تیز رفتاری نے اب فرش زمین سے چاند پر زقند لگالی ہے۔ اس صدی کے انسان نے برق رفتاری سے ترقی کی۔ سمندروں کو مسخر کیا، زمین کی طنابیں کھینچیں اور آسمان کو اپنی کمند میں لانے کی کوششوں میں مصروف ہے، فضا میں چہل قدمی اس کا روز مرہ کا معمول بن چکا ہے۔ اس تیز رفتار بلکہ برق رفتار دور میں کسے فرصت ہے کہ وہ مڑ کر دیکھے اور موجودہ نسل کسی ذکر کہن کو سننے کے لیے تیار ہو، لیکن تاریخ کا نام جب تک جریدۂ عالم پر زندہ ہے اور زندہ اقوام اپنی مذہبی اور قومی تاریخ اور اپنے ماضی کے شاندار کارناموں کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھتی رہیں گی اور ان میں اپنے مستقبل کی منزلیں تلاش کریں گی، اس وقت تک ہر پرانی یاد اور پرانا تذکرہ اور گزرے ہوئے حالات و واقعات کسی نہ کسی عنوان سے منصۂ شہود پر ضرور آتے رہیں گے۔ اور وہ زندہ قومیں اُسے افسانۂ کہن سمجھ کر بھلا نہیں دیں گے بلکہ اس کے گرد و غبار میں اپنے مستقبل کی منزلیں پوشیدہ سمجھیں گی۔ نظام کائنات جب تک متحرک ہے، زندگی اور موت کے درمیان جب تک کشمکش جاری ہے، زمین و آسمان کے درمیان جب تک بہار و خزاں کی آمد و رفت جاری و ساری ہے اور نیکی اور بدی کے مابین جب تک تصادم قائم ہے، ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اور اگر اس کے خلاف ہوگا تو وہ زندہ قومیں مردہ قوموں میں تبدیل ہو جائیں گی۔ ان کی رگ حیات میں کشمکش حیات کا جذبہ منجمد ہو جائے گا۔ ماضی و مستقبل سے ان کی

Marfat.com

نگاہیں ہٹ کر صرف حال پر مرتکز ہو جائیں گی اور زندگی کے بازار میں وہ آزادی کی جنس گراں بار کو اٹھانے کی متحمل نہ ہو سکیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک روز وہ یا تو دوسری اقوام کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ جائیں گی یا پھر حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں گی۔

دنیا گہوارۂ انقلاب ہے۔ سرزمین ہندوپاک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ہمدوش مذہب عیسوی نے بھی فروغ حاصل کیا اور سرزمین ہندو پاک پر حملہ آور ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی پوری پوری کوشش کی کہ اس مغلوب ملک کو دینی حیثیت سے بھی فتح کیا جائے۔ اسی وجہ سے کمپنی کی تائید اور اعانت سے عیسائی مذہب کی تنظیم و ترقی عمل میں لائی گئی۔ ملک کے طول و عرض میں عیسائی مشنریز کو منظم کیا گیا۔ کمپنی کے فنڈز کی ایک بہت بڑی مقدار ان کے لیے مخصوص کی گئی۔ چرچ، مشن سوسائٹی، بائیبل سوسائٹی، مشن فنڈ، مشن ہسپتال، مشن اسکول اور مشن کالج ملک کے مختلف حصوں میں قائم کیے گئے۔ مذہبی کتابوں اور اخبارات و رسائل کی نشرواشاعت کے ذریعہ عوام کے دینی رجحانات اور عقائد کو بدلنے کی مہم ایک بہت بڑے پیمانے پر جاری کی گئی۔ یہ سب کچھ مشنریز کی طرف سے نہیں تھا بلکہ خود کمپنی بہادر (حکومت) کی ملکی سیاست اور عملی تائید اس کے ساتھ تھی۔ مشنریوں کو مالی امداد سے نوازا جاتا۔ ممتاز اور اعلیٰ حکام ان کی برابر سرپرستی کرتے بلکہ اس کی سرپرستی کرنا اپنا ایک دینی اور حکومتی فرض سمجھتے تھے۔ اس بارے میں مولانا الطاف حسین حالی مرحوم نے بھی فرمایا ہے:

> ''ہندوستان میں اسلام خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دوران میں ان کو دبلا پتلا شکار پیٹ بھر کر مل جاتا تھا مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ دانت ان کا مسلمانوں پر تھا، اس لیے کہ ان کی منادیوں میں، ان کے اخباروں میں اور ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے برائیاں ظاہر کرتے

تھے۔ بانیٔ اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع واقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب ان کے دام میں آ گئے۔ اس خطرہ سے بلاشبہ علمائے اسلام جیسے مولانا آل حسن، مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم اور ڈاکٹر وزیر خان وغیرہ متنبہ ہوئے۔ انہوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلے میں لکھیں اور اُن سے بالمشافہہ مناظرے کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ردّ نصاریٰ میں تالیف و تصنیف اور پادریوں سے مقابلہ ومناظرہ کا سلسلہ ایک جماعتی نہ سہی لیکن انتظامی شکل میں شروع ہو گیا تھا۔ قدرتی طور پر ہر جگہ مسجدیں تھیں۔ علمائے کرام کے وہ گڑھ تھے۔ اس انقلابی تحریک کے چلنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ راہ نما کی ضرورت تھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے بہتر کون ثابت ہوسکتا تھا۔ انہوں نے اس کی بنیاد ڈالی، اور اس کام کے لیے دہلی، آگرہ کو مرکز قرار دیا۔ یہاں بھی مولانا نے تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ ان کی جماعت میں ہندوستان کے انتہا پسند اور حضرت اسماعیل شہیدؒ کے فدائی مسلمان تھے، جن کی تعداد کافی تھی۔

یہ اس صورتحال کی ایک معمولی سی جھلک تھی جو مولانا حالیؒ نے بتائی ہے۔ 1857ء میں جب انگریزوں کا پورے ہندوستان پر مکمل قبضہ ہو گیا تو ان کے پیش نظر سب سے پہلا کام ہی یہ تھا کہ کس طرح ہندو پاک میں عیسائی اکثریت پیدا کی جائے اور کس طرح لوگوں کو عیسائیت کے دام میں پھانسا جائے۔ چنانچہ انگریز حکام فوجیوں اور سرکاری عہدیداروں کو وقتاً فوقتاً یہ حکم دیتے رہتے تھے کہ عیسائی مشنریز کی تائید وحمایت جاری رکھی جائے۔ لارڈ منٹو کے عہد میں عیسائی مشنریز کے خلاف فساد میں تیس انگریز مارے گئے تو حکومت برطانیہ نے عیسائی مشنریز کی جدوجہد اور سرگرمیوں کو مزید تیز کرنے اور انہیں منظم کرنے کے لیے یہ حکم جاری کیا کہ سرزمین پاک وہند میں تبلیغ کے

لیے وہی مبلغ جا سکتا ہے جس کے پاس حکومت کا پروانہ اور آرڈر ہو۔ مقصد اس کا یہ تھا تا کہ تبلیغی نظام میں تنظیم پیدا کی جائے اور صرف بااختیار (Authorized) لوگ ہی تبلیغ کے فرائض سرانجام دیں۔ حکومت نے اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑے پادری کو بھی متعین کر دیا، تا کہ وہ تبلیغی سرگرمیوں میں مشورہ دے سکے۔

لارڈ کیننگ نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ تین سال کے اندر پورے ہندوستان کو عیسائی اکثریت میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ایک برطانوی ممبر پارلیمنٹ نے 1857ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد اس کا اظہار کیا تھا کہ آج سے پورا ہندوستان انگریزوں کے زیرنگین ہے۔ اب پورے ملک پر حضرت مسیح (علیہ السلام) کا پرچم لہرایا جائے گا۔ اب ہم تمام عیسائیوں کا یہ بنیادی فریضہ ہے کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ ایک رپورٹ میں اس بات کا اشارہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے عیسائی مبلغین بڑے امن وسکون سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اس لیے کہ حکومت برطانیہ کی سرپرستی اور حمایت میں وہ یہ کام انجام دے رہے ہیں۔

1857ء میں تعلیم کے نام پر گورنر نے نصرانیت کا پراپیگنڈہ اسکولوں میں شروع کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں کلکتہ کے اندر لوٹ مار ہوئی تو میر جعفر سے جرمانہ وصول کیا گیا۔ اس جرمانہ سے کلکتہ میں ایک فری اسکول قائم کیا گیا اور اس اسکول کا مہتمم خود گورنر تھا۔ اس اسکول میں لڑکیوں کی تعلیم کا بھی بندوبست تھا۔ اس مدرسہ کے قیام کی غرض و غایت یہ تھی کہ اس میں ہر مذہب وقوم کا وہ بچہ جس کی عمر 5 سے 10 سال تک ہوتی تھی، داخل ہو سکتا تھا۔ اور ہر طالب علم کے لیے یہ لازم قرار دیا گیا تھا کہ وہ عیسائی دعاؤں میں شامل ہو اور بائبل کی تعلیم ضرور حاصل کرے۔

یہ تو صرف ایک فری اسکول کا حال ہے۔ کتابوں کی ورق گردانی سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جو بھی مدرسہ قائم ہوا اس کے ہر طالب علم کو یہ حلف اٹھانا پڑتا تھا کہ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ مشنری کاموں میں ضرور حصہ لے گا۔

سرسید احمد خان نے لکھا ہے کہ مشن اسکولوں میں لڑکوں کو انجیل پڑھا کر پھر ان سے سوال کیا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ اور تمہارا نجات دہندہ کون ہے؟ عیسائی

Marfat.com

مذہب کے مطابق جواب دینے والوں کو انعام دیا جاتا تھا۔ مشن کے سینکڑوں اسکولوں میں داخل ہونے کے لیے حکام ضلع ترغیب دیتے تھے اور اسکولوں میں جا کر دیکھتے تھے کہ کون کون انجیلی دعا میں شامل ہوا ہے۔ اور اگر لوگ بچوں کو داخل نہیں کرتے تھے تو مجبور کیا جاتا تھا اور حکماً داخل ہونا پڑتا تھا۔ (اسباب بغاوت ہند: ص ۱۱۰)

1857ء کی جنگ سے قبل بالعموم اور جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد بالخصوص لوگوں کو انگریزی تعلیم کی ترغیب دی جاتی تھی۔ ان سے انگریزوں کا مقصد صرف انگریزی زبان کی تعلیم دینا نہیں ہوتا تھا بلکہ عیسائیت کی تبلیغ کرنا ہوتی تھی اور نوجوان نسل کو عیسائیت کی طرف راغب کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ آنریبل مسٹر چارلس گرانٹ، ڈائرکٹر کمپنی جو ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کا حامی تھا، وہ بھی انگریزی تعلیم کی یہی غرض و غایت بیان کرتا ہے:

> ''یہ بالکل انگلستان کے اختیار میں ہے کہ وہ ہندوؤں کو بتدریج ہماری زبان سکھائے اور بعد میں اسی کے ذریعہ ہمارے فنون فلسفہ مذہب کی تعلیم دے، مگر بلاشبہ سب سے اہم تعلیم جو ہندوؤں کو ہماری زبان کے ذریعہ ملے گی وہ ہمارے مذہب کی معلومات ہوں گی۔ مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ہندوستان کے کریکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ لیکن ہمیں ہندوستانیوں کو سچے مذہب (عیسائی مذہب) سے اور بہترین اخلاق سے اور علوم وفنون کے اصول سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔''
>
> (مسلمانوں کا روشن مستقبل: ص ۹۸)

ہندوؤں کے ہاں مدت سے یہ مذہبی اصول چلا آرہا تھا کہ جب کوئی ہندو عیسائی ہوتا تو اس کو دید اور ہندو مذہب کے اصول کے مطابق ہندو پنڈت محروم الارث قرار دیتے تھے یعنی وہ اپنے ہندو والدین اور رشتہ داروں کی وراثت سے محروم ہو جاتا تھا۔ یہ بات عیسائیت کی تبلیغ کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی اور پادریوں کو ہندوؤں کو عیسائی بنانے میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ چنانچہ لارڈ ریڈنگ گورنر جنرل

نے پادریوں کی اس دقّت کو آسان بنانے کے لیے 1850ء میں ایک ایکٹ نافذ کیا جس کی رو سے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اگر کوئی ہندو عیسائی مذہب اختیار کر لے تو وہ اپنے حقوق اور خاندانی وراثت سے محروم نہ ہو سکے گا۔ اس ایکٹ نے ہندوؤں کو عیسائی بنانے کی راہ آسان کر دی۔

حاکم اور صاحب اقتدار شخص جب کسی سے کوئی چیز منوانا چاہے تو اس کے پاس سو حربے ہوتے ہیں۔ وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنی بات منوا سکتا ہے۔ یہی حال انگریزوں کا تھا۔ ان کے ہاں تو ویسے بھی ایک مسلمہ اصول ہے ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' (Might is Rihgt) انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مخصوص دینی اور مذہبی نشانات کو بھی مٹانے سے دریغ نہ کیا تاکہ عیسائیت کی تشہیر کی راہ ہموار ہو سکے۔ چنانچہ 1808ء میں پہلی بار مقام ویلور، مدراس میں سر جان کر اور ایک کمانڈر انچیف نے اپنے فوجی قوانین میں تین باتوں کا اضافہ کیا اور حکم دیا کہ

1- ہندوستانی فوجی، ماتھے پر تلک نہ لگایا کریں۔

2- داڑھیاں منڈائیں۔

3- اپنے سروں پر بجائے ہندوستانی ٹوپی اور پگڑی کے انگریزی ہیٹ پہنیں۔

اس حکم سے اگرچہ فوجی بہت چیں بجیں ہوئے لیکن ''حکم حاکم مرگ مفاجات'' کے تحت یہ احکام ماننے پر مجبور تھے۔

لوگوں کو عیسائی بنانے کا کچھ ایسا جذبہ ان کے دلوں میں موجزن تھا کہ شہری انتظامیہ اور حکام بلکہ افسرانِ فوج بھی اپنے ماتحتوں سے فارغ وقت میں مذہبی باتیں کرتے تھے اور انہیں اپنی کوٹھیوں اور بنگلوں میں بلا کر عیسائی پادریوں سے مذہب کی تلقین اور تبلیغ کراتے تھے۔ علاوہ ازیں چھوٹی نوکریوں کے لیے یہ ضروری قرار دے دیا گیا تھا کہ سرٹیفکیٹوں پر ضلع کے ڈپٹی کمشنروں کے دستخط ہوں وگرنہ نوکری کا حصول ناممکن تھا۔ اور یہ ڈپٹی کمشنر زیادہ مشنری ہوتے تھے جن کو ہندوستانی لوگ کالا پادری کہتے تھے۔ چنانچہ جو لوگ کچھ دینی غیرت کے تحت اپنے سرٹیفکیٹ پر ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے دستخط نہ کرواتے، انہیں نوکری نہ ملتی تھی۔

انگریزوں نے حکومت چونکہ مسلمانوں سے چھینی تھی اس وجہ سے ان کی ساری جدوجہد کا ہدف مسلمان تھے۔ وہ انہیں دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے اس قدر پامال کر دینا چاہتے تھے کہ ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف ہر قسم کی کاروائی کا جذبہ ہی ختم ہو جائے۔ چنانچہ پادریوں کی ایک پوری کھیپ اسلام کے خلاف کتابیں، پمفلٹ اور مضامین لکھنے میں دن رات مصروف ہوگئی۔ اور انہوں نے اسلام میں تحریف کرنے اور اسلام اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کا طوفان اٹھا دیا۔ جن میں چند ایک الزامات اور اعتراضات یہ تھے:

1- قرآن حکیم تحریف شدہ ہے۔ یہ اصل نہیں ہے۔
2- قرآن حکیم کے تمام مضامین توریت و زبور سے سرقہ کیے گئے ہیں، اور اس میں اس کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ بھی یہودی علماء سے حاصل کیا گیا ہے۔
3- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نبی نہیں تھے۔
4- نبی کے لیے معجزہ ضروری ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معجزہ ثابت نہیں۔
5- اسلام میں بذات خود تو کوئی صداقت اور سچائی نہیں۔ اس کی تشہیر تلوار کے زور سے ہوئی ہے۔
6- اسلام جھوٹ کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ جھوٹ تمام آسمانی مذاہب میں حرام ہے۔
7- مسلمان جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی، یہ غلط ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرع (مرگی) کے مرض میں مبتلا تھے۔

علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ اور آپ کے صحابہ کرامؓ پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے اور ان کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی۔

پھر یہ اعتراضات بھی کسی علمی رنگ میں نہ لگائے جاتے بلکہ نہایت بھونڈے انداز میں وہ آپ کی ذات ستودہ صفات پر لگائے جاتے اور پادری ان پمفلٹوں کو جن میں یہ اعتراضات مندرج ہوتے، پکڑ کر بازاروں میں علی الاعلان لوگوں کو چیلنج کرتے پھرتے کہ ان الزامات کا جواب دو۔

مسلمان بیچارے انگریزوں کے مقہور تھے۔ ان کو اپنی جان کی فکر ہوتی تھی، کیونکہ جو الزامات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا، اس پر طرح طرح کی مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جاتے، لہٰذا مسلمان ان گھناؤنے اور بھونڈے الزامات کو سن کر خاموش ہو جاتا۔ خاموش رہنے کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ مسلمان عیسائی مذہب سے بہت کم واقف اور آشنا تھے، لہٰذا وہ عیسائیوں کو کوئی الزامی جواب نہیں دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی مشنری ان پر حاوی ہو گئے اور کئی مسلمان خاندان عیسائی بن گئے۔ چنانچہ پانی پت کا عمادالدین اور اس کا باپ چراغ دین اور اس کے بھائی خیر الدین نے اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لی۔ اور دنیا کے مادی فوائد سے جو انگریزی حکومت نے ایسے لوگوں کے لیے رکھے ہوئے تھے، مستفید ہونے لگے۔

غرضیکہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر مختلف فتنوں نے تابڑ توڑ حملے کیے خصوصاً عیسائیت کا حملہ تو حکومت کی زیر ہدایت نہایت سخت تھا، کیونکہ افرنگی یہ سمجھتا تھا کہ چوٹ کھایا ہوا دل جب سنبھالا لیتا ہے تو وارفتہ انتقام کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ عقل و خرد لاکھ آڑے آئے مگر جنوں اپنا کام کر جاتا ہے۔ عیسائیت کے حملے نے اہل دل پر بادِ سموم کا کام کیا۔ وہ سانپ کی طرح بل کھا کر رہ گئے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ درد گھاؤ بنتا چلا گیا۔ آخر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے اس بلائے بے درمان کا علاج فراہم کیا۔ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی اس زمانہ کے حالات کا ایک نقشہ حیات شبلی کے دیباچہ میں پیش کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں پر کئی طرف سے فتنوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ سید صاحب مرحوم لکھتے ہیں کہ

> ”انگریزوں کے برسرِ عروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا۔ عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعۂ روئیں پر حملے شروع کر دیئے۔ دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے اپنے سابق حکمرانوں سے نجات پا کر ان پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم و فنون اور تمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ

کرنے لگی۔ خدا نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر وزیر خان صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، مولانا رحم علی صاحب بنگلوریؒ، مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹیؒ، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ وغیرہ اشخاص پیدا کیے جنہوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیے، اورخصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خان صاحبؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا وجود تو ردّ عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں۔ اور کون باور کرسکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لیے ڈاکٹر وزیر خان جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی ویونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود انہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا۔ اور مولانا رحمت اللہ کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کردے گا۔

آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلہ کے لیے خاص طور پر مولانا محمد قاسم صاحب کا ظہور بھی تائید غیبی ہی کا نشان ہے اور پھر جس طرح عقائد حقہ کی اشاعت اور ردّ بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا اس کے آثار باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔" (دیباچہ حیات شبلی)

یہ اس آدمی کے تاثرات ہیں جو مولانا شبلی کے بعد تاریخ پر سب سے زیادہ گہری نگاہ رکھتا تھا۔ جو وقت کا نباض اور قدیم اور جدید علوم کی گنگا جمنا تھا۔ جس کا تاریخی تجزیہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے عیسائی مشنریوں کی تبلیغ کو ناکام بنا دیا۔ یہاں تک کہ

Marfat.com

''ہندوستان میں ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے جنہوں نے دین مسیحی قبول کیا ہو۔'' (خطبات گارسان دتاسی، ۲۰ ستمبر ۱۸۶۹ء)

پیدائش:

مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ فرنگی حکومت کو دن بدن عروج اور مغلیہ سلطنت کو روز بروز زوال حاصل ہو رہا تھا۔ بخت اور وقت دونوں اس سے روٹھ چکے تھے اور مسلمانوں کی چار پانچ سو سالہ سلطنت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہونے والی تھی کہ اس بحرانی دور میں ضلع مظفر نگر کے قصبہ کیرانہ کے محلّہ دربار کلاں میں جمادی الاولی 1233ھ میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ''رحمت اللہ''[۱] رکھا گیا۔

حق تعالیٰ شانہ کے سوا کون اس بات سے آشنا تھا کہ آج جو بچہ ایک چھوٹے سے محلّہ میں ایک ماں کی کوکھ سے خون اور گوشت کے ایک لوتھڑے کی شکل میں جنم لے رہا ہے وہ ایک روز نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بلکہ پوری امت مسلمہ کے لیے صحیح معنوں میں ''اللہ کی رحمت'' ثابت ہوگا۔ دنیائے انسانیت میں وہ وقت کا بہت بڑا مناظر، دین کا بہت بڑا مبلغ، طاغوتی اور فرنگی استعمار کے خلاف بہت بڑا مجاہد اور مستقبل کے ہندوستان کی پیشانی کا ایک ایسا جھومر ہوگا جس کی روشنی میں حکمرانوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی اور منزل ناآشنا لوگ اپنی منزل تلاش کریں گے۔

بعض قلمی یادداشتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں ''کیرانہ'' چوہان راجپوتوں کی راجدھانی رہ چکا ہے۔ جونڈا اور بانسہ ضلع کرنال میں جو چوہان آباد تھے، اُن کے مورث اعلیٰ رانا ہرہ کی اولاد میں سے رانا کلسہ ''کیرانہ'' کا حکمران تھا جس کی وجہ سے قصبہ اور نواح کے چوراسی گاؤں ''کلسیان گوجر'' کہلاتے ہیں۔

رانا کلسہ چوہان راجپوت تھا، لیکن کیرانہ اور اس کے گردونواح میں گوجر قوم آباد تھی۔ بدیں وجہ رانا کلسہ نے اسی قوم میں شادی کی۔ رانا کلسہ سلطان محمود غزنوی کا ہم عصر ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں سلطان کی اجازت سے سید سالار مسعود

۱۔ دکتور محمد عبدالقادر خلیل نے لکھا ہے کہ آپ کا نام ''محمد رحمت اللہ'' تھا۔ اور یہ لفظ ''محمد'' صرف برکت کے لیے تھا جیسا کہ ہندوستان میں یہ رواج تھا۔ (المناظرہ الکبریٰ: ص ۲۵)

Marfat.com

غازی جو کہ ایک بہت بڑے سپہ سالار، مجاہد اور بزرگ تھے، مجاہدین کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ سرزمین پاک و ہند پر حملہ آور ہوئے۔ علاقوں پر علاقے فتح کرتے ہوئے وہ جھنجھانہ ہو کر کیرانہ پر بھی حملہ آور ہوئے۔ شہر کے شمالی اور غربی نواح میں آج تک شہداء کے مزار موجود ہیں۔ ایک قبر چند گز طویل شہر کی شمالی جانب میں واقع ہے جو عرب شہداء کی قبر کہلاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس قبر میں بہت سے شہداء کو ایک جگہ دفن کر دیا گیا۔

سید سالار مسعود غازیؒ کے قصبہ کیرانہ پر حملہ کی یادگار آج تک موجود ہے اور وہ ''سالاری قوم'' ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ قوم ان مجاہدین کے پس ماندگان ہیں جنہوں نے سید سالار مسعود غازیؒ کی زیر قیادت اس قصبہ پر حملہ کیا تھا۔ اور یہ سالاری قوم عرب نژاد ہے۔ یہ قوم قصبہ میں شتر بانی کا کام کرتی ہے اور اونٹ ان کے ذریعۂ معاش ہے۔

تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ کیرانہ میں سب سے پہلے یہی سالاری قوم آباد ہوئی تھی۔ سلاطین تغلق کے زمانہ میں شیخ علاؤ الدین انصاریؒ کیرانہ اور اس کے نواح کے قاضی مقرر ہوئے اس وقت سے انصاری قوم کیرانہ میں آبادی ہوگئی جو ''انصاری کیرانہ'' کہلاتے ہیں۔ شیر شاہ سوریؒ کے زمانہ میں ''کاکڑ زئی'' افغان اس علاقہ میں آباد ہوگئے جن کی اولاد اور پسماندگان آج تک قصبہ میں موجود ہیں۔ گویا کہ قصبہ کیرانہ اور اس کے گرد و نواح میں ''سالاری قوم''، ''انصار کیرانہ'' اور ''کاکڑ زئی پٹھان'' بھی آبادی کا ایک حصہ ہیں اور ان کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کا اس قصبہ سے کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے ؎

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہی دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

نسب:

تاریخ جن لوگوں کو اپنی تکمیل کے لیے منتخب کرتی ہے یا جو لوگ بڑے ہو کر وقت اور بخت کے دھارے کو بدلتے ہیں اور جریدۂ عالم پر اپنا نام ثبت کرتے ہیں، ضروری نہیں کہ ان کی نسبت کسی اونچے گھرانے اور اعلیٰ خاندان سے ہو۔ بلکہ ماضی بعید

Marfat.com

اور ماضی قریب میں جن لوگوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنے نقش چھوڑے، ان کا تعلق اکثر و بیشتر چھوٹے گھرانوں ہی سے رہا۔ ان کے آباء و اجداد کو وقت کے حاکمانہ وقار نے کبھی نظر التفات سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ چشم فلک نے بارہا یہ نظارہ دیکھا اور تاریخ کے اوراق اس بات کی چشم دید گواہی پیش کرتے ہیں کہ جھونپڑیوں میں پرورش پانے والوں نے جب محلات پر کمندیں ڈالیں اور قصر شاہی کے درو بام کو پر کاہ کی حیثیت دی تو تاجِ شاہی ان کے قدم چومنے لگا، فرماں روائی ان کی عبائیں اٹھائے پھری اور قصر شاہی کے بام و دران کی حق گو زبان کے سامنے لڑکھڑانے لگے، لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں تھا۔ آپ نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا جو کئی نسلوں سے دینی اور دنیوی دونوں وجاہتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ یہ گھرانا نہ صرف دنیوی بلکہ دینی رشد و ہدایت کا بھی صدیوں سے محور رہا۔ انسانی زیست نے فخر و مباہات کے سینکڑوں صنم خانے ویران کر کے انہی مے خانوں سے اپنی آنکھوں کے ڈورے سرخ کیے۔ مخلوق خدا کے لڑکھڑاتے قدم اسے اس خاندان کے آستانۂ مراد تک لے آئے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے انسانیت کو اس کی منزل کا راستہ بتایا۔ حضرت مولانا محمد سلیم کیرانوی قدس سرہ نے آپ کا نسب نامہ حسب ذیل بیان کیا ہے۔ نسب نامہ کے افراد و اشخاص کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ اپنے اپنے زمانے میں کس قدر قد کاٹھ کے مالک تھے اور قصر شاہی سے لے کر حرم الٰہی تک انہیں ہر جگہ اذن باریابی تھا۔

رحمت اللہ بن خلیل اللہ المعروف بہ خلیل الرحمٰن بن حکیم نجیب اللہ بن حکیم حبیب اللہ بن حکیم عبدالرحیم بن حکیم قطب الدین بن شیخ حکیم فضیل بن حکیم دیوان عبدالرحیم (برادر نواب مقرب خان) بن حکیم عبدالکریم المعروف بہ حکیم بینا المقلب بہ "شیخ الزمان" بن حکیم حسن بن عبدالصمد بن ابوعلی بن محمد یوسف بن عبدالقادر بن کبیر الاولیاء حضرت مخدوم جلال الدین محمد بن محمود بن یعقوب بن عیسیٰ بن اسماعیل بن محمد تقی بن ابی بکر بن علی نقی بن عثمان بن عبداللہ بن شہاب الدین بن شیخ عبدالرحمٰن گازرونی بن عبدالعزیز سرخسی بن خالد بن ولید، عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کبیر مدنی بن عبداللہ الثانی بن عبدالعزیز کبیر بن عبداللہ کبیر بن سیدنا عمرو بن امیر المؤمنین ذوالنورین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ہندوستانیوں میں عثمانیوں کا نسب نامہ نسلاً بعد نسلٍ اس قدیم تاریخی طومار میں محفوظ ہے جو حضرت کبیر الاولیاء مخدوم جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پانی پت میں موجود ہے اور جس کی متعدد نقول بعض عثمانی النسب اہل پانی پت کے پاس ہیں۔ اصلی طومار میں ہر عثمانی جلالی کے نام کا اندراج کم ازکم بیس جلالی النسب اشخاص کی موجودگی میں ہوتا تھا مگر افسوس ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

آپ کے جداعلیٰ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ داماد رسولؐ اور خلیفہ راشد تھے۔ ملاء اعلیٰ کی جانب سے لقب ذوالنورین۔ (۱)

سیدنا عثمانؓ کے صاحبزادے سیدنا عمروؓ آپ کی زوجہ محترمہ سیدہ ام عمرو بنت جندب ازدی کے بطن سے تھے (سیدہ نہایت سادہ مزاج اور سادگی پسند خاتون تھیں) سیدنا عمرو بن عثمانؓ سیدنا عبداللہ بن عثمانؓ (جو سیدہ رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بطن سے تھے) کے بعد سیدنا عثمانؓ کی اولاد میں سب سے بڑے اور شرف و بزرگی کے لحاظ سے بھی سب سے بلند مرتبہ تھے۔ ابن سعد نے انہیں طبقۂ اولیٰ میں شمار کیا ہے اور انہیں ثقہ بتایا ہے۔ انہوں نے خود تو اپنے والد سیدنا عثمانؓ اور سیدنا اسامہ بن زیدؓ سے استفادہ کیا، لیکن ان سے جن حضرات نے استفادہ کیا اور حدیث روایت کی ان میں ان کے صاحبزادے عبداللہؒ، سیدنا زین العابدینؒ، سیدنا سعید بن المسیبؒ اور ابوالزناد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنی صاحبزادی سیدہ رملہ بنت معاویہؓ کو ان کی زوجیت میں دیا۔ (کتاب المحبر ص ۵۷) ان کی ایک اور اہلیہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بن الخطاب کی صاحبزادی حفصہؓ تھیں۔ (کتاب المعارف ص ۸۵) اس لحاظ سے یہ سیدنا معاویہؓ اور سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کے داماد تھے۔

سیدہ رملہ بنت معاویہؓ سے ان کے دو صاحبزادے عثمان الاکبر اور خالد تھے اور سیدہ حفصہؓ بنت عبداللہ بن عمرؓ سے ان کے ایک صاحبزادے عبداللہ الاکبر تھے۔

۱۔ اس بارے میں ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''سیدنا عثمانؓ..... شخصیت اور کردار'' جلد اول و جلد دوم

Marfat.com

(حضرت مولاناؒ کے شجرۂ نسب میں عبداللہ کبیر سے یہی مراد ہیں) ان کے بارے میں ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ ''اور عبداللہ الاکبر (اس وقت کے) لوگوں میں سب سے زیادہ حسین وجمیل تھے اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے ان کا لقب ''المطرف'' تھا۔

(کتاب المعارف: ص ۸۵)

ان کی وفات منیٰ میں ہوئی۔ آپ سیاہ خضاب استعمال فرماتے تھے، چنانچہ سعید المقبریؒ کہتے ہیں کہ ''میں نے جن ابنائے صحابہ کو سیاہ خضاب استعمال کرتے دیکھا ان میں ایک سیدنا عمرو بن عثمانؓ بھی تھے۔

سیدنا عمروؓ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ چنانچہ ان کی تعریف میں سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ جیسے جلیل القدر صحابیٔ رسول نے چند اشعار کہے ہیں جن میں سے تین یہ ہیں ؎

1- ساشکر عمرواً ان تراخت نیتی
ایادی لم تمنن وان خفی جلت

میں عمروؓ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں اگرچہ میری نیت مہمل ہے اور اس کے احسانات باوجود پوشیدہ ہونے کے روشن اور جلی ہیں۔

2- فتیً غیر محجوب الغنیٰ عن صدیقه
ولا مظهر الشکویٰ اذا النعل نزلت

وہ ایسا نوجوان ہے جس کا غنیٰ دوستوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور وہ ایسا نوجوان ہے کہ اپنے جوتے کے ٹوٹ جانے پر بھی شکوہ نہیں کرتا۔

3- رای خلّتی من حیث یخفی مکانها
فکانت قذیٰ عینیه حتی تجلت

میرے احباء اس کے مخفی حالات سے آگاہ ہیں۔ موصوف کی آنکھ کے تنکے بھی روشن نظر آتے ہیں۔

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے خروج کے زمانہ میں سیدنا عمروؓ نے ان کی کوئی نہایت اہم مدد کی تھی، وگرنہ سیدنا ابن زبیرؓ جیسا عابد وزاہد شب

Marfat.com

زندہ دار اور عالم و فاضل، مستغنی المزاج شخص خوشامد کا نام سننے سے بھی متنفر، کہاں ایسی بات کہہ سکتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے سابق یوپی میں سیدنا عمروؓ کی اولاد عثمانی سادات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، محدث کبیر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ وغیرہ اسی دودمانِ عالی شان کے افراد ہیں۔

سیدنا عمرو بن عثمانؓ کے صاحبزادے سیدنا عبداللہ الاکبرؒ نہایت صاحب عمل بزرگ تھے اور اپنے زمانے میں ان صاحب علم و فضل لوگوں میں سے تھے جو ''مرجع انام'' سمجھے جاتے تھے۔ حدیث نبوی اور کتاب اللہ کا علم انہوں نے اپنے والد ماجد سیدنا عمرو بن عثمانؓ اور اپنے نانا سیدنا عبداللہ بن عمرؓ، سیدنا عبداللہ بن عباسؓ، سیدنا عبدالرحمٰن بن ابی عمرہؓ، سیدنا حسین بن علیؓ اور سیدنا رافع بن خدیجؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کرامؓ سے حاصل کیا تھا اور اُن سے ان کے صاحبزادے محمدؒ، زہریؒ، ابوبکر بن حزمؒ اور ہشام بن سعدؒ وغیرہم نے خوشہ چینی کی۔

سیدنا حسین ابن علیؓ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہؒ ان کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ سیدہ فاطمہؒ کی پہلی شادی ان کے چچازاد بھائی حسن مثنیٰ بن حسن بن علیؓ سے ہوئی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا نکاح آپ سے ہوا۔

(کتاب المعارف: ص ۹۶، جمہرۃ الانساب: ص ۷۶، نسب قریش: ص ۵۹)

سیدہ فاطمہؒ نے سیدنا عبداللہؒ ہی کے گھر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان فاطمہ بنت حسینؓ کی والدہ ام اسحاق عشرہ مبشرہ کے صحابی سیدنا طلحہؓ کی صاحبزادی تھیں۔ اور خود سیدنا طلحہؓ سیدنا صدیق اکبرؓ کے داماد تھے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے نسب نامہ میں ایک شخصیت عبدالرحمٰن کبیرؒ ہے۔ آپ مدینہ طیبہ سے گازرون تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ بعد میں ان کی اولاد میں سے عبدالرحمٰن الثانیؒ گازدن سے تشریف لا کر پانی پت میں مقیم ہو گئے۔ حضرت کبیر الاولیاء مخدوم خواجہ محمد جلال الدینؒ آپ ہی کی اولاد میں سے ہیں۔ اسی

Marfat.com

لیے حضرت کو گازرونی کہا جاتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالرحمٰن گازرونیؒ سلطان محمود غزنوی کی فوج میں شرعی حاکم تھے۔ 1
یہ عہدہ ''قاضی عسکر'' کے نام سے خلفائے آل عثمان کے زمانے میں بھی ہمیشہ قائم رہا اور آخری خلیفہ سلطان ارشاد خان خامس مرحوم کے زمانے تک اس عہدہ پر ممتاز اور متدین علماء مقرر کیے جاتے رہے جو فوج کے تمام شرعی معاملات و مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔

تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ شیخ عبدالرحمٰن گازرونی (گازران یا گازرون توابعات شیراز میں مشہور مقام ہے) سلطان محمود غزنویؒ کے لشکر کے ساتھ ''قاضی عسکر'' کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے اور سلطان محمود غزنویؒ نے جب سومنات کے مندر پر حملہ کیا تو شیخ عبدالرحمٰن بھی فوج کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ پانی پت کی فتح کے بعد آپ یہیں مقیم ہو گئے۔ یہیں انتقال فرمایا اور یہیں زیر قلعہ دفن کیے گئے۔ آپ کی قبر مبارک پانی پت میں ایک چھوٹے سے احاطے کے اندر مشہور و معروف ہے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کے نسب نامہ میں یہ اوپر والے تین حضرات کا مختصر تذکرہ ہے۔ یوں تو آپ کے نسب نامہ کی ہر کڑی سلسلۃ الذہب ہے اور آپ کے خاندان کا ہر فرد درِّ شاہوار، اور سلک مروارید کا ہر موتی درِّ یتیم ہے لیکن آپ کے نسب نامہ میں حضرت مخدوم کبیر الاولیاء جلال الدین محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص مقام ہے۔ آپ کبار اولیاء اللہ میں سے تھے۔ آپ حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندرؒ سے ہمیشہ بیعت کی استدعا کیا کرتے تھے، لیکن ان کی استدعا کے جواب میں حضرت بوعلی قلندرؒ ہمیشہ یہ جواب ارشاد فرماتے:

''تمہارا مرشد آنے والا ہے، ابھی صبر کرو، ہم بتا دیں گے۔''

تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ حضرت خواجہ شمس الدین صاحب ترک قدس سرہ پانی پت تشریف لائے تو حضرت قلندر صاحبؒ نے مخدوم کبیر الاولیاء سے فرمایا ''جاؤ! تمہارے مرشد اور پیر آئے ہیں ان کا استقبال کرو۔'' آپ گھوڑے پر سوار ہو کر شہر سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک فقیر چلے آ رہے ہیں۔ حضرت مخدوم صاحبؒ نے اس فقیر کو

Marfat.com

سلام کیا۔ جواب میں خواجہ صاحب نے فرمایا: ''میاں جوان! ذرا اپنے گھوڑے کی چال تو دکھاؤ؟'' آپ نے باگ اٹھائی اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔ خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

''زہے اسپ وزہے سوار''

مخدوم صاحب پر اس بات سے ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اور آپ گھوڑے پر سے گر پڑے۔ خواجہ شمس الدین ترکؒ نے پکڑ کر سینے سے لگایا اور جو کچھ دینا تھا دیا اور بیعت کر کے خلاف عطاء فرمادی۔

حضرت کبیر الاولیاء کی تربیت اور آپ کے اخلاق و کردار کی تعمیر میں حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ کے فیض صحبت اور توجہ کو ایک خاص دخل تھا۔ حضرت ہی کے سایۂ عاطفت میں آپ نے مدارج معرفت طے کیے۔ حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ کی محبت اور شفقت کا یہ عالم تھا کہ جب تک حضرت کبیر الاولیاء مخدوم خواجہ محمد جلال الدینؒ کو دیکھ نہیں لیتے تھے، چین نہیں آتا تھا۔ روایات میں منقول ہے کہ ایک دن حضرت کبیر الاولیاءؒ کے مکان پر حضرت بوعلی قلندرؒ تشریف لے گئے۔ معلوم ہوا کہ آپ کھیت پر گئے ہوئے ہیں۔ حضرت قلندر صاحبؒ گھوڑے پر سوار ہو کر کھیت کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت کبیر الاولیاء نے دور سے قلندر صاحبؒ کو دیکھ کر پہچان لیا۔ آپ کا ذریعہ معاش زمینداری تھا اور آپ خود ہی اپنے کھیتوں میں کاشت کرتے تھے۔ اس وقت چنے کی پیداوار تھی۔ آپ نے چھاج میں چنے بھرے اور جیسے ہی قلندر صاحبؒ کھیت کے قریب پہنچے۔ حضرت کبیر الاولیاء نے چنوں کی نذر پیش کی۔ جونہی آپ نے اس نذر کو دیکھا تو مسکرائے اور فرمایا: ''بیٹا! کیا لائے ہو؟'' فرط ادب کی وجہ سے آپ کو یہ کہنے کی جرأت تو نہ ہوئی کہ آپ کی خدمت میں چنے پیش کر رہا ہوں کیونکہ چنے کوئی ایسی شی نہیں تھی جسے نذر میں پیش کیا جاتا، لہٰذا عرض کیا:

''حضرت! گھوڑے کے لیے تھوڑا سا دانہ پیش کر رہا ہوں۔''

حضرت بوعلی قلندرؒ نے فرمایا:

''میاں! گھوڑے سے دریافت کر لو۔ کیا یہ بھوکا ہے اور اسے دانہ کی ضرورت ہے۔ اگر وہ دانہ کھانا چاہے تو اسے کھلا دو۔''

Marfat.com

حضرت کبیر الاولیاء نے چنوں سے بھرا ہوا چھاج گھوڑے کے سامنے پیش کیا۔ روایت میں آتا ہے کہ گھوڑے نے کھانے سے انکار کر دیا، گویا بتایا یہ کہ میرا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ حضرت قلندر دانہ کھلا کر مجھ پر سوار ہوئے تھے۔"

حضرت کبیر الاولیاء پریشان ہو گئے کہ چنے تو چھاج میں حضرت قلندر کو نذر کرنے کے لیے پیش کیے تھے لیکن نذر قبول نہیں کی جا رہی۔ قلندر صاحب ان کی پریشانی کو بھانپ گئے اور فرمایا:

"جلال الدین! پریشان نہ ہو، ہم نے تمہاری نذر قبول کر لی ہے اور اب ہم یہ چنے اپنی طرف سے تمہیں دیتے ہیں۔ اور بارگاہِ اللہ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ وہ ہر دانے کے عوض تمہیں لڑکا عطاء فرمائے۔" (تذکرۃ الاولیاء: جلد۲ ص۱۲)

حضرت شاہ بو علی قلندرؒ کو حضرت کبیر الاولیاء سے نہایت درجہ محبت تھی، لیکن اتنی محبت و شفقت ہونے کے باوجود آپ نے انہیں اپنا مرید نہیں بنایا۔ حضرت کبیر الاولیاء جب کبھی بھی ان سے مرید ہونے کی خواہش کا اظہار فرمایا تو آپ جواب میں فرماتے:

"تو تو ہماری بیٹی ہے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ تجھ کو جہیز میں دیں گے اور تیرا شوہر تجھے اس گھر کا مالک بنائے گا۔"

پھر جب خواجہ شمس الدین ترک پانی پت تشریف لائے تو حضرت قلندر صاحبؒ نے انہیں خواجہ ترک کی خدمت میں مرید ہونے کے لیے بھیج دیا۔ اور جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان کیا گیا ہے حضرت کبیر الاولیاء خواجہ شمس الدین ترک سے مرید ہو گئے۔ حضرت کبیر الاولیاء نے اپنی ریاضت و عبادت سے خواجہ ترک کو نہایت متاثر کیا چنانچہ مسند خلافت عطاء کی۔ خواجہ ترک تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت خواجہ کلیری نے اس فقیر کو خلافت عطاء فرمائی اور خدمت کے لیے یہ علاقہ پانی پت کا احقر کے سپرد کیا اور کہا کہ میں ٹوپی، خرقہ، مقراض اور پیالہ اور جو کچھ میرے قلب، میری روح، میرے جسم، میری آنکھ، میرے بدن، میرے ظاہر اور پوشیدہ اور

Marfat.com

مخفی یا علانیہ میں میرے پاس ہے وہ سب اپنے روحانی فرزند واقف اسرار محمد بن محمود بن یعقوب کو عطا کرتا ہوں۔ اور میں نے اس کو جلال الدین کا خطاب دیا ہے اور اپنے مقام میں اس کو قائم کیا ہے۔ اور پورا علاقہ مع ان کے مضافات کے اس کے سپرد کر دیا ہے۔ اب میں اس علاقہ میں کسی کو مرید نہیں بناؤں گا۔ یہ شیخ جلال الدین اسرار خداوندی کے طریقوں سے واقف ہیں اور جو باقی ہیں، ان کی میں تعلیم دے رہا ہوں۔ وہ اس درجہ اور مرتبہ کے لیے نہایت موزون ہیں۔'' (سیر الاقطاب: ص ۲۰۱)

کتابوں میں مرقوم ہے کہ حضرت کبیر الاولیاء نہایت مستجاب الدعوات تھے۔ جو کچھ زبان سے کہتے حق تعالیٰ وہ پورا فرما دیتے۔ فیروز شاہ آپ کی قبولیت دعا سے نہایت متأثر تھا۔ اس نے اس بارے میں آپ کے بہت سے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ ایک مرتبہ مخدوم جہانیانِ جہاں گشت حضرت سید جلال الدین اپنے وطن اوچ شریف سے دہلی تشریف لائے۔ آپ بادشاہ کے مہمان خصوصی تھے۔ اسی اثنا میں آپ بیمار ہو گئے۔ بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ ایسے معلوم ہوتا کہ حالت نزع میں ہیں۔ لوگ تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ دفعتاً حضرت کبیر الاولیاء وہاں تشریف لائے اور حضرت مخدوم جہانیانِ جہاں گشت کے سرہانے کھڑے ہو گئے اور انہیں سلام کیا۔ انہوں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور سلام کا جواب دیا۔ حضرت کبیر الاولیاء نے فرمایا: ''اٹھیے، اور وضو کیجئے۔'' پھر آپ نے ان کے لیے بارگاہ رب العزت میں دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور حضرت مخدوم اللہ کے فضل و کرم سے تندرست و توانا ہو گئے۔ بیماری کا کوئی نام و نشان نہ رہا۔ بادشاہ فیروز شاہ جو حضرت مخدوم سے بیعت تھا، وہ وضوء کر کے اپنے پیر کی آخری زیارت کرنے کے لیے آ رہا تھا، جب اس نے حضرت کبیر الاولیاء کی یہ کرامت دیکھی تو حیران رہ گیا اور آپ سے گہری عقیدت رکھنے لگا۔ چنانچہ وہ اکثر آپ کو سلام کرنے اور دعا کروانے کے لیے پانی پت حاضر ہوتا تھا۔

حضرت کبیر الاولیاء کی بہت سی کرامات کتابوں میں مرقوم ہیں۔ سیر الاقطاب

Marfat.com

اور دوسری کئی کتابوں میں آپ کی بے شمار کرامات درج ہیں۔ آپ نے ہندو جوگیوں سے بھی مقابلہ کیا اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ (سیر الاقطاب: ص ۲۰۵)

آپ کے گھر میں تو فقر و فاقہ رہتا لیکن لنگر خانے میں سینکڑوں ہزاروں مہمان ہر وقت کھانا کھاتے رہتے۔ اگر کبھی مہمان کم ہوتے تو بازار سے آدمیوں کو بلا کر لنگر سے کھانا کھلایا جاتا۔ پھر کھانے بھی انواع و اقسام کے ہوتے۔ گویا

ہیں دوسروں کے واسطے لعل و زر و گہر
اپنا یہ حال ہے کہ ہے چولھا بجھا ہوا

حضرت کبیر الاولیاء 638ھ میں پیدا ہوئے اور 7 ربیع الاول 852ھ میں اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرمایا۔ اس حساب سے آپ کی عمر 135 سال بنتی ہے۔ آخر عمر میں آپ ریاضتوں اور مجاہدات کی وجہ سے نہایت کمزور ہو گئے تھے اور آپ پر ہر وقت ایک استغراقی کیفیت طاری رہتی تھی۔ نماز کے لیے آپ کو متوجہ کیا جاتا تھا۔ آپ کا انتقال پانی پت میں ہوا۔ پانی پت میں آپ کی اولاد موجود اور آباد تھی جو 1947ء کے بٹوارے میں منتشر ہو گئی مگر درگاہ مخدوم صاحب اور مسجد وغیرہ تاحال باقی ہے اور مرجع خلائق ہے۔

حضرت کبیر الاولیاء کے پانچ صاحبزدے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ یہ پانچوں اپنے والد ماجد کے صحیح جانشین اور اپنے زمانے کے کامل ولی تھے۔

1- خواجہ عبدالقادر صاحبؒ
2- خواجہ کریم الدین صاحبؒ
3- خواجہ شبلی صاحبؒ
4- خواجہ عبدالواحد صاحبؒ
5- خواجہ محمد ابراہیم صاحبؒ
6- سیدہ فردوسیہؒ
7- سیدہ زبیدہؒ

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ حضرت خواجہ عبدالقادر صاحبؒ کی

اولاد میں سے ہیں۔ خواجہ عبدالقادرؒ اپنے زمانہ کی ایک نہایت برگزیدہ شخصیت تھے۔ اور آپ کی اولاد سے دینی علوم کی نشر واشاعت ہوئی۔

خواجہ عبدالقادرؒ کے صاحبزادے خواجہ محمد یوسف تھے اور ان کے صاحبزادے خواجہ بوعلی اور خواجہ ابوالفتح تھے۔ خواجہ بوعلی کے فرزند ارجمند خواجہ عبدالصمد اور خواجہ عبدلصمد کے صاحبزادے خواجہ ابومحمد، خواجہ محمد ابراہیم اور خواجہ حسن حکیم تھے۔ خواجہ حسنؒ کے فرزند خواجہ عبدالکریم المعروف حکیم بینا، خواجہ الاولیاء، خواجہ حبیب اللہ اور خواجہ اسماعیل صاحب ہوئے ہیں۔ (شجرہ خاندان عثمانی)

حکیم بینا (خواجہ عبدالکریم) کے والد خواجہ حسن کو منتخب التواریخ کے مصنف نے سرہندی لکھا ہے، لیکن طبقات اکبری، آئین اکبری اور مآثر الامراء میں انہیں پانی پتی لکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ حسن کچھ عرصہ سرہند میں رہے اور کچھ عرصہ پانی پت میں۔ لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے جید اور مشہور طبیب تھے۔ چنانچہ دربار اکبری نے نورتن ابوالفضل نے لکھا ہے:

> ''از صحبت محبت ضمیمی کہ بالملکی ملکات حکیم حسن دارد، امیدواری چناں است کہ از عالم بہرہ ور باشد بحکیم روحانی سلام شوق افزا ابلاغ فرمایند۔'' (ابوالفضل دفتر دوم: ص ۸۷)

حکیم خواجہ حسنؒ کی اہلیہ محترمہ اپنے زمانہ کی ایک نہایت مخیّر خاتون تھیں۔ ان کے بارے صاحب سیر الاقطاب نے لکھا ہے کہ

> ''جن استانی صاحبہ (زوجہ محترمہ حکیم حسنؒ) نے شاہ اعلیٰ کا مزار تعمیر کرایا تھا وہ میری دادی صاحبہ تھیں۔''

> گویا آپ کے داد حکیم شیخ حسن کی یہ اہلیہ تھیں۔ انہیں صاحب سلطان نے کیرانہ کی دربار مسجد تعمیر کرائی تھی۔ چنانچہ اس مسجد کے بیرونی صحن اور درمیانی حصہ کی دیوار پر حسب ذیل عبارت کا تاریخی پتھر آویزاں ہے۔'' (اخبار متحدہ محاذ دہلی: ۲۷ ستمبر ۱۹۶۴ء)

> ''بانیٔ این مسجد صاحب سلطان والدہ شیخ محمد فضل در سنہ الف خمیس

مسجد بنا نمود و برائے خرید فرش در روشن چراغ از حاصل چاہ بابت محمد
پور موازی شصت وہشت بیگہ پختہ کہ زر خرید شصت وہشت دکان
در وجہ معیشت بخدمت خرچ مسجد صرف کند بر وے حرم است۔''

اس عبارت میں شیخ حسن کے صاحبزادے حکیم بینا کا نام نہیں بلکہ شیخ فضل کا نام ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حسنؒ کے ایک فرزند شیخ فضل بھی تھے اور وہ حکیم بینا (عبدالکریم) سے بڑے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا نام آیا ہے۔

شیخ حکیم محمد حسنؒ کے صاحبزادے حکیم عبدالرحیم تھے۔ ان کی عرفیت میں اختلاف ہے۔ طبقات اکبری، مآثر الامراء اور بادشاہ نامہ میں ''شیخ بھینا'' تزک جہانگیری میں ''شیخ بہا'' منتخب التواریخ میں ''شیخ بینا'' اور کسی نے ''شیخ مینا'' لکھا ہے۔

شیخ بینا دربار اکبری میں شاہی طبیب تھے۔ فزیشن ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت بڑے سرجن تھے۔ یعنی دوائیوں کے ساتھ ساتھ جراحی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور ہاتھیوں کے علاج معالجہ میں آپ کی عجیب و غریب قسم کی اختراعات ہیں۔ چنانچہ مآثر الامراء میں لکھا ہے:

''مشہور است کہ در ملازمت عرش آشیانی بخدمت طبابت خاصہ
جراحی کہ در آن فن بے نظیر روزگار بود قیام می نمود۔ معالجۂ فیل از
غرائب مخترعات اوست وشہرت تمام دارد۔'' (مآثر الامراء: جلد۳ص ۳۷۹)

شیخ حکیم محمد حسن اور ان کے صاحبزادے حکیم عبدالکریم عرف حکیم بینا اکبر اعظم کے ساتھ ساتھ شہزادہ سلیم کے بھی طبیب خاص تھے۔ شہزادہ سلیم انہیں اپنی خصوصی نوازشات سے نوازتا۔ چنانچہ انہیں ''مقرب خان'' کا خطاب دیا۔ پھر اکبر کے انتقال کے بعد جب شہزادہ سلیم تخت نشین ہوا تو تخت نشینی کے بعد ''مقرب الخاقان'' اور ''نائب السلطان'' کے خطاب مرحمت فرمائے۔ بعد میں منصب پنج ہزاری سے بھی معزز فرمایا۔ ان نوازشات خسروانہ کی وجہ سے ہر خاص و عام کے دل میں ان کی عزت و توقیر کے جذبات پیدا ہو گئے۔

صاحب مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ 1004ء میں ایک روز اکبر اعظم ہرنوں

کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ یکا یک ایک ہرن اس کی طرف دوڑا۔ اس نے اکبر کے ایک نازک مقام پر سینگ مار دیا۔ اس وجہ سے وہ مقام مجروح ہو کر متورم ہو گیا۔ جس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ اکبر سات آٹھ روز تک بیت الخلاء نہ جا سکا۔ بادشاہ کی طبیعت کی ناسازی رعایا کے لیے وبال جان بن جاتی ہے، چنانچہ اکبر کی بیماری نے بھی ملک میں کافی تشویش پیدا کر دی۔ حکیم مصری اور حکیم علی علاج کر رہے تھے لیکن سرجن اور جراح ہونے کے ناطے زخم کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی حکیم بینا اور مقرب خان کرتے تھے۔ دونوں باپ بیٹوں نے اس علاج میں بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ جس سے اکبر بہت خوش ہوا۔ ان باپ بیٹوں کی خدمات کے صلے میں اکبر اعظم نے حکیم بینا کو ''شیخ الزماں'' کا خطاب اور کیرانہ کا گاؤں بطور جاگیر عطا فرمایا۔ (مآثر الامراء: جلد۳ ص ۳۸۰)

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب اکبر اعظم کشمیر سے واپسی پر لاہور میں قیام پذیر تھا ایک چاندنی رات میں ہرنوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ بادشاہ کو جب زخم آیا اور زخم والی جگہ متورم ہو گئی اور دوسرے حکماء کے علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو ابوالفضل کی رائے سے حکیم بینا کو پانی پت سے علاج کے لیے بلایا گیا۔ حکیم بینا کے علاج اور مرہم پٹی سے اکبر کو ایک ماہ سات روز کے بعد صحت کاملہ ہو گئی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر کیرانہ کا گاؤں بطور جاگیر حکیم بینا کو مرحمت فرمایا۔ فرمان شاہی کی نقل درج ذیل ہے۔

حکیم بینا کو کیرانہ کی جاگیر جو انعام میں دی گئی تھی وہ ان کی جراحت وادویات میں کامل اور مکمل ہونے کا ایک صلہ تھا جو شاہی دربار کی طرف سے مرحمت خسروانہ تھا۔ حکیم بینا اپنے زمانے میں طب و جراحت میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے پاس نہایت خطرناک کیس آتے تھے۔ یہ تمام حکماء کی طرح غیر ذمہ دارانہ علاج کرنے کے عادی نہ تھے بلکہ جس مریض کو ناقابل علاج سمجھتے تھے اس کے بارے میں صاف فرما دیا کرتے تھے کہ یہ لاعلاج ہے۔ چنانچہ ایک مریض حسین خان جو کہ زخمی تھا، کے بارے انہوں نے یہی رائے دی تھی۔

مؤرخین نے اس واقعہ کی تفصیل کچھ یوں بیان کی ہے کہ حسین خان کوہستان

Marfat.com

کی جنگ میں نسبت پور کے مقام پر ایک بندوق کی گولی سے شدید زخمی ہو گئے۔ اسی کے ساتھ شانہ کے نیچے بان کا ایک کاری زخم آیا۔ وہاں سے یہ روانہ ہو کر دریائے گنگ کے راستے گڈھ مکتیسر کے نواح میں پہنچے جہاں ان کے اہل وعیال مقیم تھے۔ پھر وہ گڈھ مکتیسر سے آگرہ پہنچے۔ شہنشاہ اکبر نے شیخ حکیم بینا کو فتح پور سیکری سے ان کے علاج کی غرض سے آگرہ بھیجا۔ شیخ بینا نے حسین خان کے زخم کو دیکھ کر بادشاہ کو رپورٹ دی کہ زخم نہایت خطرناک اور لا علاج ہے۔

حکیم بینا کی رپورٹ کے بعد حکیم عین الملک کو ان کے علاج کے لیے بھیجا گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی بھی حکیم عین الملک کے ساتھ گئے کیونکہ ان کے حسین خان کے ساتھ خصوصی تعلقات تھے۔ چنانچہ ملا عبدالقادر بدایونی نے حسین خان کے علاج کے بارے لکھا ہے:

> ''حسین خان مجھ سے باتیں کر رہا تھا کہ شاہی سرجن مرہم پٹی کرنے آ گئے۔ زخم میں ایک بالشت لمبی سلائی چلی گئی۔ شاہی سرجن سلائی سے زخم کرید کرید کر دیکھ رہے تھے لیکن حسین خان مسکرا رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر معمولی سا بل تک نہ تھا، لیکن یہ زخم اچھا نہ ہو سکا۔ تین چار روز کے بعد حسین خان کو دست آنے لگے اور ان کا انتقال ہو گیا۔'' (منتخب التواریخ: ص ۲۰۸)

ابوالفضل نے بھی اپنے مختلف خطوط میں حکیم بینا کی حذاقت، طبی قابلیت اور شاہی تقرب کا اپنے مختلف خطوط میں تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ 803ھ میں لاہور ایک خط میں ابوالفضل نے حکیم بینا کو لکھا:

> ''آپ نے ظل الٰہی (اکبر بادشاہ) کے لیے جو دوا سر بمہر ارسال فرمائی تھی وہ اچھی ساعت میں بادشاہ کے حضور پیش کر دی گئی۔ بادشاہ نے دوا کے بارے نہایت شوق کا اظہار فرمایا اور آپ کو بہت یاد بھی فرمایا۔ اسی وقت تھوڑی سی دوا نوش جان فرمائی۔ تھوڑی سی بندہ کو بھی عنایت فرمائی اور فرمایا ''شیخ بینا ہمارا دانشمند

Marfat.com

اور حاذق حکیم ہے۔ ہم اس پر بہت نوازش کرتے ہیں اور اُسے بہت پسند کرتے ہیں۔" مجھے حکم دیا کہ یہ عبارت شیخ کو لکھ دو: "تجھے بادشاہ بہت یاد فرماتے ہیں اور نہایت آرزو کے ساتھ فرماتے ہیں کہ تعجب ہے کہ تم اتنے عرصہ سے ہم سے الگ ہو۔"

ان مسیح الزمان کے لیے یہی مناسب ہے کہ خط موصول ہوتے ہی فوراً چلے آئیں کہ بادشاہ ہر ساعت یاد کرتے ہیں۔ دو تین معاملات ایسے پیش آ گئے ہیں کہ بادشاہ بے اختیار آپ کو یاد کرتے ہیں۔ بادشاہ کے ایک حرم کو ایسی بیماری لاحق ہوگئی ہے جو علاج پذیر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شہزادہ کامگار خسرو ایک بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے بادشاہ کی طبیعت بدمزہ اور ناساز ہے۔ اکثر اطباء علاج میں سرگرداں ہیں مگر صحت نہیں ہوتی۔ اب علاج آپ کے آنے پر موقوف ہے، لہٰذا آنے میں تاخیر نہ فرمائیں۔"

(مآثر الامراء: جلد ۳ ص ۳۸۲)

اس خط کی عبارت حکیم بینا کی حذاقت اور بادشاہ کے تقرب کی صاف صاف غمازی کر رہی ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ حکیم بینا اکبر بادشاہ کے حضور ایک بہت بڑا مقام تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی اگرچہ حکیم بینا کا سخت مخالف تھا لیکن اس نے بھی آپ کی علم طب و جراحت میں حذاقت کاملہ کی تعریف کی ہے۔ (منتخب التواریخ: ص ۳۳۵)

حکیم بینا کے صاحبزادے نواب مقرب خان دیوان عبدالحکیم اور دیوان عبدالرحیم تھے۔ نواب مقرب خان کا اصل نام محمد حسن تھا۔ اس کو "شیخ حسو" بھی کہتے تھے۔ اوائل ہی سے وہ اکبر کے پاس رہے اور بادشاہ کے دل پر اپنے خلوص و دیانت اور اپنی ثقاہت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ چنانچہ جہانگیر کہا کرتا تھا:

"شیخ حسو جیسا ملازم شاید ہی کسی بادشاہ کو میسر ہوا ہو۔"

نواب مقرب خان بادشاہ جہانگیر کے سچے اور قابل اعتماد دوست تھے چنانچہ

Marfat.com

جہانگیر کی تخت نشینی میں بھی ان کا خاص ہاتھ ہے کیونکہ راجہ مان سنگھ جہانگیر کی تخت نشینی کے خلاف تھا۔ چنانچہ مولانا ذکاء اللہ نے تزک جہانگیری سے یوں نقل کیا ہے کہ

''رائے مان سنگھ نے اپنی تجویز وصلاح سے مقرب خان کو مطلع کیا کہ وہ اس کا شریک ہو۔ اس نے اپنی عرضداشت کے ساتھ اس تجویز وصلاح کے کاغذ کو میرے پاس بھیج دیا۔ قلعہ میں مقرب خان میری بہت خدمت کرتا تھا۔ اور اس مدت میں اس نے آرام نہیں کیا۔ وہ امرائے برگشتہ کو پھر راہ پر لایا۔ جب وہ بادشاہی سرکار میں سہ ہزاری تھا تو میں ہر چند اس سے کہتا کہ مجھ سے کوئی چیز لے لو مگر وہ نہ لیتا۔ جب بادشاہ نے مجھے دہ ہزاری منصب دیا تو اپنے مقربوں سے اول جس شخص کو میں نے باپ کے روبرو منصب دار بنایا وہ مقرب خان تھا۔ اس کے منصب پر ہزاری کا اضافہ کیا۔ وہ میرا مخلص خیر اندیش تھا۔''

(تاریخ ہند، مولانا ذکاء اللہ: جلد ۶ ص ۲۸۲)

جہانگیر نے مقرب خان کو دو ہزاری پھر سہ ہزاری اور اس کے بعد پنج ہزاری اور دو ہزار و پانچ سو سوار کا منصب عنایت فرمایا تھا۔ (تزک جہانگیری: ص ۱۴۹، جشن دہم)

تزک جہانگیری کے مطابق نواب مقرب خان کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ وہ گجرات کے حاکم مقرر ہوں۔ اس خواہش کا اظہار انہوں نے جہانگیر کے تخت نشین ہونے سے قبل ان کے زمانہ شہزادگی میں بھی کیا تھا۔ چنانچہ جہانگیر اپنے اس قدیمی خدمت گار کی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل چاہتا تھا۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ نواب مقرب خان جہانگیر کے نہایت مخلص اور قدیم خدمت گار اور مقرب تھے۔ اس وجہ وہ انہیں نہایت اہم کام سپرد کرتا تھا صوبوں کے گورنروں کی نگرانی، ان کے بارے تحقیقات جیسے اہم امور ان کے ذمہ لگاتا تھا۔ نواب مقرب خان بھی جہانگیر کی خواہشات کو حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک نہایت قیمتی موتی جہانگیر کو مہیا کیا۔ (تزک جہانگیری: ص ۱۸۵ جشن دوازدہم)

ایک مرتبہ بڑے قیمتی جواہرات، سونا چاندی کے فرنگستانی برتن، عربی گھوڑے اور دوسری کئی عمدہ اور نفیس چیزیں جہانگیر کو بطور تحفہ پیش کیں۔ (تزک جہانگیری: ص ۸۰)

ہندوستان کے تخت پر براجمان ہونے کے کچھ عرصہ بعد جہانگیر نے نواب مقرب خان کو صوبہ دکن اور گجرات کا گورنر مقرر فرمایا۔ اس زمانے میں انگریزوں کو ہندوستان میں تجارت کی اجازت مل چکی تھی۔ چنانچہ ایک انگریز کپتان ہاکنس جہانگیر کے دربار میں تھا جو ترکی زبان نہایت اچھی جانتا تھا۔ وہ 1608ء میں ہیکٹر جہاز میں سوار آیا تھا۔ اس وقت گجرات کے گورنر نواب مقرب خان تھے۔ انہوں نے اس سے بہت سی ولایتی اشیاء خریدی تھیں جو بعد میں ایک موقع پر انہوں نے تحفہ کے طور پر جہانگیر کو پیش کر دیں۔

ہاکنس کی ہندوستان میں آنے کی غرض انگریزوں کی تجارت کو فروغ دینا تھا جس سے نہ صرف ہندوستانیوں کو خطرہ تھا بلکہ پرتگیزی بھی اس سے متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ اکثر نواب مقرب خان کو انگریزوں کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ لیکن نواب مقرب خان خود نہایت سمجھدار اور بالغ نظر شخص تھے۔ ہاکنس سمجھتا تھا کہ نواب مقرب خان اور اُن کے ساتھی اس کے مقاصد کو پورا نہ ہونے دیں گے۔ اس وجہ سے اس نے جہانگیر کے سامنے نواب مقرب خان کی مخالفت شروع کر دی اور ان پر طرح طرح کے الزمات لگائے۔

نواب مقرب خان اس انگریز سے دبنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے جہانگیر سے کہا کہ اگر انگریزوں کو تجارت کرنے سے منع کر دیا جائے تو میں گوا سے لعل لاؤں گا۔ نواب مقرب خان کی بات کی تائید میں ایک اور امیر نے بھی جہانگیر سے کہا کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کے پاؤں جم گئے تو وہ پورے ہندوستان کے مالک بن جائیں گے۔ جہانگیر کی سمجھ میں یہ بات آ گئی چنانچہ اس نے انگریزوں کی تجارت کی ممانعت کا فرمان جاری کر دیا اور ہاکنس جو 1611ء میں اپنی بیوی کے ساتھ دربار آگرہ میں چلا گیا تھا دو برس تک اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ انگریزوں کو دوبارہ ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت مل جائے لیکن وہ نواب مقرب خان کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔

(تاریخ ہند، مولانا ذکاء اللہ: جلد ۶ ص ۲۵۴)

Marfat.com

نواب مقرب خان نے اپنی دانشمندی اور حکمت عملی سے سات جہاز جو کئی سالوں سے سمندر میں غرق تھے، برآمد کیے۔ اور چیزوں کے علاوہ ان جہازوں میں ستون کسوٹی بھی تھا۔ جب ان اشیاء کی برآمدگی کی اطلاع جہانگیر کو ہوئی تو اس نے یہ تمام سامان نواب مقرب خان کو مرحمت فرما دیا۔ اس کے بعد نواب مقرب خان نے اپنے رہنے کے لیے مکان بنوایا جس میں دو تالاب پختہ بنوائے۔ تالاب کے کنارے پر ایک بنگلہ تعمیر کیا۔ اس پر چبوترہ بنوا کر ستون کسوٹی لگوایا اور گڑھی بنوائی۔ دکن سے بیج منگوا کر پانچ باغ لگوائے۔ سولہویں جلوس میں جہانگیر کیرانہ آیا۔ چنانچہ تزک جہانگیری میں اس نے لکھا ہے:

''مخلص و محبّ خاص یار وفادار مقرب خان متمنی تھا کہ میں اس کے یہاں آؤں۔ میں نے اس کے گھر کو قدوم میمنت لزوم سے قابل رشک بنا دیا اور اس خیر خواہِ قدیم کو بیش قیمت سامان، قیمتی جواہرات مالیتی تین لاکھ روپے، ایک باغ اور ایک وسیع مکان دیا۔''

یہ جگہ محلّہ نواب دروازہ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

نواب مقرب خان بڑے ذہین اور موقع شناس بھی تھے۔ ایک مرتبہ جہانگیر سے کسی شخص نے کہا کہ مقرب خان کے پاس ایک ایسی شی ہے جو حضور کے پاس بھی نہیں۔ بادشاہ نے پوچھا وہ کیا۔ جواب دیا گیا ''ستون کسوٹی۔'' بادشاہ نے حکم دیا کہ مقرب خان کو لکھو کہ ''اس کو حضور کی خدمت میں بھیج دو۔'' مقرب خان کے وکیل نے انہیں اسی وقت اس فرمان کی اطلاع دے دی۔ مقرب خان نے وہ ستون کسوٹی اپنے گھر سے اکھاڑ کر راتوں رات پانی پت کی خانقاہ میں لگوا دیا۔ تیسرے روز جب فرمان شاہی پہنچا تو انہوں نے جواب دیا کہ حضور کا فرمان آنے سے قبل کسوٹی خانقاہ میں بھیج دی گئی ہے۔ اگر حکم ہو تو وہاں سے اکھڑوا کر بھیج دوں۔ بادشاہ نے جواب دیا ''نہیں وہیں رہنے دو۔''

خانقاہ میں یہ ستون کسوٹی جلدی میں لگایا گیا تھا اس لیے اس وقت اس پر کچھ نہ لکھوایا جا سکا بعد میں ان کے صاحبزادے حکیم رزق اللہ نے حسب ذیل تاریخی قطعہ لکھوایا ؎

Marfat.com

مظہر نور جمال ست و جلال
ہمچو عیسیٰ مردہ بخشند رواں
بوعلی چوں بو علی سیناش کرد
زاں سبب کیست آں ارسطوئے زماں
ثانیا فرمود ایواں چو خلد
ہر ستون سنگ محک در زیر آں
از خرد چشمے غبار سال او
چوں طلائی کیمیا کرد عیاں
سال و تاریخ نیایش درحساب
شہ بوالا جاہ رزق اللہ خان

1618ء میں شہزادہ شاہجہان جب گجرات آیا تو اس نے نواب مقرب خان کو صوبہ بہار کا گورنر مقرر کر دیا۔ مسٹر ہوجز (Hodges) انگریزی سیاح اور مصوران کی بہار کی گورنری کے زمانہ جولائی 1620ء میں پٹنہ آیا تھا اور نواب مقرب خان کا مہمان رہا۔ نواب مقرب خان نہایت حسن سلوک سے اس کے ساتھ پیش آئے اور ہر قسم کا آرام و آسائش اسے مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا۔

مسٹر ہوجز کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس پر نواب مقرب خان کا رعب بہت غالب تھا۔ اور مسٹر ہوجز نے واپسی پر شکریے کے جو خطوط انہیں لکھے، ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط شکریہ کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ان خطوط سے نواب مقرب خان کے اور بھی بہت سے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

1621ء میں نواب مقرب خان دہلی و آگرے کی حکومت پر سرفراز ہوئے۔ جب شاہ جہان سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انہوں نے نواب مقرب خان کو مزید انعام و اکرام کے ساتھ مضافات کیرانہ کے پرگنے بطور جاگیر عطا فرمائے۔ یہ شاہ جہان کی طرف سے نواب صاحب کی عزت افزائی کی گئی تھی۔

بادشاہ نامہ میں مرقوم ہے کہ شاہ جہان جب تخت سلطنت پر بیٹھے تو 22 جمادی

Marfat.com

الآخرۃ 1037ھ کو مقرب خان حکیم مسیح الزمان کے ساتھ لاہور سے آگرہ آئے اور کورنش بجالانے کا شرف حاصل کیا۔ بادشاہ نے انہیں خلعت خاصہ فاخرہ عنایت فرمایا۔ چونکہ نواب مقرب خان زندگی کی سو کے قریب منزلیں طے کر چکے تھے اور اب پیرانہ سالی نے ان کی تمام جسمانی قویٰ کو خاصہ متاثر کیا ہوا تھا، لہٰذا انہیں ملازمت کی ذمہ داریوں کے بار دوش سے سبکدوش کر دیا گیا تاکہ وہ آرام و آسائش کے ساتھ اپنی باقی ماندہ زندگی کے دن بسر کر سکیں۔ شاہجہان نے انہیں جو کیرانہ کے مضافات کی جاگیر عطا فرمائی تھی اس کی اور کیرانہ کی جاگیر کی کل آمدنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔

(بادشاہ نامہ: جلد ا ص ۱۵۹)

27 ذی قعدہ 1056ھ میں شاہ جہان کو اطلاع ملی کہ مقرب خان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر نوے سال تھی۔ ان کی قبر حضرت بوعلی قلندرؒ کے مزار کے پاس پانی پت میں ہے۔ غفر اللہ لہ

نواب مقرب خان کے ایک صاحبزادے رزق اللہ خان تھے جو ایک باکمال دادا اور بے مثال باپ کے صحیح جانشین تھے۔ شاہجہان کے عہد حکومت میں ہشت صدی منصب پر فائز ہوئے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں ان کو خانی کا خطاب ملا اور منصب کا بھی اضافہ ہوا۔ 10 جلوس عالمگیری یعنی 1668ء میں حکیم رزق اللہ خان نے اس دار فانی سے دار باقی کو انتقال فرمایا۔ (مآثر الامراء: ص ۳۸۲)

حکیم رزق اللہ خان شاہ جہان کے بھی طبیب خاص تھے۔ ان کے کچھ دشمن بھی تھے جنہوں نے انہیں ہر ممکن طریق سے بدنام کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔

حضرت شاہ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پت کی خانقاہ میں جو سرخ مسجد ہے وہ شیخ رزق اللہؒ ہی نے تعمیر کرائی تھی۔

حکیم دیوان عبدالرحیم اور دیوان عبدالحکیم نواب مقرب خان کے یہ دونوں چھوٹے بھائی تھے اور یہ بھی دربار مغلیہ میں اصحاب مناصب و جاہ تھے۔ حکیم دیوان عبدالرحیم نواب مقرب خان کی دکن و گجرات کی گورنری کے زمانہ میں جہانگیر کے طبیب

خاص تھے۔ ان کی اولاد میں آج تک طب کا سلسلہ اور خدمت خلق کا جذبہ باقی چلا آرہا ہے۔ اور ہر ایک اپنے وقت کا کامل فن طبیب تھا۔ ان کے صاحبزادے خواجہ چشتی، خواجہ گوہر حکیم اللہ دیا، خواجہ فضل، خواجہ امین الدین، خواجہ جمال اللہ، خواجہ دوست محمد، حکیم قاسم اور خواجہ یار محمد وغیرہ تھے۔

حکیم وجیہ الدین مصنف کتاب ''مخزن الحکمت'' طب ویدک جو 1196ھ میں لکھی گئی اور حکیم علی اکبر مرحوم برادر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دیوان عبدالرحیم کا مکان محلّہ نواب دروازہ میں تھا اور ان کا دیوان خانہ ''عدل گڈھ'' میں تھا جس کو عوام ''بادل گڑھ'' کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں سکونتی مکان شیخ حسینی اور شیخ اللہ دیا کو دے کر دوسرا مکان تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام ''دربار'' رکھا تھا۔

یہ ایک مختصر تذکرہ تھا ان چند حضرات کا جو مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے آباواجداد تھے۔ سیدنا عثمانؓ سے لے کر مولانا رحمت اللہ صاحبؒ تک ایک فرد بھی مولانا مرحومؒ کے شجرۂ نسب میں ایسا نہیں ہے جو یکتائے روزگار نہ ہو۔ آپ کے خاندان کا ہر شخص دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال اور مرجع خلائق تھا۔ اور علمی کمالات سے حظ وافر رکھتا تھا۔

کیرانہ میں سکونت:

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے کہ مخدوم کبیر الاولیاء نے اپنے پیرومرشد حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی قدس سرہ کے ساتھ پانی پت ہی میں سکونت پذیر رہے اور وہیں 12 ربیع الاول 765ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ پانی پت میں جہاں ان کی اولاد سکونت پذیر تھی، اس محلّہ کا نام ہی ''محلّہ مخدوم زادگان'' ہے۔ 915ھ میں فرمان اکبری کے مطابق جب کیرانہ اور مضافات کیرانہ نواب مقرب خان کو بطور جاگیر عطاء ہوا تو عثمانی النسب جلالی خاندان کا یہ حصہ پانی پت سے ترک سکونت کر کے کیرانہ میں آ کر آباد ہو گیا۔ پانی پت سے آنے والے لوگوں کی وجہ سے اس قصبہ کی

Marfat.com

آبادی بڑھ گئی اس وجہ سے اس معمولی قصبہ کی توسیع اور تنظیم کی گئی۔ قصبہ کیرانہ سے باہر نواب مقرب خان اور دیوان حکیم عبدالرحیم نے اپنے محلات، کچہریاں اور ریاست کے متعلقین کے مکانات وغیرہ تعمیر کرائے جو اب قصبہ کی آبادی کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔

کیرانہ میں محلات، مکانات اور عدالتوں کی تعمیر سے فراغت کے بعد نواب مقرب خان نے کیرانہ میں آموں کا ایک باغ لگانے کا ارادہ فرمایا کیونکہ نواب صاحب مرحوم کو آموں کا بہت زیادہ شوق تھا۔ آم کو ویسے بھی پھلوں کا بادشاہ کہتے ہیں اس وجہ سے شاہی طبیعت کے لوگوں کو، تاریخ کے اوراق کی گواہی کے مطابق، آموں کا شوق ہوتا تھا، اس شوق کی تکمیل کے لیے وہ آموں کے باغ لگوایا کرتے تھے۔ چنانچہ گجرات، دکن اور دور و قریب کے صوبوں سے مختلف قسم کے آموں کے درخت منگوائے اور ایک سو چالیس بیگہ رقبہ میں آموں اور دیگر اقسام کے پھلوں کا ایک نہایت وسیع و عریض باغ لگایا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ باغ کے وسط میں دو سو بیس گز لمبا دو سو گز چوڑا حوض بنوایا۔ حوض کے اندر ماہتابی وغیرہ بیس گز مربع میں بنوائی۔ اس حوض میں جمنا کا پانی ایک طرف سے آتا اور دوسری طرف سے نکل جاتا۔ باغ میں گرم اور سرد دونوں علاقوں کے درخت نصب کرائے۔ سولہویں جلوس میں شہنشاہ جہانگیر آموں کے اس باغ کو دیکھنے کے لیے خود کیرانہ آیا۔ اس نے اپنے اس سفر کا ذکر اپنی کتاب ''تزک جہانگیری'' میں کیا ہے اور اس باغ کی بہت تعریف کی ہے۔ جہانگیر نے لکھا ہے

> ''جمعہ 21 ماہ آذر کو مقرب خان کی جاگیر پرگنہ کیرانہ میں نزول اجلال کیا۔ اس سرزمین پر مقرب خان نے باغ اور عمارات تعمیر کرائی ہیں۔ ہفتہ 22 ماہ مذکور کو میں اہل محل کے ساتھ باغ اور عمارات کی سیر کو گیا۔ اس باغ میں ہر قسم کے پھل دار درختوں کے پودے لگائے گئے ہیں۔ باغ کی سیر سے میں بہت محظوظ ہوا اور بہت تعریف کی۔'' (تزک جہانگیری مترجمہ احمد علی رامپوری: ص۲۷۲)

کہتے ہیں کہ اس باغ میں نو لاکھ درخت تھے۔ نواب مقرب خان کا یہ باغ حسب روایت ''تاج المآثر'' مدتوں تک دہلی میں مشہور و معروف رہا۔ اگرچہ انقلابات

Marfat.com

زمانہ نے پست کو بالا اور بالا کو پست کر دیا اور 1857ء کے انقلاب نے تو مسلمانان ہند کی یادگاروں کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر برباد کر دیا لیکن یہ مشہور و معروف باغ جس سرزمین پر قائم تھا وہ اب بھی ''نولکھا باغ'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

باغ میں نواب مقرب خان کی بنائی ہوئی بارہ دری بھی موجود ہے۔ جس زمانہ میں نواب صاحب مرحوم گجرات کے گورنر تھے اور سورت کی بندرگاہ بھی ان کے زیر اثر تھی، اس وقت انہوں نے اپنی حکمت عملی سے سات جہاز جو مدت سے سمندر میں غرقاب تھے، باہر نکلوائے۔ ان جہازوں سے بہت سی نادر اشیاء برآمد ہوئیں۔ علاوہ دیگر اشیاء کے سنگ سماق (کسوٹی کا پتھر) کے چند نادر الوجود ستون بھی برآمد ہوئے۔ ان سب اشیاء کی اطلاع شہنشاہ جہانگیر کو دی گئی۔ شہنشاہ جہانگیر مقرب خان کے اس عمل سے نہایت خوش ہوئے، لہٰذا شاہی حکم سے یہ تمام سامان نواب مقرب خان کو عطاء کر دیا گیا۔ (جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا گیا ہے)۔

مذکورہ بالا تالاب کے وسط میں چبوترہ پر جو بنگلہ تعمیر کیا گیا تھا اس میں کسوٹی کے یہ ستون بھی لگوائے گئے، جواب حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ کی درگاہ پانی پت میں نصب ہیں۔ نواب مقرب خان کے اس باغ کے مشرقی جانب پتھروں سے بنی ہوئی عمارات کا ایک سلسلہ تھا جو ''دربار'' کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں عدالتیں، جیل خانے اور ریاست کے دفاتر وغیرہ تھے۔ باغ کی دوسری جانب سکونتی محلات وغیرہ تھے جو ''نواب دروازہ'' کے نام سے اب تک معروف ہے۔ یہ پرانی عمارتیں اگرچہ زمانے کے ناسازگار حالات اور پھر انقلاب 1857ء کی دست برد اور تباہ کاری میں برباد ہو گئیں، مگر ''دربار'' اور ''نواب دروازہ'' کے سر بفلک اور عالی شان پھاٹک، نقار خانے اور کچھ پرشکوہ پرانی عمارتیں اپنی عظمت رفتہ کی یاد دلاتی ہیں اور زبان حال سے ''الدوام للہ'' کا قصیدہ پڑھتی ہیں۔

نواب مقرب خان صاحب کا مزار پانی پت میں حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ کے مزار کے احاطہ میں موجود ہے۔ قبر کا تعویذ اصلی زہر مہرہ کے ایک ٹکڑے کا ہے جس کا وزن 27 من بتایا جاتا ہے۔ دیوان عبدالرحیم کے مزار کا پتہ نہیں چل سکا۔

Marfat.com

سرزمین پاک و ہند میں عثمانیوں کی آمد:

ہندوستان میں عثمانی خاندان کے بہت سے حضرات موجود ہیں جن میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ بلکہ حضرت شیخ الہند بھی عثمانی النسب تھے۔ حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کیرانویؒ اور دیگر علماء کی تحقیق یہ ہے کہ خاندان عثمانی کے حضرات سلطان محمود غزنویؒ کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد سلیم صاحب کیرانویؒ نے لکھا ہے کہ ''سلطان محمود غزنوی (المتوفی 23 ربیع الاول 421ھ مطابق 29 اپریل 1030ء) کا جس ماحول میں نشوونما ہوا اس کا اثر ہے کہ وہ ابتداء ہی سے اہل علم اور ارباب فضل و کمال کا دلدادہ تھا۔ اس کی زندگی پر اس واقعہ کا بہت گہرا اثر ہے کہ اس نے ایک نہایت خوشنما باغ میں ایک حسین وجمیل اور دل کش مکان تعمیر کیا جس کے جشن میں اس نے دوسرے امراء اور اعیانِ مملکت کے ساتھ اپنے باپ امیر سبکتگین کو بھی مدعو کیا۔ باپ نے باغ اور مکان کے دل فریب ماحول کو بے حد پسند کرتے ہوئے اپنے ہونہار اور لائق ولی عہد کو جو قیمتی نصیحت کی وہ یہ تھی:

> ''ایسے باغ اور مکان تو دوسرے امیر بھی بنوا سکتے ہیں۔ تم کو وہ عمارت تعمیر کرنی چاہیے جس کی برابری کوئی دوسرا نہ کر سکے۔ محمود نے پوچھا ''ایسی عمارت کون سی ہے؟'' باپ نے جواب دیا ''وہ اہل علم وفضل کے دلوں کی تعمیر ہے جو کوئی نہال احسان ان کی زمین دل میں لگائے اس کا ثمر پائے۔''

اس قسم کی مشفقانہ نصائح و ہدایت اور اس زمانہ کے قدر شناس ماحول میں مذہبی اور دینی تربیت کا نتیجہ تھا کہ سلطان محمود غزنویؒ علماء اور اہل کمال کا ہمیشہ قدردان رہا۔ اس کو مختلف علوم وفنون سے طبعی لگاؤ تھا۔ ہر کام میں کفایت شعاری مدنظر رہتی مگر ہنر پروری میں اس کا فیض عام تھا۔ علماء کے لیے وظائف اور تنخواہیں مقرر تھیں۔ دارالعلوم، کتب خانے، عجائب خانے وغیرہ اس کی علم نوازی کا ثبوت تھے۔ اس کے دربار میں علماء، ادباء

اور شعراء جمع رہتے۔ رازی، اسدی، طوسی، منوچہر بلخی، عنصری، عسجدی، فرخی، دقیقی اور علامہ ابوریحان البیرونی جیسے یگانۂ عصر شعراء اور علماء اس کے عہد میں پائے گئے۔ یہی پہلا مسلمان حکمران ہے جو سلطان کے لقب سے موسوم ہوا۔ سلطان محمود غزنوی کی دین پروری اور علماء نوازی سے سلطنت کے اکثر و بیشتر عہدوں پر قابل اور لائق دینی حکام مقرر تھے۔ فوجی عہدوں میں بھی علماء کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ اور اسی فوجی عہدے کی وجہ سے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے جد اعلیٰ شیخ عبدالرحمٰن گازرونی سلطان محمود غزنوی کی فوج میں ''قاضی عسکر'' بن کر تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

تعلیم و تربیت:

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے نسب نامہ میں خلیفۂ راشد سیدنا عثمان بن عفانؓ سے لے کر حضرت مولاناؒ کے والد ماجد مولانا خلیل اللہؒ تک ایک شخص بھی ایسا نہیں جو عوام تو کیا خواص میں بھی عزت و احترام کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا تھا، بلکہ حضرت مولاناؒ کے اجداد اعلیٰ میں اکثریت ان حضرات کی ہے جو حکومت وقت کے ہاں نہایت اعلیٰ مناصب پر فائز تھے جیسا کہ گذشتہ سطور میں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ غرضیکہ حضرت مولاناؒ کے خاندان کے ہر فرد کی قبائے زندگی ہمیشہ روشن رہی۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی ولادت باسعادت اپنے آباؤ اجداد کے تاریخی مکانات واقعہ محلّہ ''دربار'' میں ہوئی۔ حق تعالیٰ شانہ کے سوا اس بات سے کون آشنا تھا کہ آج ایک ماں اپنی کوکھ سے جس بچے کو جنم دے رہی وہ دنیائے انسانیت میں اپنے وقت کا ایک بہت بڑا مناظر اور مجاہد ہوگا۔ بارہ سال کی عمر میں قرآن حکیم ختم کرنے کے ساتھ آپ نے دینیات اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے بزرگوں سے پڑھیں۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ دہلی تشریف لے گئے جو اس زمانہ میں مختلف علوم کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ دہلی میں آپ نے حضرت مولانا محمد حیاتؒ کے مدرسہ میں داخلہ لے لیا۔ اور قیام بھی مدرسہ ہی میں رکھا تاکہ

Marfat.com

پڑھائی میں آسانی ہو اور ہمہ وقت توجہ سے علم حاصل کیا جا سکے۔

غیر ملکی اقتدار کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ابھی حالات نے وفا کے دامن کو گرہ نہیں دی تھی۔ ہندوستانی لوگ غیر ملکی لوگوں کی اس غیر متوقع کامیابی پر انگشت بدنداں بھی تھے اور آتش زیر پا بھی۔ کسی شخص کو نہ ذہنی سکون تھا اور نہ قلبی اطمینان، لیکن پھر بھی لوگ پیٹ کے تنور کو ایندھن مہیا کرنے کے لیے مختلف کاروبار کی تلاش کرتے۔

1280ھ میں حضرت مولانا کیرانویؒ کے والد محترم حضرت مولانا خلیل اللہ صاحبؒ کو دہلی میں مہاراجہ ہندو راؤ بہادر کے میر منشی کی جگہ مل گئی۔ ہندو راؤ کا میر منشی مقرر ہونے کے بعد مولانا خلیل اللہ صاحب نے اپنا قیام دھیرج پہاڑی کے قریب رکھا اور مولانا کیرانویؒ مدرسہ مولانا محمد حیات صاحبؒ میں تعلیم حاصل کرتے اور رات کو مہاراجہ ہندو راؤ بہادر کو اکبر نامہ سناتے تھے۔ کچھ عرصہ تک حضرت مولاناؒ نے بھی مہاراجہ ہندو راؤ کے یہاں بحیثیت میر منشی کام کیا ہے۔

دہلی میں حضرت مولانا کیرانویؒ کی علمی پیاس نہ بجھی۔ جنون شوق اگر خرد کا پاسبان ہو تو ناخن تدبیر دل کی گرہ کشائی میں راہ نمائی کرتا ہے۔ چنانچہ لیلائے علم کی جستجو کا شوق حضرت مولانا قدس سرہ کو لکھنؤ لے گیا۔ آپ چند رفقاء کے ساتھ لکھنؤ تشریف لے گئے اور حضرت مولانا مفتی سعد اللہ صاحب مرحوم سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ مولانا امام بخش صہبائی سے آپ نے فارسی زبان کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ جناب حکیم فیض الحق صاحب سے آپ نے علم طب کی تعلیم حاصل کی۔ دورۂ حدیث آپ نے شاہ عبدالغنی سے پڑھا۔ شاہ عبدالغنی صاحب سے آپ نے مدرسہ رحیمیہ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ یہ مدرسہ اپنے زمانہ میں ایشیاء کی سب سے بڑی درسگاہ شمار ہوتا تھا۔ اس مدرسہ کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے قائم کیا تھا اور اس مدرسہ میں بڑے بڑے لوگوں نے تعلیم حاصل کی تھی اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اس مدرسہ کے سرپرست تھے۔ جن بڑے بڑے علماء نے اس مدرسہ میں تعلیم پائی ان میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

1- حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ۔ مترجم قرآن حکیم

2- حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ۔ مترجم قرآن حکیم
3- حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ۔ محدث (استاذ حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحبؒ)
4- حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق محدثؒ نبیرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ و جانشین شاہ عبدالعزیزؒ
5- مجاہد اسلام حضرت سید احمد شہید بریلویؒ
6- مجاہد اسلام حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ
7- مجاہد اسلام حضرت شاہ عبدالحی صاحبؒ
8- حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب آزردہؒ
9- حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کاندہلویؒ
10- حضرت مولانا شاہ غلام علی صاحبؒ
11- حضرت مولانا حسین احمد صاحب ملیح آبادیؒ
12- حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادیؒ
13- حضرت مولانا مملوک علی صاحب نانوتویؒ
14- حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند
15- حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند
16- حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ
17- حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ
18- حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

درس و تدریس:

ہندوستان کے حالات کے زیر و بم نے حضرت مولانا کیرانویؒ کے درس و تدریس کے زمانہ کو بہت محدود رکھا۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ نہایت ذہنی اطمینان کے ساتھ تعلیم و تدریس کا فیض عام جاری کیا جائے، کیونکہ آپ کے پاس ذرائع کی کمی نہ تھی

Marfat.com

لیکن ہندوستان کے حالات کے نشیب و فراز اور عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی تبلیغی سرگرمیوں اور مسلمانوں پر ان کی زیادتیوں نے آپ کو آتش زیر پا کر دیا۔ آپ کا ذہنی سکون اور قلبی اطمینان غارت ہو گیا اور آپ درس و تدریس کی طرف وہ توجہ نہ دے سکے جو اس کا حق تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ تکمیل تعلیم اور اکبر آباد (آگرہ) کے یادگار زمانہ مناظرہ کی درمیانی مدت میں آپ نے قصبہ کیرانہ کے محلہ دربار کی مسجد میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا تاکہ تعلیم و تدریس کے لیے حاصل کردہ علم اگلی نسل تک منتقل کیا جا سکے، لیکن آپ یہ کام دل جمعی کے بجائے ایک اضطرابی کیفیت کے ساتھ کرتے رہے۔ آپ چاہتے تھے کہ تعلیم و تدریس کے اس کام کو چھوڑ کر عیسائی مشنریوں کا مقابلہ کیا جائے تاکہ مسلمانوں کو ارتداد کی دہلیز کی طرف بڑھنے سے روکا جا سکے۔ تعلیم و تدریس کا کام تو ہر عالم دین کر رہا تھا لیکن عیسائی مشنریز جس جذبہ و جرأت کے ساتھ اقتدار کے زیر سایہ اہل ہندوستان کو عمومی طور پر اور مسلمانوں کو خصوصی طور پر عیسائی بنانے کے لیے کام کر رہے تھے، مسلمان علماء میں سے خال خال ایسے حضرات تھے جو ان کے ان جارحانہ اقدام کی مزاحمت کرتے۔ بہر حال دربار کیرانہ کی اس مسجد میں جن طلبہ نے آپ سے علمی فیض حاصل کیا ان میں چند خاص نام حسب ذیل ہیں۔ قیام مکہ کے دوران جو حضرات آپ سے علمی طور پر فیض یاب ہوئے ان کی فہرست آگے آ رہی ہے۔ جن حضرات کے نام ذیل میں دیئے جا رہے ہیں ان میں بھی بعض حضرات نے مکہ معظمہ پہنچ کر آپ سے علمی استفادہ کیا۔

1- حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب رامپور، مصنف حمد باری
2- حضرت مولانا احمد الدین صاحب چکوالی
3- حضرت مولانا نور احمد صاحب امرتسری
4- حضرت مولانا شاہ ابوالخیر صاحب
5- حضرت مولانا شاہ شرف الحق صاحب صدیقی
6- حضرت مولانا قاری شہاب الدین صاحب عثمانی کیرانوی
7- حضرت مولانا حافظ الدین دجانوی
8- حضرت مولانا امام علی صاحب عثمانی کیرانوی

Marfat.com

9: حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب ویلوری، بانی مدرسہ باقیات الصالحات، مدارس
10- حضرت مولانا بدرالاسلام عثمانی کیرانوی، مہتمم حمیدیہ کتب خانہ شاہی قسطنطنیہ

ان تلامذہ کے علاوہ اور بھی کئی حضرات ایسے تھے جن کو حضرت مولانا سے زیادہ نہیں لیکن تھوڑا اشرف تلمذ حاصل تھا۔ان کے نام یہاں نہیں دیئے جا رہے۔

شادی:

شادی ایک مسلمان کے لیے نہایت ضروری امر ہے، کیونکہ اس سے خلاف انسان کی تکمیل ہوتی ہے۔حق تعالیٰ شانہ نے سیدنا آدم علی نبینا وعلی الصلوٰۃ والسلام سے اپنی خلافت کا وعدہ فرمایا تھا۔لیکن تخلیق آدم کے کچھ عرصہ بعد "وخلق منها زوجها" کے فرمان الٰہی کے تحت حضرت حوا علیہا والسلام کو سیدنا آدم علیہ السلام سے نکال لیا گیا۔ اب فرض کیجیے کہ سیدنا آدم علیہ السلام (تھے۔اب جب "وخلق منها زوجها" کے تحت سیدہ حوا علیہا السلام کو ان سے نکالا گیا تو سیدنا آدم علیہ السلام (۔ب رہ گئے۔ اب جبکہ شادی کی شکل میں حوا کی بیٹی آدمؑ کے بیٹے سے نہیں ملتی، ایک انسان خلافت الٰہی کا مستحق اور سزاوار نہیں ہوسکتا۔اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ایک خاص اہمیت کا حامل ہے

﴿النكاح من سنتي فمن رغب عن سنتي فليس منيّ﴾

"نکاح میری سنت ہے اور جو شخص میری سنت سے اعراض برتے گا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

گویا کہ نکاح سنت انبیا بھی ہے اور سنت سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بھی، تکمیل تعلیم کے بعد والدین کے ذمہ ضروری تھا کہ وہ حضرت مولاناؒ کی شادی کا بندوبست کریں کیونکہ مشرقی معاشرہ میں یہ والدین کی ذمہ داری ہے۔یہ مغربی معاشرہ ہے جس میں بالغ لڑکی اور لڑکا خود ایک دوسرے کے گریبانوں سے کھیلنے کی مشق کرتے ہیں۔ اسلام کے مزاج میں ایسی حیا سوز مشق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔چنانچہ 1256ھ میں حضرت مولانا کیرانویؒ کی شادی اپنی خالہ کی لڑکی سے کر دی گئی، 1257ھ کو پھر مہاراجہ

Marfat.com

ہندوراؤ نے آپ کو اور آپ کے والد ماجد کو اپنے پاس دہلی باڑہ ہندراؤ میں بلا لیا۔ اس دفعہ اس نے حضرت مولانا کیرانویؒ کو اپنا میر منشی مقرر کیا اور آپ کے والد ماجد حضرت مولانا خلیل اللہ مرحوم کے ذمہ جائداد کی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام لگا دیا۔

آپ کو دہلی میں ابھی تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا خلیل اللہ (المعروف بہ خلیل الرحمٰن) اس عَدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرما گئے۔ اور آپ مہاراجہ ہندوراؤ کے ہاں اکیلے رہ گئے۔ والد ماجد کے انتقال نے بہت سی خانگی مجبوریوں کو جنم دیا، لہٰذا آپ مہاراجہ ہندوراؤ کے ہاں اپنی جگہ پر اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد جلیل صاحب کو ملازم کروا کر خود واپس کیرانہ تشریف لے آئے۔ کیرانہ میں آپ نے پھر ''محلہ دربار'' کی مسجد میں تعلیم و تدریس کا کام شروع کر دیا، لیکن ابھی حالات کی کروٹوں نے لوگوں میں ایک سیمابی کیفیت پیدا کی ہوئی تھی۔ انگریزی استعمار ہندوستانی تہذیب وتمدن کے پیرہن کو تار تار کر رہا تھا۔ کچھ بجھتی ہوئے قندیلیں ایسی روشنی دے رہی تھیں جن کے جلو میں چند حدی خوان دکھائی دیتے تھے جو ویران صحراؤں میں حجازی لَے پر تہذیب کہنہ کے گیت الاپ رہے تھے۔ چنانچہ حضرت مولاناؒ نے درس و تدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف کی طرف بھی توجہ دینی شروع کی۔

اگرچہ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں اس وقت زوروں پر تھیں۔ آپ نے ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس دور میں مندرجہ ذیل کتابیں تالیف فرمائیں۔

1- ترجمہ تحفہ اثنا عشریہ۔ یہ ردّ شیعیت پر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کی بے نظیر تالیف ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ حضرت مولاناؒ نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کا مخطوطہ مدرسہ صولتیہ میں محفوظ ہے۔

2- آداب المریدین (اردو) مطبوعہ

3- المحبوب القلوب (اردو) غیر مطبوعہ

4- النصرین فی تائید صلوٰۃ العصر علی المثلین۔ صلوٰۃ عصر کے وقت کے بارے میں حضرت مولاناؒ نے عربی زبان میں یہ رسالہ لکھا جو مخطوطہ کی شکل میں مدرسہ صولتیہ میں موجود ہے۔

Marfat.com

5- التنبیہات، حشر ونشر کے بارے میں کتاب

6- رسالۃ فی رفع الیدین فی الصلوٰۃ

نماز میں رفع الیدین نہ کرنے کے بارے میں آپ نے یہ رسالہ تحریر فرمایا۔ یہ ابھی تک طبع نہیں ہوا۔

آپ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں سے بہت پریشان تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو مختلف ذرائع سے مرعوب کر کے اور ان کو مالی پریشانیوں میں مبتلا کر کے عیسائیت میں داخل کرتے تھے۔ ان کا منصوبہ ہندوستان کو اسپین بنانے کا تھا۔ اگرچہ دوسرے کئی ایک علماء نے عیسائیوں کی ان کاروائیوں اور اسلام پر مختلف اعتراضات کا جواب دینے کے لیے قلم اٹھایا، لیکن ان کی یہ کوششیں بعض لحاظ سے مکمل (Comprehensive) نہ تھیں۔ اس پریشانی نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی رات کی نیندیں حرام کی ہوئی تھیں۔ وہ ماہی بے آب کی طرح عیسائی مشنریوں کی کاروائیوں کو دیکھ کر تڑپتے تھے جو اقتدار کے سایہ میں وہ لوگوں کو عیسائیت میں داخل کرنے کے لیے کر رہے تھے، چنانچہ مولانا کیرانویؒ نے لکھا ہے:

> ”جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کر لی اور مکمل انتظام کر لیا۔ تو اس 33 سال کے عرصہ میں ان کے پادریوں کی طرف سے کوئی تبلیغی دعوت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے رسالے اور کتابیں اسلام کی تردید میں لکھنی شروع کیں اور ان کو ہندوستان کے مختلف شہروں اور عوام الناس میں تقسیم کرنا شروع کر دیا، اور بازاروں اور لوگوں کے مجمعوں میں اور عام گزرگاہوں پر وعظ کہنے شروع کر دیئے۔ مسلم عوام ایک مدت تک ان کی باتیں اور مواعظ سننے سے پرہیز کرتے رہے اور ان کی کتابوں اور ان کے رسالوں کو دیکھنے سے متنفر رہے۔ اس لیے ہندوستانی علماء نے ان رسالوں کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن کچھ مدت کے بعد بعض عوام الناس اور جہلاء ان کی

Marfat.com

باتوں پر راغب ہوئے۔ اس وقت یہ خوف پیدا ہوا کہ بے علم مسلمان ان کے پھندوں میں نہ پھنس جائیں۔ اس لیے علماء اسلام نے ان کی تردید شروع کی۔

میں اگرچہ گمنامی کے گوشہ میں تھا اور علماء کے زمرہ میں میرا شمار نہ تھا، لیکن جب میں نے ان کی تقریروں اور تحریروں کو دیکھا اور بہت سے مطبوعہ رسالے میرے پاس پہنچے تو میں نے چاہا کہ اپنی حیثیت و قابلیت کے مطابق ان کی تردید کرنے کی کوشش کروں۔

لہٰذا میں نے چند کتابیں اور چند رسالے حقیقت حال کے اظہار کے لیے لکھے۔''

مولانا کیرانویؒ جس زمانہ میں کیرانہ میں درس و تدریس میں مصروف تھے، اس وقت آپ نے اپنے استاذ حدیث حضرت مولانا شاہ عبدالغنی قدس سرہ کی فرمائش پر ازالۃ الاوہام نامی کتاب کی تالیف شروع کی۔ یہ کتاب عیسائیت کے ردّ میں تھی۔ ابھی یہ کتاب زیر ترتیب ہی تھی کہ حضرت مولاناؒ سخت بیمار ہو گئے۔ حکماء نے بہت علاج کیا لیکن نتیجہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' نکلا۔ آخر میں آپ اپنے بھائی حکیم علی اکبر صاحب کے زیر علاج تھے لیکن افاقہ عنقا تھی۔ آخر کار مرض نے اتنی شدت اختیار کی کہ آپ کا اٹھنا، بیٹھنا اور چلنا پھرنا یک قلم ختم ہو گیا یہاں تک کہ نماز کے لیے بھی بیٹھنا مشکل تھا۔ چنانچہ آپ اشارے سے نماز پڑھتے تھے۔ اعزاء و اقربا اور مدرسہ کے اساتذہ و تلامذہ بیماری کی شدت سے نہایت پریشان تھے۔ تیمار دار بڑھتی ہوئی کمزوری اور مرض کی شدت کی وجہ سے آپ کی زندگی سے کافی حد تک مایوس ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی آپ کی صحت کے لیے بدست دعا تھے۔

بعض احباب اور اعزاء نے کسی اور طبیب سے علاج کروانا چاہا لیکن آپ کی والدہ نے اتفاق نہ کیا اور فرمایا کہ نہیں علاج میرا بیٹا علی اکبر ہی کرے گا۔ ایک روز نماز فجر کے بعد تیمارداری کرنے والوں نے دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید آپ بھی اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے ہیں، لہٰذا وہ تسلی و تشفی دینے لگے۔ لیکن آپ نے فرمایا:

Marfat.com

''بخدا! میری بیماری کی شدت اور کمزوری اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ صحت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن مجھے قوی امید ہے کہ انشاء اللہ ضرور صحت ہوگی۔''

نیز فرمایا:

''میرے رونے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے خواب میں حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا اور آپ کے ساتھ سیدنا صدیق اکبرؓ اور سیدنا فاروق اعظمؓ بھی تھے۔ آپ نے مجھے ارشاد فرمایا ''رئیس المجاهدین یا رئیس المعالجین'' اور سیدنا صدیق اکبرؓ نے فرمایا اے جوان! مبارک ہو تیرے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا۔ اگرچہ تالیف ازالۃ الاوہام مرض کا باعث بنی لیکن یقین قوی ہے کہ یہی شفا کا باعث بھی بنے گی۔''

حضرت مولاناؒ فرمایا کہ

''سیدنا صدیق اکبرؓ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خوشخبری کے بعد مجھے کوئی مایوسی اور رنج و ملال نہیں بلکہ میں مسرور اور خوش ہوں اور یہ آنسو فرط مسرت کی وجہ سے ہیں۔''

اس خواب کے تھوڑے ہی دنوں بعد حضرت مولاناؒ کو صحت و عافیت ہوگئی۔ روبصحت ہونے کے بعد آپ نے سب سے پہلے ازالۃ الاوہام کے منتشر اوراق کو اکٹھا کیا اور سات ماہ کے عرصہ میں اس کتاب کو مکمل فرمایا۔ (تذکرۂ اولیاء ہند: جلد۲ ص ۳۲۱)

ازالۃ الاوہام ابھی زیور طباعت سے مزین نہیں ہوئی تھی کہ دہلی میں اس کی کافی شہرت ہوگئی۔ اور اس کی تردید کرنے اور اس کا جواب لکھنے کی بعض لوگ تیاریاں کرنے لگے۔ اس وجہ سے حضرت مولاناؒ نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی جید اور قابل عالم کو اس کا مسودہ دکھا لیا جائے۔ اس بارے میں مولانا کی نگاہِ انتخاب حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کے پوتے حضرت مولانا نور الحسن پر پڑی۔ چنانچہ آپ نے ایک خط کے ساتھ جو کہ فارسی میں لکھا تھا، کتاب کا مسودہ انہیں ارسال کر دیا۔ اس خط کا جو حضرت مولانا

Marfat.com

کیرانویؒ نے مولانا نورالحسن صاحبؒ کو لکھا، اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

(اس زمانہ کے رواج کے مطابق القاب وخطابات کے بعد آپ نے لکھا)

''عرض پرداز ہوں کہ آنجناب کے دولت خانہ میں پاؤں پھسل کر گرنے کی خبر کو سنا۔ اگرچہ دل نحیف اس پر برانگیختہ کرتا ہے کہ وہاں پہنچ کر شوق کی پیاس کو قدمبوسی اقدس کے آب زلال سے رفع کرے، مگر بخت ناساز گار کا تقاضا اس کے برعکس ظاہر ہو رہا ہے۔ پانچ چھ روز بخار اور دیگر عوارض کی وجہ سے صحت کی پونجی سے محروم ہوں۔ صحت حاصل ہونے کے بعد اگر خدا نے چاہا تو اغلب گمان ہے کہ اس مقصد میں کامیابی ہوگی۔ جناب کے خادم حضرت مولانا مملوک علی صاحب بذریعہ عنایت نامہ اور اس طرف سے آنے والوں کے زبانی پیام سے رسالہ ''ازالۃ الاوہام'' کو جو اس کمترین خلائق کی تالیفات سے ہے طباعت کے لیے طلب فرما رہے ہیں، اور احقر کی خشک جانی اور بے جوہری سے اگرچہ بعض اہل بصیرت بخوبی واقف و آشنا ہیں لیکن مولانا معظم کی عالی ذات (چونکہ اس بے نصیب کو کبھی ان فیض مآب کی مجلس میں استفادہ کا موقع نہیں ملا) پورے طور پر اس انجان کی کم استعدادی سے واقفیت نہیں۔ اس وجہ سے اس رسالہ کو بھیجنے میں توقف رہا ہے کہ مبادا حضرت مولانا اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد محض اپنی طلب کی بنا پر اور بزرگوں کی پسندیدہ عادت کے مطابق میری غلطیوں کو نظر انداز فرما کر طبع کرا دیں اور بعد میں اس سراپا خطا کی خطائیں اور لغزشیں مخالف اور دشمن کے لیے دستاویز بن جائیں اور بیشتر لوگوں کے سامنے مجھے نگاہ نیچی کرنے کا بہانہ اور ذریعہ نہ بنے۔ یہ ذلت اٹھانا بھی قابل برداشت ہے لیکن اس کے علاوہ چند نصرانی ماسٹر رام چندر وغیرہ اس کے نسخہ کی دستیابی کے بعد اس کی تردید کا ارادہ

بھی اپنے دل میں رکھتے ہیں جس کی وجہ سے بہت زیادہ احتیاط برتنا نہایت ضروری ہے۔ اس ضلع میں سوائے آپ کی ذات مصدر حسنات کے کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں ہے کہ اس کی ذات سے اصلاح طلب کی جائے اور اس بارے میں استفسار کیا جائے۔ لہٰذا کتاب کا جس قدر حصہ نظر ثانی ہو چکا ہے خدمت والا میں روانہ کیا جاتا ہے۔ بشرط فرصت اللہ و رسول کے لیے اس کو ملاحظہ فرمائیں۔ اور جہاں میری کم استعدادی کی وجہ سے کوئی خطا اور غلطی سرزد ہو گئی ہو، اصلاح فرما دیں۔ اور اگر میری بدبختی سے سب کچھ قابل محو ہو اور موافق ''لن یصلح العطار افسده الدھر'' کے اس کی اصلاح ذات مقدس کے لیے انتہائی دشوار ہو تب بھی مجھے اطلاع سے مشرف فرمائیں تا کہ پھر اس کو اس طرح غائب کروں کہ عنقا کی طرح کوئی اس کے بعد اس کے نام کے علاوہ نہ سنے۔ اور لوگوں کی چیرہ دستی سے نجات ملے۔ اللہ و رسول اس بات کے شاہد ہیں کہ جس قدر بھی اصلاح اور ترمیم حضرت والا کی طرف سے ہو گی مجھ پریشان حال مشتاق کے لیے وہی سامان مسرت و نشاط ہو گی۔ اگر چہ جہلاء محض بلکہ اس زمانہ کے علماء بھی اس بات سے رنجیدہ خاطر ہوں، لیکن میرے مکرم، نہ میں اس زمانہ کے گروہ علماء میں سے ہوں اور بحمد اللہ نہ جاہل محض ہوں بلکہ اپنے کو آنحضرت کے شاگردوں میں سے ادنیٰ شاگرد کے برابر سمجھتا ہوں۔ اگر چہ بظاہر اب تک اس دولت سے مشرف نہیں ہوا ہوں۔''

یہ تو پتہ نہیں چلا کہ حضرت مولانا نور الحسن صاحب کاندھلویؒ نے اس مسودہ کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ کر اس کے بارے اپنے کیا تاثرات بتائے۔ یہ کتاب یکم رمضان المبارک 1269ھ کو سید المطابع، کوچہ بلاقی بیگم، دہلی سے سید قوام الدین کے زیر اہتمام زیور طباعت سے مزین ہوئی۔ یہ 564 صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کے حاشیہ پر مولانا

آل حسن موہانی کی کتاب استفسار بھی طبع ہوئی۔

اس کتاب میں پادری فنڈر کی کتاب ''میزان الحق'' کے اعتراضات کے دندان شکن اور مسکت جوابات دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ عیسائی پادریوں کے اعتراضات کے جوابات اور عیسائی عقائد کے ردّ میں بھی کافی مواد موجود ہے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے:

''یہ کتاب میں نے پہلے اردو میں لکھی تھی، لیکن اہل اسلام کے اہل علم فارسی زبان سے زیادہ رغبت رکھتے تھے، اس لیے مجبوراً ان کے اصرار پر اس کو فارسی زبان میں تحریر کیا۔''

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب ''ازالۃ الاوہام'' کے نام سے مولانا کیرانویؒ نے ردّ عیسائیت کے موضوع پر لکھی۔ کتاب نے عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ قصر عیسائیت میں زلزلہ سا آنے لگا۔ لیکن کسی کو کیا پتہ تھا کہ اس کتاب کا مصنف ایک روز ردّ عیسائیت پر پوری دنیا میں ایک اتھارٹی تسلیم کیا جائے گا۔

کتاب کی مقبولیت اور علمی دنیا میں افادیت اور عیسائی دنیا میں تزلزل کی وجہ سے حضرت مولانا نور محمد صاحب مہتمم مدرسہ حقانی لدھیانہ نے اس کا اردو ترجمہ دافع الاسقام اردو ترجمہ ازالۃ الاوہام کے نام سے کیا اور بالاقساط اخبار منشور محمدی، بنگلور سے شائع فرمایا۔

اس ترجمہ کا فائدہ یہ ہوا کہ عوام الناس جو فارسی زبان سے واقف نہ تھے یا کامل دستگاہ نہ رکھتے تھے وہ بھی عیسائیت کے مسائل وعقائد اور حضرت مولانا کیرانویؒ کے دلائل سے واقف وآشنا ہو گئے اور عیسائی پادریوں کا دائرہ تبلیغ تنگ ہو گیا۔ اور ان کی حسرتیں جو وہ ہندوستان کے بارے اپنے دلوں میں رکھتے تھے، ختم ہو گئیں۔

1270ھ میں حضرت مولانا کیرانویؒ کا ایک سالہ لڑکا فوت ہو گیا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد آپ کی اہلیہ محترمہ تپ دق کے عارضہ میں مبتلا ہو کر انتقال فرما گئیں۔ اعزاء واقارب نے حضرت مولاناؒ کے مزاج میں قدرتی افسردگی کو دیکھ کر دوسری شادی کے لیے کہا لیکن آپ نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ یک سالہ بچے اور بیوی کی بیماری اور پھر داغ مفارقت نے حضرت مولاناؒ کی طبیعت کو کافی مضمحل کر دیا تھا۔ اس کے

Marfat.com

ساتھ والد ماجد کے انتقال کے صدمہ نے آپ کی طبیعت کی افسردگی میں اور اضافہ کیا۔ اعزاء واحباب کا دوسری شادی کا مطالبہ اصرار کی صورت اختیار کرتا گیا، لیکن آپ نے ان کے اصرار کو قبول کرنے سے پہلوتہی کی اور کافی عرصہ تک دوسری شادی نہ کی۔

ازالۃ الاوہام کی تکمیل اور اوپر ذکر کردہ سارے واقعات ایک مختصر سے عرصہ میں رونما ہوئے، لیکن حضرت مولاناؒ نے ان سب واقعات سے کوئی اثر نہ لیا۔ آپ چشم بصیرت سے دیکھ رہے تھے کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد فرنگی سامراج کے ہاتھوں پورے ہندوستان کا سہاگ اجڑنے والا ہے۔ گنگ وجمن کی سرزمین فرنگیوں کے گھوڑوں کے پاؤں تلے پامال ہوگی۔ اور دہلی اور اس کے مضافات کے ساتھ ان گوری چمڑی والوں کے ہاتھ سے وہ کچھ ہونے والا ہے کہ حیاء وشرافت منہ چھپاتی پھرے گی۔ حضرت مولاناؒ کی چشم بصیرت نے مستقبل کے پردہ میں جو کچھ دیکھا تھا وہ ہوا اور من وعن ہوا اور تاریخ پاک وہند کے اوراق گواہ ہیں کہ فرنگی سامراج کے ہاتھوں دلی کا جو سہاگ اجڑا۔ اگر جمنا کی لہریں آج تاریخ کے وہ اوراق اگل دیں اور لال قلعہ ان خونی حادثات کی گرہ کشائی کرے تو ماضی کی ایک ایک لکیر ابھر کر سامنے آجائے۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولاناؒ کے لیے یہ بات سب سے زیادہ سوہان روح بنی ہوئی تھی کہ عیسائی مشنریز لمبے چغے پہنے ہوئے میلوں ٹھیلوں اور گلیوں اور بازاروں لوگوں کی متاع ایمان کو لوٹ رہے ہیں۔ حضرت مولانا شرافت اور تمدن کی برہنہ لاشوں کو دہلی کی شاہراؤں پر شرم وحیاء کی بھیک مانگتے ہوئے دیکھ سکتے تھے، غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم وجور کی وجہ سے آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی عمارات دیکھ سکتے تھے، شرافت وحیاء کے پیکر خاندانوں کے بے خانماں ہونے پر گلیوں اور بازاروں کو بے خانماں ہوتے دیکھ سکتے تھے، یورپی قوم کے ہاتھوں ایشیائی لوگوں کی ہلاکت آفرینی دیکھ سکتے تھے، لیکن وہ بات کسی صورت نہیں دیکھ سکتے تھے کہ تہذیب و شرافت کے ان مدعیوں اور برطانوی استعمار کے زیر سایہ راہبوں اور پادریوں کے ہاتھوں کسی ادنیٰ سے مسلمان کی متاع ایمان غارت ہو۔ وہ ایمان کی دولت کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ عیسائی مشنریوں نے ہندوستان میں برطانوی

استعمار کے زیر اثر بلکہ اس کی اعانت سے اسلام دشمن سرگرمیاں تیز کر رکھی ہیں۔ اس وقت جو حالات تھے اس پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندویؒ نے اپنے ایک مضمون میں بڑا جامع تبصرہ فرمایا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''مولانا کیرانویؒ کا وہ عظیم کارنامہ جس نے ان کو علمائے سلف اور مجاہدین امت کے درمیان ممتاز مقام عطا کیا، یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی مدافعت اس طرح کی کہ حق و باطل کو آئینہ کی طرح روشن کر کے دکھا دیا۔ مولانا نے نہ صرف یہ کہ ان تہمتوں کی حقیقت واضح کر دی بلکہ مسلمانوں کے اندر دین پر یقین و اعتماد کو پختہ سے پختہ تر کر دیا۔ مسلمانوں کو اپنے دین کی صداقت اور اپنے رسول کی لائی ہوئی ہدایت پر از سر نو غیر متزلزل ایمان نصیب ہوا۔''

''حضرت کیرانویؒ نے یہ خدمت ایسے زمانہ میں انجام دی جو مسلمانوں کے لیے انتہائی نازک اور صبر آزما زمانہ تھا۔ ان کا حریف وہ تھا جس کو اس زمانہ کے سب سے بڑے فاتح گروہ کی پشت پناہی حاصل تھی اور وہ بڑی دنیاوی طاقت اس کی سرپرست تھی جس کے قلمرو میں آفتاب نہیں غروب ہوتا تھا اور جس کے تمدن، تہذیب اور تعلیم کی پوری دنیا میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔''

''دوسری طرف مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اپنے حریف کے برعکس ایسی قوم کے فرد تھے جو شکست خوردہ بھی تھی اور شکستہ دل بھی، اور آزمائش کے سنگین ترین وقت سے گزر رہی تھی۔ اس کو اپنے تابناک ماضی کا بھی ہوش نہیں تھا۔ اس کے نزدیک اسلاف کے مجاہدانہ کارنامے قصہٴ پارینہ تھے جو اس کی سیاسی پسپائی اور اقتصادی بحالی کا مداوا نہیں بن سکتے تھے۔ اور اس ذہنی پسپائی کے نتیجے میں خود دین اسلام کی صداقت و حقانیت پر یقین میں کمزوری بلکہ کھوکھلا پن آچکا تھا۔ انگریز اس کو اپنا حریف اور حقیقی دشمن سمجھتے

Marfat.com

تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ ایشیا اور افریقہ میں کہیں بھی ان کے دین وتہذیب کو کوئی علمی محاذ پر چیلنج کر سکتا ہے تو وہ صرف مسلمان ہیں۔ اس لیے اس کا سارا زور مسلمانوں کی حوصلہ مندیوں کو مٹانے اور ان کی معنوی قوت کمزور کرنے پر صرف ہو رہا ہے۔''

''یورپ کی عیسائی مشنریاں پوری آزادی کے ساتھ حکومت وقت کی سرپرستی اور کفالت میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں اپنے جال بچھائے ہوئے تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں عیسائی مبلغین ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ سینکڑوں ناخواندہ اور نیم تعلیم یافتہ افراد ''اقبال مند فاتح قوم'' کا مذہب اختیار کر رہے تھے اور ان کی ظاہری شان وشوکت، حکومت وقوت کمزور اور ناخواندہ اشخاص کے نزدیک حقانیت کی دلیل تھی۔''

''عوام اور سادہ لوح لوگ تو الگ رہے خود علمائے کرام کو عیسائیت کی پوری حقیقت نہیں معلوم تھی۔ ان کو بائبل کے عہد قدیم، عہد جدید اور ان کی شرحوں اور تفسیروں سے واقفیت نہیں تھی۔ ان کتابوں کی تاریخ اور ان میں جو مختلف زمانوں میں اضافے ہوتے رہے اور کتر بیونت کی جاتی رہی، بائبل سوسائٹیوں نے جو تصرفات کیے، عیسائی انجیل مقدس انجمن نے جس طرح بائبل کو ایڈٹ (Edit) کیا، ان سب سے سطحی واقفیت بھی پڑھے لکھے مسلمانوں کو نہیں تھی۔ علمائے کرام کی ذہنی جولانیوں اور علمی تحقیقات کے میدان یا تو فقہی جزئیات تھے یا یونانی منطق وفلسفہ اور علم کلامی کی بحثیں، یا کسی درجہ میں احادیث وتفسیر پر حواشی اور تحقیقات۔ عیسائیوں کے ان ناروا حملوں کا مقابلہ کرنے کی کوئی تیاری انہوں نے نہیں کی تھی۔ یہ حملے ان کے لیے ایسے تھے جیسے کسی نے اچانک رات کی تاریکی میں ان کے گھر پر شبخون مارا ہو، ان

Marfat.com

حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے دل گردہ کی ضرورت تھی۔ ہمت و جرأت کے ساتھ کتب سماویہ پر گہری نظر کی ضرورت تھی، اور اس بات کی ضرورت تھی کہ عیسائیت کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہو، اور عیسائیت کو عیسائیت کے بنیادی اور علمی مراجع سے سمجھا گیا ہو۔ جو ان پر تنقیدیں کی گئی ہیں اور ان کے تجزیے جس انداز میں کیے گئے ہیں ان سے واقفیت بھی لازمی تھی۔ ان سب کے لیے ایک طرف تو بھرپور غیرت ایمانی کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف وسیع مطالعہ اور بصیرت مطلوب تھی۔ اور خاص مشکل یہ تھی کہ عیسائیت پر تحقیقی کام کرنے والے کے سامنے کوئی روشن شاہراہ نہیں تھی بلکہ ایک سرنگ تھی جو اندر سے تاریک تھی اور اس میں پیچ در پیچ راستے تھے۔ کھانچے اور کھائیاں تھیں یعنی ان کے علمی ماخذ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اور جو تھوڑے بہت تھے وہ یورپین زبانوں میں تھے۔ ان زبانوں میں زیادہ مانوس زبان انگریزی تھی۔ اہل ہند نے ابھی اس زبان کو سیکھنا شروع ہی کیا تھا۔ اکثر مسلمان اور خاص طور پر علماء اس سے متنفر تھے، کیونکہ یہ ان ظالموں کی زبان تھی جنہوں نے ان سے حکومت چھینی تھی اور ان کی تذلیل کی تھی۔ دوسری طرف خود عیسائی مشنریاں بھی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی کتاب مقدس پر جو جرح ہوئی ہے اور اس کے جو تجزیئے کیے گئے ہیں وہ ہندوستانیوں کے علم میں آئیں، کیونکہ ان کی تبلیغ کی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بے خبر رکھا جائے، لہٰذا وہ یہاں کی لائبریریوں اور علمی مراکز کو ایسی کتابیں کیونکر فراہم کر سکتے تھے، بلکہ ان کی کوشش تھی کہ اس طرح کی کتابیں اس ملک میں آنے ہی نہ پائیں۔''

یہ ان حالات کی صحیح تصویر ہے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندویؒ نے اپنے ایک عربی مضمون میں کھینچی ہے۔ علماء عیسائیت کے بارے میں مکمل معلومات نہ

ہونے کی وجہ سے خاموش تھے اور ان کی خاموشی امت مسلمہ کو پریشان کر رہی تھی۔ اور مشنری لوگ اس خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے تھے۔ مولانا کیرانویؒ نے یہ محسوس فرمایا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میدان میں آیا جائے اور آپ نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس سیلاب کا مؤثر مقابلہ اس وقت تک نہ ہو سکے گا جب تک پادری فنڈر کے ساتھ کسی مجمع عام میں ایک فیصلہ کن مناظرہ کر کے عیسائیت کی کمر نہ توڑ دی جائے تاکہ عوام الناس کے دلوں میں عیسائیت کا جو خوف مسلط ہونے لگا ہے وہ بالکل دور ہو جائے اور وہ پہچان لیں کہ دلیل و حجت کے میدان میں عیسائیت کے اندر کتنی طاقت اور سکت ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا کیرانویؒ نے اعلان کیا

> ''میں نے ہندوستان کے سب سے بڑے پادری جو علمائے مسیحین میں ممتاز حیثیت کا مالک اور میزان الحق کا مصنف تھا، اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے ساتھ مجمع عام میں مناظرہ کرے تاکہ حق واضح ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ علمائے اسلام نے ان رسائل کی تردید اس لیے نہیں کہ وہ عاجز تھے بلکہ جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔'' (اظہار الحق: ص ۳)

یہ اعلان کر کے حضرت مولانا کیرانویؒ نے مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن کی بجائے اپنے حریف یعنی عیسائیوں کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا۔ اس سے قبل حالت یہ تھی کہ عیسائی مبلغ مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا کرتے تھے۔ یہ چیلنج اور وہ بھی پاک و ہند کے سب سے بڑے پادری فنڈر کو، حضرت مولانا کی سب سے پہلی کامیابی تھی۔ حضرت مولانا کی دینی بصیرت نے محسوس کیا کہ ''میزان الحق'' کی اشاعت کے بعد اور پادری فنڈر اور اس کے ساتھیوں کی ان تبلیغی سرگرمیوں کے بعد اب عیسائیوں سے دوبدو مقابلہ ضروری اور لابدی ہو گیا ہے ورنہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو جائیں گے بلکہ عرب ممالک کو بھی انہی خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر پاک و ہند کے مسلمان جو سیاسی لحاظ سے پسپا اور شکست خوردہ اور اپنی سلطنت کے کھو جانے کی وجہ سے شکستہ دل ہیں، اگر اس مورچہ پر بھی شکست کھا گئے اور اس مناظرہ میں اپنے حریف کا

Marfat.com

کھوکھلا پن اور بوداپن ثابت نہ کر سکے تو عیسائیت کا سیلاب پورے عرب اور مشرقی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اور اگر یہ مسلمان اس مناظرہ میں کامیاب و کامران ہو کر نکلتے ہیں تو یہ سیلاب بلا نہ صرف برصغیر پاک و ہند سے اور تمام مسلم ممالک سے رُک جائے گا۔ بلکہ عیسائیت کا یہ خوفناک اور ایمان کا غارت گر عفریت ہمیشہ کے لیے دم توڑ دے گا۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے تمام حالات کا تجزیہ کر کے پادری فنڈر کو مناظرہ کا چیلنج تو دے دیا لیکن آپ کو ایک بہت بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ وہ یہ کہ آپ انگریزی زبان سے ناآشنا تھے۔ زندگی بھر آپ کا مشغلہ علوم دینیہ کی درس و تدریس رہا۔ اب آپ عمر کی اس منزل میں تھے جہاں دوسری زبانوں کو اتنی آسانی سے سیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ عیسائیت کا لٹریچر زیادہ تر یورپی زبانوں میں تھا، لہٰذا آپ کے لیے اس سے کما حقہ آشنائی مشکل تھی۔

اس کے برعکس پادری فنڈر جس کو آپ نے مناظرہ کا چیلنج دیا تھا وہ صرف انگیزی ہی جانتا تھا یا یورپ کی کوئی اور دوسری زبان، یا پھر تھوڑی بہت عربی اور فارسی زبان سمجھ لیتا تھا۔ اب ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ایک طرف تو یورپی زبانوں سے واقف و آشنا ہو اور دوسری طرف عیسائی وثائق کو پڑھ کر اس کا ترجمہ وغیرہ کر سکتا ہو۔ عربی و فارسی وغیرہ زبانوں کو بھی جانتا ہو تاکہ ان دونوں کے درمیان واسطہ بن سکے۔

حق تعالیٰ شانہ کے وعدہ کے مطابق کہ ''اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا'' حق تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کو حضرت مولانا کیرانویؒ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جس کی اس وقت انتہائی ضرورت تھی۔ وہ شخص ڈاکٹر وزیر خان اکبری آبادی تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دیندار شخص تھے۔ آپ نے لندن سے 1832ء میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی۔ آپ انگریزی کے علاوہ یونانی زبان کے بھی ماہر تھے۔ لندن کے قیام کے دوران آپ نے عیسائیت کا بڑا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ بائبل کی شروحات اور اس کے تمام متعلقات ان کی نظر سے گزر چکے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ ساری کتابیں انگلستان سے واپسی پر اپنے ساتھ ہندوستان لے کر

Marfat.com

آئے تھے۔اس مناظرہ میں ڈاکٹر صاحب مولانا کیرانویؒ کے بہترین معاون اور ساتھی ثابت ہوئے اور ان دونوں حضرات نے مل کر پادری فنڈر کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا، یہاں تک کہ اُسے ہندوستان سے بھاگنا پڑا۔

ایک طرف یہ حالت تھی۔دوسری طرف پادری فنڈر اور اس کے ساتھی سرزمین پاک و ہند میں دندناتے پھر رہے تھے۔کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔حکومت کی پوری انتظامیہ ان کی پشت پر تھی عیسائی مشنریز شتر بے مہار کی طرح پوری بے حیائی اور جرأت کے ساتھ اسلام پر ناروا حملے کر رہے تھے۔ان زبانی حملوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں سے کئی رسائل و جرائد بھی اسلامی عقائد پر ناروا حملہ کرنے کے لیے نکالے گئے۔پھر ان لوگوں کی جرأت و ہمت یہاں تک بڑھی کہ وہ مسجدوں کے اندر جا کر انجیل کی بشارت دینے لگے۔

ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ:

پیشتر اس کے کہ ہم پادری فنڈر کا حدود اربعہ بیان کریں یا اس مناظرہ کی کاروائی پر روشنی ڈالیں جو پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مابین ہوا، ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قارئین کرام کو یہ بتائیں کہ ہندوستان میں عیسائیت کیسے وارد ہوئی اور ہندوستان کے بارے میں عیسائی مشنریوں کا کیا منصوبہ تھا اور اس میں انہیں کہاں تک کامیابی ہوئی؟ اور پادری فنڈر اور اس کے ساتھی جو کچھ کر رہے ہیں، کیا یہ ان کا اپنا پلان تھا یا اس کے پیچھے کوئی اور سازش تھی جس کی تکمیل کے لیے یہ پادری حضرات ایک آلۂ کار کا کام دے رہے تھے؟ ان سب باتوں کا بیان کرنا بھی ضروری ہے تاکہ اس مناظرہ کا پس منظر سمجھ میں آ جائے۔

یورپ کی صلیبی طاقتوں کو جب شام، فلسطین اور مصر وغیرہ میں اہل اسلام کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی تو انہوں نے اب یہ پلان بنایا کہ مشرقی ممالک میں ایک ایسی عیسائی حکومت قائم کی جائے جو طاقت کے بل پر مسلمانوں سے مقامات مقدسہ چھین لے۔دوسری طرف پرتگالی حکمران ہنری (Henry) (1394-1460ء) نے عیسائی

Marfat.com

مبلغین کو ایک پیغام بھیجا جس میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ غیر مسلم ملکوں پر اسلامی فوجوں کی یورش پر پابندی لگا دی جائے۔ یہ ہنری وہی حکمران تھا جس کے باپ یوحنا نے مسلمانوں کو اسپین سے نکالنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اس شخص کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ایک خاص نفرت بھری ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ دین اسلام کو تباہ و برباد کر کے مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دیا جائے اور پوری دنیا میں مسیحی مذہب کا پھریرا لہرایا جائے۔

اس شخص کے عزائم یہ تھے کہ اسپین سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد اب ہندوستان کا رخ کیا جائے اور اس وسیع وعریض ملک کو بھی اندلس کی طرح مسیحی دائرے میں داخل کر لیا جائے۔ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے 1417ء میں ''یسوع مسیح کے مجاہدین'' کے نام سے ایک تبلیغی دستے کی تشکیل کی اور انہیں خطیر رقمیں دے کر افریقہ اور ایشیاء کے ملکوں کو روانہ کیا تا کہ ان ملکوں میں عیسائی تبلیغ کے میدان کو وسیع کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دین مسیحی میں داخل کیا جائے۔

(عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص۳۳۳، بانیکار، آسیا والسیطرۃ الغربیۃ: ص۷۴-۷۶)

پاپائے روم نیکولس پنجم نے 1454ء میں اپنے ایک پیغام میں کہا کہ:

''ہمیں اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ ہمارے بیٹے ہنری بادشاہ پرتگال نے اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر وہ کام کرنا شروع کیا ہے جو اس کے والد نے (مسلمانوں کو سرزمین اندلس سے نکال کر) کیا تھا۔ یہ سب کچھ وہ اس غیرت اور بہادری کے باعث کر رہا ہے جو مسیح کے ایک سپاہی کے اندر ہونی چاہیے۔ اُس نے اللہ کے نام کے ساتھ دور ونزدیک شہروں میں اپنے لوگوں کو بھیجنا شروع کیا ہے جو مسیح کے دشمنوں کو سبق سکھائیں گے۔''

(آسیا والسیطرۃ الغربیۃ: ص۳۷)

اس سلسلہ میں ایک وفد ہندوستان میں بھی آیا۔ اس نے مختلف مقامات کا دورہ کر کے واپسی پر شاہِ پرتگال کو یہ رپورٹ دی کہ فوجی، سیاسی، تجارتی اور دینی میدانوں

میں وہاں کامیابی کے غیر معمولی امکانات ہیں۔ اس رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد ہندوستان کے ساحلی علاقوں، گوا، دمن، دیو، کلکتہ اور مالا بار میں پرتگالیوں نے سب سے پہلے تجارتی دفاتر قائم کیے۔اس کے بعد ان لوگوں نے تجارت کے پردے میں اپنے اصل مشن کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ ان ساحلی علاقوں میں لبنان اور شام سے عیسائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو لا کر آباد کیا گیا جو تجارت کے پردے میں عیسائی دعوت کے کاموں میں بڑی مہارت اور تجربہ رکھتے تھے۔

ان لوگوں نے وہاں آباد ہوتے ہی وہاں کی غیر مسلم آبادی پر اپنا حربہ آزمایا جو غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ایک طرف تو ان لوگوں نے وہاں کی غیر مسلم آبادی کو عیسائی بنانا شروع کر دیا اور دوسری طرف ان ساحلی علاقوں پر انہوں نے قبضہ کر کے پرتگال کے ساتھ تجارتی تعلقات کو مزید مستحکم اور مضبوط کر لیا جو آگے چل کر عیسائیوں کے لیے فوجی اور اقتصادی لحاظ سے بڑا مفید ثابت ہوا۔

کتابوں میں آتا ہے کہ عیسائی پادریوں نے کافی زمانے تک اس بات کی کوشش کی کہ مغل عیسائیت قبول کر لیں، لیکن جب انہوں نے دعوت اسلام کو لبیک کہا اور اسلام کے شیدائی ہو گئے تو پادریوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اب مغربی استعمار نے مشرق میں لوگوں کو عیسائیت قبول کرنے کی ترغیب دینی شروع کی اور دین کے ذریعے مشرقی ممالک میں اپنا اثر ونفوذ کرنا شروع کر دیا۔ اسی مقصد کے لیے وہ ساری صلیبی جنگیں لڑی گئیں۔ (التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیۃ: ص ۱۱۵)

پرتگالیوں نے مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دربار میں مختلف اوقات میں تین وفود بھیجے۔ اکبر نے ان وفود کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ پہلے وفد کے ارکان نے شہنشاہ اکبر سے آگرہ میں ایک گرجا گھر کے قیام کی درخواست کی، بادشاہ نے عواقب سے ناواقف ہونے کی وجہ سے انہیں آگرہ میں ایک گرجا گھر کے قیام کی اجازت دے دی، نہ صرف اجازت دی بلکہ اس کے ساتھ شہزادہ سلیم کو تربیت کے لیے ان عیسائی پادریوں کے حوالے کر دیا۔ تین سال تک یہ عیسائی وفد اکبر اعظم کے پاس اس امید میں مقیم رہا کہ شاید بادشاہ عیسائی مذہب اختیار کر لے کیونکہ وہ اندر ہی اندر کچھ ایسے حربے

Marfat.com

اختیار کر رہے تھے جن کی وجہ سے انہیں قوی امید تھی کہ جلد ہی شہنشاہ اکبر دین عیسوی قبول کر لے گا، لیکن 1583ء میں یہ وفد ناکام و نامراد واپس گیا کیونکہ اکبر نے دین عیسوی قبول نہ کیا۔

دوسری طرف شہزادہ سلیم پر تین سال کی تربیت کے باوجود یہ عیسائی اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس وجہ سے انہیں اپنے مقاصد میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

اس وفد کے بے نیل مرام واپس جانے کے بعد اسی طرح کا ایک دوسرا وفد اسی غرض کے تحت 1590ء میں دربار اکبری میں حاضر ہوا۔ یہ وفد بھی 1594ء میں اسی طرح نامراد واپس چلا گیا۔ جب پرتگالیوں کو اپنی ناکامی کا احساس ہوا تو انہوں نے پھر تیسرا وفد دربار اکبری میں روانہ کیا جس نے لاہور اور آگرہ میں گرجا گھروں کی تعمیر کی اجازت اور سہولت حاصل کر لی جس کی وجہ سے آگے چل کر بہت مشکلات پیش آئیں اور ہندوستان کی تاریخ کا رخ اکبر کی اس چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے تبدیل ہو گیا۔

(جمال الدین الشیال: تاریخ دولۃ اباطرہ المغول الاسلامیہ فی الہند: ص ۹۲)

شہنشاہ اکبر ہو یا کوئی اور مغل بادشاہ، یہ حضرات اپنی شاہ خرچیوں اور غیر ضروری سخاوتوں کی وجہ سے مسلم قوم کو ایسی مشکلات میں ڈال کر گئے جن کا خمیازہ اہل اسلام آج تک بھگت رہے ہیں۔ ان سخاوتوں اور نوازشات میں اکبر اعظم کی ایک یہ نوازش بھی تھی کہ پرتگالیوں نے تجارت کے نام پر گوا اور دوسرے ساحلی علاقوں میں اپنے سیاسی اور تبلیغی اڈے قائم کیے جن میں مسلمانوں اور غیر مسلم دونوں کو عیسائی بنانے کی کوششیں کی جاتیں تاکہ عیسائیوں کی آبادی میں اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ پرتگالیوں نے بہت سی جگہوں پر اسلامی سرحدوں میں مداخلت شروع کر دی اور حکومت کے داخلی معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی، تجارت کے پردے میں وہاں کے لوگوں کو قید کر کے یورپ کی منڈیوں میں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے تنگ آ کر انہیں تکلیف دینا شروع کر دیا اور حکومت کی آنکھیں بھی ان کے ظلم و ستم کو دیکھ کر کھل گئیں۔ چنانچہ گوا کے بڑے پادری نے پرتگال کے بادشاہ سے اس بارے میں شکایت بھی کی۔ (الشرقاوی والصیاد، ملامح الہند والباکستان: ص ۱۶۳)

Marfat.com

شہزادہ سلیم کے بعد جب اس کا لڑکا شاہجہان ہندوستان کے تخت پر بیٹھا اور اسے پرتگالیوں کے اس جور وستم کا پتہ چلا ہے، تو تاریخ کے رپورٹ بتاتے ہیں کہ اس نے 1627ء مطابق 1038ھ میں بنگال کے حاکم قاسم خان کو حکم دیا کہ عیسائیوں کے مراکز پر قبضہ کر کے ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے، تاکہ عوام الناس ان کے شرور وفتن اور ظلم وستم سے نجات پاسکیں۔ بادشاہ کے اس حکم کا ملنا تھا کہ گورنر بنگال قاسم خان نے ہوگلی وغیرہ میں عیسائیوں کے مستحکم اور مضبوط قلعوں کو شاہجہانی فوج کے ذریعہ سے زمین بوس کر دیا اور بادشاہ کے حکم کے مطابق واقعی ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

ان خونریز معرکوں میں قریباً دس ہزار عیسائی مارے گئے اور چار ہزار کے قریب پابجولاں ہوئے۔ نیز ان دس ہزار ہندوستانیوں کو بھی پرتگالیوں کے قبضہ سے رہا کرایا گیا جنہیں اس مقصد کے لیے جہاز میں قید کر کے رکھا گیا تھا تاکہ انہیں یورپ کی منڈیوں میں غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا جائے۔

لوگوں کو عیسائی بنانے کا پرتگالیوں کو اس قدر جنون تھا کہ وہ آزاد لوگوں کو غلام بنا کر فروخت کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے تاکہ ان غلاموں کو ان کے آقا عیسائی بنا سکیں۔ کاش اس قسم کی کوششیں لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے اگر ہندوستان کے مغل بادشاہ کرتے تو آج ہندوستان کا نقشہ اس سے مختلف ہوتا۔ وہ مسلمان بادشاہ مفت میں بدنام بھی ہو گئے لیکن اسلام کی نشرواشاعت کے لیے انہوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ کاش! پرتگالیوں کی مذہب کے بارے میں اس قسم کی کاروائیوں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلتیں۔

شاہ جہان کے بعد جب اس کا لڑکا اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کی سلطنت کے تخت پر بیٹھا تو پرتگالیوں کے ظلم وستم اس کی نگاہ میں تھے جو انہوں نے اپنے زیر اثر علاقوں کے لوگوں پر کیے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنے وقت کے بنگال کے گورنر شائستہ خان کو حکم دیا کہ وہ پرتگالیوں کے رہے سہے مراکز کو بھی نیست ونابود کر دے تاکہ لوگ ہمیشہ کے لیے ان کے ظلم وستم سے نجات پا جائیں۔ شائستہ خان نے اورنگ زیب کے اس حکم کی تعمیل کی اور پرتگالیوں کی قوت کے خاتمہ کے لیے بھرپور ایکشن کیا۔ اس مہم میں بنگال کے بحری بیڑے کی تین سو کشتیاں بھی کام میں لائی گئیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے

Marfat.com

لیے ولندیزی، فرانسیسی اور انگریزی کمپنیوں نے بھی حکومت کی بھرپور مدد کی یہاں تک کہ اسلام آباد اور جفنہ کے علاقوں کو پرتگالیوں کی دست برد سے رہا کرا لیا گیا۔ یہ ایکشن 1658ء میں لیا گیا۔ پرتگالیوں کے خلاف ولندیزی، فرانسیسی اور انگریزی کمپنیوں نے اس وجہ سے حکومت کا ساتھ دیا تھا کہ پرتگالیوں نے تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ اور یہ بات ان کمپنیوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنے ذاتی کینہ کی بنا پر پرتگالیوں کی اجارہ داری ختم کرنے میں حکومت کا ساتھ دیا۔ (الساداتی، تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیۃ: جلد ۲ ص ۱۹۳، ۲۱۹، الشبال، تاریخ دولۃ اباطرۃ المغول الاسلامیۃ: ص ۱۴۰، ۱۵۷)

1490ء میں جب پرتگالیوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر قدم رکھا تھا اسی وقت سے عیسائیت کی نشر واشاعت کے بارے میں ان کی نیتیں طشت ازبام ہو گئی تھیں اور ہر شخص یہ جاننے لگا تھا کہ یہ تجارت کے لبادہ میں کیا کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ان کی سرگرمیاں بھی یہ بتاتی تھیں کہ ان کے باطن میں کیا کچھ ہے۔ انہوں نے بہت جلد ہی گوا اور دیگر ساحلی علاقوں پر گرجا گھر قائم کیے اور پانچ کیتھولک پادریوں کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ عیسائی مذہب کی اشاعت وتبلیغ میں دن رات ایک کر دیں۔ اس سے پرتگالی حاکموں کے شعور کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے عیسائی کیتھولک مذہب کی تبلیغ اور نشر واشاعت کو اپنی حکومت کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ہر گرجا گھر کی تعمیر وتاسیس اور اس کے دوسرے اخراجات باہر سے بھیجتے اور ہر گرجا کو اپنے کلی تسلط کا حق دیتے اور کوشش کرتے کہ ہر گرجا گھر مشرق میں ایک حکومت قائم کرے۔

(بانیکار، آسیا والسیطرۃ الغربیۃ: ص ۱۲۲)

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ 1490ء میں پرتگالیوں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر قدم رکھتے ہی کوچین اور گوا میں اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مختلف یورپی ملکوں سے تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور سرگرم مبلغین منگوائے گئے۔ پاپائے روم کی طرف سے 1539ء میں ایک عیسائی کارکن فرانسس زیور کو، جس نے پیرس میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہایت متعصب کیتھولک عقیدہ کا عیسائی تھا،

Marfat.com

عیسائی مبلغین کے وفد کا سربراہ بنا کر گوا بھیجا گیا۔ اس شخص نے گوا کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی عیسائیوں کے تبلیغی مرکز جانے کے بجائے ننگے پاؤں جذامیوں (کوڑھیوں) کے ہسپتال کا رخ کیا۔ وہاں اس نے مریضوں کے قدم چومے، ان کے زخم دھوئے اور اس طرح ان کے دل میں پہلے اپنا مقام بنا کر انہیں مسیحیت کی بشارت دی۔ مسیحیت کی تبلیغ کا یہ ایک انوکھا طریقہ تھا جو لوگوں کے جذبات کو اپیل کرتا تھا۔ اس طریقہ سے عیسائیت کے فروغ میں بہت کامیابی ہوئی اور اسی طریقہ کو آج تک عیسائی اپنا رہے ہیں اسی لیے انہوں نے جگہ جگہ ہسپتال اور شفا خانے کھولے ہوئے ہیں۔

1542ء میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ مسیحیت کی دعوت کا کام کرنے والوں کی ٹریننگ نہایت ضروری ہے تاکہ دعوت اور تبلیغ کا کام کسی سلیقے سے ہو اور اس کے اثرات بھی جلد ظاہر ہوں۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ''قدیس یونیورسٹی'' کے نام سے گوا میں ایک تربیتی مرکز قائم کیا گیا، اور ایشیاء کے پورے خطے میں عیسائی مبلغین کے لیے یہ ضروری اور لازمی قرار دیا گیا کہ وہ تبلیغ کے لیے جانے سے پہلے اس یونیورسٹی میں ٹریننگ حاصل کریں۔ اس کے علاوہ جاپان اور چین سے لوگوں کو اغوا کر کے یہاں لایا جاتا اور ان کو عیسائی مبلغوں اور مربیوں کی نگرانی میں زبردستی عیسائی بنایا جاتا۔

اگرچہ یہ طریقۂ تبلیغ پہلے سے بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوا، لیکن فرانس زیور اس سے کوئی بہت زیادہ مطمئن نہ تھا۔ اس نے اپنے منصوبے کے مطابق تمام عیسائی مبلغین کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ چین و جاپان کے ادیان و مذاہب اور ان ملکوں کے باشندوں کی عقلی وفکری اور سماجی و معاشی حالات کا گہرا مطالعہ کریں اور ان کی سطح پر اتر کر ان سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کریں۔ ان ملکوں کی زبان سیکھیں اور یہاں کے اطوار و عادات اور رسوم و رواج پر گہری نظر رکھی جائے۔ اس منصوبے نے آگے چل کر عیسائی مبلغین کو خاص فائدہ پہنچایا کیونکہ یہ تبلیغ کا ایک سائنٹیفک طریقہ تھا۔ (برنارولویس، الغرب والشرق الاوسط: ص ۱۴۹)

پرتگالیوں نے 1530ء میں گوا پر قبضہ کیا۔ قبضہ کرتے ہی انہوں نے گوا میں

Marfat.com

اسپین کی طرز پر ایک ایسی عدالت قائم کر دی جو لوگوں کے عقائد و خیالات کی چھان بین کر کے زبردستی ان کو عیسائیت کے دائرے میں داخل کرتی۔ جو لوگ عیسائیت میں داخل ہونے سے انکار کرتے ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا جاتا۔ کسی غیر مسیحی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کوچین اور گوا کے علاقوں میں رہ سکے۔ کم سن بچے اور بچیاں بھی ان کے ظلم وستم سے محفوظ نہ تھیں۔ چنانچہ کم سن بچوں، بچیوں اور یتیم بچوں کو اغوا کر کے عیسائی مراکز میں رکھا جاتا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد انہیں پرتگال کی راجدھانی لشبونہ بھیج دیا جاتا۔ جہاں انہیں باقاعدہ عیسائی بنانے کا کام شروع کر دیا جاتا۔ اور اگر وہ نرم طریقے سے عیسائی نہ ہوتا تو پھر ہر سخت سے سخت طریقہ اُسے عیسائی بنانے کے لیے آزمایا جاتا۔ چنانچہ ان صغیر السن اور یتیم بچوں کو عیسائی بنانے کے لیے بڑے بڑے بھیانک طریقے اختیار کیے گئے۔ (تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد ۲ ص ۱۹۱)

تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ گوا کے صرف ایک علاقہ سے تین سال کے قلیل عرصہ میں چھ ہزار ایسے بچے اغوا کر کے لشبونہ بھیج دیئے گئے جن کی عمر ابھی چودہ سال نہیں ہوئی تھی۔ (صور من الاستعمار: ص ۶۷-۶۹)

ان لوگوں کے سروں میں لوگوں کو عیسائی بنانے کا ایسا بھوت سوار تھا کہ ان کے ہاتھ جو بھی لگتا یہ لوگ اسے عیسائی بنانے کے لیے لشبونہ بھیج دیتے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ممتاز محل کی دو خادماؤں کو اغوا کیا اور کچھ عرصہ پاس رکھنے کے بعد انہیں بھی لشبونہ بھیج دیا گیا۔ (السادتی، تاریخ المسلمین فی شبہ القارہ الہندیہ: جلد ۲ ص ۱۹۱)

ان لوگوں نے بچوں کو اغوا کر کے عیسائی بنانے کی مہم کو بڑا کامیاب سمجھا۔ چنانچہ اس کو مزید کامیاب بنانے کے لیے انہوں نے کچھ عرصہ کے بعد لشبونہ سے مزید فوج گوا اور کوچین اس مقصد کے لیے بھیجی تاکہ دیہاتوں اور شہروں سے بچوں کو زبردستی اغوا کیا جائے۔ اور اگر کسی صورت ان کے اغوا میں ناکامی ہو یا ان کے اغوا میں کوئی مزاحمت ہو تو شہروں اور دیہاتوں کے غریب اور فاقہ کش لوگوں سے ان کے بچے اونے پونے میں خرید لیے جائیں۔ چنانچہ صرف ایک سال یعنی 1548ء میں دس ہزار اور 1560ء میں تیرہ ہزار بانوے ہندوؤں کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا۔ ہر سال اس تعداد میں

کچھ اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ 1578ء تک زبردستی عیسائی بنائے جانے والے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہوگئی۔

1588ء میں ایک نو مسیحی پر سورام جوشی عیسائیت کی تعلیم لینے کے بعد پادری کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اس کے بعد مزید نو ہزار چار سو ہندو پنڈتوں کو عیسائی بنا کر تبلیغ کے لیے چین اور جاپان بھیجا گیا۔

ایک طرف اس زور شور سے عیسائی دعوت کا کام جاری تھا اور لوگوں کو زبردستی مسیحیت کے حلقہ میں داخل کیا جا رہا تھا، لیکن ان سب باتوں کے باوجود پرتگالیوں کو اس بات کا احساس تھا کہ انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو رہی، خصوصاً برہمنوں نے ابھی تک معقول تعداد میں عیسائیت کو قبول نہیں کیا ہے، اور اگر یہ برہمن لوگ دین مسیحی کو قبول کرلیں تو تمام ہندو ہمارے دین کو قبول کرلیں گے۔ (لکان جمیع الوثنین قد اعتنقوا ادیننا) چنانچہ پرتگالیوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے فوج کا سہارا لیا جس نے مندروں پر دھاوا بول کر ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ہندوؤں کو مجبور کر دیا کہ وہ دین مسیحیت کو قبول کرلیں۔ (صور من الاستعمار: ص ٦٩)

جب لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانے کے جنون میں اور جوش پیدا ہوا تو پرتگالیوں نے مختلف احکامات اور قوانین کے ذریعہ اپنی مقبوضات کو غیر عیسائیوں کے وجود سے یک قلم بے دخل کر دیا۔ مثال کے طور پر 1559ء میں یہ فرمان جاری ہوا کہ تمام پرتگالی مقبوضہ علاقوں میں طبی خدمات صرف عیسائی ہی سرانجام دیں گے۔ ایک دوسرے سرکلر کے ذریعہ صرف عیسائیوں ہی کو سرکاری عہدہ کا اہل قرار دیا گیا۔ ایک اور فرمان شاہی میں یہ کہا گیا کہ جو ہندو بچے یتیم ہو جائیں گے ان کی نگرانی اور تربیت عیسائیوں کے ذمہ ہوگی اور وہی ان کے والی وارث ہوں گے۔

ایک اور سرکلر کے ذریعہ عیسائی پادریوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ گوا کے تمام علاقوں سے غیر عیسائیوں میں سے جس کو چاہیں بے دخل کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر وہ مسیحیت قبول کرلے تو وہ اس قانون سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے یعنی یہ قانون اس پر لاگو نہ ہوگا۔ اسی طرح پادریوں کو اس بات کا بھی پورا پورا اختیار دیا گیا کہ جو شخص مسیحیت قبول نہ کرے اس

Marfat.com

کو زندہ جلا دیا جائے یا اس پر اتنا تشدد کیا جائے کہ وہ اس دنیا ہی سے کوچ کر جائے۔

تاریخ کے رپورٹر کے یہ بتاتے ہیں کہ اس حکم اور تفویض کے مطابق واسکوڈی گاما نے ان سینکڑوں مسلمانوں کو سمندر میں غرق کرا دیا جو حج بیت اللہ کے ارادہ سے جہازوں پر سوار ہو کر حجاز مقدس جانا چاہتے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان پرتگالی عیسائیوں میں اس قدر مذہبی تعصب تھا کہ وہ کسی غیر مسیحی کو زندہ دیکھنا پسند ہی نہیں کرتے تھے، خصوصاً مسلمانوں سے ان کو خاص عداوت تھی، کیونکہ وہ انہیں اپنا براہ راست حریف سمجھتے تھے۔ اسی طرح ایک اور پادری الیڈا کے متعلق کتابوں کے اوراق بتاتے ہیں کہ جو مسلمان خواتین عیسائیت قبول نہیں کرتی تھیں وہ ان کی آنکھیں پھوڑ دیتا تھا۔ ایک اور پادری بوکریک کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مسلمان خواتین کی ناک اور مردوں کے ہاتھ کاٹ کر انھیں زندہ جلا دینے میں لذت محسوس کرتا تھا۔ اس ذلیل پادری نے پرتگالی بادشاہ کو ایک خط میں بڑے فخر سے لکھا کہ

> ''میں نے شہر میں کسی مسلمان کی عمارت قائم و سالم نہیں رہنے دی۔ جو مسلمان بھی میرے ہاتھ لگ جاتے ہیں ان کو زندہ جلا دینے کا حکم دیتا ہوں۔''

یہ پادری (بوکویرک) ان علماء کو بھی زندہ جلا دیتا تھا جو مسلمانوں کو عیسائیت کے قبول نہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اس طرح اس ظالم اور ذلیل شخص کے ہاتھوں سینکڑوں علماء زندہ جلائے گئے، آگ میں بھونے گئے بلکہ ہزاروں خواتین، بچوں اور بوڑھوں تک کو نذر آتش کر دیا گیا۔ یہ سفاکی کی ایک بڑی بھیانک مثال تھی اور عیسائی پادریوں کا مذہب کے پردہ میں ظلم و ستم کا ایک زندہ ثبوت۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صور من الاستعمار: ص ۳۷۔۳۸، السادتی، تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیۃ: جلد ۱ ص ۲۱۱، جلد ۲ ص ۹۷، الموسوعۃ العربیۃ المیسرۃ: ص ۵۹۷)

لوہے کی زنجیریں، بندوقوں کی سنگینیں، جیل خانوں کی کوٹھریاں، عدالتوں کے کٹہرے اور پھانسی کے رسے سب کے سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ غلام اور آقاؤں، مذہبی پیشواؤں اور ان کے زیر دستوں کے درمیان نفرت و تشدد کے بادل اس

تیزی کے ساتھ برسے کہ سارا ملک لہو سے داغدار ہو گیا۔ آسمان و زمین کے درمیان خون بے گناہ کی لکیر کھینچ گئی جس کے دونوں جانب پرتگالی قانون کے نخچیر تڑپتے نظر آتے تھے۔ مذہبی راہنماؤں اور ان کے زیردستوں کے درمیان اعتماد کی ساری گرہیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ رعایا کے گریبان راعی نے نوچ ڈالے اور قانون کے محافظوں نے قانون کے گریبان کی دھجیاں اڑا دیں اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرنے والے اپنے ہاتھوں سے لوگوں کے جان و مال کو ظلم و ستم کے تیشہ سے بیخ و بن سے کاٹنے لگے۔ تاریخ کے اوراق اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے خون کے آنسو روتے ہیں کہ ایک خاص تقریب کے موقع پر جنوبی ہند کے ساحلی شہروں اور دیہاتوں پر بوکریک کی فوجوں نے مسلمانوں کو اچانک حملہ کر کے ایک دن میں چھ ہزار مسلمان مردوں کو اس طرح تہ تیغ کیا کہ گلیاں اور سڑکیں خون میں نہا گئیں۔ خود گوا جیسے شہر کی جامع مسجد میں خواتین، بوڑھوں اور بچوں کو جمع کر کے چاروں طرف سے آگ لگا دی۔ اور یہ سب مسجد میں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ پھر بڑے چاؤ کے ساتھ اور داد حاصل کرنے کے لیے یہ سارا واقعہ پرتگالی بادشاہ کو ایک خط میں لکھا گیا کہ

> ''میں (برکوریک) نے اس کے بعد پورے شہر کو جلا کر راکھ کر دیا اور ہر شخص کی گردن پر تلوار رکھ کر اس گردن کو اس کے جسم سے جدا کر دیا۔ اور جہاں کہیں بھی ہم نے کسی مسلمان کو پایا اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہم نے ایسا کیا کہ چھ ہزار مسلمانوں سے مسجد کو بھر لیا پھر اس کو چاروں طرف سے آگ لگا دی یہاں تک کہ وہ چھ ہزار نفوس جل کر راکھ ہو گئے۔ اور اے میرے آقا (یعنی پرتگالی بادشاہ) یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جو آغاز و انجام کے لحاظ سے بہت اچھا تھا۔'' (صور من الاستعمار: ص ٦٦)

چشم فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ مسلمان مردوں کو زندہ جلا کر ان کی لڑکیوں اور بیویوں کو عیسائی حکام کے حوالے کر دیا جاتا تاکہ وہ ان کو لونڈیاں بنا کر رکھیں۔ پھر ان کی شادی عیسائی مردوں کے ساتھ کر دی جاتی تاکہ ان کا وجود ہی تحلیل ہو کر رہ جائے۔

(صور من الاستعمار۔ ص ٦٦)

Marfat.com

1540ء میں یوحنا سوم نے یہ فرمان جاری کیا کہ گوا اور کوچین کے علاقوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے جو اوقاف یا دینی مراکز ہیں، ان کو زمین بوس کر کے ان کی جگہ گرجا گھر بنائے جائیں اور ان اوقاف کی آمدنی کو مسجد یا مندر پر صرف کرنے کے بجائے گرجا گھروں پر وقف کر دیا جائے۔ نتیجہ یہ کہ ساڑھے تین سو مسجدوں اور مندروں کو پرتگالی فوجوں نے منہدم کر دیا، جہاں بعد میں گرجا گھر تعمیر کیے گئے، چنانچہ سینٹ پال نامی گرجا جو گوا میں واقع ہے وہ ایک مسجد کو گرا کر بنایا گیا۔ علاوہ ازیں مقدسہ کیتھرائن کا گرجا بوکریک پادری نے خود ایک جامع مسجد کو گرا کر بنایا۔ اسی طرح فرانسس ڈی اسیسی کا گرجا بھی ایک مسجد کو گرا کر بنایا گیا۔

(صور من الاستعمار: ص ۶۶، ملاحظہ ہو مقدمۃ السقا لکتاب اظہار الحق: ص ۲۲۔۲۳)

معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ پرتگالیوں کی طرح انگریزوں نے بھی ہندوستان کے مسلمانوں ہی کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ اور ہندومت کے بجائے انہیں اسلام ہی سے زیادہ دشمنی رہی۔ چنانچہ ولیم ہوارڈسل کے ان الفاظ سے انگریزوں کی اسلامی دشمنی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''ہماری مخالفت اور عناد پیروانِ محمدؐ سے کہیں زیادہ شدید ہے بمقابلہ اس اختلاف کے جو ہمارے اور شیوا اور وشنو کے پجاریوں کے درمیان ہے۔ یہ لوگ (مسلمان) ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر ہم ان روایات کو اکھاڑ پھینکتے اور اپنی طاقت اور کوشش سے محمدؐ کی مسجد کو مسمار کر دیتے تو یہ مسیحی عقیدہ اور ہماری برطانوی حکومت کے حق میں یقیناً بڑا اچھا ہوتا۔''

(منقول از ''ذکر وفکر'' ص ۱۶، جون ۱۹۸۸ء، مضمون مولانا حسن مثنیٰ)

انگریزوں کے مسلمانوں پر ظلم وستم اور وحشت و بربریت کے لیے ملاحظہ ہو کفاح المسلمین فی تحریر الہند از عبدالمنعم نمر، نیز از ہبت ریح الایمان لابی الحسن علی الندوی صفحہ ۱۹۴۔۲۰۰۔

پرتگالی وحشت و بربریت اور جبر وتشدد سے انسان تو انسان جانور اور درخت

Marfat.com

تک محفوظ نہ تھے۔ تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ ''1555ء میں کانا کور شہر میں نو ہزاروں مسلمانوں کو قتل کر کے ان کے تمام پالتو جانوروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، نیز ان کے چالیس ہزار درختوں کو کاٹ کر جلا دیا گیا۔'' (صور من الاستعمار: ص ۴۸)

ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر مظلوموں کے دل میں ظالموں کے خلاف نفرت کا لاوا پکنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس نفرت کو نہ پھر بندوقوں کی سنگینیں، جیل خانوں کی کوٹھریاں اور پھانسی کے پھندے ختم کر سکتے ہیں اور نہ ظلم وستم کا کوئی اور حربہ مظلوموں کی نگاہوں کا میل اور دلوں کی کدورت کو کوئی شی ختم نہیں کر سکتی۔ حکومت کا مقصد رعایا پر ظلم وستم نہیں بلکہ ان کے دلوں میں محبت ویگانگت کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ گوا کے پرتگالی حکمرانوں کو بڑی دیر کے بعد احساس ہوا کہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ ان کا رویہ نہایت شرمناک ہے۔ رعایا سلطنت کے باغ کے پودے ہوتی ہے۔ باغبان جب پودوں کی تخم ریزی اور پھر آبیاری کرتا ہے تو ان کے جوان ہونے تک لیل ونہار کی محنت اُسے مجبور کرتی ہے کہ وہ روز وشب کی ستم ظریفیوں سے انہیں محفوظ رکھے۔ موسم کے نشیب وفراز بھی پھول آنے تک سدراہ ہوتے ہیں باغبان کی تمنائیں موسم سے بھی دست وگریبان ہوتی ہیں، لیکن یہاں تو معاملہ بالکل الٹا تھا۔ باغبان تبر ظلم سے گلستان کے ہر نخل کو بیخ و بن سے کاٹ رہا تھا۔ رعایا ملک چھوڑ کر بھاگ رہی تھی اور جو بھاگ نہ سکے وہ وحشت و بربریت کی نذر ہو گئے۔

ان سب چیزوں کو بعض با اختیار انتظامیہ کے لوگوں نے محسوس کیا اور انہیں اس بات کا شدید احساس ہوا کہ لوگوں کو عیسائی بنانے کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا ہوا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ رعایا کے قلب ونظر پر اس کے اثرات الٹے پڑ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے لشبونہ (لزبن) کے حکام کو اس بارے میں لکھا کہ لوگوں کو مسیحیت کی دعوت کے لیے جبر وتشدد کے یہ جو طریقے اختیار کیے گئے ہیں ان کو ختم کیا جائے اور شفقت و محبت کی نیو پر دعوت کی عمارت کو کھڑا کیا جائے۔ لیکن لشبونہ کے حکمرانوں کے دل ودماغ پر خون سوار تھا۔ انہوں نے ان سفارشات کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور ظلم وستم کے وہ تمام حربے جاری رکھنے کی ہدایت دی جو کئی سالوں سے رعایا کا مقدر بن چکے تھے۔ اور جن

Marfat.com

حکمرانوں نے خزاں سے بہار چھین کر گل وگل چین کے رشتہ کی نیو اٹھانے کی کوشش کی تھی، انہیں سوائے مایوسی کے اور کچھ نہ ملا، لہٰذا حالات میں کوئی سدھار پیدا نہ ہوا۔ غیر ملکی حکمران غلام رعایا کے ساتھ باہم دست و گریبان رہے، آدمی کے لہو سے آدمیت کی ذلت چمکنے لگی، دلوں کے انگارے بدبو دینے لگے اور خار مغیلاں بھی خون انسانی سے لالہ وگل کی رنگت حاصل کرنے لگے۔

انگریزی استعمار اور فروغ عیسائیت:

یہ تو پرتگالیوں کی داستان ظلم کی چند جھلکیاں تھیں۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ داستان ظلم بھی اس سے کوئی مختلف نہیں۔ انگریزوں کے ہندوستان میں وارد ہونے پر اگرچہ بہت سے غدارانِ وطن نے ان کا ساتھ دیا، لیکن جب قفس کی تیلیاں ٹوٹیں تو بہار ان سے روٹھ چکی تھی اور شبنم کے آنسو ہچکیاں لے رہے تھے، بادنسیم موت کی مضراب لے کر ان کے استقبال کو آئی۔ اور ان لوگوں نے غیر ملکی حکمرانوں کا ساتھ دے کر غیر معینہ وقت تک کے لیے اہل وطن کو غلامی کے لیے پابند سلاسل کر دیا۔

پرتگالیوں نے یورپ میں ہندوستان کی زرخیزی وشادابی اور خوشحالی کا زبردست پروپیگنڈہ کیا تھا جس کی وجہ سے کئی ملکوں اور کئی لوگوں کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ پرتگالیوں نے یہ خوشخبری بھی عیسائی دنیا کو دی تھی کہ وہاں عیسائیت کے فروغ اور اس کی نشر واشاعت کے سنہرے مواقع ہیں۔ ان خبروں کے سننے کے بعد یورپی قزاقوں نے بڑی تعداد میں ہندوستان کا رخ کیا تاکہ اس سونے کی چڑیا پر جلد از جلد قبضہ کر سکیں۔ سترھویں صدی میں فرنچ اور ولندیزی تاجروں نے سورت اور گجرات میں اپنے تجارتی مراکز قائم کر دیے۔ ان کی تجارتی سرگرمیاں اس حد تک بڑھ گئیں کہ انہوں نے مالابار کے ساحل پر واقع تمام پرتگالی مراکز پر قبضہ کر لیا۔ اس سے قبل فرانسیسیوں نے ان مراکز پر قبضہ کیا تھا، لیکن آخر میں انگریزوں نے پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور ولندیزوں سب کا پتہ ہندوستان سے کاٹ دیا اور خود بلاشرکت غیرے پورے ہندوستان کے مالک بن گئے۔ (الساداتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیۃ: جلد۲ص ۱۸۱، حضارات الہند: ص۲۴۰، محنۃ فی الفردوس لنور الدین داؤد: ص۲۳)

سب سے پہلا انگریز جس نے سرزمین پاک و ہند پر قدم رکھا تھا، وہ پادری تھامس سٹیفنز (Thomas Stephenes) تھا جو 1579ء میں گوا آیا تھا۔ تین اور انگریز ہندوستان آئے اور انہوں نے 1599ء میں شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں ہندوستان کے تعاون و اشتراک سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔ 1601ء میں ملکہ الزبتھ اول نے یہ فرمان جاری کیا کہ ''لندنی تاجروں کی کمپنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ معاملہ کرے گی۔'' اس کمپنی کو یہ حق دیا گیا کہ وہ جس غیر مسیحی کے ساتھ چاہے صلح یا جنگ کرے۔

(نور الدین داؤد، محنۃ فی الفردوس: ص ۱۸۶)

1608ء میں مسٹر ولیم ہاکنز برطانوی سفیر بن کر ہندوستان آیا۔ اس نے برطانوی سفیر کی حیثیت سے انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کا ایک خط شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا۔ اس خط میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ ہندوستان میں انگریزوں کو تجارتی سہولتیں مہیا کی جائیں، لیکن شہنشاہ جہانگیر نے اس کی یہ درخواست مسترد کر دی۔ بعد میں مسٹر تھامس رو 1612ء میں انگلستان کے بادشاہ کا پیغام دوبارہ لے کر آئے تو انہیں یہاں فیکٹریاں لگانے اور تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ سب سے پہلی تجارتی فیکٹری 1612ء میں سورت میں قائم کی گئی۔ اس کے بعد ان کے کارخانے اور فیکٹریاں پورے ہندوستان میں پھیلتی گئیں اور غدر و خیانت اور مکر و خباثت سے انگریزوں نے سارے ہندوستان پر اپنے قدم جما لیے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہو گیا۔ بنگال اور بعض دوسرے ساحلی علاقوں میں انہوں نے بڑی فیکٹریاں اور تجارتی مراکز قائم کر لیے۔

انگریز لوگوں نے سیاست یہ کی کہ جس جگہ بھی یہ رہے انہوں نے رہائش کے لیے مخصوص جگہ کا انتخاب کیا۔ اس طرح تجارتی قافلوں اور کاروبار کی حفاظت کا بہانہ بنا کر انہوں نے اپنی مخصوص فوج بھی تیار کر لی۔ مغل فوجیوں اور حکام نے اپنی دور نا اندیشی کی وجہ سے انگریزوں کی اس فوجی تیاری کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ یہ لوگ تجارت پیشہ ہیں اور مغلیہ خاندان کی ایک طاقتور اور مستحکم حکومت کے لیے یہ کسی طرح خطرہ نہیں بن سکتے۔ اس کو اس بات سے بھی تقویت ملی کہ ابتدائی مراحل میں انگریزوں اور مغل فوجوں کے مابین

Marfat.com

ایک معرکہ ہوا جس میں انگریزی فوجوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مغل حکام اس چھوٹے سے واقعہ سے انگریزوں کے خطرات سے اپنے کو بالکل محفوظ سمجھنے لگے، لیکن اس کے برعکس انگریزوں نے اپنے ان فوجیوں کی ناکامی سے یہ سبق سیکھا کہ انہوں نے اپنے کو طاقتور بنانا شروع کر دیا تا کہ آئندہ کے معرکوں میں ان کی فوج کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں عیسائیوں کی تعداد بہت کم تھی اور عیسائی مبلغین نے بھی اپنا کام شروع نہیں کیا تھا، اس لیے انگریزوں کے ساتھ بدگمانی کے بجائے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی کمپنیوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ مدغم کر دیں، لیکن انگریزوں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس وجہ سے سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ ہوگلی اور دوسرے علاقوں میں انگریزوں کے مضبوط ٹھکانوں کو تباہ و برباد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ انگریزوں نے بادشاہ سے اپنی غلطی کی معذرت چاہی، چنانچہ اورنگ زیب عالمگیر نے انہیں معاف کر دیا اور انہیں دوبارہ اپنے کارخانوں، فیکٹریوں اور کمپنیوں کے قیام کی اجازت مل گئی۔ جس کے بعد ہی کلکتہ شہر کی داغ بیل پڑی۔

(تشریح جثۃ الاستعمار: ص ۲۱۲، نشأۃ پاکستان: ص ۳۰، تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد ۲ ص ۱۸۱، ص ۱۸۴، ص ۲۳۵، ص ۲۴۸، حقائق عن پاکستان: ص ۲۷)

انگریزوں نے مسلمانوں کی قوت و شوکت کا اندازہ کر کے دو باتوں کو اپنی گرہ میں باندھ لیا تھا:

1- کل ہند پیمانے پر تجارتی سرگرمیوں کی وسیع تنظیم و ترتیب ضروری ہے تا کہ برطانوی مفادات کا تحفظ ہو سکے، لیکن اس کے ساتھ خود اس ملک کی تجارتی سرگرمیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا ضروری ہے۔

2- اس کا پورا اہتمام کیا جائے اور مظاہرہ بھی کہ انگریزوں کو ہندوستان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے کوئی مطلب نہیں تا کہ اس بہانے پورے ملک میں قدم مضبوط کیے جائیں۔ اسی طرح ساحلی علاقوں کو اپنے تصرف میں کر کے باہر سے ایسے جدید ترین اسلحے درآمد کیے جائیں جو مغل

Marfat.com

فوجوں کے پاس نہیں ہیں۔

انگریزوں نے ان دو اصولوں پر عمل کر کے پورے ملک میں اپنے قدم جما لیے۔ انہوں نے نوابوں، صوبائی اور مرکزی حکام کے درمیان غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کر کے اس ملک کے شیرازے کو پراگندہ کر کے رکھ دیا۔

(الساداتی، تاریخ المسلمین فی شبہ القارة الہندیة: جلد ۲ص ۲۴۸)

انگریزوں سے پہلے پرتگالیوں نے تجارتی کمپنیوں کی اوٹ میں دعوتی جدوجہد شروع کی تھی، لیکن انہوں نے اس میں بہت غلطیاں کی تھیں۔ انگریزوں نے پرتگالیوں کی دعوتی جدوجہد اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کا بڑا اہتمام کیا کہ اپنی تجارتی کمپنیوں کو صرف تجارتی مقاصد کے فروغ میں مصروف کر دیا اور عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کی سرگرمیوں سے اُن کو دور رکھا۔ ظاہری طور پر تو ان دونوں شعبوں کو الگ الگ رکھا لیکن خفیہ طور پر عیسائی مبلغین کی ان تجارتی کمپنیوں نے بھرپور مدد کی اور اسی کے ساتھ ان مبلغین کو ہدایت کی کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے کمپنی کے مفادات کو نقصان پہنچے یا ہندوستانیوں کو دینی حیثیت سے انگریزوں کے خلاف فتنہ وفساد کا موقع فراہم ہو۔ جنگ آزادی 1857ء تک اسی پالیسی پر عمل ہوتا رہا، لیکن جوں جوں انگریز کمپنیوں کی طاقت اور اثر ونفوذ میں اضافہ ہوتا گیا، انگریزوں کی پالیسی میں تبدیلی آتی گئی اور عیسائی مبلغین کو بھی آہستہ آہستہ ڈھیل دی جاتی رہی۔ ڈھیل دینے اور پالیسی میں تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد پورا ہندوستان انگریزوں کا محکوم ہو گیا اور غلامی میں صرف آزادی ہی سلب نہیں ہوئی بلکہ عقل انسانی بھی اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور مذہب کی پاکیزگی غلامی کے گناہوں سے آلودہ ہو کر اپنا دامن داغدار کر لیتی ہے۔ غلام قوم اپنا وقار کھو چکتی ہے، حکمران قوم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور نسیم سحر گاہی کا ہر جھونکا بادِ سموم بن جاتا ہے اور چمن کا ایک ایک پتا صیاد کا معاون بن کر لالہ وگل کی پتیاں بکھیرنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے غلام قوم سے حکمران قوم کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اس لیے انگریزوں نے اب اپنی پالیسیاں تبدیل کر دیں اور یہ ہدایات جاری کی گئیں کہ اب دعوتی جدوجہد ان علاقوں میں انجام

Marfat.com

دی جائیں جہاں غیر مسلموں کی آبادی ہے۔ مسلم آبادی میں تبلیغی کام قطعاً نہ کیا جائے کیونکہ مسلمان حکمران قوم سے انگریزوں نے حکومت چھینی تھی، لہٰذا ابھی تک انگریز کی سیاسی قوت شامہ مسلمان قوم سے باوجود اس کے محکوم ہونے کے مزاحمت کی بوسونگھ رہی تھی۔

انگریز نے اپنی اس پالیسی کے تحت نہایت خاموشی سے پورے ملک میں گرجا گھر، تعلیمی ادارے، ہسپتال اور شفاخانے بڑی تعداد میں قائم کر دیئے۔ 1792ء، 1795ء اور 1799ء میں مختلف ناموں سے عیسائی تبلیغ کی انجمنیں قائم کی گئیں۔ اس کے بعد ہی یورپ، امریکہ، جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں سے عیسائی مشنریز نے ہندوستان پر یورش کر دی، لیکن ان سب کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ کن لوگوں سے کام کا آغاز کیا جائے۔ آیا عام لوگوں میں تبلیغ کی جائے یا روشن خیال، مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کو عیسائیت کی دعوت دی جائے۔

کئی ماہ تک اس سوال پر غور وخوض ہوتا رہا۔ بہت سے عیسائی دانشور اور مبلغ سر جوڑ کر بیٹھے۔ آخر میں اس بات کا فیصلہ ہوا کہ کم سن بچوں کو خرید کر یا زبردستی اغوا کر کے انہیں عیسائی بنانا زیادہ مفید ہے، لیکن لارڈ منٹو (Minto) کو یہ منصوبہ پسند نہ آیا۔ کمپنی کے عیسائی مبلغین اور برطانوی حکومت لارڈ منٹو کے ان خیالات سے متفق نہ ہو سکی۔ البتہ اس نے عیسائی مبلغین کو متنبہ کر دیا کہ اصل خطرہ کیتھولک مبلغین سے ہے جو کمپنی کے تابع نہیں ہیں۔ اس لیے اس بات کا انتہائی اندیشہ ہے کہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک مبلغین کے درمیان مسابقت کا جذبہ ہندوستانیوں کے دینی جذبے کو ٹھیس پہنچا دے، لہٰذا کمپنی کے مبلغین کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ کیتھولک مبلغین کی دعوتی جدوجہد کو حدود میں رکھیں اور پروٹسٹنٹ مبلغین کی ہر طرح مالی اعانت اور سرپرستی کریں۔ چنانچہ اس طریقے سے کیتھولک مبلغین کی سرگرمیاں کم ہو گئیں اور ساتھ ہی یورپ اور امریکہ سے آنے والی مالی امداد بھی کم ہو گئی۔

اب پروٹسنٹ مبلغین کے سامنے میدان بالکل صاف تھا۔ کمپنی کا اپنا عقیدہ بھی چونکہ پروٹسنٹ تھا، لہٰذا کمپنی نے ان کی کھل کر سرپرستی کی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان عیسائی دعوت کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ اسلامی عقائد، شخصیات، تاریخ و

Marfat.com

تہذیب کے ساتھ قرآن مجید اور رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس کو شکوک و شبہات کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ جدوجہد زیادہ دیہی علاقوں کے سادہ دل مسلمانوں میں مرکوز رکھی گئی تاکہ ان کے اسلامی عقائد متزلزل ہو جائیں اور وہ آسانی سے عیسائیوں کے جال میں پھنس جائیں۔ شہری علاقوں میں اس دعوتی جدوجہد میں ابھی خطرہ محسوس ہو رہا تھا، چنانچہ وہاں اس پر اتنا زور نہ دیا گیا۔

شروع شروع میں عیسائی مشنریز کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی زبردست تائید اور حمایت حاصل رہی۔ 1857ء کے انقلاب کے بعد حکومت نے سرکاری سطح پر یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انگریز حاکم فوجیوں اور سرکاری عہدیداروں کو گاہے گاہے یہ حکم دیتے رہتے تھے کہ عیسائی مشنریز کی تائید وحمایت جاری رکھی جائے۔

لارڈ منٹو کے عہد حکومت میں عیسائی مشنریز کے خلاف فساد میں تیس انگریز مارے گئے۔ اس پر حکومت برطانیہ نے عیسائی مشنریز کی جدوجہد اور سرگرمیوں کو مزید تیز تیز کرنے اور ان میں تنظیم پیدا کرنے کے لیے یہ حکم جاری کیا کہ ہندوستان تبلیغ کے لیے وہی مبلغ جا سکتا ہے جس کے پاس حکومت کا آرڈر ہو۔ حکومت نے اس مقصد کے لیے ایک بڑے پادری کو متعین بھی کر دیا تاکہ وہ تبلیغی سرگرمیوں میں مشورہ دے سکے۔

اب چونکہ پورے ہندوستان پر انگریز کا سیاسی اقتدار تھا لہٰذا اس کی دلی خواہش تھی کہ اب اندلس کی طرح یہ خطہ بھی عیسائیت کی اکثریت والا علاقہ ہو جائے۔ ہندوستان کی سرزمین میں انہیں اندلس سے زیادہ چارم (Charm) نظر آتے، لہٰذا وائسرائے ہند لارڈ کیننگ نے اس بات کا عہد کیا کہ تین سال کے اندر پورے ہندوستان کو عیسائی اکثریت میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ادھر انگلستان میں ایک برطانوی ممبر پارلیمنٹ نے 1857ء میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ ''آج سے پورا ہندوستان انگریزوں کے زیر نگیں ہے۔ اب پورے ملک میں سیدنا مسیح (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کا پرچم لہرایا جائے گا۔ اب ہم تمام عیسائیوں کا یہ بنیادی فریضہ ہے کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔'' ایک اور رپورٹ میں اس بات کا اشارہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے عیسائی مبلغین بڑے امن وسکون سے اپنے

Marfat.com

فرائض انجام دے رہے ہیں اس لیے کہ حکومت برطانیہ کی سرپرستی اور حمایت میں وہ یہ کام انجام دے رہے ہیں۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ دولۃ الاباطرۃ المغول الاسلامیۃ: ص۱۶۲، نورالدین داؤد، محنۃ فی الفردوس: ص ۱۸۶، عبدالمنعم النمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص۴۰۴، الساداتی، تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد۲ ص ۲۷۱، ص ۲۸۱، انور الجندی، العالم الاسلامی والاستعمار: ص ۱۵۳، عبدالعزیز نوار، الشعوب الاسلامیہ: ص ۵۴۸۔۵۵۵، عبداللہ حسین، المسألۃ الہندیۃ: ص ۲۰۵۔۲۰۷ وغیرہم)

Marfat.com

عیسائیت کی یلغار

صلیبی جنگوں میں ناکامی کے بعد مسیحی دنیا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انتقام لینے کے لیے جو منصوبہ بندی کی تھی، اس کا کرتا دھرتا اسپینی پادری رمون للّی (Reymun Lilly) تھا۔ جس نے اسپین میں مسلمانوں کو نہ صرف تباہ کرنے بلکہ ان کے وجود ہی کو تحلیل کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ریمون للّی نے پاپائے روم کے سامنے جو منصوبہ پیش کیا اس میں گرجا گھروں سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ تعلیمی اور ثقافتی مراکز کو عیسائی دعوت کی نشرواشاعت اور تبلیغ کے لیے استعمال کیا جائے۔ اگر تعلیم و تربیت کے تمام وسائل استعمال کرنے کے بعد بھی مسلمان عیسائی نہ بنیں تو یہ جبر و اکراہ یعنی جس طریقے سے بھی ہو سکے انہیں عیسائی بنایا جائے۔

یہ منصوبہ عیسائی مبلغین کے ذہنوں پر ایک عرصہ تک چھایا رہا۔ بالآخر پادری گریگورس شانزدہم نے 1831ء میں تعلیمی مشنریز کی تشکیل کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ پھر 1881ء میں پادری لیون نے عیسائی مبلغین کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ہر قسم کی علمی سندیں حاصل کر سکتے ہیں تاکہ مسیحی عقائد کی ترویج و اشاعت کا کام وسیع پیمانہ پر کر سکیں۔ اس کے بعد تجربات سے اس بات پر تمام مبلغین کا تقریباً اتفاق ہو گیا کہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ ذہین مسلمان نوجوانوں کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اور شہروں اور دیہاتوں میں نہایت آسانی، آزادی اور بڑے اطمینان کے ساتھ یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تعلیم و تربیت کے ادارے قائم کیے گئے۔

Marfat.com

1900ء میں سرزمین پاک و ہند میں عیسائی مشنریز کے زیرِ انتظام چلنے والے تعلیمی اداروں کی تعداد ایک ہزار تھی جب کہ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء اور طالبات کی تعداد 65 ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ آگرہ، اودھ، الٰہ آباد، حیدرآباد اور مدراس میں ایسے معیاری تعلیمی ادارے تھے جہاں عیسائی مبلغین کو مسلمانوں کے درمیان دینِ مسیحی کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔

عیسائیت کو تعلیمی اداروں کے علاوہ ہسپتالوں کے ذریعہ لانے کی بھی کوشش کی گئی، کیونکہ دانشوروں نے اس طریقے کو بڑا مؤثر بتایا۔ اس طریقے سے مریض اور اس کے گھر والوں کے جذبات سے کھیلا جاتا ہے۔ اس سے قبل فرانس زیور بھی اس طریقے کے مؤثر ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کر چکا تھا۔ چنانچہ اب حکومت برطانیہ نے ان تعلیمی اداروں کے پہلو بہ پہلو عیسائی مشنریز کے زیرِ انتظام ہسپتال اور شفاخانے بھی قائم کیے۔ ان سب کا مجموعی بجٹ بیس لاکھ ڈالر سالانہ تھا۔ ان مسیحی ہسپتالوں میں کام کرنے والی نرسوں کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ سال میں کم از کم چھ ہزار خاندانوں سے ذاتی ربط پیدا کریں، خصوصی طور پر خواتین کو مختلف عیسائی تقریبات میں مدعو کر کے ان کے ذہنوں کو عیسائیت کے لیے ہموار کریں۔ سالانہ تیس ہزار خواتین کے مفت علاج کی سہولت بھی ان ہسپتالوں میں مہیا کی گئی تھی۔

انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے اور نئے نصاب تعلیم کے نافذ ہونے کے بعد انگریزی حکومت کو ایسے افراد ملنے شروع ہو گئے جو ذہن و فکر اور ذوق و مزاج کے اعتبار سے نیم انگریز تھے۔ جو دین اور اخلاقی قدروں کا مذاق اڑانے کو فیشن سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کے ذریعہ اسلامی عقائد اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو بے اعتبار ثابت کرنے کی ایک خاص مہم چلائی گئی تاکہ اسلامی عقائد کی عمارت میں دراڑیں بھی پڑ جائیں اور ہم پر کوئی حرف بھی نہ آئے۔ چنانچہ یہ مہم بڑی کامیاب رہی۔ ایک پادری نے ایک خط میں لکھا ہے کہ

> ”ہم ہندوستان اس لیے نہیں آئے کہ یہاں کے باشندوں کے ساتھ کوئی بھلائی کریں بلکہ ہم نے ان پر ایسا تعلیمی نظام مسلط کر دیا

Marfat.com

ہے جو رفتہ رفتہ ان کی دینی اور اخلاقی قدروں کو ختم کر کے زوال کے آخری درجہ تک انھیں پہنچا دے گا۔“

یہ تعلیمی ادارے اور مشنری اسکول حکومت نے اس لیے کھولے تھے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں ایک ایسا نظام تعلیم ٹھونس دیا جائے جس کو پڑھ کر لوگ دیکھنے میں تو مسلمان لگیں لیکن ذہنی طور پر انگریز ہو جائیں، ان کو چلانے کے لیے انگریزی حکومت نے اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا تھا بلکہ مسلمانوں کے مدارس اور مساجد کے اوقاف کو بحق سرکار ضبط کر کے ان کی ساری آمدنی بلکہ ان اوقاف کی عمارتوں کو بھی عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کے لیے وقف کر دیا، گویا ہمارے ہی جوتے اور ہمارا ہی سر۔ علاوہ ازیں جو مسلمان امراء اور نواب اسلامی مدارس کی امداد واعانت کرتے، ان کو سخت دھمکیاں دی جاتیں۔ بسا اوقات معمولی غلطیوں کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کو بند کر دیا جاتا۔ اس طرح بڑی تعداد میں مسلمان اپنے تعلیمی مراکز سے محروم ہو گئے۔ یہ بھی ایک طریقہ تھا مسلمانوں کو اسلامی تعلیم سے دور رکھنے اور انگریزی تعلیم سے نزدیک لانے کا۔ پھر اس سے انگریزوں کو یہ فائدہ بھی ہوا کہ اسلامی تعلیمی مراکز بند کرنے یا بند ہونے سے نہ صرف موجودہ نسل اسلامی تعلیم سے محروم ہو گئی بلکہ آئندہ مسلمان نسلیں بھی اسلامی تعلیم سے یک قلم دور چلی گئیں۔

مولانا رحمت اللہؒ کے دور میں عیسائیت کی سرگرمیاں:

حضرت مولانا رحمت اللہؒ کا زمانہ جنگ آزادی کے قریب کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں انگریزی حکومت ہر وہ پالیسی اختیار کر رہی تھی یا کیے ہوئے تھی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس زمانہ میں انگریز اپنی سیاسی بالادستی کے ساتھ ساتھ اپنا فکری اور تہذیبی اثر ورسوخ پیدا کرنے کے لیے بہت سے حربے استعمال کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی اور دینی زبانوں کو ختم کر دیا جائے اور ان کی جگہ انگریزی زبان کو رواج دیا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر انگریزوں نے ملک میں بہت سے اسکول اور کالج قائم کیے، کیونکہ سیاسی دباؤ کو مستحکم کرنے کے ساتھ مسیحیت کی

Marfat.com

تبلیغ واشاعت میں اس سے بڑے فوائد حاصل ہوسکتے تھے۔

کسی قوم کی زبان اس کے افکار، فلسفۂ حیات اور تاریخی وثقافتی اقدار کا آئینہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ اس کی روایات، نفسیات اور اجتماعی خصوصیات کا عکس اور نقش دیکھا جاسکتا ہے۔ کسی قوم کا تعلق اپنے ماضی اور علمی، فکری اور دینی سرمایہ سے منقطع کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہوسکتی ہے کہ زبان کو یا صرف اس کے رسم الخط کو بدل دیا جائے۔ ماضیٔ قریب میں آپ کو ایشیاء میں ایسی مثالیں مل جائیں گی جو اس دعویٰ کی صداقت کی شاہد عدل ہیں۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو حق تعالیٰ شانہ نے بڑی ایمانی بصیرت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ انگریزوں نے اسی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں کوشش کی ہے کہ مشنری اور سامراجی لائحہ عمل کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ اپنے اسلامی تمدن اور تہذیبی اقدار سے کاٹ دیا جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ مغربی افکار اور مسیحیت کے لیے لقمۂ تر بن سکیں۔

فرانس پادری A.Le Chatlier نے اپنی کتاب La Conquet du Moude Muslum میں اس زمانہ کی مشنری سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس حکمت عملی سے مشنریاں اس وقت عالم اسلام میں سرگرم عمل تھیں۔ یہ کتاب فرانس سے شائع ہونے والے مجلّہ La Conquet du Moude Muslum کا ایک خاص نمبر ہے۔ یہ ایک مشنری پرچہ تھا اور اس کا مقصد اسلامی ممالک میں پروٹسٹنٹ مشنری کے خوابیدہ عزائم کو بیدار کرنے کے لیے پچاس سال قبل یہ پرچہ نکلتا تھا شاتلیہ نامی شخص اس وقت اس کا مدیر تھا۔ اس شمارہ میں شامل طویل مقدمہ اسی کے قلم سے ہے۔ مصر کے مساعد الیافی اور شیخ محب الدین الخطیب نے اس کا عربی ترجمہ کر کے اپنے مجلّہ 'المؤید' میں شائع کیا تھا جو بعد میں 1305ء میں ''الغارۃ علی العالم الاسلامی'' کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آیا تھا۔

(محمد قطب، ہل نحن المسلمون: ص ۱۴۵)

عیسائی مشنریز کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ اس کتاب میں ان اہم

Marfat.com

مشنری کانفرنسوں کی تجاویز اور قراردادوں کی تفصیلات بھی درج ہیں جو 1906ء میں قاہرہ میں 1910ء میں ایڈنبرا اور 1911ء میں ہندوستان کے شہر لکھنؤ میں منعقد کی گئی تھیں۔ یہ کتاب نہایت معلومات افزا ہے اور اس کو پڑھنے سے مشنریوں کی عجیب و غریب سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے مقدمہ میں شاتلیہ ایک جگہ پر لکھتا ہے:

''اس بات میں ذرا برابر شک نہیں کہ صرف پروٹسٹنٹ اور کیتھولک مشنری کی سرگرمیوں سے اگر ہم چاہیں کہ اہل اسلام کے دل اسلامی عقائد سے خالی ہو جائیں تو یہ بات محالات میں سے ہے۔ اس کی صرف ایک صورت یہ ہے کہ یورپی افکار پھیلائے جائیں۔ انگریزی، جرمن، ولندیزی اور فرانسیسی زبانوں کے پھیلانے سے اسلام یورپ کے پرچوں میں کسی طرح جگہ پا سکتا ہے اور ایک مادی اسلام کے لیے راہ ہموار ہو گی۔ اسی طرح مشنریاں اسلامی دینی عقائد وافکار کو ناپید کرنے میں مصروف عمل رہیں گی جن کے وجود ونمود کی بقاء اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ دنیا سے کٹ کر ہی رہیں۔''

ایک اور موقع پر شاتلیہ لکھتا ہے کہ

''عیسائی مشنریوں کی جدوجہد کا پہلا ثمرہ یہ ہے کہ نوجوان مردوں اور عورتوں کی اگرچہ ایک تھوڑی سی تعداد عیسائی بن سکی ہے، لیکن دوسرا اہم ثمرہ اور نتیجہ یہ ہے کہ ہر طبقہ کے مسلمان بتدریج مسیحی افکار اخذ کرنے کے عادی بنتے جا رہے ہیں۔''

پھر اسی صفحہ پر شاتلیہ لکھتا ہے کہ

''عیسائی مشنریاں اگر یہ دیکھیں کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی جدوجہد کے نتائج سست ہیں تو اس سے ان کو مایوس نہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ اب ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دلوں

Marfat.com

میں یورپ کے علوم وفنون اور آزادئ نسواں کی طرف شدید میلان بڑھتا جارہا ہے۔"[1] (الغارة علی العالم الاسلامی: ص ۴۸)

یہ وہ مسیحی لائحہ عمل تھا جو عیسائی مشنریز نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے بنایا تھا جس کا خلاصہ ہم نے یہاں شاتلیہ کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

جیسا کہ لکھا گیا ہے کہ 1911ء میں ہندوستان کے شہر لکھنؤ میں مشنریوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ شاتلیہ نے اس کے زیرعنوان لکھا ہے کہ اسلامی حکومتوں کے زیر اقتدار رہنے والے مسلمانوں کی تعداد اب 37128800 سے زیادہ نہیں ہے۔ خود مسلمانوں کی اکثریت کے ذریعہ ہی سیاسی اقتدار اسلامی خلافت سے منتقل ہوکر انگلینڈ، فرانس، روس اور ہالینڈ کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ مسلمانوں کی جو تعداد ان ممالک کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہی ہے وہ خلافت اسلامیہ کے تحت رہنے والے مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ پھر مسلمانوں کی جو تعداد مسیحی ممالک کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہی ہے اس میں مستقبل قریب میں آنے والے انقلابات سے ضرور اضافہ ہوگا۔ اس طرح اسلامی ممالک میں مشنری مہم کو سرگرم رکھنے کے سلسلہ میں عیسائی حکمرانوں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ (الغارة علی العالم الاسلامی: ص ۹۴)

قاہرہ اور لکھنؤ میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں جو قرار دادیں اور تجاویز منظور کی گئی تھیں، اس سلسلہ میں شاتلیہ نے یہ لکھا ہے کہ:

۱۔ اسلامی اقدار اور شریعت اسلامیہ کے ارکان سے اپنے آپ کو بری قرار دینا اور اُن پر عمل نہ کرنا یہ بھی گویا عیسائیت کی طرف ایک میلان ہے۔ اور مشنریز یہی چاہتے تھے کہ اگر کوئی شخص مسیحیت کے دائرہ میں داخل نہیں ہے تو نہ ہو اس کی احکام اسلامی سے آزادی بھی ان کے مشن کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ مرے کالج سیالکوٹ کے پرنسپل مسٹر جان گیرٹ سے ایک مرتبہ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کو یہاں اتنا عرصہ ہوگیا، لیکن میرے علم کے مطابق آپ نے ابھی تک کسی مسلمان کو عیسائی نہیں بنایا؟ جان گیرٹ نے جواب دیا اگرچہ میں کسی مسلمان کو عیسائی نہیں بنا سکا لیکن جو مسلمان میرے زیر اثر تھے ان کو مسلمان بھی نہیں رہنے دیا۔

Marfat.com

''ان تمام واقعات سے (یعنی عالم اسلام میں نشأۃ ثانیہ کے آثار سے) کلیسا کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ عزم صمیم اور ثابت قدمی کے ساتھ سرگرم عمل رہے اور مشنری معاملہ کا زیادہ اہتمام کرے۔ اس کی روشنی میں لکھنؤ کانفرنس کے پروگرام میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:

1- حالات حاضرہ کا مطالعہ

2- مشنری تعلیم اور تعلیم نسواں کے دائرہ کی توسیع

3- ضروری حد تک طاقت کے استعمال کی تیاریاں اور اس کے معیار کو بلند کرنے کی تدابیر۔ (الغارۃ علی العالم الاسلامی: ص ۸۸۔۸۹)

یہ اقتباسات اس بات کے اندازے کے لیے کافی ہیں کہ انگریزوں کی لسانی اور تعلیمی پالیسی کے پیچھے کون کون سے عوامل کارفرما تھے، اور وہ اصلاً کس شی کے حصول کی کوشش کررہے تھے۔ اس سیاق وسباق میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کی کامیاب کوششوں کا تاریخ میں صحیح مقام متعین کیا جاسکتا ہے۔

حکومت کی طرف سے عیسائیت کے لیے سرگرمیاں:

جیسا کہ گذشتہ سطور پر ذکر کیا گیا ہے کہ جنگ آزادی 1857ء سے قبل انگریزوں کی پالیسی اور تھی اور جنگ آزادی کے بعد اس سے مختلف۔ چنانچہ حضرت مولانا کیرانویؒ نے اظہار الحق کے پہلے صفحہ ہی پر لکھا ہے کہ

''انگریزوں نے جب ہندوستان پر مکمل قبضہ کرلیا اور صحیح طریقہ سے امن و امان بحال ہوگیا۔ تو اپنی حکومت کے آغاز سے 34 سال تک ان کے علماء نے عیسائی مذہب کی دعوت کی طرف اس قدر دھیان نہ دیا، لیکن اس کے بعد انہوں نے بڑے زور شور سے دعوت کا کام شروع کیا۔ پھر اس کی درجہ بندی کی یہاں تک کہ بے شمار رسائل اور کتابیں مسلمانوں کے ردّ میں شائع کر کے

Marfat.com

مختلف شہروں کے عوام میں تقسیم کیں۔

اہل اسلام کے ردّ میں رسالے اور کتابیں لکھ کر تقسیم کرنے کے علاوہ حکومت کی بنیادوں پر عیسائیت کے فروغ کے لیے جو کام کیا وہ زود اثر بھی تھا اور دیرپا بھی اور اس کے نتائج بھی بڑے دور رس تھے۔ عیسائیت کی نشر واشاعت اور مسلمانوں کو دین اسلام سے دور رکھنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے وہ حسب ذیل تھے:

1۔ انگریزی زبان کی ترویج:

انگریزوں نے جب ہندوستان میں قبضہ کیا اس وقت سرزمین پاک و ہند میں اردو اور فارسی اسلامی زبانیں تھیں اور علماء، مفکرین اور دانشور حضرات کا ذریعۂ اظہار تھیں۔ اس زمانہ کے تمام علوم وفنون کی تدوین ان ہی دو زبانوں میں ہوئی تھی۔ عہد مغلیہ میں اور اس وقت بھی جب خاندان مغلیہ کی حکومت چراغ سحری کی طرح دم آخریں تھی ملک کی سرکاری زبان ہونے کا شرف فارسی کو حاصل تھا اور اردو اگرچہ اپنے ابتدائی ادوار میں تھی، لیکن عوام میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ پھر دین کے علوم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی اس زبان میں تھا۔ اس عہد کے علماء اور مفکرین اسلام نے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے اور بغاوتوں کا سلسلہ جاری کرنے کے لیے ان ہی دو زبانوں کو تقریر وتحریر کا ذریعہ بنایا تھا۔

ان دونوں زبانوں کے علاوہ اس زمانہ میں ایک اور زبان کا بھی کافی چلن تھا۔ اور وہ عربی زبان تھی۔ یہ زبان چونکہ قرآن و حدیث کی زبان ہے، لہٰذا غیر مسلم ہندوستانیوں کے درمیان اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں اس کا کردار معاون رہا ہے۔ عیسائیت کی تبلیغ میں اس سے رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کو قرآن وحدیث سے الگ کر کے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں ایک تعداد ایسے مسلمانوں کی بھی تھی جن کی تقریر وتحریر کا ذریعہ عربی زبان تھی۔

(انوار الجندی، العالم الاسلامی والاستعمار: ص ۳۵۹۔۳۶۳، ساداتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیۃ: جلد۱ص ۲۵، جلد۲ص ۲۲۴۔۲۲۵، المسلمون فی الہند لابی الحسن علی الندوی)

علماء اور اہل علم حضرات اردو اور فارسی کے علاوہ عربی زبان کو بھی اپنا ذریعہ

Marfat.com

اظہار بناتے تھے۔ بڑے بڑے علماء نے عربی زبان میں بڑی کارآمد کتابیں لکھیں جن سے نہ صرف اس زمانہ کے لوگ مستفید ہوئے بلکہ آج تک لوگ ان سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ خود حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے ردعیسائیت پر اپنی کتابیں عربی اور اردو زبانوں میں لکھیں۔

کسی قوم کے افکار اور تہذیب وتمدن کی نشوونما میں اس کی زبان کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ زبان ایک قوم کے جذبات اور افکار کا آئینہ ہوتی ہے۔ چنانچہ جن ماہرین تعلیم کو اندازہ تھا کہ مشرقی اقوام میں یورپی افکار اور تمدن کی اشاعت میں خود یورپی زبان بڑا اہم کردار ادا کرسکتی ہے، انہوں نے انگریزوں کو مشورہ دیا کہ ان اسلامی زبانوں کو ختم کرنے کی مہم چلائی جائے اور انگریزی زبان کو ان کا قائم مقام بنا دیا جائے۔

انگریزوں نے اپنی حکومت کے خیر خواہوں اور ان ماہرین تعلیم کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے عملاً اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری اداروں میں انگریزی کو لازمی زبان قرار دے دیا۔ توریت وانجیل کے مخصوص اور منتخب حصوں کے پڑھنے کے لیے انگریزی زبان کا ناجائز استعمال کیا گیا اور اسلامی زبانوں کی تعلیم وتدریس کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ ان زبانوں کے سیکھنے اور سکھانے والوں کو ملازمت کے بہت سے مواقع سے محروم رکھا گیا، کیونکہ وہ مشنری اسکولوں میں اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے قائل نہ تھے۔

گورنر جنرل ہند لارڈ ولیم بینٹنگ نے انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اپنے مشیر خاص مورخ ماکولی کے مشورہ پر یہ قانون بنایا کہ انگریزی زبان کی تعلیم وتدریس کا اعلیٰ انتظام کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے ملک کے مختلف حصوں میں اس نہج پر چلنے والے اسکول اور کالج قائم کیے۔

(اتول ترجی، الہند الجدیدۃ: ص ۱۳۵، شاتلیہ، الغارۃ علی العالم الاسلامی: ص ۸، نور الدین داؤد، محنۃ فی الفردوس: ص ۱۸۸)

1835ء میں لارڈ میکالے نے ماہر تعلیم ہونے کے ناطے حکومت برطانیہ کو ایک ایسا نظام تعلیم مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو انگریزی حکومت کی مصلحتوں کو ملحوظ خاطر رکھے۔ اور اس بات پر بھی زور دیا کہ مشرقی زبانوں کے بجائے انگریزی زبانوں کو

Marfat.com

ذریعۂ تعلیم قرار دے۔ اس نے کہا کہ ہمیں ایسے لوگ چاہیے جو ہمارے اور ہماری رعیت کے درمیان ترجمان کا کام دیں۔ اور یہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو رنگ و خون کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوں، لیکن ذوق ورائے اور زبان وفکر کے لحاظ سے انگریز ہوں۔

(الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ: ص ۶۷، لابی الحسن علی الندوی)

انگریزوں کی اسلامی زبان سے دشمنی کا دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ ہندوستان کی قدیم زبانوں کے احیاء کی حوصلہ افزائی کی جائے تا کہ ہندوؤں کی تاریخ اور تمدن سامنے آسکے اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ واریت کو ہوا دی جائے۔

انگریزوں نے کلکتہ میں 1800ء میں ''دان جیکرسٹ'' نامی ایک مستشرق کے زیراہتمام فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ اس کے علاوہ انگریزی، لاطینی اور سنسکرت کی تعلیم دینے کے لیے بہت سے کالج کھولے گئے۔ اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ زبان، ثقافت اور تہذیبی روایات کے تضاد کی بنا پر مسلمان اور ہندو طلبہ کے مسائل بہت بڑھ جاتے۔ سنسکرت کو سبھوں کے لیے لازمی کر دیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ اعلان کیا تھا کہ ہندوؤں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اردو زبان کا مطلق سہارا نہ لیں، کیونکہ یہ صرف مسلمانوں کی کتابوں کی زبان ہے، لیکن جہاں تک سنسکرت کا معاملہ ہے تو یہ ہندوستان کی مذہبی امہات کتب کی زبان ہے۔

(المسلمون فی الہند: ص ۱۱۲، لابی الحسن علی الندوی، العالم الاسلامی والاستعمار: ص ۳۶۳_۳۶۵، انور الجندی۔ ساداتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد ۲ ص ۳۲۵)

ماہرین تعلیم نے انگریزوں کو جو تعلیمی پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دیا اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ اس کو بھی ایک انگریز مونیہ ولیمس کی زبان سے سنئے:

''وہ (مسلمان) اپنی زبان کو خیر باد کہتے ہوئے اپنی ادبیات، فلسفہ اور دین کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور ہماری تربیت سے جو انحطاط ہوتا ہے اس کا آخر ہم سے بدلہ لیتے ہیں۔''

(ہسٹری آف ایجوکیشن، میجر بالو: ص ۷۰، الصراع بین الفکرۃ الاسلامیہ والفکرۃ الغربیۃ لابی الحسن علی الحسنی الندوی)

گستاخ لیبان نے مونیہ کے کلام پر حاشیہ چڑھایا ہے کہ:

''اس پر مستزاد وہ زبردست فکری شکوک وشبہات تھے جو خالص مغربی تربیت کی بنا پر ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے تھے، کیونکہ وہ تربیت اخلاق سے عاری ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کے عادات و اطوار میں ان پختہ دینی بنیاوں کا فقدان ہوتا جو ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو گئی تھیں۔''

(حضارات الہند:ص ۶۹۳)

نتائج تو ان مدارس وکلیات کے یہی نکلنے تھے جو نکلے اور آج تک نکل رہے ہیں کیونکہ ان کے قیام کی غرض و غایت ہی مسلمانان پاک و ہند کو دین سے دور لے جانا تھا تا کہ وہ اپنی دینی قومیت اور روحانی اور تاریخی ورثے کو یک قلم فراموش کر کے انگریزی حکومت اور اس کی تہذیب کی مضبوطی کا باعث بنیں۔ یہ مدارس اور کالج ہندوؤں کے فائدے کے لیے بھی نہ تھے، کیونکہ ایک انگریزی ماہر تعلیم نے اس بارے میں کہا تھا کہ

''ہندوؤں کی بھی اتنی ہی تعلیم و تربیت کی جائے جتنا وہ ہماری تجارت اور حکومت کے لیے مفید ہو سکیں۔''

(عبدالمنعم النمر: تاریخ الاسلام فی الہند:ص ۳۹۸، مسعود الندوی: الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند وتطوراتہا:ص ۳۰)

یہ درست ہے کہ انگریزی تعلیم نے نہ تو ہندو کو ہندو رہنے دیا اور نہ مسلمان کو مسلمان، نہ سکھ کو سکھ اور نہ عیسائی کو عیسائی، لیکن اس سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا، کیونکہ دیگر تمام مذاہب کا کوئی پس منظر نہیں جب کہ اسلام کی روحانی اور تاریخی طاقت کا دنیا میں کوئی مدمقابل نہیں۔ یہ سارے مدارس وکلیات مسلمانوں کی قومیت کو نیست و نابود کرنے کے لیے کھولے گئے تھے تا کہ ان کے تاریخی اور روحانی ورثہ کو تباہ و برباد کر کے انگریزی تہذیب وثقافت میں رنگ دیا جائے اور ان کے اجتماعی نظام کو غارت کر کے ان کی اجتماعی قوت کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ چنانچہ اس بات کا اعتراف ایک انگریز ماکولی نے اپنے باپ کے نام ایک خط میں یوں کیا ہے کہ:

Marfat.com

''اس تعلیم نے ہندوستان میں وہ اثر دکھایا ہے کہ انگریزی جاننے والا ایک شخص بھی ہمیں ایسا نہیں ملتا جو انگریزی جاننے کے بعد اپنے دین کی صداقت پر قائم رہا ہو۔''

(عبدالمنعم النمر : تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۴۰۱)

مسٹر ہالسن ایک انگریزی ماہر تعلیم نے ان الفاظ میں اس تعلیم کے اثرات کا اعتراف کیا۔کہا:

''ہم (انگریز قوم) ہندوستان میں ہندوستانیوں کی خیریت اور بہبودی کے لیے نہیں آئے بلکہ ہم نے یہاں مدارس وکلیات میں ایک ایسا نظام تعلیم رائج کر دیا ہے جس کا بتدریج یہ تقاضا ہے کہ وہ ان کی دینی اور اجتماعی زندگی کو خرافات کے طور پر ان کے سامنے پیش کرے اور انسانی حقوق کی پامالی کا باعث بنے۔'' (الامیر یالیہ: ص ۳۰۶، ہوبسون)

مسلم اوقاف پر قبضہ:

مسلمان امراء اور حکام نے مدارس اور مساجد اور دوسرے دینی احکام کے سرانجام دینے کے لیے بڑے بڑے اوقاف قائم کیے ہوئے تھے جن کی آمدنی سے یہ ادارے چلتے تھے۔انگریزوں نے جونہی انگریزی نظام تعلیم کو رائج کیا اور اس کی ترویج کے بڑے بڑے مدارس اور کالج قائم کیے۔ان مدارس وکلیات کو چلانے کے لیے اوقاف پر قبضہ کرلیا، اور اُن کی آمدنی پر بھی قبضہ کرلیا جو ان اوقاف سے حاصل ہوتی تھی اور ان ذرائع آمدنی پر بھی قبضہ کرلیا جن سے مساجد اور مسلمان بچوں کی تعلیم کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔بعض مساجد کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ان میں دہلی کی بھی ایک مسجد شامل تھی جس پر انگریزوں نے 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد قبضہ کرلیا تھا۔وائسرائے ہند نے بعد میں دہلی کے لیے جب ایک خاص پادری کا تقرر کیا تو اس مسجد کو گرجے میں تبدیل کر دیا گیا۔ (مسعود الندوی: المسلمون فی الہند، الافغانی: العروۃ الوثقی: ص ۲۱۳، عبدالمنعم النمر : تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۲۵، عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ: ص ۵۵۶)

Marfat.com

لارڈ ہیسٹنگز نے 1773ء مطابق 1207ھ میں پھر اوقاف کو سرکاری تحویل میں لینے کی طرف توجہ کی لیکن اس کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر 1815ء مطابق 1229ھ میں انگریزی عدالت نے اپنے انگریز جسٹس کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے اوقاف کو چھین لیا جائے، کیونکہ ایسا کرنے سے انگریزی حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ کا اضافہ متوقع تھا۔ بنگال کے صوبہ کے ٹیکس کی آمدنی کی ایک چوتھائی انگریزوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی، کیونکہ مدارس اور مساجد کے اوقاف میں شامل اراضی ٹیکس سے مستثنیٰ تھی اور اوقاف زیادہ تر بنگال ہی میں تھے۔

انگریزی زبان کی ترویج اس وقت تک نہیں ہوسکتی تھی جب تک دینی اور تعلیمی ادارے بند نہ ہوں اور ان کو بند کرنے کا نہایت مؤثر طریقہ صرف یہی تھا کہ جن اوقاف کی آمدنی پر وہ ادارے چل رہے ہیں ان اوقاف پر قبضہ کرلیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اسلامی اوقاف پر قبضہ کرنے سے مسلمان اپنے بہت سے اداروں سے محروم ہو گئے۔ اوقاف کے چھین جانے کے بعد مساجد، بڑے بڑے تالاب، پارک اور دوسری کئی ایک چیزیں بالکل ویران ہوگئیں۔ مساجد یا تو گرجوں میں تبدیل کردی گئیں یا پھر انگریز فوج کی چھاؤنیوں میں۔ انگریزوں کو اس بات کا خود اعتراف ہے کہ انہوں نے مسلمانوں پر عیدین کی نماز ادا کرنے اور دیگر دینی مراسم پر پابندی عائد کردی تھی۔ عیسائی مشنریوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ جمعہ کو سرکاری چھٹی کا دن منسوخ کر کے اتوار کو سرکاری چھٹی کا دن قرار دیا جائے تاکہ کسی حال میں بھی سرکاری اداروں میں ملازمین کو اسلامی آداب اور روایات کے سامنے جھکنا نہ پڑے۔

(شاتلیہ: الغارۃ علی العالم الاسلامی: ص ۴۷، محمود شاکر: پاکستان: ص ۲۶)

ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب The Indian Muslamans میں لکھا ہے

''مسلمان ہم پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ہم نے اُن کو دینی امور کے انجام دینے سے روکا ہے۔ ان کے نزدیک ہمارا یہ سب سے بڑا جرم تھا کہ ہم نے ان اوقاف کو چھین لیا جو مسلمان سربراہوں نے مساجد اور تعلیم کے لیے وقف کیے تھے۔ اور ہم نے ان کا دوسرا

Marfat.com

مصرف نکالا۔ عیدین اور نکاح ورواج کے قواعد وضوابط بدل ڈالے۔"

ہنٹر نے مزید لکھا ہے کہ

"ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانون وراثت کو مسخ کر دیا۔ ان کے دینی شعائر کو مضحکہ بناتے تھے۔ ان کی مساجد کے اوقاف اور سارے صوبے ہمارے قبضہ میں آ گئے۔"

(مسلمانان ہند: ص ۲۰۸، عبدالمنعم النمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۴۰۹)

انگریزوں نے صرف مسلم اوقاف ہی پر قبضہ نہ کیا بلکہ جن علماء نے انگریزوں کے خلاف مہم میں حصہ لیا تھا ان کی ذاتی جائدادوں کو بھی غصب کر لیا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے جب زبان وقلم کے ساتھ ساتھ اپنی فوج کے ہمراہ تیغ وتفنگ سے بھی انگریزوں کے خلاف عملاً جہاد کیا اور بعض لڑائیوں میں انگریزوں کو شکست بھی ہوئی (جیسا کہ آئندہ صفحات میں اس پر بحث ہوگی) تو اس جرم کی پاداش میں انگریزوں نے حضرت مولاناؒ کی تمام جائداد بحق سرکار ضبط کر لی اور بعد میں اپنے چند حاشیہ برداروں بلکہ غدارانِ قوم ووطن کے ہاتھ اونے پونے میں نیلام کر دی۔ لیکن حضرت مولاناؒ نے اپنی جائداد کے اس نیلام کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی۔ اور اپنے موقف اور مشن پر ڈٹے رہے ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

علماء پر سختی:

ہندوستان میں مشنریوں نے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے یلغار کی اور ہر طریقے سے لوگوں کو انگریزی مذہب اور انگریزی تہذیب وتمدن میں رنگنے کی کوشش کی تو مشنریوں کی یلغار اور انگریزی سامراجیت سے ان کی ملی بھگت سے پیدا ہونے والے خطرات علماء کی نظروں سے مستور نہیں رہ سکتے تھے۔ علماء کی بصیرت اور ان کی دوررس نگاہوں نے فوراً اس فتنہ کو بھانپ لیا، اور نہ صرف زبان وقلم سے بلکہ عملاً تیغ وتفنگ سے ان کے خلاف جہاد کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ علماء اگرچہ بے سروسامان تھے۔ نہ قالین ان کے پاؤں تلے تھے اور نہ سونے کا چھتر سر پر تھا، لیکن درویش جب تاج شاہی سے

ٹکراتا ہے تو قباؤں کے پیوند ہی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جنون شوق میں جب دیوانے بادہ پیائی کو نکلتے ہیں تو بادسحر گاہی بادسموم سے ہم آہنگ ہوتی ہے کہ ریت کے ذرات دیوانوں کی پیشوائی نہ کر سکیں، لیکن جن کے سامنے منزل ہوتی ہے وہ آبلہ پائی کے نشانوں پر سفر کرتے ہیں۔ زمانہ کی کوئی رکاوٹ ان کا راستہ نہیں روک سکتی اور نہ وقت کا کوئی فیصلہ ان سے متصادم ہوتا ہے۔

علماء نے بغیر کسی خوف وڈر کے فتویٰ دیا کہ انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کے دوستانہ مراسم، تعاون اور مشنری اسکولوں میں مسلمان بچوں کو بھیجنا ناجائز اور حرام ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کے شدت اہتمام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ مولانا کو معلوم ہوا کہ ان کے ایک قریبی رشتہ دار کے بچہ کو مشن اسکول میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ مولاناؒ اس پر بہت زیادہ پریشان ہوئے اور جب تک اس کو مشن اسکول سے نکلوا نہ لیا چین سے نہ بیٹھے۔ بعد میں یہی بچہ حضرت مولانا کیرانویؒ کی دعوتی اور علمی سرگرمیوں میں مولانا کا دست راست ثابت ہوا۔ تاریخ اب اس کو شیخ محمد سعید کے نام سے یاد کرتی ہے۔

علماء حضرات مسلمانوں کو مساجد کے منبر اور مدارس کے پلیٹ فارم سے خطاب کرتے تھے۔ مسلمانوں کو اس مسئلہ کی سنگینی سے آگاہ کیا جاتا تھا اور سامراجیت کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے سخت مقابلہ کی دعوت دی جاتی تھی۔ انگریزوں سے ٹکر لینے میں پیش پیش وہی علاقے رہے جن میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہوتی تھی۔ عقیدۂ جہاد کے سرچشمہ سے پھوٹنے والی قوت کا مقابلہ کرنے میں انگریزوں کو سخت مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی وجہ سے انگریزوں نے بعد میں مرزا غلام احمد سے نبوت کا دعویٰ کروا کر مسئلہ جہاد کو حرام کروانے کی پوری پوری کوشش کی۔ چنانچہ ولیم ہنٹر نے اعتراف کیا ہے کہ انگریزوں کا اولین اور سخت مقابلہ کرنے والے علاقوں میں سرفہرست ہندوستان کے شمالی اور مغربی حصے آتے ہیں کیونکہ ان ہی علاقوں میں علماء نے سب سے پہلے جہاد کے واجب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ بنگال کے مسلمانوں کا اس کے بعد نمبر آتا ہے۔

(عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ: ص ۵۵۹، عبدالمنعم النمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۴۴۲،۲۴۸)

انگریزوں نے علماء کو بڑی آزمائشوں اور امتحانات میں ڈالا، لیکن علماء بھی بڑے سخت جان نکلے۔ بڑی سختیاں برداشت کیں لیکن اسلام کے دامن کو داغدار نہ ہونے دیا۔ کچھ لوگ سرسید احمد خان جیسے بھی تھے جنہوں نے حکومت وقت سے فائدہ اٹھانے کی خاطر حقیقی اسلام کے دامن تک کو چھوڑ دیا۔ انگریزوں نے جب دیکھا کہ مساجد و مدارس کے اوقاف چھین لینے اور اُن کو برباد کر دینے کے بعد بھی علماء کی دعوتی جدوجہد، اسلامی تعلیمات کی اشاعت، انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو صف آراء کرنے کی دعوت اور نور قرآن سے مستیز ہونے میں کچھ بھی فرق نہیں آیا تو انہوں نے علماء پر عرصۂ حیات مزید تنگ کرنے کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ان کو بدنام کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے اختیار کیے گئے۔ خود مولویوں میں سے ایک گروہ ایسا پیدا کیا گیا جنہوں نے علمائے ربانی پر کفر کے فتوے لگائے اور انہیں عوام میں بدنام کرنے اور عوام کے دلوں میں ان کے بارے میں نفرت پیدا کرنے کے لیے ان پر ''وہابی'' ہونے کے الفاظ استعمال کیے تاکہ ان کی عزت و ناموس کو عوام میں مجروح کر دیا جائے اور لوگ ان کی بات پر عمل نہ کریں اور ہمارے آقا انگریز کو ان سے کوئی گزند نہ پہنچے۔

انگریزوں کی طرف سے علماء کو انگریزوں کی مخالفت سے باز رکھنے کے لیے دردناک سزائیں دی گئیں جن میں کسی قسم کی سماعت کے بغیر قید دائمی، جلا وطنی اور پھانسی جیسی سزائیں بھی شامل تھیں۔ جب کسی عالم دین سے جواب طلب کرنا ہوتا تو عدالت میں اس کو حاضر کیا جاتا۔ کوئی افسر قرآن حکیم اور حدیث کی کوئی کتاب لاتا۔ جہاد کے بارے میں آیات اور احادیث نکالی جاتیں۔ پھر وہ افسر اس عالم دین سے پوچھتا کہ ان آیات اور احادیث کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اگر وہ عالم یہ جواب دیتا کہ یہ سب صحیح اور درست ہیں تو وہ افسر کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے خلاف جہاد کرنے کو واجب اور ضروری سمجھتے ہو۔ اس پر اس عالم دین کا موقف اگر یہ ہوتا کہ میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں۔ ان آیات اور احادیث کی صحت کا عقیدہ صرف اس لیے ہے کہ یہ قرآن اور حدیث میں وارد ہوئی ہیں تو اس کو چار روز کی مہلت دی جاتی۔ اس دوران اگر وہ اپنا موقف بدل لیتا اور کسی اخبار میں اپنے مؤقف کی

Marfat.com

تبدیلی کا اعلان کر دیتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا وگرنہ اُسے تختۂ دار پر چڑھا دیا جاتا یا پھر دائمی جلاء وطنی۔ اس سے کم اس کے لیے کوئی سزا نہ ہوتی تھی۔ اس طریقہ سے لنکا اور انڈیمان کے جزائر ایسے ہی بے گناہ ''مجرم'' علماء سے بھر گئے تھے۔ سی یون نے اپنی کتاب Muhammedanism in India میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

ایک اور انگریز مصنف ''بلنٹ'' نے لکھا ہے کہ

> ''شہرت پانے والے ہر مولوی پر حکومت کی سخت نگاہ ہوتی تھی۔ ہر طرح سے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ اس پر بھی اگر وہ اپنے موقف پر قائم رہتا تو اس کو جزائر انڈیمان جلاء وطن کر دیا جاتا۔''
>
> (مسعود الندوی: تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند، ہامش: ص ۱۸۵، جمال الدین الافغانی: العروۃ الوثقی: ص ۳۲۲، ۴۱۳، ابوالحسن علی الحسنی الندوی: ربانیۃ ولا رہبانیۃ: ص ۱۲۱، نور الدین داؤد: محنۃ الفردوس: ص ۱۸۸)

علماء کے شوق شہادت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ایک بار ایک انگریز جج نے علماء کی ایک جماعت کو پھانسی دینے کا فیصلہ سنایا تو وہ شہادت کے تصور سے بے انتہاء خوش ہوئے۔ انگریز جج کو یہ بات ہرگز پسند نہ تھی کہ اس کا کوئی فیصلہ ان کے لیے مسرور کن ہو۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر اپنا فیصلہ بدل دیا اور کہا:

> اے باغیو! پھانسی تم کو بہت عزیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں تم اس کو شہادت تصور کرتے ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ذریعہ تمہاری کوئی امید برآئے یا ہم تمہارے لیے کسی خوشی اور مسرت کا باعث بنیں۔ لہٰذا ہم پھانسی کے حکم کو فوری طور پر منسوخ کرتے ہیں اور تمہیں جزائر لنکا میں دائمی جلاء وطنی کا فیصلہ سناتے ہیں۔''
>
> (عبد المنعم النمر: کفاح المسلمین فی تحریر الہند: ص ۳۲-۳۴، تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۴۶۶، ابوالحسن علی الندوی: اذا ھبت ریح الایمان: ص ۱۹۴-۲۰۰)

معاون تحریکیں:

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے یا اسلام

کے راستہ سے ہٹانے کے لیے انگریزوں نے جو پلاننگ کی تھی وہ پرتگالیوں کی طرح نہ تھی بلکہ یہ بڑی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تھی اور اس کے پیچھے بڑے بڑے ذہن اور سرد و گرم چشیدہ لوگوں کے تجربے اور مشورے تھے۔ وقفے وقفے کے بعد اس لائحہ عمل کا از سر نو جائزہ لیا جاتا اور جو ترمیم اس میں کرنی ہوتی وہ کی جاتی۔ کامیابی اور ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کیا جاتا اور پھر ان میں مختلف ترامیم بڑے غور و خوض کے بعد تجویز کی جاتیں۔

عیسائی مشنریاں یہ سمجھتی تھیں کہ اگر مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنالیا جائے تو ہمیں اپنی سرگرمیوں میں جلدی کامیابی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ شاتلیہ نے لکھا ہے کہ:

> ''مسلمانوں کے اندر مشنری سرگرمیوں کے بارآور ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود ان ہی میں سے کسی کو آلۂ کار بنایا جائے اور اس کے ذریعہ سے کام کیا جائے کیونکہ کسی درخت کو کاٹنے کے لیے خود اسی کے کسی حصہ کو استعمال کرنا چاہیے۔''

(الغارۃ علی العالم الاسلامی: ص۹۴)

عیسائی مبلغین نے یہ بھی مشورہ دیا کہ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے نتائج اگر کمزور نظر آئیں تو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یورپ سے محبت اور عورتوں کی آزادی کا جذبہ بتدریج (1) ان کے اندر بڑھ رہا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کو ایسے دو افراد مل گئے جن کی جد و جہد سے ان کے بہت سے مقاصد پورے ہوئے۔ یہ دو اشخاص تھے۔

(1) مرزا غلام احمد قادیانی (2) سرسید احمد خان

پیشتر اس کے کہ ہم ان دونوں حضرات کے بارے میں بتائیں کہ ان کا حدود اربعہ کیا تھا اور انہوں نے کس کس طریقہ سے انگریزوں کی خدمت کی۔ ہم یہ بتایا چاہتے ہیں کہ یہ دونوں افراد اور ان کے ساتھ ان کے اور کئی اذناب بڑی جستجو کے بعد تلاش کیے گئے تھے۔

ا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یورپی تہذیب کی محبت اور عورتوں کی آزادی کا جذبہ بھی عیسائیت کی جانب ایک قدم ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے اس رویہ پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

Marfat.com

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب انگریز تمام ہندوستان پر بلا شرکت غیرے قابض ہو گیا تو اس نے ولیم ہنٹر کی سرکردگی میں ایک وفد انگلستان سے سرزمین پاک و ہند بھیجا تاکہ وہ اس بات کا جائزہ لے کہ ہندوستان پر ہمارا قبضہ کس طرح مضبوط (Stable) رہ سکتا ہے، کیونکہ انگریزوں کو مسلمان علماء اور اسلام کے مسئلہ جہاد سے ہر وقت بغاوت کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ یہ وفد ہندوستان آیا اور پورا ایک سال اس نے ہندوستان میں گزارا۔ مختلف لوگوں سے ملاقات کی، ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیا۔ یہاں کے دینی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ ایک سال کی اس جستجو کے بعد اس نے واپس جا کر اپنی رپورٹ ہاؤس آف لارڈز میں پیش کی۔ اس رپورٹ کا نام ہے The Arrival of British Empire in India اس رپورٹ میں اراکین وفد نے بتایا کہ جس طرح آپ لوگوں نے میر جعفر اور میر صادق جیسے سیاسی غدار پیدا کر کے ہندوستان پر قبضہ کیا ہے۔ اب آپ کا قبضہ اسی صورت میں پائیدار رہ سکتا ہے جب کہ آپ اس میں مندرجہ ذیل قسم کے اشخاص پیدا کریں جو مذہبی محاذ پر مسلمانوں سے غداری کریں۔ دوسرے لفظوں میں مذہبی غدار پیدا کریں۔ اور وہ مذہبی غدار اس قسم کے ہوں۔

1- مسلمانوں کا مسئلہ جہاد ہر وقت آپ کی حکومت کے لیے خطرہ بنا رہے گا، کیونکہ جب بھی مسلمانوں کو یہ بتایا جائے گا کہ جہاد کا وقت آ گیا ہے، وہ بغیر سوچے سمجھے آپ کی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ لہٰذا سب سے پہلے اس مسئلہ جہاد کو حرام کرنا ضروری ہے، لیکن اسلام کے اس بنیادی مسئلہ کو کوئی مولوی یا پیر حرام نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لیے ایک نبیؑ کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا آپ لوگوں کو سب سے پہلے ایک نبی پیدا کرنا ہوگا جو اس مسئلہ جہاد کو حرام قرار دے اور مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کرے کہ اب دین کے لیے لڑنا اور جہاد کرنا حرام ہے اور اس کی زندگی کا مقصد وحید یہی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی کو پیدا کیا گیا۔

2- ایک شخص وہ پیدا کیا جائے جو مسلمانوں کو انگریزی تعلیم میں رنگ دے۔ اور

Marfat.com

لوگوں کو یہ باور کرائے کہ تم اس وقت تک ترقی ہی نہیں کر سکتے جب تک تم اس تعلیم کو حاصل نہیں کرو گے۔ اس زبان سے آشنا نہیں ہو گے جو حاکم قوم کی زبان ہے۔ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان وہ نفرت کو دور کرے۔ چنانچہ اس کام کے لیے سرسید احمد خان انہیں مل گیا جس نے انگریز کا ہر وہ کام کر دیا جس کو انگریز تنہا نہیں کر سکتا تھا۔

3- کچھ ایسے لوگ پیدا کیے جائیں جو علماء کی عزت و توقیر لوگوں کے دلوں سے نکال دیں۔ علماء ربانی کو ''وہابی'' یا دوسرے القاب سے یاد کر کے لوگوں کے دلوں میں ان کی نفرت پیدا کر دی جائے تا کہ لوگ ان کی بات نہ مان کر انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑے نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے بھی بہت سے علماء کو ڈھونڈ لیا گیا۔ علماء ربانی کو عوام میں بے وقار کرنے میں انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ کتابیں لکھیں۔ فتوے دیے۔ لیکچر دیئے تا کہ علمائے حقانی کی ساکھ عوام میں مجروح ہو۔

اس مقصد کے لیے اور اس وفد کی سفارشات پر یہ تین قسم کے لوگ تلاش کیے گئے اور حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے انگریز کی حکومت کی مضبوطی میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور وہ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہوئے۔

پہلا شخص جس نے انگریزی حکومت کی مضبوطی میں اہم کردار ادا کیا اور اسلام کے منصوص اور تا قیامت قائم رہنے والے مسئلہ جہاد کو حرام کیا اور اپنی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا وہ مرزا غلام احمد قادیانی تھا۔

مرزا غلام احمد قادیانی سکھ حکومت کے آخری عہد 1839ء میں پنجاب کے ضلع گورداسپور کے قصبہ قادیان میں پیدا ہوا (حاشیہ کتاب البریہ: ص ۱۴۶) 1857ء کی جنگ آزادی کے وقت اس کی عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ مرزا صاحب کا نسبی تعلق مغل قوم کی شاخ برلاس سے تھا۔ (کتاب البریہ حاشیہ: ص ۱۳۴) لیکن کچھ عرصے کے بعد انہیں بذریعہ الہام معلوم ہوا کہ وہ ایرانی النسل ہیں۔ مرزا صاحب کے پردادا مرزا گل محمد صاحب جائداد و املاک تھے اور پنجاب میں ان کی اچھی خاصی ریاست تھی۔ ان کے

Marfat.com

انتقال کے بعد اس ریاست کو زوال آیا اور سکھ ریاست کے دیہاتوں پر قابض ہو گئے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب کے دادا مرزا عطاء محمد کے پاس صرف قادیان کا قصبہ رہ گیا۔ آخر میں سکھوں نے اس پر بھی قبضہ کر لیا اور مرزا صاحب کے خاندان کو قادیان سے نکال دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخری زمانہ میں مرزا صاحب کے والد مرزا غلام مرتضٰی قادیان واپس آئے اور مرزا صاحب موصوف کو اپنے والد کے علاقہ میں پانچ گاؤں واپس ملے۔ (کتاب البریہ حاشیہ: ص۱۴۲۔۱۴۴)

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے گھر ہی میں متوسطات تک تعلیم پائی۔ انہوں نے مولوی فضل الٰہی، مولوی فضل احمد اور مولوی گل علی شاہ سے نحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں۔ طب کی کتابیں اپنے والد صاحب سے پڑھیں جو ایک طبیب حاذق تھے، لیکن مرزا صاحب کو اپنے والد کے اصرار پر آبائی زمینداری کے حصول کے لیے جدوجہد اور عدالتی کارروائیوں میں مصروف ہونا پڑا۔

بعد میں مرزا صاحب نے سیالکوٹ میں ڈپٹی کمشنر کی کچہری میں قلیل تنخواہ پر ملازمت کر لی۔ وہ 1864ء سے 1868ء تک چار سال اس ملازمت میں رہے۔ (سیرت المہدی حصہ اول: ص۴۴) دوران ملازمت آپ نے دو ایک کتابیں انگریزی کی بھی پڑھ لیں۔ اسی زمانہ میں انہوں نے مختاری کا امتحان دیا لیکن شومیٔ قسمت سے یا اپنی نالائقی کی وجہ سے اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ 1868ء میں وہ اس ملازمت سے استعفٰی دے کر قادیان آ گئے اور بدستور زمینداری کے کاموں میں مشغول ہو گئے، لیکن اکثر وقت قرآن حکیم کے تدبر، اور تفسیروں اور حدیثوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔

لکھا کہ مرزا صاحب بچپن میں بڑے سادہ لوح تھے۔ ان کو گھڑی میں چابی دینا بھی نہیں آتا تھا۔ جب وقت دیکھنا ہوتا تو گھڑی دیکھتے ہی وقت نہ پہچان سکتے تھے بلکہ ایک کے ہندسہ پر انگلی رکھ کر گنتے تب وقت کا پتہ چلتا۔ جوتے کے الٹے سیدھے کا بھی انہیں پتہ نہیں چلتا تھا۔ کئی دفعہ جوتا الٹا پہن لیتے۔ پھر تکلیف ہوتی۔ بعض دفعہ اسی وجہ سے پاؤں الٹا پڑ جاتا۔ چنانچہ آپ کی سہولت کے لیے الٹے سیدھے پاؤں کے لیے جوتے کو نشان لگا دیے گئے۔ (سیرۃ المہدی حصہ اول: ص۱۸۰۔۶۷)

Marfat.com

انہیں بار بار پیشاب آنے کی بیماری تھی۔ اس وجہ سے اکثر جیب میں ڈھیلے رکھتے تھے اور شیرینی سے غیر معمولی رغبت کی وجہ سے گڑ کے ڈھیلے بھی رکھ لیا کرتے تھے۔

(مرزا صاحب کے حالات مرتبہ معراج الدین قادیانی، شامل براہین احمد: جلد اص ٦٧)

مرزا صاحب کا خاندان انگریزی حکومت سے جو پنجاب میں نئی نئی قائم ہوئی تھی، شروع ہی سے وفادارانہ اور مخلصانہ تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان کے متعدد افراد نے اس نئی حکومت کی ترقی اور اس کے استحکام میں جان بازی اور جاں نثاری سے کام لیا تھا اور بعض نازک موقعوں پر اس کی مدد کی تھی۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی کتاب البریہ کے ابتداء میں ''اشتہار واجب الاظہار'' میں لکھتے ہیں:

> ''میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔ میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا جن کو دربار گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ رئیسان پنجاب میں ہے۔ اور 1857ء میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکار انگریز کی مدد کی تھی یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانۂ غدر کے وقت سرکار انگریزی کی امداد میں دیئے تھے۔ ان خدمات کی وجہ سے جو چھٹیات خوشنودی حکام اُن کو ملی تھیں، مجھے افسوس ہے کہ بہت سی اُن میں سے گم ہو گئیں۔ مگر تین چھٹیات جو مدت سے چھپ چکی ہیں، ان کی نقلیں حاشیہ میں درج کی گئی ہیں۔ پھر میرے والد صاحب کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدماتِ سرکاری میں مصروف رہا اور جب تموں کے گزر پر مفسدوں کا سرکار انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکار انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک تھا۔'' (اشتہار مؤرخہ ٢٠ ستمبر ١٨٩٧ء صفحہ: ٣۔٦ ملحق بکتاب البریہ)

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسئلہ جہاد کو حرام کرنے اور اس مسئلہ کو لوگوں کے ذہن وقلب سے نکالنے کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو نبوت کا دعویٰ کر کے

Marfat.com

اس مسئلہ کو حرام قرار دیتا تاکہ کوئی بھی کلمہ گو انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کا خیال بھی اپنے ذہن نہ لاتا۔ انگریزوں کی نگاہ اس پرانے کاسہ لیس خاندان پر پڑی جس نے ہر آڑے وقت میں مسلم قوم سے غداری اور انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرا۔ ساری مسلم قوم سے کٹ کر انگریزوں کی مدد کی اور جس وقت دوسرے علماء انگریز کے خلاف برسرپیکار تھے اور پھانسی اور دائمی جلاوطنی کی سزائیں پا رہے تھے، مرزا غلام احمد اور اُن کا پورا خاندان انگریزوں کی مالی اور افرادی مدد کر رہا تھا تاکہ یہ مسلمانوں کو اور ماریں اور اذیتیں دیں۔ چنانچہ اس ملکی، وطنی اور سیاسی غدار خاندان کو اس مقصد کے لیے چنا گیا کہ وہ نبوت کا دعویٰ کر کے مسئلہ جہاد کو حرام قرار دے، لیکن جس شخص کو بھی نبوت کا دعویٰ کے لیے کھڑا کیا جاتا وہ یک دم نبوت کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا بلکہ پہلے وہ اہل اسلام کے دلوں میں اپنا وقار اور عظمت پیدا کرتا۔ پھر بتدریج وہ نبوت کا دعویٰ کرتا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ دور مذہبی مناظروں کا دور تھا کیونکہ اس زمانہ میں عیسائی پادری عیسائی مذہب کی تبلیغ و دعوت اور دین اسلام کی تردید میں سرگرم تھے۔ حکومت وقت جس کا سرکاری مذہب عیسائیت تھا، ان کی پشت پناہ اور سرپرست تھی۔ وہ سرزمین پاک و ہند کی حکومت کو یسوع مسیح کا عطیہ اور انعام سمجھتی تھی۔ دوسری طرف آریہ سماجی مبلغ جوش و خروش سے اسلام کی تردید کر رہے تھے۔ انگریزی حکومت کی اپنی پالیسی بھی یہ تھی کہ ان مناظرانہ سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، اس لیے کہ ان کے نتیجہ میں ملک میں ایک کشمکش اور ذہنی و اخلاقی انتشار پیدا ہوتا تھا اور تمام مذاہب اور فرقوں کو ایک ایسی طاقتور حکومت کا وجود غنیمت معلوم ہوتا تھا جو ان سب کی حفاظت کرنے اور جس کے سایہ میں یہ سب امن و امان کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کرتے رہیں۔ ایسے ماحول میں جو شخص اسلام کی مدافعت اور مذاہب غیر کی تردید کا علم بلند کرتا وہ مسلمانوں کا مرکز توجہ و عقیدت بن جاتا۔

مرزا صاحب نے بھی اس میدان کو اپنی سرگرمیوں کے لیے منتخب کیا، کیونکہ وہ اس طریقے سے مسلمانوں کے دلوں میں اپنی عقیدت کا نقش بٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک بہت بڑی تصنیف کا بیڑا اٹھایا جس میں دین اسلام کی صداقت، قرآن

Marfat.com

حکیم کے اعجاز اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے گا اور بیک وقت سارے مذاہب کی اس میں تردید ہو گی۔اس کتاب کا نام انہوں نے ''براہین احمدیہ'' تجویز کیا۔

مرزا صاحب نے اس کتاب کے تیسرے اور چوتھے حصہ کے شروع میں ''اسلامی انجمنوں کی خدمت میں التماس ضروری اور مسلمانوں کی نازک حالت اور انگریزی گورنمنٹ'' کے عنوان سے انگریزی حکومت کی مدح و توصیف کی ہے اور اس کے مسلمانوں پر احسانات گنوائے ہیں اور اس بات کی پرزور اپیل کی ہے کہ تمام اسلامی انجمنیں مل کر ایک میمورنڈم (Memorandum) تیار کر کے اور اس پر تمام سربرآوردہ مسلمانوں سے دستخط کرا کر گورنمنٹ کو بھیجیں۔اس میں اپنی خاندانی خدمات کا پھر تذکرہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ جہاد کی ممانعت کی بھی پرزور تحریک ہے۔گویا کہ بحیثیت مبلغ اسلام مرزا صاحب نے اپنا وہ کام یعنی ممانعت جہاد اور خیر خواہی حکومت شروع کر دیا جس کے لیے ان کے انگریز آقاؤں نے انھیں چنا تھا۔

براہین احمدیہ کی طباعت سے قبل مرزا صاحب نے اس کے بارہ میں بہت دعوے کیے تھے،لیکن کتاب چھپنے پر پڑھنے والوں کو پتہ چل گیا کہ اس ضخیم دفتر میں کوئی نادر علمی تحقیق اور مسیحیت کے مآخذ اور اس کی قدیم کتابوں اور اس کے اسرار وحقائق سے اس طرح کی واقفیت و آشنائی نظر نہیں آتی جو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کی تصنیفات میں نظر آتی ہے۔نہ وہ شیریں گفتاری اور ندرت استدلال نظر آتی ہے جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتابوں میں ہے۔

البتہ اس کتاب میں پڑھنے والے کو مرزا صاحب کی بسیار نویسی، کثرت الہامات، خوارق، کشف، مکالمات خداوندی، پیش گوئیاں اور طویل وعریض دعوے ضرور ملتے ہیں جن سے ایک قاری کی طبیعت بدمزہ اور منغض ہو جاتی ہے۔اس کتاب میں غیر مسلم حضرات کے جوابات دینے سے زیادہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ الہام کا سلسلہ نہ منقطع ہوا ہے اور نہ اس کو منقطع ہونا چاہیے۔گویا اپنے دعویٰ نبوت کی اس کتاب میں تمہید ہے اور لوگوں کو مائل کیا گیا ہے کہ وہ آئندہ سالوں میں مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت کو ماننے

Marfat.com

کے لیے تیار رہیں۔

کتاب میں جگہ جگہ مختلف آیات کے غیر مربوط ٹکڑوں کو الہام کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ بیچ بیچ میں چند احادیث بھی جوڑ دی گئی ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ جو مرزا صاحب کے اپنے جملے ہیں وہ خالص ہندوستانی عربی کا نمونہ ہیں جن میں عربیت اور قواعد کی بھی فاش غلطیاں ہیں۔

مرزا صاحب کو اس کتاب کے لکھنے کے بعد اپنی شخصیت کا نیا انکشاف ہوا، وہ یہ کہ انہیں اپنی تحریر، متکلمانہ، مناظرانہ اور بعض دیگر خفیہ صلاحیتوں کا انکشاف ہوا۔ اور انہیں اندازہ ہوا کہ ان میں اپنے ماحول کو متاثر کرنے اور ایک نئی تحریک کے چلانے کی اچھی خاصی استعداد ہے۔ اس انکشاف نے ان کے ذہن میں ایک نئی تبدیلی پیدا کی، چنانچہ اب ان کا رخ غیر مسلموں سے مناظرہ کرنے کے بجائے خود مسلمانوں کو دعوت مناظرہ ومقابلہ دینے کی طرف ہوگیا۔

1885ء میں مرزا صاحب کا حکیم نور الدین بھیروی جو اس زمانے میں بسلسلۂ ملازمت ریاست جموں میں مقیم تھا۔ خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور 1888ء میں مرزا صاحب نے کشمیر کا سفر اختیار کیا اور ایک ماہ حکیم صاحب موصوف کے پاس قیام کیا۔ 1890ء تک مرزا صاحب نے صرف مجدد و مأمور ہونے کا دعویٰ کیا تھا، لیکن 1891ء میں حکیم صاحب نے مرزا صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ ''مسیح موعود'' ہونے کا دعویٰ کریں۔ اس مشورہ کے حقیقی اسباب ومحرکات کیا تھے؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ حکومت وقت کے اشارہ سے تھا اور ایک خاص مقصد کے لیے تھا جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

نزول مسیح کا عقیدہ ایک اسلامی عقیدہ ہے۔ مسلمان اس عقیدے سے واقف اور اس کے قائل تھے۔ احادیث نبویہ میں اس کی اطلاع دی گئی ہے اور مسلمان حالات کی خرابی، حکومت کے چھینے جانے اور پیہم حوادث ومصائب کے اثر سے کسی مردِ غیب کے منتظر بھی تھے۔ حکیم صاحب کو اس کا خیال ہوسکتا تھا کہ مرزا صاحب نے اپنی دینی خدمات سے جو مقام حاصل کرلیا ہے، اس کی بناپر مسلمان ان کے دعوۓ مسیحیت کو تسلیم کرلیں گے۔ چنانچہ مرزا صاحب پہلے تو سیدنا مسیح علیہ السلام کے نزول کے بارے میں

Marfat.com

وہی عقیدہ رکھتے تھے جو عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے جس کو بعد میں انہوں نے غلط اور کفریہ عقیدہ کہا، لیکن پھر یک دم اس عقیدہ میں تبدیلی پیدا کر کے لکھا کہ

''مسلمانوں اور عیسائیوں کا کسی قدر اختلاف کے ساتھ یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح بن مریمؑ اسی عنصری وجود سے آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں اور پھر وہ کسی زمانہ میں آسمان سے اتریں گے۔ میں اس خیال کا غلط ہونا اپنے اسی رسالہ میں لکھ چکا ہوں اور نیز یہ بھی بیان کر چکا ہوں کہ اس نزول سے مراد درحقیقت مسیح بن مریمؑ کا نزول نہیں بلکہ استعارہ کے طور پر ایک مثیل مسیح کے آنے کی خبر دی گئی ہے۔ جس کا مصداق حسب اعلام والہام الٰہی یہی عاجز ہے۔''

(توضیح مرام: ص۲)

حکیم نورالدین بھیروی چونکہ احادیث و روایات پر وسیع نظر رکھتا تھا، اس لیے وقتاً فوقتاً ان علمی اشکلات پر متنبہ اور ان دقتوں کی طرف بھی متوجہ کرتا رہتا تھا جو اس دعویٰ کے بعد پیش آتے ہیں، اور ان کے حل میں بھی مدد دیتا تھا، چنانچہ دمشق کی تاویل قادیان، دو زرد چادروں کی تاویل دو بیماریاں، دمشق کے منارۂ شرقی کی تاویل قادیان کا منارۃ المسیح وغیرہ حکیم نورالدین ہی کی بتائی ہوئی تھیں۔

مرزا صاحب کی تصنیفات کا غیر جانبدرانہ مگر ناقدانہ مطالعہ کرنے سے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان کے اعلانات اور دعاوی کے تدریجی منازل ایک مرتب اسکیم اور خاکے کے تحت ہیں۔ مرزا صاحب نے اب نبی اور نبوت کا لفظ صاف صاف زبان سے کہے بغیر صفات نبوت اور خصائص نبوت پر گفتگو کرنی شروع کر دی اور یہ ثابت کرنا شروع کر دیا کہ یہ صفات افراد امت اور کامل لوگوں کو بطریق تبعیت و وساطت حاصل ہوتی ہیں۔ اس منطق اور ان مقدمات کا طبعی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ ایک دن مرزا صاحب نبوت کا دعویٰ کر دیں۔ چنانچہ ایک روز ایسا ہو گیا۔ یہ 1900ء کی بات ہے۔ مولوی عبدالکریم نے جو جمعہ کے خطیب تھے، ایک خطبۂ جمعہ میں مرزا صاحب کے لیے نبی اور رسول کے الفاظ استعمال کیے۔ اس خطبہ کو سن کر مولوی سید محمد احسن امروہی نے

بہت پیچ و تاب کھائے لیکن مولوی عبدالکریم نے پھر ایک اور خطبہ میں کہا کہ اگر میں غلطی کروں تو حضور (مرزا صاحب) مجھے بتائیں۔ میں حضور کو نبی اور رسول مانتا ہوں۔ مرزا صاحب نے کہا "ہمارا بھی یہی مذہب اور دعویٰ ہے جو آپ نے بیان کیا۔" یہ خطبہ سن کر مولوی محمد احسن غصے میں بھرے ہوئے واپس آئے اور مسجد کے اوپر ٹہلنے لگے۔ جب عبدالکریم واپس آئے تو مولوی محمد احسن اس سے لڑنے لگے۔ لڑنے میں دونوں کی آواز بہت بلند ہوگئی تو مرزا صاحب مکان سے نکلے اور یہ آیت پڑھی "یاایھاالذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی" گویا اپنی نبوت کی مزید تائید کردی۔

(تقریر سید سرور شاہ قادیانی مندرجہ اخبار الفضل قادیان: جلد ۱۰ نمبر ۵۱ مورخہ ۴ جنوری ۱۹۲۳ء، حقیقت النبوۃ: ص ۱۴۴)

گویا اس طرح ایک نئے دور کا افتتاح ہوگیا اور مرزا صاحب کو معلوم ہوگیا کہ لوگ اتنے راسخ الایمان ہو چکے ہیں کہ وہ ان کے ہر دعویٰ کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ 1901ء سے مرزا صاحب اپنی تصنیفات میں اپنے لیے نبی اور رسول کے الفاظ استعمال کرنے لگے۔ 1902ء میں انہوں نے اپنی کتاب "تحفۃ الندوۃ" میں اپنے کو ظلی اور بروزی نبی کہا اور ہر مسلمان کے لیے اپنی اطاعت کو واجب قرار دیا۔ اور کہا کہ میں اپنے دعویٰ میں موسیٰؑ، عیسیٰؑ، داؤدؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سچا ہوں۔ زمین و آسمان نے میری گواہی دی۔ (تحفۃ الندوہ: ص ۴)

اسی طرح اپنی کتاب اربعین میں بھی اپنی نبوت کی تاویل کرتے ہوئے لکھا:

"وہ اپنی ذات سے نہیں بلکہ اپنے نبی کے سرچشمے سے لیتا ہے، اور نہ اپنے لیے بلکہ اسی کے جلال کے لیے، اسی لیے اس کا نام آسمان پر محمدؐ اور احمدؐ ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ محمدؐ کی نبوت آخر محمدؐ ہی کو ملی مگر بروزی طور پر مگر نہ کسی اور کو۔" (اربعین: ص ۵)

اپنی ایک اور کتاب میں لکھا:

"غرض اس حصہ کثیر وحی الٰہی اور امور غیبیہ میں اس امت سے میں ہی ایک فرد مخصوص ہوں اور جس قدر مجھ سے پہلے اولیاء اور ابدال اور اقطاب اس امت میں گزر چکے ہیں ان کو یہ حصہ کثیر اس نعمت

Marfat.com

کا نہیں دیا گیا۔ پس اس وجہ سے نبی کا نام پانے کے لیے میں ہی مخصوص کیا گیا اور دوسرے تمام لوگ اس نام کے مستحق نہیں۔''

(حقیقۃ الوحی: ص۳۹۱)

یہ نبوت کا دعویٰ تو تھا لیکن جب کبھی کوئی کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا تو کہا جاتا کہ یہ دعویٰ غیر تشریعی نبوت کا ہے۔ تشریعی نبوت کا نہیں، لیکن پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ مرزا صاحب کھل پڑے اور صاف کہہ دیا کہ میں تشریعی نبی ہوں کیونکہ تشریعی نبی ہی مسئلہ جہاد کو حرام قرار دے سکتا تھا اور یہی مرزا صاحب کے نبی کہلانے کا مقصد تھا، جیسا کہ اگلے صفحات میں آ رہا ہے۔

چنانچہ اربعین ہی میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:

''ماسوا اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے؟ جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر و نہی بیان کیے اور اپنی امت کے لیے ایک قانون مقرر کیا، وہی صاحب شریعت ہو گیا۔ پس اس تعریف کی رو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہیں اور نہی بھی۔ مثلاً یہ الہام ''قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم ويحفظوا فروجهم ذالك ازكیٰ لهم'' یہ براہین احمدیہ میں درج ہے اور اس میں امر بھی ہے اور نہی بھی۔ اور اس پر تئیس برس کی مدت بھی گزر گئی۔ اور ایسا ہی اب تک میری وحی میں امر بھی ہوتے ہیں اور نہی بھی۔ اور اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مراد ہے جس میں نئے احکام ہوں تو یہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ان هذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراهيم و موسى'' یعنی قرآنی تعلیم توریت میں بھی موجود ہے۔''

(اربعین: نمبر۴، ص۷)

جب تشریعی نبوت کا دعویٰ کر دیا تو اب وہ پرچار شروع ہو گیا جس کے لیے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور وہ تھا انگریزوں کی اطاعت اور مسئلہ جہاد کا حرام کرنا۔ چنانچہ

Marfat.com

اپنی کتاب تریاق القلوب میں لکھا:

''میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید وحمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھیں ہیں کہ اگر وہ اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیحی خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔'' (تریاق القلوب: ص ۱۵)

انگریزوں کی اطاعت پر اتنا زور دیا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے برابر قرار دیا چنانچہ اپنی کتاب شہادۃ القرآن میں لکھا:

''میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں، یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرے، دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہو۔ جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سائے میں پناہ دی ہو۔ سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے۔''

(اشتہار گورنمنٹ کی توجہ کے لائق: ص ۳ کتاب شہادۃ القرآن کے آخر میں)

ایک جگہ خود اقرار کیا کہ مجھے حکومت برطانیہ نے اٹھایا ہے اور میں اس کا خود کاشتہ پودا ہوں۔ چنانچہ مرزا صاحب نے اس درخواست میں جو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو 24 فروری 1898ء میں پیش کی تھی، یہاں تک لکھا ہے کہ

''یہ التماس ہے کہ سرکار دولت مدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس سال کے متواتر تجربے سے ایک وفادار، جاں نثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ

قدیم سے سرکار انگریزی کے خیر خواہ اور خدمت گزار ہے، اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم و احتیاط اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اتنا فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔'' (تبلیغ رسالت: جلد ۷ ص ۱۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ **"الجهاد ماض الیٰ یوم القیامة"** جہاد قیامت تک کے لیے جاری و ساری رہے گا، لیکن مرزا صاحب کی خصوصی توجہ مسئلہ جہاد پر مرکوز تھی جو انگریزی حکومت کے لیے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں خاص تشویش اور اضطراب کا باعث تھا۔ مرزا صاحب نے جہاد کے دائمی طور پر منسوخ اور ممنوع ہو جانے کا اعلان فرمایا اور اس کو اپنے مسیح موعود ہونے کا نشان قرار دیا۔ چندہ منارۃ المسیح کے اعلان میں کہا کہ

''تیسرے وہ گھنٹہ جو اس منارہ کے کسی حصۂ دیوار میں نصب کرایا جائے گا۔ اس کے نیچے یہ حقیقت مخفی ہے کہ لوگ اپنے وقت کو پہچان لیں کہ آسمان کے دروازوں کے کھلنے کا وقت آ گیا۔ اب سے زمینی جہاد بند کیے گئے اور لڑائیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ جیسا کہ حدیثوں میں پہلے لکھا گیا تھا کہ جب مسیح آئے گا تو دین کے لیے لڑنا حرام کیا جائے گا۔ سو آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھا کر کافروں کو قتل کرتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے۔''

(اشتہار چندہ منارۃ المسیح ضمیمہ خطبہ الہامیہ)

ایک اور جگہ نہایت صفائی اور اختصار کے ساتھ لکھا ہے کہ

''میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔'' (تبلیغ رسالت: جلد ۷ ص ۱۷)

Marfat.com

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قادیانی افکار میں دو چیزیں بہت نمایاں ہیں:

ایک.........دعویٰ نبوت دوسری.........حرمت جہاد

اس طریقے سے مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے انگریز آقاؤں سے حق وفاداری ادا کیا اور انگریزوں کی حکومت کی مضبوطی (Stability) میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔

مرزا صاحب کو انگریزی حکومت کے ساتھ ایسا اخلاص اور اس کی خیر خواہی کا ایسا جذبہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے جوش نفرت کو کم کرنے کے لیے مختلف تدبیریں کرتے تھے۔ انہوں نے عیسائی مناظرین اور پادریوں کے مقابلے میں جس جوش اور سرگرمی کا اظہار کیا اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ان عیسائی پادریوں نے اسلام کی تردید اور پیغمبر اسلام کی توہین میں ایسا رویہ اختیار کیا تھا جس سے مسلمانوں میں جوش واشتعال پیدا ہو جانے اور انگریزوں کی حکومت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا، اس لیے میں نے بھی مصلحتاً و قصداً ان کی تردید میں جوش وتأثر کا اظہار کیا تا کہ مسلمانوں کا جوش طبیعت فرو ہو جائے اور اُن کو تسکین ہو۔

(ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۳ مسلکہ تریاق القلوب صفحہ ۳۰، بعنوان حضور گورنمنٹ عالیہ میں ایک عاجزانہ درخواست)

مرزا غلام احمد کو انگریزوں کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ اس نے ہر اس شخص کی گندی گالیوں سے تواضع کی جس نے انگریزوں کے خلاف کام کیا یا اس کو (مرزا غلام احمد کو) انگریزوں کا سیاسی ایجنٹ بتایا۔ ایک طرف تو اس نے اپنے کو نبی کے لفظ سے یاد کیا لیکن نبیوں والے اخلاق کے برعکس انہوں نے منافقوں والے اخلاق واذا خاصم فجر (جب اس کا کسی سے جھگڑا ہوتا ہے تو فوراً گالی گلوچ پر اتر آتا ہے) سے کام لیا۔

مرزا غلام احمد نے اپنے مخالفیں (جن میں جلیل القدر علماء اور عظیم المرتبت مشائخ تھے) ان الفاظ سے یاد کیا اور ان کی ان الفاظ میں ہجو کی اور خاک اڑائی کہ بار بار تہذیب کی نگاہیں نیچی اور حیاء کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ اپنے ان مخالفین کے لیے ذریۃ البغایا (رنڈیوں کی اولاد) کا کلمہ تو ان کا گویا تکیہ کلام ہے۔

اپنی کتاب انجام آتھم کے ضمیمہ میں لکھتے ہیں:

"اگر یہ گالی دیتے ہیں تو میں نے ان کے کپڑے اتار لیے ہیں اور

Marfat.com

ان کو ایسا مردار بنا کر چھوڑ دیا ہے جو پہچانا نہیں جاتا۔" (ص ۱۵۸)
ایک اور جگہ اپنے مخالفین کو اس طرح یاد کرتے ہیں
"ہمارے دشمن جنگلوں کے خنزیر ہو گئے ہیں اور ان کی عورتیں کتیوں سے بڑھ گئی ہیں۔" (نجم الہدیٰ ص ۱۵)

اپنے ایک حریف مقابل مولانا سعد اللہ لدھیانوی کو بجائے مدلل جواب دینے کے بے نکت گالیاں دیں اور وہ گالیاں بھی عربی نظم میں دیں۔ اپنے زمانہ کے علماء اور شیوخ کو اتنی گالیاں دیں کہ اُن کو نقل کرتے ہوئے قلم کو حیاء آتی ہے لیکن مرزا صاحب کو گالیاں دیتے ہوئے حیاء نہ آئی۔ چنانچہ بعض حضرات نے مرزا صاحب کی گالیوں کو حروف تہجی کے حساب سے جمع کر کے "مغلظات مرزا" کے نام سے کتابیں تصنیف کی ہیں۔

یہاں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کی تردید مقصود نہیں اور نہ ہی مسئلہ ختم نبوت کو بیان کرنا مقصود ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو انگریز نے صرف اس مقصد کے لیے کھڑا کیا اور اس کی سرپرستی بھی کی تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد کو ختم کیا جا سکے، کیونکہ یہ جذبۂ جہاد سامراجی اور مشنری منصوبوں کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

مختصر یہ کہ قادیانیت کے خط و خال اور اس کے ترکیبی عناصر اسلام اور نبوت محمدی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے خلاف ایک بغاوت تھی جس کی سرپرستی انگریزی حکومت اپنے خاص مقاصد کے پیش نظر کر رہی تھی، لیکن اس وقت حالات ایسے تھے کہ پورا عالم اسلام سامراجیت کے خلاف میدان کارزار بنا ہوا تھا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا حافظ محمد ضامن شہیدؒ وغیرہ اکابر علماء نے عملاً جہاد میں حصہ لیا بلکہ کیرانہ کی حیثیت تو اس وقت ایک چھاؤنی کی سی ہو گئی تھی جس کے مجاہدین کا نعرہ یہ تھا "ملک خدا کا اور حکومت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی۔"

سرسید احمد خان:

انگریزوں کا دوسرا آلۂ کار سرسید احمد خان تھا جس نے اگرچہ مرزا غلام احمد

Marfat.com

قادیانی کی طرح نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا تھا، لیکن انگریزوں کی حمایت میں مرزا غلام احمد سے پیچھے نہ تھا، اور دین کے بگاڑنے میں اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ اور اگر تحریک علی گڑھ اور تحریک قادیانیت کا جائزہ لیا جائے تو ان دونوں میں کئی باتیں آپس میں مشترک ہیں۔

سر سید احمد خان جو اس تحریک کے علمبردار تھے 17 اکتوبر 1817ء مطابق 1232ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا جواد الدولہ سید ہادی شاہ عالم کے زمانہ میں صوبۂ شاہ جہان کے محتسب اور قاضیٔ لشکر تھے۔ اُن کے والد میر متقی ایک آزاد طبیعت آدمی تھی اور دنیاداری کے مشغلوں میں کم دلچسپی لیتے تھے۔ وہ مشہور نقشبندی بزرگ شاہ غلام علی کے مرید تھے اور اپنا بیشتر وقت ان کی صحبت یا تیراکی اور تیراندازی میں، جس کے وہ بڑے ماہر تھے، صرف کرتے تھے۔

سر سید کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ تھے، جو پہلے کمپنی کے مدرسہ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور پھر اکبر شاہ ثانی کے وزیر ہو گئے تھے۔ وہ بھی صوفی منش آدمی تھے، لیکن سر سید کی تربیت زیادہ تر ان کی والدہ نے کی جو بڑی دانش منداور دور اندیش خاتون تھیں۔

سر سید کے ابتدائی اثرات میں سے دو باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ایک ان کی ننھیال کے طور طریقے اور دوسرے ان کا مذہبی ماحول۔ سر سید پر دوسرا بڑا اثر مذہبی تھا۔ اس وقت دہلی میں ترویج مذہب اور علوم اسلامی کے دو بڑے مرکز تھے۔ ایک شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا مدرسہ۔ دوسرے حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے جانشین شاہ غلام علی کی خانقاہ۔ پہلے میں مسلک ولی اللہی کی پیروی ہوتی تھی اور دوسرے میں طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کی۔ سر سید نے ان دونوں سے کسب فیض کیا۔ ان کی ننھیال کو شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی اور وہاں اکثر رسوم و امور میں شاہ صاحب کی پیروی ہوتی، لیکن سر سید کے والد شاہ غلام علی کے چہیتے مرید تھے، لہٰذا سر سید کے تعلقات ''خانقاہ'' سے بہت گہرے تھے۔ شاہ غلام علی کو اس خاندان سے بڑی محبت تھی اور سر سید اور اُن کے بہن بھائی شاہ صاحب کو ''دادا حضرت'' کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ سر سید کہا کرتے تھے کہ ''شاہ صاحب کو ہم سے ایسی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں

Marfat.com

سے ہوتی ہے۔" شاہ غلام علی بھی فرمایا کرتے تھے کہ گو خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے، لیکن متقی (سرسید کے والد) کی اولاد کی محبت ایسی دے دی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔ شاہ صاحب ہی نے سرسید کا نام احمد رکھا تھا اور اس کی بسم اللہ کی تقریب بھی شاہ صاحب ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

سرسید کی تعلیم پرانے اسلامی اصولوں پر ہوئی۔ پہلے قرآن حکیم پڑھا۔ پھر فارسی کی درسی کتابیں مثلاً کریما، گلستان، بوستان وغیرہ پڑھیں۔ عربی میں شرح ملا جامی، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطول کا کچھ حصہ پڑھا۔ ریاضی کا علم اپنے ماموں نواب زین العابدین سے سیکھا اور طب حکیم غلام حیدر خان سے۔ اس کے بعد اپنے طور پر مختلف کتابیں پڑھتے رہے۔ اور 1846ء سے 1855ء تک جب وہ دہلی کی منصفی پر مأمور تھے، انہوں نے تحصیل علم میں زیادہ ترقی کی۔ اس زمانے میں سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیز کے جانشین شاہ محمد اسحاقؒ اور حضرت مولانا حجۃ الاسلام محمد قاسم نانوتوی کے استاذ اور محسن حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے نام لیے جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سرسید کی زندگی کے یہ نو سال بہت اہم تھے۔ ایک تو انہوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کر لی۔ دوسرے شاہ جہان آباد کی آخری بہار کو طفولیت یا عنفوان شباب کی نیم در آنکھوں سے نہیں بلکہ ایک پختہ کار مبصر کی نظر سے دیکھا۔ بہادر شاہ کی حکومت اس وقت اگرچہ قلعہ معلیٰ تک محدود تھی لیکن اس کے دربار میں جو شعراء قصیدے پڑھتے تھے، ان میں غالب موجود تھا۔ غالب اور اس زمانہ کے دوسرے باکمال لوگوں کی مجلس میں سرسید کو بار حاصل تھا۔ سرسید کی علمی اور روحانی تربیت ان باکمال لوگوں کی صحبت میں ہوئی۔ اور انہیں دہلی اور اہل دہلی اور اس قوم اور اس کے تمدن سے ایک خاص عشق تھا۔

سرسید کی مذہبی تصنیفات کافی ہیں کیونکہ بقول مولانا الطاف حسین حالی مرحوم کہ "مذہب ہی کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔" 1839ء سے لے کر جب انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے مختصر حالات قلم بند کیے، 1898ء تک وہ امہات المؤمنین سلام اللہ علیھن کے متعلق ایک عیسائی

Marfat.com

مصنف کے اعتراضات کا جواب لکھتے لکھتے وفات پا گئے، برابر ساٹھ سال مذہبی مباحث میں ان کی دلچسپی برقرار رہی۔ انہوں نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں حضرت سید احمد شہید بریلویؒ حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کے حالات زندگی بڑی عقیدت اور فرط محبت وادب سے لکھے ہیں۔ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس زمانے میں وہابی مسلمان کہا تھا جب سب وہابی باغی سمجھے جاتے ہیں۔ (حیات جاوید ص ۱۲۳) سرسید احمد خان اس قدر پکا وہابی تھا کہ اُس نے سید نذیر حسین محدثؒ کو بھی نیم چڑھا وہابی بنا دیا حالانکہ اس سے قبل وہ رفع الیدین وغیرہ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ سرسید نے 1895ء میں اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

> ''میں نے وہابیوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک وہابی، دوسرے وہابی کریلا، تیسرے وہابی کریلا، اور نیم چڑھا۔ میں اپنے تئیں تیسری قسم میں قرار دیتا ہوں اور بجز حق، حق، حق جو میرے نزدیک ہو، ذرہ برابر دریغ نہیں کرتا.......... جناب مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کو میں نے ہی نیم چڑھا وہابی بنایا تھا۔ وہ نماز میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، مگر اس کو سنت ہدیٰ جانتے تھے۔ میں نے انہیں عرض کیا کہ نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو آپ نیک جانتے ہیں، لوگوں کے خیال سے اس کو نہیں کرتے۔ جناب ممدوح میرے پاس تشریف لائے تھے۔ جب یہ گفتگو ہوئی، میں نے سنا کہ میرے پاس سے اُٹھ کر وہ جامع مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے گئے اور اُس وقت سے رفع یدین کرنے لگے۔ گو ان پر لوگوں نے بہت حملے کیے مگر کلمۃ الحق ہمیشہ کلمۃ الحق ہے۔''

سرسید 1870ء میں ولایت سے واپس آئے۔ واپسی پر انہوں نے ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' قائم کی۔ اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک کالج کھولا جائے۔ انگریزوں کی حکومت کو اس فیصلے کی اطلاع دی گئی۔

انہوں نے اس چیز کو بہت پسند کیا کیونکہ جیسا کہ بتایا گیا ہے انگریز اسلامی زبانوں کے بجائے اپنی انگریزی زبان کو ہندوستان میں فروغ دینا چاہتے اور اسی طریقے سے وہ اپنی تہذیب اور کلچر کے مہلک جراثیم مسلمانوں کے قلب ونظر میں ٹھونسنا چاہتے تھے۔

انگریزی حکومت نے اخلاقی مدد اور امدادی گرانٹ کے وعدے کے علاوہ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے وگورنر جنرل ہندوستان نے اپنی جیب سے دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا۔ سرولیم میور نے ایک ہزار روپیہ دیا اور دوسرے انگریز افسروں نے بھی مدد کی۔ چنانچہ سرولیم میور نے 24 مئی 1875ء کو اسکول کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ سرسید اس زمانے میں بنارس میں تھے چنانچہ اس اسکول کا انتظام مولوی سمیع اللہ خان سیکریٹری علی گڑھ سب کمیٹی کو کرنا پڑا۔ سرسید جولائی 1876ء میں پنشن پا کر علی گڑھ آ مقیم ہوئے اور 8 جنوری 1877ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں کالج کا افتتاح ہوا۔

کالج کے قیام میں سرسید کو تمام روشن خیال اور بااثر مسلمانوں کی مدد حاصل تھی، لیکن دیندار طبقہ نے اس کی سخت مخالفت کی۔ بعض لوگ اس بارے میں علماء کو دقیانوسی خیالات کا حامل قرار دینے کے لیے یہ بتاتے ہیں کہ علماء نے سرسید کی مخالفت صرف اس وجہ سے کی تھی کہ وہ انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے اور علماء اور اسلام کے ساتھ بہت بڑی زیادتی اور ناانصافی ہے۔ اسلام نے کسی زبان کو سیکھنے سے نہیں روکا۔ چنانچہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہ نے جامعہ ملیہ کے خطبۂ افتتاحیہ میں فرمایا تھا

> ''آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے اور دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔''

اصل بات یہ ہے کہ علماء نے علی گڑھ کالج کی مخالفت نہیں کی تھی اور نہ ہی انگریزی زبان کی مخالفت کی تھی بلکہ انہوں نے ''تحریک علی گڑھ'' کی مخالفت کی تھی۔ اور سرسید احمد خان کی مخالفت کی تھی۔ تحریک علی گڑھ ایک داعیہ تھا اور سرسید اس داعیہ کا محرک تھا۔ علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے

Marfat.com

تھے بلکہ اس وجہ سے ہوئی کہ اس کی بنا میں سرسید احمد خان کا ہاتھ تھا، اور سرسید اپنی کتب اور تہذیب الاخلاق میں معاشرتی اور دینی مسائل کے بارے ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جو صریحاً اسلام کے خلاف تھے۔ علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاویٰ میں یہ نہیں لکھا گیا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے بلکہ یہی درج ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں اور ایسا شخص جو مدرسہ قائم کرنا چاہے اس کی اعانت وامداد جائز نہیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں. کہ سرسید کی کتابوں میں کئی ایسی باتیں ہوتی تھیں جن سے مخالف تو کیا موافق بھی بدظن اور مخالف ہو جاتے تھے۔ سرسید نے جب بائبل کی نامکمل تفسیر لکھی تو نواب محسن الملک کو اس کی عبارت اتنی شاق گذری کہ اس وقت سرسید سے تعارف نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اس کے خلاف سرسید کو ایک طویل خط لکھا اور جب تک اُن سے نہ ملے انہیں یقین نہ آتا تھا کہ سرسید قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔

اس تفسیر کے بعد سرسید نے دوسری بے احتیاطی بلکہ بد احتیاطی الفنسٹن کی کتاب ''تاریخ ہند'' کا ترجمہ کرتے وقت کی۔ اس کتاب میں جہاں کہیں مصنف نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے وہاں آپ کے متعلق (العیاذ باللہ) ''پیغمبر باطل'' کا لفظ لکھا ہے۔ سرسید نے بھی بلاکم وکاست یہ لفظ اسی طرح ترجمہ میں لکھ دیا۔ جب کتاب کا یہ حصہ چھپا تو مولوی سمیع اللہ خان اور دوسرے ممبر حضرات نے اس پر اعتراض کیا۔ مولانا حالی نے بھی اس پر اعتراض کیا۔

مخالفت کرنے والے یہ کہتے تھے اور بالکل ٹھیک کہتے تھے کہ ایسے بے ایمان اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کے مخالف کی کتاب وہ بھی صرف ہندوستان کی تاریخ پر، سرسید کو کیا پڑی تھی کہ اس کی اس کتاب کا ترجمہ کر کے شائع کرتا۔ اس کتاب میں کون سی خصوصیات تھیں کہ اس کو اس اہتمام سے شائع کیا گیا جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اس قدر گستاخی کی گئی تھی۔ اگر کوئی انگریز سرسید کے باپ کو کسی کتاب میں جگہ جگہ گالی دیتا تو کیا سرسید اس کی کتاب کو ترجمہ کر کے ملک کے کونے کونے میں پھیلاتا۔ وہ ہرگز ایسا نہ کرتا۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں پیغمبر اسلام کا اتنا بھی

Marfat.com

احترام نہیں تھا جتنا اپنے باپ کا تھا۔

سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کر کے جن خیالات کی نشرو اشاعت کی وہ بھی بالکل غلط تھے اور اُن خیالات سے انگریز دوستی اور عیسائیت سے محبت مترشح ہوتی تھی۔ سرسید نے اس رسالہ میں اسلامی عقائد کے منافی اور ملحدانہ عقائد کا اظہار کیا مثلاً طیور مختفہ اہل کتاب کے کھانے کا جواز، جنوں کے وجود سے انکار، آسمانوں کے بارے میں عام نقطۂ نظر کی تردید، حدیث تشبہ کی صحت سے انکار۔ معجزات کا تاویلات کے ذریعہ انکار وغیرہ ایسی باتیں اہل علم حضرات کو بہت کھٹکیں۔

جنگ آزادی 1857ء کے بعد ہندوستان میں اسلام کو تین خطرات درپیش تھے۔ پہلا خطرہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے تھا جو اس امید میں ہندوستان کے مختلف شہروں اور قریوں میں دندناتے پھر رہے تھے کہ سیاسی زوال کے ساتھ مسلمانوں کا مذہبی انحطاط بھی شروع ہو جائے گا اور توحید کے پیروکار تثلیث کے آگے سرنگوں ہو جائیں گے۔

دوسرا خطرہ انگریزوں کے ان خیالات سے تھا جن کو سن کر بقول سرسید ''مر جانے کو جی چاہتا تھا۔'' یہ لوگ اسلام کو عقل اور اخلاق کا دشمن اور انسانی ترقی کا مانع سمجھتے تھے۔ ان خیالات کے حامل نہ صرف مشنری تھے بلکہ مغربی یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور وہ انگریز حاکم بھی تھے جنہیں خدا نے ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت سونپ رکھی تھی۔ اسلام اور بانئ اسلام کے متعلق بدترین کتاب سرولیم میور کی ہے جو صوبجات متحدہ (یو۔پی) کا حاکم اعلیٰ تھا اور جس نے اپنی کتاب کا خلاصہ دو فقروں میں لکھ دیا ہے کہ ''انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن، محمدؐ کی تلوار اور محمدؐ کا قرآن۔''(۱)

تیسرا خطرہ مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات کا پیدا ہونا تھا۔ یہ شکوک وشبہات مشنری اور دوسرے عیسائی مصنفوں اور آزاد خیال مفکروں کی کتابوں سے ڈالے جانے کا خطرہ تھا۔

۱۔ ''محمدؐ کی تلوار اور محمدؐ کے قرآن'' کو انسانیت کا دشمن کہنے والا شخص علی گڑھ کالج کو ایک ہزار روپیہ چندہ دینے والوں میں سے ہے۔ جس کالج کو وہ چندہ دے رہا ہے کیا وہ اس میں محمدؐ کا عقیدہ یا اس کی کوئی اور چیز چلنے دے گا؟ اور علی گڑھ اسکول کا افتتاح بھی اسی کے ہاتھوں ہوا۔

Marfat.com

پہلے خطرہ کا ازالہ تو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا آل حسن موہانیؒ، ڈاکٹر وزیر خانؒ، مولوی سید ناصر الدینؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دیگر علمائے اسلام نے کر دیا۔ ان حضرات نے مشنریوں سے مناظرے کیے، ان کے مقابلہ میں کتابیں لکھیں، رسائل تقسیم کیے اور ہر طریقہ سے مشنریوں کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر کے ان کے عزائم کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

دوسرے اور تیسرے خطرے کا ازالہ بھی علماء اسلام نے اپنے دلائل اور اپنی کتابوں کے ذریعہ فرمایا، لیکن سرسید کا خیال ہے کہ یہ کام میں نے کیا ہے یا سرسید نے اس کام کو کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید کی مذہبی تصنیفات کا مقصد مشنریوں کے مقابلے سے زیادہ اُن اعتراضات کی تردید تھا جو ولیم میور (William Muir) اور دوسرے مغربی مصنفین اور خود مشنری اسلام پر کیا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے سرسید نے اسلام کی ایسی ترجمانی کی جس پر عقل، سمجھ اور جدید فلسفے کی رو سے کوئی اعتراض نہ ہو سکے۔ لیکن سرسید کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے عیسائی مصنفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسلام کی ترجمانی نہیں کی بلکہ اس اسلام کی ترجمانی کی ہے جو انگریز چاہتے ہیں یا جو اسلام سرسید کا ہے اور جدید علم الکلام کے نام سے سرسید نے ہر غیر اسلامی چیز اسلام میں ٹھونسنے کی کوشش کی۔ گویا کہ یہ ایک سازش تھی جو سرسید کے ذریعہ انگریزوں نے اسلام کے خلاف کی۔ اور معراج، شق صدر، ملائکہ، اجنہ، حساب و کتاب، میزان اور جنت و دوزخ غرض کہ ہر ضروریات دین کا یا تو انکار کیا گیا یا پھر تاویل کی گئی۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سرسید کے جو عقائد تھے وہ مرزا غلام احمد نے اختیار کر لیے۔ مولوی محمد علی، امیر جماعت احمدیہ لاہور کی تفسیر ''بیان القرآن'' بیشتر سرسید ہی کے خیالات کی ترجمانی ہے۔ غرض کہ علمائے اسلام نے نہ تو سرسید کے خیالات سے اتفاق کیا نہ ہی سرسید کی تفسیر سے۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ انگریزوں نے تلاشِ بسیار کے بعد اس شخص کو تلاش کیا تھا، لہٰذا اس سے ہر وہ کام کروایا اور اس کے منہ سے ہر وہ بات کہلوائی جو وہ اسلام کے بارے میں کہلوانا چاہتے تھے

چنانچہ سرسید کی زندگی ہی میں اُن کے بعض عقائد کے خلاف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے رسائل لکھے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے لوگوں کو اس کے ساتھ مل کر کام کرنے سے منع کیا۔ ان پرانے علماء نے ہی سرسید کی مخالفت نہ کی بلکہ جن کو تجدد پسندی کا دعویٰ تھا یا جن کو تجدد پسند سمجھا جاتا ہے انہوں نے بھی سرسید کے عقائد اور اس کی تفسیر قرآن بلکہ تحریف قرآن کی شدت سے مخالفت کی۔ ان میں مولانا شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد پیش پیش ہیں۔ سید اکبر حسین الٰہ آبادی نے بھی سرسید کے نظریات پر خاصی تنقید کی اور سرسید کے خلاف بہت سی نظمیں بھی لکھیں

سید سے آج حضرت نے واعظ یہ کہا
چرچا ہے جا بجا تیرے حال تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا
دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الٰہ کا
ہے تجھ سے ترک صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج
کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمال عروس دہر
بندہ بنا دیا ہے تجھے حب جاہ کا
اُس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا
افسوس ہے کہ آپ ہیں دنیا سے بے خبر
کیا جانئے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا
یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر
گذرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
وہ آب و تاب شوکت ایوان خسروی
وہ محکموں کی شان وہ جلوہ سپاہ کا
آئے نظر علوم جدید کی روشنی

Marfat.com

جس سے خجل ہو نور رخ مہر وماہ کا
دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی
کمسن مسوں سے ذکر ہو الفت کا چاہ کا
نوخیز و دلفریب، گل اندام نازنین
عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رُکیے اگر تو ہنس کے کہے اک بت حسین
ویل مولوی! یہ بات نہیں ہے گناہ کا
اس وقت قبلہ جھک کے کروں آپ کو سلام
پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا
پتلون و کوٹ، بنگلہ ویسکٹ کی دھن بندھے
سودا جناب کو بھی ہو ترکی کلاہ کا
منبر پہ یوں تو بیٹھ کے گوشے میں اے جناب
سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

غرض کہ اس زمانہ کے ہر صحیح العقیدہ شخص نے سرسید کے ان خیالات کی جن کو وہ یورپ سے درآمد کر کے لائے تھے اور ملکہ وکٹوریہ کے ڈنر اور لنچ میں ان کی خاص ہدایات کے تحت وہ نظریات گھڑے گئے تھے، سخت مخالفت کی۔

کہا جاتا ہے 1869ء میں سرسید نے جب انگلستان کا دورہ کیا جہاں ان کا لڑکا سید محمود زیر تعلیم تھا۔ ملکہ وکٹوریہ نے انگلستان کے قیام کے زمانہ میں آپ کی بڑی عزت وتکریم کی۔

سرسید نے انگلستان میں سترہ ماہ قیام کیا۔ وہاں سے ''عقیدہ حجاز سے لو اور تہذیب وتمدن مغرب سے'' کا پیغام لے کر لوٹے۔ لندن کی تہذیب نے حجازی فکر ہی کو بدل ڈالا اور ہندوستان آ کر عقیدہ بھی مغرب سے لینے کا نظریہ قائم کرلیا۔ اور انگریزوں سے کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ جنت، دوزخ، فرشتے، حجت، قیاس اور اجماع وغیرہ سب کا انکار کرتے۔

Marfat.com

تفصیل کے لیے مولانا الطاف حسین حالی کی کتاب ''حیات جاوید'' کا مطالعہ ضروری ہے۔ سرسید نے قرآن حکیم کی ایسی تاویل کی جس سے صرف قرآن ہی کی تحریف نہیں بلکہ عربی زبان اور نحوی قواعد کی بھی تحریف ہوتی ہے۔ اجماع مفسرین میں بھی دراڑ پیدا کی۔ انھی باتوں کی وجہ سے سید جمال الدین افغانی نے سرسید کو ہندوستان میں دہریوں کا زعیم اور سرخیل قرار دیا ہے اور ان کی تردید میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ''الرد علی الدھریین'' رکھا۔ یہ کتاب فارسی زبان میں لکھی تھی لیکن ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہ نے اس کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ ''العروۃ الوثقیٰ'' میں بھی سید جمال الدین افغانی نے سرسید اور تحریک علی گڑھ پر اس انداز کے چند مضامین شائع کیے۔ سرسید کی رائے کے مطابق انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا صحیح نہ تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران سرسید نے انگریز سپاہیوں کی بہت حمایت کی تھی۔

(د۔ محمد البہی: الفکر الاسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربی: ص ۴۴، ۱۸۵، الصعیدی: المجددون فی الاسلام: ص ۴۸۳، عبدالمنعم النمر: کفاح المسلمین فی تحریر الہند: ص ۴۳، مسعود عالم الندوی: تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند: ص ۱۸۸، ابوالحسن الندوی: الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ: ص ۷۱-۷۹)

جس زمانہ میں سرسید احمد خان اور مرزا غلام احمد قادیانی پیدا ہوئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز کی حکومت نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ انگریز ایک تجارتی کمپنی کی شکل میں ہندوستان آیا تھا اور ایک قلیل عرصہ میں اس نے یہاں سیاسی غدار پیدا کر کے سرزمین پاک و ہند پر قبضہ کرلیا۔ ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہونے سے قبل سرزمین پاک و ہند کے باسیوں نے 1857ء میں ایک عام بغاوت کی تاکہ آخری بار انگریزوں کے خلاف قسمت آزمائی ہو سکے۔ یہ بغاوت اور ہنگامہ محض وقتی نہیں تھا بلکہ ایک عرصہ سے اس کی چنگاریاں ہندوستانی لوگوں کے جذبات خصوصی طور پر مسلمانوں کے جذبات کی خاکستر میں سلگ رہی تھیں۔ لارڈ ڈلہوزی کے مستعفی ہونے کے بعد لارڈ کیننگ (1856ء-1862ء) کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ کمپنی کی مجلس نظامت نے لندن میں لارڈ کیننگ کو ایک الوداعی پارٹی دی۔ اس پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ کیننگ نے کہا ''میری خواہش ہے کہ میرا عہد حکومت پرامن رہے، لیکن میں اس بات کو نہیں بھول

Marfat.com

سکتا کہ ہندوستان کی فضا میں بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دے گا۔ اتنا چھوٹا جتنا انسانی ہاتھ، لیکن یہ ٹکڑا اتنا بڑا ہوتا جائے گا کہ خود ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔''

اگلے سال بنگال آرمی کے فوجیوں نے بغاوت کر دی۔ انسانی ہاتھ اتنا بڑا بادل میرٹھ سے اٹھا۔ بادل بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ شمالی ہندوستان پر چھا گیا۔

1857ء کی بغاوت ایسے ہی اٹھ کھڑی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے پیچھے انگریزوں کا وہ ظلم وتشدد تھا جو سرمایہ دارانہ نظام کا ایک خاصہ اور ظالموں کی حکومت کی ایک تمہید تھا۔ عوام یہ سمجھتے تھے کہ جب ابھی سے کارکنان حکومت کے ظلم وتشدد اور وحشت و بربریت کا یہ عالم ہے تو ان کی حکومت کے مستقل طور پر قائم ہونے کے بعد کیا نتائج نکلیں گے۔

انگریزی حکومت نے ہندوستان میں کیا کچھ کیا اور لوگ ان کے خلاف اٹھنے پر کیوں مجبور ہوئے؟ اس کے کچھ سیاسی اسباب تھے اور کچھ معاشرتی وجوہات۔ کسی اور کتاب سے نہیں بلکہ سرسید احمد خان کی کتاب سے ان اسباب کو نقل کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے سرزمین پاک و ہند کے باسیوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر مجبور کیا۔ ان اسباب کو دیکھتے ہوئے قارئین کرام خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ 1857ء کی بغاوت میں جن لوگوں نے انگریزوں کی حمایت کی تھی وہ کہاں تک صحیح تھے؟ وہ نہ صرف وطن کے غدار تھے بلکہ دین وملت کے بھی دشمن تھے۔ اور انہوں نے ملت اسلامیہ کے ساتھ وہ غداری کی کہ ملت تا قیامت اسے فراموش نہیں کرسکتی۔ انہی لوگوں کی غداری بلکہ دھوکہ دہی کا نتیجہ تھا کہ ملت اسلامیہ اور مسلم قوم ڈیڑھ سو سال انگریزوں کی غلامی کے شکنجے میں کراہتی رہی۔ ہزاروں علماء نے پھانسیوں کے رسوں کو اپنی گردن میں ڈالا اور ہزاروں ہی کی تعداد نے دائمی جلاء وطنی کی زندگی گزاری۔ ان کی جائدادیں ضبط ہوئیں۔ اور وہ ساری عمر فاقہ کشی کی زندگی بسر کرتے رہے۔

اس بغاوت کے اسباب کیا تھے؟ سرسید احمد خان نے اس کے بارے میں ایک کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کے نام سے تحریر کی ہے، اس کے چند اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں تاکہ انگریزوں کی ان زیادتیوں کا پتہ چل سکے جو انہوں نے لوگوں پر روا رکھیں۔

-1 قوانین ضبطی اراضیات لاخراج جس کا آخر قانون 1819ء ہے، حکومت ہندوستان کو نہایت مضر تھا۔ ضبطی اراضیات نے جس قدر ناراض اور بدخواہ ہماری گورنمنٹ کا کر دیا تھا[1] اس سے زیادہ اور کسی چیز نے نہیں کیا تھا۔ سچ فرمایا تھا لارڈ مزد اور ڈیوک اور ولنگٹن صاحب بہادر نے کہ ضبط کرنا معافیات کا ہندوستانیوں سے دشمنی پیدا کرنی اور ان کو محتاج کر دینا ہے۔ میں نہیں بیان کر سکتا کہ ہندوستانیوں کو کس قدر ناراضگی اور دلی رنج اور ہماری گورنمنٹ کی بدخواہی اور نیز کتنی مصیبت اور تنگی معاش اس سبب سے ان کو تھی۔ بہت سی معافیات صدہا سال سے چلی آتی تھیں جو ادنیٰ ادنیٰ حیلہ پر ضبط ہو گئیں۔ ہندوستانی صاف خیال کرتے تھے کہ سرکار نے خود تو ہماری پرورش نہیں کی بلکہ جو جاگیر ہم کو اور ہمارے بزرگوں کو اگلے بادشاہوں نے دی تھیں وہ بھی گورنمنٹ نے چھین لیں۔ پھر ہم کو اور کیا توقع گورنمنٹ سے ہے۔

(اسباب بغاوت ہند: ص ۲۵۔۲۶)

ضبطیٔ جائداد کے ساتھ دوسرا قاعدہ نیلام زمینداری کا تھا، اس کے نتائج کے بارے سید احمد خان کی شہادت ہے کہ

"بعوض زر قرضہ نیلام حقیت کے رواج نے بہت فساد برپا کیے۔ مہاجنوں اور روپیہ والوں نے دم دے کر زمینداروں کو روپے دیئے اور قصداً ان کی زمینداری چھین لینے کو بہت فریب برپا کیے اور دیوانی میں ہر قسم کے جھوٹے سچے مقدمات لگائے اور قدیم زمینداروں کو بے دخل کیا اور خود مالک بن گئے۔ ان آفات نے تمام ملک کے زمینداروں کو ہلا ڈالا۔ (اسباب بغاوت ہند: ص ۲۸)

"ابتداء عملداری سے آج تک شاید کوئی گاؤں ایسا ہو گا جس میں

ا۔ ملاحظہ فرمائیے وہ بدیشی حکومت جس نے اہل اسلام کو ذلیل کر کے رکھ دیا اور ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے۔ مسلم اوقاف کو بحق سرکار بلکہ بحق عیسائیت ضبط کیا اس حکومت کو سرسید احمد خان اپنی گورنمنٹ کہہ رہے ہیں۔ تفو برتو اے چرخ گرداں تفو۔

Marfat.com

تھوڑا بہت انتقال (ردّوبدل) نہ ہوا ہو۔ ابتداء میں ان نیلاموں نے
ایسی بے ترتیبی سے کثرت پکڑی کہ تمام ملک الٹ پلٹ ہو گیا۔"

(اس سلسلہ میں مسٹر کئی (Kay) نے بنگال کے ایک مقدمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں چار روپیہ کی ڈگری کے عوض ایک جاگیر کے نیلام کا حکم دے دیا گیا تھا۔ حاشیہ صفحہ 178 بحوالہ 1857ء از مولانا غلام رسول مہر)

اس اقتباس میں چونکہ مہاجنوں کا ذکر ہے لہٰذا واقعہ کی صحیح تصویر نظر میں لانے کے لیے مسئلہ سود کا بھی صحیح خاکہ ذہن میں رکھیئے۔

بے شک ہندوستان میں سود کا رواج ہمیشہ سے رہا لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی وحشیانہ بھوک معمولی سود سے نہیں مر سکتی تھی۔ اس نے سود در سود (Compound Interest) کا قانون بنایا جس کی ٹھنڈی مار نے تھوڑے ہی دنوں میں ہندوستان کا اقتصادی ڈھانچہ درہم برہم کر دیا۔ بڑے بڑے گھرانے ختم ہو گئے۔ ان کے سایہ میں پرورش پانے والے ہزاروں لاکھوں نفوس اناج کے ایک ایک دانہ کے محتاج ہو گئے اور دولت کے یہ انبار یورپ کے ساہوکاروں یا ان ہندوستانی مہاجنوں کی تجوریوں میں بند ہو گئے جن کے باورچی خانہ کا دھواں بھی کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

آج سوشلزم اور کمیونزم کے دور میں زمینداری کا لفظ ایسا ناگوار ہو گیا ہے کہ کان اس کا نام بھی سننے کے لیے تیار نہیں، لیکن اس جاگیرداری اور زمینداری کے بارے سرسید سے سنیئے۔ سرسید اگرچہ زمینداروں کے حامی نہیں ہیں مگر جو بات حق ہے اس کا اظہار وہ بھی ضروری سمجھتے ہیں لکھتے ہیں:

"اگر خیال کیا جائے تو ہندوستان میں ہر ایک محال زمینداری کا "ایک چھوٹی سی سلطنت" دکھائی دیتی ہے۔ قدیم سے دستور ہے کہ سب کی رضامندی سے ایک شخص سردار ہوتا ہے۔ وہ ایک بات تجویز کرتا تھا اور ہر ایک حقیت دار کو بقدر اپنے حصہ زمینداری کے بولنے کا دخل دینے کا اختیار ہوتا تھا۔ رعیت باشندۂ دیھ (گاؤں میں رہنے والوں کے) چودھری بھی حاضر ہو کر کچھ کچھ گفتگو کرتے

Marfat.com

تھے۔ اگر کسی مقدمہ نے زیادہ طول پکڑا تو کسی بڑے گاؤں کے مقدم اور سردار کے حکم سے فیصلہ ہو گیا۔ ہندوستان کے ہر ایک گاؤں میں بہت خاصی صورت ایک چھوٹی سلطنت اور پارلیمنٹ کی موجود تھی۔'' (اسباب بغاوت ہند: ص ۲۷)

زمینداری اور جاگیرداری کے دور میں عدل و انصاف اور شہری حقوق کی ادائیگی کی یہ ایک صورت تھی۔ دوسری بات یہ کہ ان زمینداروں اور جاگیرداروں کا سلوک ان کے ساتھ جن کو رعایا کہا جاتا تھا، ایسا ہوتا تھا۔ اس بارے میں ایک دو نہیں سینکڑوں تاریخی مثالوں کی شہادت یہ ہے کہ زمیندار اور رعایا اور راجہ و پرجا کا باہمی تعلق محبت و خیر خواہی، پرورش اور وفاداری کا ہر دل عزیز رشتہ ہوتا تھا۔

یورپین نفع اندوزوں کی آمد کے بعد جب استحصال بالجبر، نفس پرستی، بے دردانہ قتل و غارت اور انسانی حقوق سے بے پروائی اور بے تعلقی کے ناپاک تحفے جگہ جگہ تقسیم ہونے لگے اور بے مروتی، خود غرضی اور محنت کش نے سکۂ رائج وقت کی حیثیت اختیار کر لی تو کچھ زمینداروں اور جاگیرداروں نے بھی وہ ظلم و تعدی اور وحشت و بربریت اختیار کی جس کی مثالیں پیش کر کے موجودہ نسلوں کو اپنے پیش رو بزرگوں سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ مگر اسی گئے گزرے دور میں، جبکہ یورپین نفع اندوزوں کو قدم جمائے ہوئے ڈیڑھ سو برس گزر چکے تھے، وہ مثالیں بھی سامنے آتی ہیں جن کی شہادت یہ ہے کہ بادِ سموم کی تمام آتش انگیزیوں اور شعلہ افشانیوں کے باوجود رعایا پروری اور غرباء نوازی کے چمن اب بھی بالکل خشک نہیں ہوئے تھے۔ محنت کش طبقہ کسی بھی عنوان سے جب اپنے زمینداروں اور جاگیرداروں کی پناہ ڈھونڈتا تھا تو یہ خزاں رسیدہ چمن اور گلشن تازگی اور آسودگی کی بخشش میں فراخ حوصلگی کی مردہ روایتیں زندہ کرنے میں کوتاہی نہیں کیا کرتے تھے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے نامور جاگیردار بہادر شاہ ظفر کی سیر چشمی اور فراخ حوصلگی کی صرف ایک روایت جو دہلی کے دیہات میں مشہور ہے، پیش کی جاتی ہے۔ وہ بھی اس جاگیردار کی زبانی نہیں بلکہ ایک دہقان کی زبان سے سنیئے:

''غدر سے پہلے پرانے قلعے کی دھرتی میں باجرا بہت اچھا پیدا ہوتا

Marfat.com

تھا۔ یہ دھرتی ہمارے پاس تھی۔ ہم پر سرکاری لگان صرف یہ تھا کہ بادشاہ سلامت کے کبوتروں کے واسطے ہل پیچھے سوا سیر باجرہ دینا پڑتا تھا۔

بوڑھے دہقان نے کہا۔ گوجروں کی قوم بہت شریر ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ہم لوگوں کے دل میں شرارت آئی۔ ہم نے سوچا کہ اس مرتبہ باجرے کو بھی گول کر جاؤ اور بادشاہ سلامت کو کسی طرح پھسلا دو۔ بات یہ تھی کہ اس سال برکھا کچھ کم ہوئی تھی۔ اگر ہم ایسے ہی سیدھی طرح بادشاہ سلامت سے معافی مانگ لیتے تو لگان معاف ہو جاتا، مگر ہمیں چال سوجھی کہ ہم نے باجرے کی بالیں صفائی سے کاٹ لیں اور خالی پودے کھیتوں میں کھڑے رہنے دیئے۔ پھر سارے کسان لال قلعہ کے جھروکوں کے سامنے جمنا کی ریت پر جا پڑے اور بادشاہ سلامت کو دہائی کا شور مچانے لگے۔ شور وغل کی آواز بادشاہ تک پہنچی تو جہاں پناہ نے جھروکوں میں آ کر ہمیں درشن دیئے ''کیا بات ہے؟ کیا شور ہے؟'' جہاں پناہ کے ایک نقیب نے دریافت کیا۔

''سرکار ہم لٹ گئے۔ کھاری باؤلی کے بنیوں نے باجرے کا بیج جانے کیسا دیا کہ پیڑ تو خوب اُگ آئے۔ ہرے بھرے بھی خوب ہیں لیکن بال ایک بھی نہیں آئی۔ اب ہم جہاں پناہ کے کبوتروں کا باجرہ کیسے ادا کریں گے۔ اس سال لگان معاف کر دیا جائے کسانوں نے یہ درخواست کی۔''

''اچھا کل ہم خود موقع پر پہنچ کر ملاحظہ کریں گے۔ پھر حکم دیں گے۔'' بادشاہ نے جواب دیا۔ چنانچہ دوسرے دن شام کے وقت بادشاہ سلامت ہوادار پر سوار ہو کر پرانے قلعے آئے۔ کھیتوں کو ملاحظہ فرمایا۔ وہاں کوئی بال چھوڑی ہوتی تو نظر آتی۔ بادشاہ

سلامت نے دور ہی سے کھیتوں پر نظر ڈال کر فرمایا ''اماں![1] گوجروں کی فریاد ٹھیک ہے۔ کھاری باؤلی کے بنیوں نے بڑا دھوکہ کیا۔ کل انہیں بلواؤ۔ اچھا جاؤ، اس سال لگان معاف۔''

دہقان کا کہنا ہے کہ گاؤں کے سمجھدار مکھیا وغیرہ اس کھیل میں شریک نہیں تھے۔ وہ بخار کا بہانہ بنا کر گھروں میں لیٹ گئے تھے۔ انہیں خیال تھا کہ بادشاہ سلامت ایسے بے وقوف نہیں ہے۔ وہ جب پیڑ دیکھیں گے، اصل بات سمجھ جائیں گے۔ پھر ان کی خفگی جانے کیا رنگ لائے۔

بات بھی یہی تھی۔ بادشاہ سلامت ایسے بے وقوف نہیں تھے۔ مگر یہ رعایا کا ناز تھا اور وہ ناز برداری اور رعایا پروری۔ سچ ہے ''آدمی آدمی انتر ہے کوئی ہیرا ہے کوئی کنکر ہے۔''

(افسانۂ غم: ص ۱۴۷)

اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ کو اس زمینداری اور جاگیرداری نظام میں ملیں گی۔ زمینداروں کا ظلم وستم تو زیادہ تر ان گوری چمڑی والوں کی آمد کے بعد شروع ہوا۔ بادشاہ سلامت اچھے تھے یا برے۔ بادشاہ بیگم کا کردار کیا تھا۔ ان سب سے قطع نظر یہ ہمدردی اور وطن کے دکھی انسانوں سے یہ میل جول وہ جوہر ہے جو اس جاگیرداری اور زمینداری میں کمیاب نہیں تھا۔

پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے صرف جاگیرداری نظام ہی میں خرابیاں پیدا نہ کی تھیں بلکہ اس کمپنی نے اپنے دور تسلط میں جاگیرداری سے کہیں زیادہ صنعت وتجارت کو برباد کر دیا تھا۔ اور وہ ہندوستان جو علوم وفنون میں تمام دنیا سے فائق، فراوانیٔ دولت میں سونے کی چڑیا، خوش حالی میں رشک اِرم اور راحت وآرام میں جنت نشان مانا جاتا تھا، اس کو انتہائی بے دردی سے اور خود غرضی سے تباہ کاری اور غارت گری کا تختۂ مشق بنا کر اتنا برباد کر دیا تھا کہ اب وہ علم و ہنر سے تہی دامن، قحط زدہ، فاقہ مست اور کاشتکاروں اور بے ہنر مزدوروں کا ویران خانہ بن کر رہ گیا تھا۔ کہیں کہیں کوئی شمع باقی رہ گئی تھی تو لارڈ ہیسٹنگز اور لارڈ ڈلہوزی جیسے ستم ایجاد گورنر جنرلوں کی پھونکیں ان کو بھی بجھا چکی تھیں یا بجھا

۱۔ بادشاہ کا تکیہ کلام تھا۔ ارے میاں کے بجائے اماں کہا کرتے تھے۔

Marfat.com

رہی تھیں۔ تاریخ ہندوستان کی یہ المناک حقیقتیں اتنی واضح ہو چکی ہیں کہ تحریر کی ضرورت نہیں۔ تفصیل درکار ہو تو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کی نقش حیات جلد اول کا مطالعہ فرمائیں۔

سرسید احمد خان نے اس بارے میں لکھا ہے کہ

''اہل حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیاء تجارت ولایت کے بالکل جاتا رہا یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ پارچہ بافوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اسی وجہ سے سب سے زیادہ اس ہنگامہ میں یہی لوگ گرم جوش تھے۔''

(اسباب بغاوت ہند:ص ۳۶)

یہ تو جاگیرداری اور صنعت وحرفت کے بارے میں تھا، لیکن عام لوگ جو نہ جاگیردار تھے نہ معافی دار اور نہ سرمایہ دار، ان کے تأثرات بھی سرسید احمد خان نے نقل کیے ہیں وہ بھی اس بدیشی حکومت سے سخت نالاں تھے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ

''ہندوستان کی رعایا روز بروز مفلس ہوتی جاتی تھی۔ ٹیکس کی زیادتی نے زمینداروں اور کاشتکاروں کو تباہ کر دیا تھا۔ بقایا وصول کرنے کے لیے زمینداریاں نیلام کرائی جاتی تھیں جو ہندوستان میں بالکل نیا دستور تھا۔ ولایتی مال کی آمد نے اہل حرفہ کو برباد کر دیا تھا۔ بایں ہمہ حکومت نے پرامیسری نوٹ جاری کر دیئے جس پر مالک سے سود وصول کیا جاتا تھا۔ اگلی عملداریوں میں شاہی انعام و اکرام آسودگی رعایا کا ایک مستقل ذریعہ تھا۔ جب شاہ جہان تخت پر بیٹھا تو صرف تخت نشینی کے دن چار لاکھ بیگہ زمین اور ایک سو بیس گاؤں اور لاکھوں روپے انعام دیئے تھے۔ یہ بات ہماری گورنمنٹ میں یک قلم مسدود تھی، بلکہ پہلی جاگیریں بھی ضبط ہو گئی تھیں۔ اس عام افلاس کا نتیجہ تھا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر

رکھنا چاہا تو جیسے بھوکا آدمی قحط کے دنوں میں اناج پر گرتا ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جا گرے۔ بہت سے آدمی صرف آنہ یومیہ پر نوکر ہوئے تھے اور بہت سے آدمی سیر ڈیڑھ سیر یومیہ اناج پاتے تھے۔''

آخر میں سرسید نہایت جوش میں لکھتے ہیں:

''غرض کہ ملک ہر طرح سے مفلس ہو گیا تھا۔ اگلے خاندان جن کو ہزاروں کا مقدور تھا، معاش سے بھی تنگ گئے تھے۔ اور یہ اصلی سبب ناراضگی رعایا کا گورنمنٹ سے تھا۔

لوگوں کے دل جو تبدیلی عملداری کو چاہتے تھے اور نئی عملداری کے لیے راغب اور دل سے اس سے خوش تھے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اسی سبب سے تھے۔ ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں کہ جب افغانستان سرکار نے فتح کیا تو لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ کیا سبب تھا؟

صرف یہ سبب تھا کہ اب مذہب پر علانیہ دست اندازی ہو گی۔ جب گوالیار فتح ہوا۔ پنجاب فتح ہوا۔ اودھ لیا گیا تو لوگوں کو کمال رنج ہوا۔ کیوں ہوا؟ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی۔ نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں۔ ہر قسم کی ہندوستانی اشیاء کی تجارت بکثرت تھی۔ ان عملداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی جاتی تھی۔'' (اسباب بغاوت ہند: ص ۳۵۔۳۷)

یہ تو اقتصادیات اور صنعت و حرفت کی تباہی تھی، لیکن انگریزوں نے تو مذہب و تہذیب کو بھی برباد کر دیا تھا۔ مذہب اور تہذیب انقلاب کا ایک بہت بڑا محرک ہے اور ایسا طاقتور جذبہ ہے جو انسان کو ہر ایک قربانی پر آمادہ کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ موت کو حیات اور فنا کو بقا سمجھنے لگتا ہے۔

Marfat.com

مذہب بسا اوقات ذاتی رجحانات کا نتیجہ ہوتا ہے اور تہذیب کو انسان اپنا خاندانی اور آبائی ترکہ تصور کرتا ہے۔ جس طرح موروثی جائداد کی حفاظت کے لیے جان ہتھیلی پر لیے رہتا ہے اسی طرح حفاظت تہذیب کے لیے بھی وہ ہمیشہ کفن بردوش رہتا ہے۔

سرسید کا بیان ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، اقتصادیات و معاشیات دین و مذہب غرضیکہ ہرشی تباہ و برباد کرنے کا عزم کر رکھا تھا اور سرسید اور مرزا غلام احمد قادیانی جیسے لوگ پھر بھی انگریزوں کی حمایت میں سرگرداں تھے۔ اور لوگوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت نہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حضرات میں نہ دینی حمیت تھی اور نہ قومی غیرت۔ ہم نے سرسید کے اتنے لمبے اقتباسات صرف اس لیے دیئے ہیں تاکہ پتہ چلے کہ باوجود اس بات کے کہ سرسید احمد خان یہ جانتا تھا کہ انگریز ہندوستانیوں پر اور خصوصی طور پر مسلمانوں پر زیادتی کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود سرسید احمد خان اور اس کے ساتھی انگریزوں کی ناجائز حمایت پر ادھار کھائے ہوئے ہیں۔

سرسید کے ذہن میں انگریزوں کی اتنی محبت اور عقیدت بھری ہوئی تھی کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بارے میں جب علماء نے فتویٰ دیا تو سرسید بہت سیخ پا ہوئے۔ اور جو کچھ منہ میں آیا اُن کے خلاف کہہ دیا۔ چنانچہ اپنی مشہور کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں ایک جگہ فرمایا:

> ''اور یہ جو ہر ضلع میں باجی (1) اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا۔ اگر ہم اس کو جہاد ہی فرض کریں تو بھی اس کی سازش و اصلاح قبل دسویں مئی 1857ء مطلق نہ تھی۔ غور کرنا چاہیے کہ اس

ا۔ یہ باجی اور جاہل کے القاب کن لوگوں کو دیئے جا رہے ہیں؟ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا احمد شاہؒ، حضرت مولانا لیاقت علیؒ، حضرت مولانا فیض احمدؒ، حضرت مولانا کفایت علیؒ اور حضرت مولانا مفتی عنایت احمد کاکورویؒ جیسے اکابر علماء کے لیے یہ الفاظ القاب استعمال کر رہے ہیں؟

Marfat.com

زمانہ میں جن لوگوں نے جھنڈا اسلام کا بلند کیا ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ ورنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا۔ بھلا یہ کیونکر پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جاسکتے تھے۔ اس ہنگامے میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب جو امانت تھا، اس میں خیانت کرنا، ملازمین کو نمک حرامی کرنی مذہب کی رو سے درست نہ تھی۔ صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں، بچوں اور بڈھوں کا، مذہب کے بموجب گناہ عظیم تھا، پھر کیونکر یہ ہنگامۂ غدر جہاد ہوسکتا تھا؟ ہاں البتہ چند بدذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورے کرنے اور جاہلوں کے بہکانے کو اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام دے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرامزدگیوں میں سے ایک حرامزدگی تھی نہ واقع میں جہاد۔''

(اسباب بغاوت ہند: ص۱۵۶)

یہ سرسید احمد کی سیاسی سرگرمیاں تھیں جو پوری ملت مسلمہ سے الگ تھیں۔ جہاں تک دینی عقائد کا تعلق ہے وہ بھی، جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، اسلام سے خاصے ہٹے ہوئے تھے۔ دین کے معاملہ میں بھی انہوں نے ہر وہ کام کیا جس سے اُن کا آقا انگریز خوش ہو۔ چنانچہ 1862ء میں سرسید نے ''تبیان الکلام'' نامی ایک کتاب لکھی جس میں اُنہوں نے انجیل میں تحریف واقع ہونے کا انکار کیا، حالانکہ خود عیسائی علماء انجیل میں تحریف کا اقرار کرتے ہیں۔ اور پادری فنڈر کا حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ سے جو مناظرہ آگرہ میں ہوا تھا، اس میں بھی اس نے تحریف کا اقرار کیا، لیکن سرسید نے صرف اور صرف انگریزوں کی خوشنودی کے لیے تحریف کا انکار کیا۔ سرسید نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس کے ''خاص مقاصد'' تھے، قرآن حکیم کی آیات کی تحریف اور وہ مضامین نشر کرنا جن سے انگریز خوش ہو اور مسلمانوں کی جماعت میں تشتت وافتراق پیدا

Marfat.com

ہو۔ عیسائی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے اور مغربی افکار کی نشرو اشاعت کے لیے انگریزوں نے ایک علمی ادبی انجمن بنانے میں بھی سرسید سے تعاون کیا۔

1875ء میں غازی پور میں ملکہ وکٹوریہ کالج اور علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کرنے میں انگریزوں نے اس کی بہت مدد کی۔ یہ درحقیقت دینی مدارس پر ایک حملہ تھا جو مغرب کی رو میں نہیں بہنا چاہتے تھے۔ علی گڑھ تحریک کے خاص مقاصد حسب ذیل تھے:

1- مسلم خواتین کی آزادی اور مغربی عورتوں کی تقلید کی دعوت

2- اسلام اور عیسائیت میں ہم آہنگی پیدا کرنا (دوسرے لفظوں میں اسلام کو عیسائیت کی طرف دھکیلنا نہ کہ عیسائیت کو اسلام کے قریب لانا)

3- انگریزوں کے خلاف جہاد نہ کرنے کی دعوت دینا کیونکہ وہ اولی الامر ہیں اور مسلمانوں سے زیادہ قوی ہیں۔

4- مسلمانوں کو جامد افکار سے آزاد کرنا اور مغربی تہذیب میں پوری طرح رنگ دینا کیونکہ نجات کا یہی ایک راستہ ہے۔

(الصعیدی: المجددون فی الاسلام: ص ۴۸۴، البہی: الفکر الاسلامی الحدیث: ص ۴۱-۴۲، انوار الجندی: العالم الاسلامی والاستعمار: ص ۱۰۴، برنارد لولیس: الغرب والشرق الاوسط: ص ۱۵۵)

سرسید نے جس انداز سے قرآن حکیم کی تفسیر لکھی تھی وہ تفسیر کم اور تحریف زیادہ تھی۔ اور انجیل کی تفسیر لکھنا بھی شروع کیا تھا جو کہ اسلام اور عیسائیت کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کی ایک نمایاں ناپاک کوشش تھی۔ علی گڑھ تحریف کے بارے میں مسلمان علماء کا یہ خیال ہے کہ وہ عیسائیت اور استعمار کی خدمت کا ایک طریقہ کار تھی۔ اور علی گڑھ کالج نے وہ نسل پیدا کی جنہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کو حکومت کرنے میں اعانت کی۔ اس کالج نے نوجوان نسل کو مفید علوم عصری تو نہیں دیئے البتہ ادب وفن کا علم عطا کیا ہے، اس تحریک نے ہماری دنیا کی بہتری سے زیادہ ہمارے دین کو برباد کیا ہے۔ اس سے مسلمانوں میں ''اینگلو محمڈن'' اور ''اینگلو انڈین'' نسل پیدا ہوئی جس کی نفسیات کی ترکیب میں ''محمڈن'' عناصر کم اور ''انگریزی'' عناصر زیادہ تھے۔

Marfat.com

جب ہمیں یہ پتہ چل گیا کہ ان عیسائی اداروں کا مقصد ایک ایسی نسل کا تیار کرنا ہے جس کا نہ اپنے دین پر ایمان ہو اور نہ اپنی تاریخ سے آشنائی۔ اس کے قلوب عقائد اسلام کے بارے میں شبہات اور طعن و تشنیع سے بھرے ہوئے ہوں اور ان کی دعوت مغربی تہذیب و تمدن کو اپنانے کی ہو، اس سے ہمیں یہ پتہ بھی چل گیا کہ سر سید احمد خان نے یہ تعلیمی ادارے قائم کر کے قوم و ملت کی کیا خدمت سرانجام دی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان سب اداروں کے قیام سے سر سید احمد خان کا مقصد ہندوستان میں عیسائی استعماری تعلیمی سیاست کو فروغ دینا تھا۔ چنانچہ ان تعلیمی اداروں کے اثرات عیسائی تعلیمی اداروں سے بھی زیادہ بڑے پڑے۔

شاتلیہ نے مشورہ دیا تھا کہ ملک کے باشندے اگر عیسائی اداروں سے گریز کریں تو حکومت کو ایسے سیکولر (Secular) ادارے قائم کرنا چاہئیں جن کو چلانے والے ملک کے ایسے باشندے ہوں، جن کی تربیت مغربی انداز سے ہوئی ہو۔ سر سید کی تحریک کو عیسائی مشنریاں کس نقطۂ نظر سے دیکھتی تھیں، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ 1906ء میں قاہرہ (مصر) میں منعقد ہونے والی مشنری کانفرنس میں اس تحریک پر بحث کی گئی۔ شاتلیہ کے الفاظ یہ ہیں:

> ”..........اس کانفرنس میں اس تحریک کو بھی موضوع بحث بنایا گیا جو ہندوستان میں داخل ہو چکی تھی اور سر سید احمد خان اس کے قائد تھے۔ علی گڑھ میں سر سید کے کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شکل میں جو کوششیں ہو رہی تھیں، وہ بھی کانفرنس کے پیش نظر تھیں۔ پادری ویٹبر ٹشٹ نے ”جدید اسلام“ کے عنوان پر تقریر کی اور اس میں بتایا کہ یورپ کی تعلیمات مسلمانوں کو عیسائیت سے قریب لا رہی ہیں۔ قاہرہ کی اس عیسائی کانفرنس نے سر سید احمد خان کی اس تحریک کو اپنے مفہوم کے مطابق ایک اصلاحی تحریک قرار دیا اور بتایا کہ قائد تحریک اس کی کامیابی کے لیے بہت زیادہ کوشش کر رہے ہیں۔“ (الغارۃ علی العالم الاسلامی: ص ۵۰)

Marfat.com

شیخ ابراہیم خلیل احمد نے ایک موقع پر کہا ہے کہ ''سر سید احمد خان استعماری قوتوں کے شاگرد ہیں اور وہ انگریزوں کی مصلحتوں کی پاسبانی کر رہے ہیں۔ گویا اسلام کے تحفظ سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔''

(ابراہیم خلیل احمد: الاستشراق والتبشیر وصلتھا بالامبریالیہ العالمیۃ: ص ۷۵)

اپنی تاریخ اور تہذیبی اقدار سے دوری، اسلامی عقائد کا استخفاف، ہر شی میں مغرب کی تقلید اور آزادیٔ نسواں جیسے مشنری مقاصد اگر کسی کی نظر میں ہوں تو وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک سے انگریزوں کے سامراجی اور مشنری مقاصد کو بروئے کار لانے میں اس سے کیا مدد مل سکتی تھی؟

ان دو آدمیوں کے علاوہ ایک اور شخص تھے جن کا انتخاب انگریزوں نے صرف اس لیے کیا کہ وہ علماء ربانی جن سے انگریزوں کو اپنی حکومت کی مضبوطی (Stablity) میں خطرہ تھا اور جن لوگوں نے انگریز کے خلاف جہاد کیا تھا یا جہاد کرنے والوں کی مدد کی تھی، ان پر کفر کے فتوے لگائیں اور وہابی یا اس قسم کے غلط خطابات دے کر ان کے وقار کو عوام میں مجروح کریں تاکہ دین کے بارے میں عوام ان کی بات پر کان نہ دھریں۔

یہ ذات ستودہ صفات مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے اہل السنّت والجماعت کو جن کی سرزمین پاک و ہند میں اکثریت تھی، دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ اہل سنت کے دو طبقوں میں کچھ رسمی اختلافات اٹھے۔ ان حضرات نے ان اختلافات کو اتنا بڑھایا کہ کفر و اسلام تک کے فاصلے قائم ہو گئے۔ مسائل میں اختلاف کوئی نئی بات نہیں۔ اہل علم کے درمیان اختلاف ہوتا ہی ہے۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں میں بھی بعض مسائل میں اختلاف ہوتا ہے۔ ایسے اختلاف فقہاء و محدثین میں بھی تھے، لیکن اسلاف نے ان اختلافات کو کبھی علیحدگی کا نشان نہیں بنایا تھا۔ اختلاف میں نظر دلیل پر رہتی ہے لیکن تفریق میں نفرت اور علیحدگی پر۔ اختلاف میں مخاطب علماء کرام ہوتے ہیں۔ دلائل پیش ہوتے ہیں۔ بحثیں ہوتی ہیں، لیکن تفریق میں مخاطب عوام ہوتے ہیں۔ اُن سے دلائل کی بجائے جذبات سے بات ہوتی ہے۔ الزام تراشی ہوتی ہے اور نفرتیں بڑھتی ہیں۔

Marfat.com

اس تفریق کی بنیاد مولانا احمد رضا خان نے ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان دو ٹکڑوں میں بٹ گئے اور ایسے بٹے کہ کہیں ایک ہوتے نظر نہیں آتے۔ مسلمان دو ٹکڑے کیسے ہوئے؟ وہ علماء کرام جو تحریک آزادیٔ وطن میں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما تھے اور امت مسلمہ کی بہتری اور ان غیر ملکی درندوں سے مادر وطن کو آزاد کرانے کے لیے اپنی راتوں کی نیندیں اور دن کا آرام غارت کیے ہوئے تھے، مولانا احمد رضا خان صاحب نے ان کے خلاف کچھ الزامات تصنیف کیے۔ یہ اختلافات نہ تھے بلکہ الزامات تھے، کیونکہ اختلافات میں سمجھنا سمجھانا ہوسکتا ہے لیکن الزامات میں صرف علیحدگی مقصود ہوتی ہے۔ مولانا احمد رضا خان صاحب اختلافات کی راہ سے محاذ تکفیر پر نہ آسکتے تھے لہٰذا اختلافات کی بجائے الزامات کی راہ کو اختیار کیا گیا۔

مولانا احمد رضا خان صاحب الزامات کی راہ سے تکفیر کی منزل پر پہنچے۔ اور پھر جو تکفیر کی ایسی توپ داغی کہ کوئی عالم بھی ان کی تکفیر سے نہ بچ سکا۔ ان کی نگاہ میں تمام علمائے دیوبند کافر، ہر وہ عالم کافر جس نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔ لوگ انہیں "مکفر المسلمین" (مسلمانوں کو کافر بنانے والا) کا خطاب دینے لگے۔ چنانچہ ان کے اپنے مکتب فکر کے ایک مجلّہ نے ان کے بارے میں لکھا کہ:

> "آج کا سنجیدہ انسان اس طرف رخ کرنے سے جھجکتا ہے۔ عام طور پر امام احمد رضا خان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ "مکفر المسلمین" تھے۔ بریلی میں انہوں نے کفر ساز مشین نصب کر رکھی تھی۔ آج ایشیا میں جتنے بھی سائنسی ادارے ہیں وہاں امام احمد رضا پر کام تو درکنار نام بھی نہ ملے گا۔" (ماہنامہ المیز ان بمبئی، احمد رضا نمبر: ص ۲۹)

ان "مکفر المسلمین" کی فتاویٰ کی زبان ملاحظہ فرمائیں۔ ایک استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں:

> "وہابی، قادیانی، دیوبندی، نیچری، چکڑالوی، جملہ مرتدین کہیں کہ ان کے مرد یا عورت کا تمام جہان میں جس سے نکاح ہوگا، مسلم ہو کافر اصلی یا مرتد، انسان ہو یا حیوان محض باطل اور زنا خالص ہوگا

اور اولاد ولد الزنا۔'' (ملفوظات حصہ دوم: ص ۱۰۰)

مولانا احمد رضا خان کفر کے اس قسم کے فتوے دینے میں اکیلے نہ تھے بلکہ تفریق کی جو خلیج انہوں نے پیدا کی تھی، اس میں انہوں نے اپنے بہت سے ساتھی پیدا کر لیے جنہوں نے مولانا محمد علیؒ، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، چودھری افضل حق اور دیگر اکابر امت پر کفر کے فتوے جڑ دیئے۔ اوران لوگوں کی نگاہ میں سوائے ان کے اپنے چند ایک عالمانِ دین کے پاک و ہند کے سارے عالم کافر تھے، کیونکہ انہوں نے انگریزوں کی ایک ایسی عینک لگائی ہوئی تھی کہ انہیں سوائے کفر کے کچھ اور نظر ہی نہیں آتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہہ لیجیے کہ ''تکفیر کی تلوار لے کر ہر کسی کو قابل گردن زنی قرار دینے والے فرد کا نام سرزمین پاک و ہند میں مولانا احمد رضا خان ہے۔ اسی وجہ سے ان ''مکفر المسلمین'' کے صاحبزادے مولانا حامد رضا خان ایک مرتبہ 1930ء میں پنجاب آئے تو روزنامہ زمیندار میں حضرت مولانا ظفر علی خان صاحبؒ نے ان کا ان الفاظ میں استقبال کیا۔

اوڑھ کر احمد رضا خان آئے بدعت کا لحاف
ذات ان کی ہے مجدد بات ان کی لام کاف
مانچسٹر کے کفن سازوں سے لایا ہے ادھار
شرک کی انٹی بریلی کا یہ بڈھا نور باف
پیکر طاغوت ہے یا ہے رضائے مصطفےٰ
باپ تھا اس لاش کا سر اور بیٹا اس کی ناف
مشغلہ ان کا ہے تکفیر مسلمانانِ ہند
ہے وہ کافر جس کو ہو ان سے ذرا بھی اختلاف
جب سے پھوٹی ہے بریلی میں کرن تکفیر کی
دید کے قابل ہے ان کا انعکاس و انعطاف
زندگی اس کی ہے ملت کے لیے پیغام موت
کر رہا ہے جو بجائے کعبہ قبروں کا طواف

تاریخ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ قادیانی اور رضا خان

Marfat.com

دونوں تحریکوں کا سرچشمہ ایک تھا اور دونوں کے پیچھے انگریز بہادر کارفرما تھے۔ دونوں کی بنیاد ان دو اصولوں پر تھی۔

1- سرزمین پاک و ہند میں انگریزی سامراجیت کو استحکام بہم پہنچانا۔ آزادی کی تمام تحریکات کی مخالفت کرنا اور مسلمانوں کو انگریزوں سے جہاد سے منع کرنا۔

2- مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا کرنا تاکہ یہ اپنے سوا دوسروں کو کافر سمجھیں اور مسلمانوں میں ایسی علیحدگی کے فاصلے پیدا کرنا جو پھر کبھی مٹ نہ سکیں اور ملت اسلامیہ مستقل طور پر گروہوں میں بٹ جائے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی کے والد ماجد سید عبدالحی، مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کے بارے میں لکھتے ہیں

"دشمنی اور خصومت میں بہت ہی زیادہ سخت تھے۔ اپنی ذات اور اپنے علم پر گھمنڈ کرتے تھے۔ ہر اصلاحی تحریک کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔"

(نزہۃ الخواطر: جلد ۷ تحت احمد رضا)

قادیانی اور رضا خانی نظریات مندرجہ ذیل عنوانات پر آپس میں مشترک تھے۔

1- انگریزوں سے خاندانی وفاداری

2- انگریزوں کی تعریف

3- جہاد کی ممانعت

4- ترک موالات کی مخالفت

5- ماموریت کا دعویٰ

6- مسلمانوں کی عام تکفیر

7- تحریک خلافت کی مخالفت

8- انگریزی حکومت سے امیدیں

9- قرآن حکیم میں تحریف لفظی کی کوشش

10- حرمین شریفین اور دیگر صحیح عقائد رکھنے والے ائمہ کے پیچھے نماز ناجائز قرار دینا۔

غرض کہ یہ وہ لوگ تھے اور یہ وہ تحریکات تھیں جو انگریزی حکومت کے استحکام

Marfat.com

میں اس کی معاون بنیں اور انہوں نے جہاں ایک طرف مسلمانوں میں تشتت وافتراق کی تخم ریزی کی وہاں دوسری طرف انگریزوں کی جائز وناجائز حمایت کر کے ان کا حق نمک ادا کیا۔ ان تحریکوں کے بانیوں کے رویوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود کچھ نہیں کر رہے بلکہ ان کے پیچھے انگریزوں کا غیبی ہاتھ ہے جو ان سے کچھ کروا رہا ہے۔ اور وہی کچھ کروا رہا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

ان معاون تحریکات سے ہندوستان میں انگریزی سامراجیت اور مشنریوں کو جو تقویت ملی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ سامراجی اور مشنری جدوجہد سے ہندوستان میں بہت سی غیر مسلم تحریکوں نے بھی جنم لیا جن کی خطرناکی علی گڑھ تحریک، قادیانیت اور رضا خانیت سے کہیں زیادہ تھی۔ چنانچہ 1875ء میں بمبئی میں سوامی دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک نے غیر ملکیوں کے خلاف علم عداوت و بغاوت بلند کیا۔ غیر ملکیوں سے ان کی مراد انگریز اور مسلمان تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں سے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اپنے اصل دین (ہندومت) کی طرف واپس آجائیں۔ جس طرح حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے عیسائی پادریوں سے زبردست مناظرے کیے، اسی طرح حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ نے آریوں سے زبردست مناظرے کر کے دین وملت کی بہت بڑی خدمت انجام دی تھی۔

ان غیر مسلم تحریکوں میں سب سے زیادہ خطرناک مہاسبھائی تحریک تھی جو 1922ء میں قائم ہوئی۔ اس کے لیڈر بابا ہردیال نے ایک بار کہا تھا۔ ''ہندو رگ وخون کا مستقبل چار چیزوں کا محور ہوگا۔ اسلام کا مقابلہ، ہندو ریاست کا قیام، مسلمانوں کو ہندو بنانے کی مہم اور افغانستان پر قبضہ تاکہ وہاں کے باشندے بھی ہندومت میں داخل کیے جا سکیں۔'' اس نے ہندوستان میں مسلمانوں کے رہنے کی یہ شرط بتائی تھی کہ اپنے عربی اور اسلامی نام بدل دیں۔ ہندوؤں کا سا لباس پہنیں۔ ہندوؤں کی شخصیتوں کا احترام کریں۔ ان کے تہواروں میں شریک ہوں۔ ان کے رسم ورواج اور قومی روایات کو قبول کرلیں۔ اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے بجائے ''ہندو مسلمان'' یا ''ہندو محمڈن'' کہیں۔ بعض دینی شعائر کی ادائیگی کے لیے پہلے ان سے اجازت حاصل کرلیں۔

Marfat.com

ان دو ہندو تحریکوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تعصب اور بغض و عداوت کی ایسی وسیع خلیج پیدا کر دی جس کو تاریخ کبھی بھی نہیں بھلا سکتی اور جس کے عفریت نے ہزاروں مسلمانوں کو نگل لیا اور اب تک نگل رہا ہے۔

(احسان حقی: تاریخ شبہ الجزیرۃ الہندیۃ الباکستانیۃ: ص ۳۷۴، ۳۷۶)

ماضی قریب اور حال میں جن خطرناک اسلام دشمن ہندو تحریکوں نے جنم لیا ہے وہ قارئین کی نظروں سے پوشیدہ نہ ہوں گی۔ ان کی ہندو جارحانہ احیائیت اور اسلام دشمنی کے واقعات آئے دن ہمارے سامنے آرہے ہیں۔

یہ تھی اس پر آشوب دور کی ایک دھندلی سی تصویر، جس دور میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو پیدا فرمایا۔ اس پر آشوب دور کے سیاق وسباق میں اگر مولانا کیرانوی مرحوم کے مجاہدانہ، مناظرانہ دعوتی اور اصلاحی کارناموں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو پھر ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انگریزوں کے استعمار کی سیاہ آندھی اور مختلف فتنوں کے سیاہ بادل ہندوستان کے افق پر محیط تھے تو اس وقت میں حضرت مولانا مرحوم کا وجود واقعی اللہ کی رحمت سے کم نہ تھا۔ حضرت مولانا کے مجاہدانہ، مناظرانہ اور تجدیدی کارناموں کا اعتراف نہ صرف اس دور کے علماء اور معاصرین ہی نے نہیں بلکہ خود خلافت عثمانیہ اور اس میں بسنے والے سب علماء نے بھی کیا۔ چنانچہ خلیفۃ المسلمین نے آپ کو ترکی آنے کی دعوت دی اور خلعت فاخرہ سے آپ کو نوازا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

عیسائی مبلغین کا طریقۂ تبلیغ:

اس دور میں عیسائی مبلغین تبلیغ و اشاعت کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہوئے تھے۔ ان میں ایک طریقہ نشر واشاعت کا تھا، یعنی انہوں نے اس وقت کی مروجہ زبانوں، عربی، فارسی اور اُردو اور ہندی میں بڑے پیمانے پر حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں مسیحی عقائد پر مشتمل کتابیں اور رسائل شائع کیے۔ اسی کے ساتھ اسلامی عقائد، ارکان، اسلامی تاریخ وتہذیب، قرآن حکیم اور وحی و رسالت کے بارے مختلف شکوک و

Marfat.com

شبہات اور اعتراضات اٹھائے گئے۔ تورات کے لاکھوں نسخے چاروں زبانوں میں کتابی شکل میں شائع کر کے ڈاک کے ذریعہ عوام وخواص میں اور پادریوں کے ذریعہ بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں تقسیم کیے گئے۔ جنرل مارٹن (Martin) نے سب سے پہلے تورات کا ترجمہ اردو اور فارسی میں کیا تھا۔ 1802ء میں جو عیسائی انجمن تورات کی نشر واشاعت کے لیے قائم ہوئی تھی اس کے ایک کارکن نے اس کا اعتراف کیا کہ 1899ء تک اس انجمن نے مختلف علاقائی زبانوں میں تورات کا ترجمہ کر کے 16 کروڑ کی تعداد میں تقسیم کیا تھا۔

عیسائی مشنری نے، معلوم ہوتا تھا کہ اس بات کا تہیہ کیا ہوا ہے کہ وہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنا کر ہی دم لیں گے۔ چنانچہ انہوں نے دھڑا دھڑ عیسائیت کے حق میں اور اسلام کے خلاف کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ عیسائی مبلغین اور مشنریز کے قلم سے جو کتابیں مسیحی عقائد کی تعلیم و تبلیغ اور اسلامی عقائد و شخصیات کے متعلق تشکیک وارتیاب سے متعلق شائع کی گئیں، ان میں ٹی۔جی۔اسکاٹ کی ''تصدیق الکتاب'' پادری یونس کی ''البراہین الالٰہیہ'' اور پادری فنڈر کی ''میزان الحق''، ''مفتاح الاسرار''، ''حل الاشکال''، ''اظہار الدین النصرانی'' کی ''طریق الحیاۃ'' نے ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ جن مسلموں اور غیر مسلموں نے میسحیت کو قبول کیا تھا، ان کے قلم سے بھی اسلام کے خلاف متعدد کتابیں شائع ہوئیں انگریزوں نے سرسید کی تفسیر اور تبیان الکلام کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا کہ سرسید نے مؤخر الذکر کتاب میں انجیل میں تحریف سے انکار کیا ہے، گویا یہ بھی سرسید نے عیسائیت کی خدمت کی ہے۔ جو دلائل عیسائیوں کو معلوم نہ ہو سکے وہ سرسید نے انہیں مہیا کیے۔

ان کتابوں اور رسائل کے علاوہ انگریزی روزناموں ہفت روزہ اور ماہناموں سے بھی عیسائیت کی تبلیغ وترویج اور دینی اور اخلاقی قدروں کے خلاف ذہن تیار کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ کیونکہ دین اسلام کے بارے میں اگر ایک مسلمان کی گرفت ڈھیلی ہو جائے تو ہر فرقہ اُسے دبوچنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے ہر باطل فرقہ سے بچنے کا بہترین اور آسان طریقہ یہ ہے کہ دین کو مضبوطی سے پکڑا جائے۔

عیسائی مشنریز اور مسیحی مبلغین نے بڑے پیمانے پر لائبریریاں اور دارالمطالعے قائم کیے اور ان کے ذریعہ خاموشی سے نوجوانوں کو عیسائی عقائد سے باخبر اور مانوس کیا جاتا۔ قادیانیوں، اہل بدعت، منکرین حدیث، سرسید کے پیروکاروں (متنورین)، ہندو احیاء پرستوں اور مغربی تہذیب و کلچر کے داعیوں کی بھی سرپرستی اور ہمت افزائی کی جاتی، کیونکہ ان کی راہیں بھی دراصل عیسائیت کے قریب جا کر ملتی ہیں ۔

تھیں میری اور رقیب کی راہیں جدا جدا
آخر کو ہم دونوں درجاناں پہ مل گئے

انگریزوں نے حکومت چونکہ مسلمانوں سے چھینی تھی، لہٰذا انہیں سب سے زیادہ خوف اور خطرہ مسلمانوں سے تھا۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی آبادی اگرچہ مسلمانوں سے زیادہ تھی، لیکن ہندوؤں سے انگریزوں کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ چنانچہ مسلمانوں پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے قریباً قریباً بند تھے۔ اگر کسی سرکاری عہدہ پر مسلمان کو فائز کیا بھی جاتا تو پادری کی سفارش اور تزکیہ کے بعد اُسے کوئی عہدہ دیا جاتا۔ حکومت برطانیہ نے یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ اگر کسی عہدہ کے لیے انگریز نہ مل سکیں تو اس جگہ پارسی کو متعین کیا جائے۔ اگر پارسی بھی نہ ملے تو ہندوؤں کو متعین کیا جائے اور اگر ہندو بھی نہ ملیں تب مسلمانوں کو وہ جگہ دی جائے۔

ولیم ہنٹر نے لکھا ہے کہ بنگال کے ہائی کورٹ میں انگریز اور ہندو ججوں کی تعداد اکیس تھی۔ ان میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ مسلمان عہدیداروں کے خلاف غیر مسلموں کو جاسوس مقرر کر دیا جاتا جو ہر لمحہ کی رپورٹ حکومت کو دیتا رہتا۔

مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک صرف اس وجہ سے تھا کہ مسلمانوں سے انگریزوں کو بہت زیادہ خطرہ تھا لہٰذا ان کو اس طریقہ سے ذلیل کرنے کی کوشش کی جاتی۔

پادری فنڈر اور اس کا حدود اربعہ:

پادری فنڈر جس کو ڈاکٹر فنڈر (Rev.C.G. Pfander) بھی کہتے ہیں اور جس نے ہندوستان آ کر اور میزان الحق کتاب لکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو چیلنج کیا

Marfat.com

تھا، اس کا تعارف کرانا بھی ضروری ہے تا کہ پتہ چل سکے کہ یہ حضرت کون تھے؟ اور ہندوستان کس غرض کے لیے تشریف لائے؟ اور پھر ہندوستان میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ قدس سرہ کے ہاتھوں ان کی کیا درگت بنی، کہ زمین باوجود اپنی وسعت کے اس پر تنگ ہوگئی۔

پادری فنڈر امریکن نژاد کیتھولک مستشرق تھا۔ دنیا کی طمع کی خاطر اس نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کیا تھا جیسا کہ اس کے دوست پادری فرنچ نے بیان کیا ہے۔ وہ انگلستان کو اپنا مستقل وطن بنانا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی چونکہ پروٹسٹنٹ مسلک کی تھی لہٰذا اس نے بھی اپنی بیوی کی خوشنودی کی خاطر پروٹسٹنٹ مسلک اختیار کر کے انگلستان میں اپنی مستقل رہائش اختیار کر لی۔ انگلستان میں مستقل رہائش کے تھوڑا ہی عرصہ بعد چرچ آف انگلینڈ نے اسے مسیحی مبلغین کا سربراہ بنا کر ہندوستان بھیج دیا۔ جہاں اس نے اپنی تبلیغی جدوجہد میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی۔ چنانچہ فنڈر کو ان تین خطرناک اور سرگرم مسیحی مبلغین میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے غیر معمولی جدوجہد کے ذریعہ سرزمین پاک و ہند میں مسیحیت کے فروغ کے لیے نمایاں کردار ادا کیا۔

پادری فنڈر شروع میں دس یا بارہ سال تک جرمنی کے ایک عیسائی مبلغ کی حیثیت سے روس کی ریاست جیارجیا (Georgia) میں قلعہ شوش (Shushy) میں مقیم رہا جہاں سے وہ اکثر ایران کا دورہ کیا کرتا تھا۔ ایک دوبار اُس نے بغداد تک کا سفر بھی کیا۔

ایران میں آمدورفت کے نتیجہ میں اس نے فارسی زبان میں خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اس کے علاوہ آرمینیہ کے رہنے والے ایک مسلمان لڑکے کو جسے ڈاکوؤں نے پکڑ کر غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا تھا، اس نے عیسائی بنا لیا تھا جس سے وہ اپنی فارسی انشاء پردازی میں مدد لیا کرتا تھا۔

1836ء میں روسی حکومت کی غیر ملکیوں کے اخراج کی پالیسی کے زیر اثر اُسے روس چھوڑنا پڑا اور 1838ء میں اُس نے ہندوستان میں عیسائی مبلغ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ہندوستان آمد سے قبل جیروم ہندوستان آچکا تھا اور

اس نے لاہور کو اپنا مرکز بنا کر توحید، تثلیث، الوہیت مسیح اور کتب مقدسہ کی صحت کے متعلق مسلمان علماء کے ساتھ بحث ونزاع کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس نے ایک کتاب بھی مسیحی عقائد کی وضاحت وتشریح کے لیے تالیف کی تھی جس کا نام ''المرأۃ المریۃ للحق'' رکھا گیا اور اس کتاب کے لکھنے کا سبب احمد بن زین العابدین کی کتاب ''الانوار الالہیۃ'' بنی۔

جیروم کے بعد ہنری مارٹن کی آمد ہوئی جس نے فارسی اور اردو میں انجیل کا ترجمہ کر کے عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کے لیے اس ملک میں ایک مستحکم بنیاد فراہم کی۔ پھر پادری فنڈر نے اپنی کتاب ''میزان الحق'' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔

پادری فنڈر نے ہندوستان آنے سے قبل ''میزان الحق'' تصنیف کر لی تھی۔ اس کتاب کا موضوع اسلامی عقائد اور ضروریات دین میں تشکیک وارتیاب کے کانٹے بونا تھا۔ چنانچہ اس میں اس نے اپنے پیش رو عیسائی مشنریوں پادری لی (Rev.S. Lee) کی کتاب ''عیسائیت اور اسلام کی مناظرانہ تحریریں'' (Controversial Tracts on Christianity and Muhammedanism) مطبوعہ کیمبرج 1824ء اور پادری چارلس فاسٹر (Charles Foster) کی تصنیف ''راز اسلام طشت از بام'' (Mahommedanism Unveiled) مطبوعہ لندن 1829ء سے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔ فنڈر کی کتاب ''میزان الحق'' سب سے پہلے شوش (Shushy) سے 1835ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد اس کا اردو ترجمہ مرزا پور سے 1843ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں پادری فنڈر نے:

اولاً یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ قرآن حکیم کی رو سے بائبل بھی الہامی کتاب ہے اور یہ کہنا کہ متاخر الہام کے ذریعہ قدیم الہام منسوخ ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی شانِ الوہیت سے بعید ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ اپنے احکامات میں کوئی ترمیم کرے۔

کتاب کا دوسرا باب جو کتاب کے نصف صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس میں فنڈر نے عیسائیت کے عقائد اور اس کی تعلیمات کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ عیسائیت کے پاس ایک مکمل ضابطۂ اخلاق موجود ہے جو ہر زمانہ کی

ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں اسلام پر اعتراضات کیے گئے ہیں جن کا بڑا حصہ مذکورہ بالا پادری لی (Rev.Lee) اور پادری چارلس فاوسٹر (Charles Foster) کی کتابوں سے لیا گیا ہے۔ اس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیش گوئیوں سے انکار، قرآن حکیم کا بائبل سے ماخوذ ہونا، تقدیر پر اعتقاد، گناہوں پر ندامت، معافی طلب کرنا نجات کے لیے کافی نہ ہونا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اعمال پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں چھ افراد کے قبول عیسائیت کی روداد بیان کی گئی ہے۔

پادری فنڈر کا دوسرا مختصر کتابچہ ''مفتاح الاسرار'' ہے جس میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت اور تثلیث کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ قرآن کریم میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ ان کی الوہیت کی مظہر ہیں۔ تثلیث کے ثبوت میں فنڈر کہتا ہے کہ مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر سے وحدت کا وجود محال ہے کیونکہ ایسی وحدت محض کسی شخص کے وجود تک محدود ہوگی، جو مجہول اور بے حرکت ہوگی، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایسے کسی وجود کے ساتھ عقل و ارادہ کو بھی شامل کیا جائے۔ فنڈر اس دلیل کو پیش کرتے ہوئے یہ نظر انداز کر دیتا ہے کہ عیسائیت تثلیث کے ذریعہ جن دو اشخاص کو الوہیت میں شریک کرتی ہے وہ عقل اور ارادہ کی طرح صفات نہیں بلکہ وہ بذات خود ان صفات کے حامل وجود ہونے کے دعویدار ہیں۔

فنڈر نے جونہی اپنی کتاب ''مفتاح الاسرار'' لکھی اور وہ کتاب زیور طباعت سے مزین ہوکر لوگوں کے ہاتھوں میں آئی تو پھر تو دہلی، آگرہ اور لکھنؤ کے علماء کے ساتھ بحث و مناظرہ کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہو گئے۔ اس وجہ سے عیسائی مبلغین اور حکومت کی نگاہ میں پادری فنڈر کا وقار و اعتبار بڑھ گیا۔ خود فنڈر کو بھی اس بات پر فخر و غرور تھا کہ وہ فارسی اور اردو زبان سے واقف ہے۔

فنڈر کی تیسری تصنیف ''طریق الحیات'' تھی جس میں اُس نے عیسائیت کے نقطۂ نظر سے گناہ کی اصل حقیقت یا ماہیت اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت کے ذریعہ

نجات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس طرح سے یہ کتاب گویا ''میزان الحق'' کا تتمہ ہے جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گناہ کے متعلق اسلام کا یہ نظریہ کہ وہ انسان کی ایک داخلی کمزوری ہے جس پر توبہ اور عبادات کے ذریعہ فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ گناہ انسان کے ضمیر کو مردہ کر دیتا ہے۔ فنڈر کا کہنا ہے کہ گناہ صرف عمل کے ذریعہ ہی سرزد نہیں ہوتا بلکہ گناہ کے لیے انسانی رجحان اور ارادہ بھی قابل سزا ہے جس سے صرف اور صرف سیدنا عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان کے ذریعہ ہی نجات مل سکتی ہے۔

فنڈر نے ان کتابوں کے علاوہ اردو زبان میں ایک رسالہ بھی جس کا نام ''شجر زندگانی'' ہے تحریر کیا تھا جس میں عیسائی عقائد واخلاق سے متعلق اقتباسات جمع ہیں۔

فنڈر نے ہندوستان میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز عوامی اجتماعات میں تقریروں سے کیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تقریبات، میلوں ٹھیلوں میں بھی وہ تقریریں کر کے اسلامی عقائد کے بارے میں شکوک وشبہات کے کانٹے پیدا کرتا اور پھر سامعین کو یہ مشورہ دیتا کہ وہ مسیحی عقائد کو قبول کر لیں۔ جو شخص مسیحی عقائد پر ایمان لائے بغیر اس دنیا سے چلا جائے گا وہ گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر لاد کر اس دنیا سے جائے گا۔

پادری فنڈر کی جرأت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر مسلح پولیس کی نگرانی وحمایت میں مسلمانوں اور اسلام کی خلاف تقریریں کر کے انہیں مسیحیت قبول کی دعوت عام دیتا۔ پولیس والے زبردستی دکانوں اور شاہراہوں سے لوگوں کو جمع کر پادری فنڈر کی تقریر سننے پر مجبور کرتے۔

پادری فنڈر کے تربیت یافتہ مبلغین دیہاتوں میں بھی جا کر سادہ لوح دیہاتیوں کو دین مسیحیت کی دعوت دیتے۔ جنوبی ہند کے شہروں میں انگریزی زبان میں تعلیم یافتہ مسلمان اور غیر مسلمانوں کو خطاب کیا جاتا۔ فنڈر کے کام میں وہ لوگ خاص طور پر معاون و مددگار ہوتے جو اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی بن چکے تھے۔ ان لوگوں میں صفدر علی، عماد الدین، سید عبداللہ اثیم، منشی محمد حنیف موسیٰ احمد مسیح کے ساتھ ڈاکٹر برخوردار خان قابل ذکر ہیں۔

پادری فنڈر کی تبلیغ واشاعت کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اس نے اپنی ان کتابوں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اور اُن کے اردو ترجموں کو وسیع پیمانے پر مسلمانوں خصوصاً علماء

کے طبقہ میں تقسیم کیا، کیونکہ حکومت وقت کا پورا خزانہ اس کے لیے کھلا تھا۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ حکومت برطانیہ نے اپنے اس مذہب کی نشرواشاعت کے لیے تمام وسائل اس کو مہیا کیے ہوئے تھے۔ فنڈر کی یہ کتابیں جب عوام اور طبقہ علماء میں پہنچیں تو انہیں سخت تشویش ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کفر نے اسلام کو کھلا چیلنج کیا تھا اور اہل کفر نے اس طرح اہل اسلام کو اور خصوصی طور پر علماء کے طبقہ کو دعوت ارتداد دی تھی۔ اور دعوت بھی ایسی جسے حکومت وقت کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور حکومت کے تمام ذرائع اس کی پشت پر تھی۔ علماء کو خطرہ تھا کہ کہیں عوام ترغیب وترہیب یا طمع وخوف میں اسلام کو چھوڑنا شروع نہ کر دیں یا ان کتابوں کے کسی مغالطہ یا دلیل سے متاثر ہو کر اسلام کے بارے شکوک وشبہات اپنے ذہن میں پیدا نہ کر لیں۔ چنانچہ علمائے اسلام نے ان کتابوں کے اور خصوصی طور پر ''میزان الحق'' (جو کہ اصل کتاب تھی اور فنڈر کی دوسری کتابیں اسی کی تشریح وتفصیل تھیں) کے جوابات دینے شروع کیے۔

سب سے پہلے شمال مغربی صوبہ جات کی محمڈن سوسائٹی (Mohammedan Society of the North Western Provines) نے ان کتابوں خصوصاً ''میزان الحق'' کے جواب میں چند مختصر کتابچے شائع کیے، لیکن ان میں فنڈر کے اعتراضات کے شافی اور مدلل جواب دینے کے بجائے اکثر اعتراضات کے بارے میں صرف یہ کہا گیا تھا کہ اُس نے جو دلائل دیئے ہیں وہ ناقابل فہم ہیں۔

پادری فنڈر نے اپنی تصنیفات کے نسخے دربار اودھ سے منسلک مجتہد سید علی کو بھی 1842ء میں ارسال کیے تھے۔ شیعہ مجتہد سید علی نے فنڈر کی فارسی دانی کی تعریف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ ان کتابوں کو تحریر کرنے میں کسی اہل زبان کی خدمت سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک شاگرد سید محمد ہادی (جو مذہباً سنی العقیدہ تھے) کو پادری فنڈر کا جواب لکھنے پر مامور کیا۔ سید محمد ہادی نے 222 صفحات پر مشتمل ایک کتاب تحریر کی جو ''مفتاح الاسرار'' کے جواب میں تھی۔ یہ کتاب 1845ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

یہ کتاب اگرچہ فارسی میں تھی لیکن اس میں طویل عربی عبارتیں اور اقتباسات

Marfat.com

نقل کیے گئے تھے۔ اگر چہ اس میں فنڈر کی کتاب ''مفتاح الاسرار'' کا مدلل جواب دیا گیا تھا اور خود سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال سے عیسائی عقائد کی تکذیب و تردید کی گئی تھی، لیکن ''میزان الحق'' میں اسلام پر کیے گئے اعتراضات سے بحث نہیں کی گئی تھی، بلکہ اسے ''میزان الباطل'' کہہ کر اس سے اعراض برتا گیا تھا۔

اسی زمانہ میں پادری فنڈر کی سید [1] رحمت علی اور محمد کاظم علی سے خط و کتابت ہوتی رہی، جو 1842ء سے شروع ہو کر 1844ء یا 1845ء تک چلتی رہی یہ سلسلہ اس وقت ختم ہو گیا جب پادری فنڈر نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔ ایک روایت اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ماسٹر رام چند (نو عیسائی) اور سائمن فریزر نے بے سروپا اعتراضات کی بارش شروع کر دی اور کھلم کھلا یہ کہنے لگے کہ نعوذ باللہ ''جو کتاب اسلام کے رسولؐ نے دنیا کو دی ہے، اس کا کلام اللہ ہونا ظاہری اور باطنی سند سے خارج ہے۔'' (ملاحظہ ہو مخطوطہ یوڈلین لائبریری آکسفورڈ نمبر Ms. Mill-217) تو محمد کاظم علی سجادہ نشین درگاہ حضرت سلیم چشتیؒ، آگرہ، سید رحمت علی اور رئیس الاحرار حضرت مولانا حسرت موہانی کے جد امجد مولانا آل حسن نے 1842ء میں پادری فنڈر کو باقاعدہ چیلنج کیا اور پبلک مناظرہ کی دعوت دی، لیکن پادری فنڈر کا تبادلہ پشاور ہو گیا یا کر دیا گیا اور عیسائی سرگرمیاں نسبتاً ہلکی پڑ گئیں، لیکن شرارت انگیز رسالوں اور کتابوں نے فضا کو نہایت مکدر کر دیا ہوا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد کاظم علی، سید رحمت علی مولانا آلِ حسن نے پہلے تو پادری فنڈر کو زبانی مناظرے کا باقاعدہ چیلنج کیا تھا لیکن جب پادری فنڈر کا پشاور تبادلہ ہو گیا تو مولانا سید رحمت علی اور محمد کاظم نے فنڈر سے خط و کتابت شروع کر دی۔ دو تین

ا۔ سید رحمت علی اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ دو مختلف شخصیات ہیں، لیکن اہل مغرب نے ان دونوں کو خلط ملط کر دیا ہے، تاکہ لوگ دونوں حضرات کو ایک شخصیت ہی سمجھنے لگیں، حالانکہ سید رحمت علی وہ ہیں جن سے پادری فنڈر کی صرف خط و کتابت ہوئی تھی جبکہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے باقاعدہ زبانی مناظرہ کر کے فنڈر کو شکست فاش دی تھی۔ اس طریقہ سے انگریز مؤرخین پردہ ڈالنا چاہتے ہیں اور بجائے مولانا رحمت اللہ کے سید رحمت علی کا نام لیتے ہیں تاکہ پادری فنڈر کی شکست کا ذکر نہ آنے پائے۔

Marfat.com

سال تک یعنی 1845ء تک خط و کتابت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر پادری فنڈر نے ان حضرات کو خطوط کا جواب دینا بند کر دیا۔ فنڈر کا جواب دینے سے انکار اس وجہ سے تھا کہ اس کے پاس ان دونوں حضرات کے سوالوں کا جواب نہیں تھا۔

ان خطوط میں محمد کاظم علی مرحوم نے فنڈر سے یہ سوال کیا تھا کہ جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے خود ہی یہ کہا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی ہدایت کے لیے آئے ہیں تو پھر ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ساری دنیا کے لیے مبعوث ہوئے تھے، کیا ان کی تکذیب نہیں ہے؟ اس سوال کے جواب میں پادری فنڈر کو بالآخر یہ اقرار کرنا پڑا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اصلاً یہودیوں کے لیے تھی اور ان کی تعلیمات ان کی دنیوی زندگی میں (یعنی مصلوب ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے سے پہلے) تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں۔ مولانا سید رحمت علی اور محمد کاظم علی نے اپنے خطوط میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت اور اُن کے حواریوں کے الہام اور نبی آخر الزمان کے بارے میں بائبل کی پیش گوئیوں کے متعلق مسائل بھی اٹھائے، لیکن پادری فنڈر ان کا کوئی شافی اور کافی جواب نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ حق حق ہوتا ہے اور باطل باطل، اور باطل حق کا سامنا نہیں کر سکتا۔

پادری فنڈر اور آگرہ کے مولانا سید علی حسین کے درمیان بھی اسلام اور عیسائیت کی حقانیت کے بارے میں خط و کتابت ہوتی رہی تھی جسے مرزا پور کے ایک مشنری ماہ نامہ ''خیر خواہ ہند'' نے شائع کیا تھا۔ مولانا سید علی حسین نے بعد میں ردّ عیسائیت پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جو غالباً لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی، لیکن اس کے بارے میں کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہو سکی۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ میں کسی نامعلوم شخص نے پادری فنڈر کی تصنیفات کے جواب میں ''خلاصہ صولت الضیغم'' کے نام سے 1842ء مطابق 1258ھ میں ایک کتابچہ شائع کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتابچے کا مصنف ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی ملازم تھا جس نے اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

جن ہندوستانی علماء نے فنڈر کی کتاب ''میزان الحق'' کی تردید میں کتابیں لکھیں ان میں ناصر الدین ابوالمنصور دہلوی، اور شیخ محمد آل حسن رضوی شامل ہیں، لیکن

Marfat.com

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کی شخصیت اور تصنیفات نے عیسائی مبلغین اور عیسائی دعوت و تبلیغ کی راہ میں کوہ گراں کھڑا کر دیا۔

سید آل حسن رضوی کی کتاب استفسار کے مطالعہ سے فنڈر نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی کتاب ''میزان الحق'' میں کچھ بنیادی خامیاں ہیں، اس لیے اس نے اپنی کتاب کا ازسرنو جائزہ لے کر بعض عبارتوں کو حذف کر کے آگرہ سے فارسی میں نیا ایڈیشن 1849ء میں شائع کر دیا۔ اس کے ایک سال بعد 1850ء میں اردو تر کی ایڈیشن بھی شائع ہو گیا۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور دیگر علماء نے ''میزان الحق'' پڑھنے والوں کو متنبہ کیا کہ اس کتاب میں بعض مقامات پر نقل اصل کے مطابق نہیں ہے۔ جو شخص اس ترمیم و اضافہ سے واقف نہیں وہ یہ سمجھے گا کہ تردید اور نقل کرنے والوں نے عبارت کے نقل کرنے میں غلطی کی ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تردید کرنے والوں نے جو عبارتیں نقل کی ہیں وہ صحیح اور درست ہیں، البتہ میزان الحق کے مصنف نے ان عبارتوں کو نئے ایڈیشن میں یکسر تبدیل کر دیا ہے جن کے جوابات علماء نے دے دیئے تھے۔ جب پادری فنڈر کو اپنے دلائل کے بودے پن کا احساس ہوا تو اس نے ان عبارتوں کو اس طرح حذف کیا تاکہ یہ پتہ نہ چل سکے کہ کون سی عبارت کس ایڈیشن میں تھی۔ نئے ایڈیشن میں پرنٹ لائن اور سن طباعت بھی نہیں۔

پادری فنڈر کے جواب میں جتنی بھی کتابیں اس وقت تک لکھی گئی تھیں ان میں سے کسی میں بھی اس کے اعتراضات خصوصاً میزان الحق کا مدلل اور شافی جواب موجود نہیں تھا۔ بالآخر 1854ء میں پادری فنڈر اور حضرات مولانا کیرانویؒ کے درمیان آگرہ میں مناظرہ ہوا جس میں فنڈر لا جواب ہو کر مناظرہ کے آخری دنوں میں گھر بیٹھ رہا جو کہ اس کی شکست کا ایک واضح اعتراف تھا۔

ڈاکٹر سنگر نے پادری فنڈر کی ''میزان الحق'' کو منقح کر کے چوتھی مرتبہ اسے طبع کیا۔ اُس نے اس کے مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کر دیا۔ اس کی مضامین میں کافی ردّ و بدل کیا۔ اس میں بہت سا حک و اضافہ بھی کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی یہ سب کچھ

Marfat.com

علمی انکشافات کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ ایک قاری اس کتاب کے مختلف ایڈیشنوں میں بنیادی اختلافات پاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے نئے ایڈیشن پرانے اور قدیم ایڈیشنوں کے ناسخ ہیں۔ جدید ایڈیشن ویسے بھی حجم وضخامت میں قدیم ایڈیشنوں سے چھوٹے ہیں۔

ڈاکٹر سنگلر نے میزان الحق کا یہ آخری ایڈیشن منقح اور تمام غلط حوالوں اور باتوں کی جھاڑ جھنکار سے صاف کر کے عربی زبان میں مصر سے شائع کیا، لیکن اس نے اس میں اس کا سن طباعت نہیں بتایا اور نہ کوئی پرنٹ لائن اس پر لگائی۔ نہ اس پر مؤلف کا نام لکھا اور نہ ہی ایڈیٹ کرنے والے کا جیسا کہ ان لوگوں کی اکثر کتابوں میں عادت ہوتی ہے۔ اس کتاب کا صرف ایک نسخہ دار الکتب المصریۃ میں نمبر 88 لاھوت 1999/623 کے تحت موجود ہے۔ یہ نسخہ کئی اہم معلومات سے خالی ہے اور صفحات کے نمبروں میں بھی بہت سی اغلاط کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

1983ء میں سوئیٹزرلینڈ کے شہر باؤل کے مرکز الشبیبہ نے میزان الحق کو کئی زبانوں میں طبع کیا۔ ان میں عربی زبان کا نسخہ تین چھوٹے چھوٹے حصوں جن میں مسلسل صفحات لگے ہوئے ہیں، نہایت خوب صورت طریقے سے طبع کیا ہے۔ اس عربی ایڈیشن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ تیسرا ایڈیشن ہے، لیکن پرنٹ لائن اس پر بھی نہیں دی گئی چنانچہ سن طباعت ہے، نہ پریس کا نام اور نہ ہی وہ شہر جہاں اس کی طباعت ہوئی ہے۔

اس ایڈیشن میں سابقہ ایڈیشنوں کے بہت سے مقامات پر اضافہ اور حذف کیا گیا ہے اور بعض فصلیں بھی زیادہ کر دی گئی ہیں۔ اس ایڈیشن کے پہلے حصہ جلی خط میں یہ عبارت لکھی ہے "لاتحریف ای التوارۃ والانجیل" (انجیل اور تورات میں کوئی تحریف نہیں ہوئی) یہ حصہ 163 صفحہ تک ہے دوسرے حصہ کے شروع میں لکھا ہے "کیف تخلص ایھاالانسان" (اے انسان! تیری نجات کس طرح ہے) یہ حصہ 295 صفحات تک ہے۔ اور تیسرے حصہ کے شروع میں لکھا ہوا ہے "کیف نعرف دین الحق" (دین حق کی معرفت ہمیں کیسے ہوسکتی ہے؟) اور یہ حصہ 484 صفحات تک جاتا ہے۔

Marfat.com

دار الکتب المصریۃ اور سوئیٹزر لینڈ کے اس مطبوعہ نسخہ میں اس قدر فرق ہے کہ دونوں نسخوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو مصنفین کی دو مختلف کتابیں ہیں۔ اور ان دونوں ایڈیشنوں کے مابین بعد المشرقین ہے۔

دار الکتب المصریۃ، قاہرہ میں میزان الحق کا جو نسخہ موجود ہے اس کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ میں تین فصلیں ہیں اور پوری کتاب تین ابواب اور پندرہ فصول پر مشتمل ہے۔ چند مرکزی عنوانات اس طرح ہیں:

انسان کی روحانی ضروریات اور قلبی شوق کی تسکین دنیوی لذتوں سے ممکن نہیں۔ عقل انسانی سے خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی۔ عہد قدیم اور عہد جدید کی کتابیں نہ تو منسوخ ہیں اور نہ ہی ان میں تحریف ہوئی ہے۔ قرآن حکیم تورات اور انجیل کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ تورات و انجیل میں کبھی نسخ نہیں ہوا۔ مسیح نے نجات کا راستہ کیسے تلاش کیا۔ تورات اور انجیل کے کلام اللہ ہونے کے دلائل۔ دنیا میں مسیحی تعلیمات کیسے پھیلیں؟ کیا مسلمانوں کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی پیش گوئی تورات و انجیل میں کی گئی تھی؟ قرآن کے معانی و احکام اور خبریں۔ محمدؐ کے اوصاف اور اُن کے اعمال اسلام کیسے پھیلا۔ وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

حضرت مولانا رحمت اللہؒ عیسائیت کے مقابلہ میں

پادری فنڈر اور اس کے ساتھی جب اپنی کتابوں، رسائل اور وعظوں سے سرزمین پاک و ہند میں عیسائیت کی دعوت دیتے پھر رہے تھے اور ہندوستان کا کوئی عالم اُن سے مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں نہ آتا تھا۔ انگریزی سامراجیت کا بھیانک عفریت ہر طرف محیط تھا۔ مغل سلطنت کی تمام قوتیں سلب ہو چکی تھیں۔ کان بہرے، ہاتھ کٹے ہوئے اور پاؤں لنگڑے ہو چکے تھے، اور سارے ہندوستان سے حکومت سمٹ سمٹا کر لال قلعہ کی چار دیواری کے اندر محدود ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی گردنوں پر دشمنوں کی تلواریں چل گئی تھیں اور چل رہی تھیں۔ مسلمانوں کی آبادیاں غیروں کے قبضہ و تسلط سے پامال ہو رہی تھیں۔ علماء دانشور اور قائدین ملت اس حالت زار پر انگشت بدنداں تھے۔ کسی کے دل میں نہ جنبش تھی اور نہ قدموں میں حرکت۔ نہ کسی کی آنکھ نے محبت و ماتم کا ایک آنسو بخشا اور نہ کسی کے دل سے امت کی بربادی کا غم آنسو بن کر اس کی آنکھ سے ٹپکا۔ بڑے بڑے مالداروں کے خزانوں پر بخل و سرپرستی کے قفل چڑھے ہوئے تھے اور بڑے بڑے قائدین بستر پر لیٹ لیٹ کر بربادی ملت اور پامالی اسلام کا خونین تماشا اس بے درد تماشائی کی طرح بے حس و حرکت دیکھ رہے تھے جو سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر ڈوبتے جہاز اور بہتی ہوئی لاشوں کا نظارہ کر رہا ہو۔

حضرت مولانا محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ، نے ان حالات کے بارے یوں لکھا ہے:

”یہ وہ وقت تھا جب کہ ہندوستان میں اسلامی شان و شوکت و

Marfat.com

سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور شاہانِ مغلیہ کی آخری یادگار بہادر شاہ مرحوم زوال سلطنت کا پرحسرت منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جمنا کے پرسکون بہاؤ میں انقلاب زمانہ کی نیرنگیوں کو بہتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ مگر اغیار کی ان ریشہ دوانیوں کی کوئی تدبیر ان کے پاس نہ تھی اور انگریزی رسوخ و اقتدار کا سیلاب قلعہ کی سنگین دیواروں سے ٹکرا رہا تھا جس کی پر آشوب آواز سے بادشاہ مرحوم خوفزدہ تھے۔ اس پرآشوب زمانہ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر عصر و مغرب کے درمیان ایک مسیحی فاضل پادری فنڈر عوام الناس کے سامنے عیسائی مذہب کی خوبیوں اور بزعم خود اسلامی کمزوریوں پر تقریر کیا کرتا تھا۔ پادری فنڈر خود تنہا نہ تھا بلکہ انگلینڈ سے اس کے ساتھ مسیحی مشنری اور پادریوں کی ایک بڑی جماعت تھی جو اس امر کا بیڑا اٹھا کر ہندوستان آئی تھی کہ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت ہندوستان میں اس طرح کرے کہ اسلامی سلطنت کے زوال اور مغلوبی کے ساتھ اسلام بھی مغلوب ہو، اور عیسائیوں کے غلبے اور اقتدار کے ہمدوش عیسائی مذہب بھی ہندوستان کی نرم اور اثر پذیر زمین میں جڑیں چھوڑ دے۔ گو اسلامی حکومت کا چراغ ٹمٹا رہا تھا مگر اس سیاسی اضمحلال کے باوجود زوال رسیدہ دہلی باکمال مشاہیر اور اہل علم اور اہل فن سے خالی نہ تھی۔ لیکن اس دور کے علماء کو اگرچہ اپنے دینی و مذہبی علوم میں کامل دستگاہ و تبحر تھا، مگر دوسرے مذاہب کی مذہبی کتابوں پر نہ ان کی نظر تھی اور نہ ان کو اس کی چنداں ضرورت۔ معلوم نہیں کن وجوہ سے اس مسیحی فاضل کی طرف علماء نے توجہ نہیں کی اور علماء اسلام کے اس سکوت نے پادری فنڈر کا حوصلہ اس قدر بڑھایا کہ اس نے جسارت اور دلیری کے ساتھ صداقت اور حقانیت اسلام پر

Marfat.com

زبردست حملے اور اعتراض شروع کر دیئے اور بہ بانگ دہل علماء اسلام کو مناظرہ کی دعوت دی۔'' (ندائے عام: ۱۳۴۵ھ)

اس وقت امت مسلمہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی متاع آخرت چند دنیوی خزف ریزوں کے عوض بیچ کر اور اللہ کی حکومت سے باغی ہو کر دنیا کی حکومتوں سے صلح کرنے کی خواہش دل میں رکھتے تھے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو بچھوؤں اور سانپوں کے ساتھ تو صلح کر سکتے تھے لیکن انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھانا ان کے لیے موت سے بدتر تھا۔ وہ جنگلوں میں سؤروں کا ریوڑ تو چرا سکتے تھے لیکن انگریزوں کے ساتھ دو قدم نہیں چل سکتے تھے بلکہ انگریز کی شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے۔

اس بھیانک وقت میں کیرانہ کی سرزمین سے ایک شخص اٹھا اور تمام خطروں سے بے خوف و خطر ہو کر میدان عمل میں کود پڑا۔ وہ اس راہ کے نشیب و فراز سے بھی واقف تھا اور ان مصائب سے بھی آشنا تھا جو اس راہ پر چلنے سے پیش آتے ہیں۔ اور اس عازم و فاتح کی طرح میدان میں نکلا جس کے بارے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے:

''بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان و اسباب کار فراہم نہیں، لیکن وقت کا عازم و فاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کرلوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے۔ اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہو گئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے۔ وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھرلوں وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں جس کو پورا کر دوں۔ اس کا مایۂ خمیر بخشش و نوال ہے طلب و سوال نہیں۔ اس کی نظریں طاق کی بلندی نہیں ناپتی، ہمیشہ اپنے ہاتھ کی رسائی اور قد کی بلندی دیکھتی رہتی ہیں۔

اس زمانہ کے عازم و فاتح حضرت مولانا کیرانویؒ یہی عزم و ارادہ لے کر اٹھے

Marfat.com

تھے، اس زمانہ کے حالات کو اگر آپ چشم تصور سے دیکھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ مغلیہ حکومت ختم ہو چکی تھی، اور مسلمان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ محکومی اور غلام قوم کی شرافت و تمدن کی برہنہ لاشیں شاہراہوں پر شرم و حیا کی بھیک مانگ رہی ہوتی ہیں۔ فاتح قوم کے پاس غلام قوم کے لیے لوہے کی زنجیروں، بندوقوں کی سنگینوں، جیل خانوں کی کوٹھڑیوں، عدالتوں کے کٹہروں اور پھانسی کے رسوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کے سامنے میں یہ سب کچھ تھا، اپنی کم مائیگی بھی اور مخالف کی بھرپور طاقت بھی۔ اپنے پاس کچھ نہ ہونے کا احساس بھی اور فریق مخالف کے پاس سب کچھ ہونے کا خوف بھی، لیکن اس مرد قلندر نے فنڈر کو للکھا اور اُسے آگرہ میں بر سر عام زبانی مناظرہ کا چیلنج کیا۔ پادری فنڈر کو للکارنا صرف ایک شخص کو للکارنا نہ تھا بلکہ برطانیہ کی پوری حکومت کو چیلنج دینے کے مترادف تھا، لیکن ؏

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مولانا کیرانویؒ کی اس للکار میں بغاوت کی بو بھی تھی اور شریعت کی غیرت اور حمیت بھی۔ چنانچہ آپ نے اپنی کتاب اظہار الحق کے مقدمہ کے پہلے صفحہ پر لکھا ہے کہ

> ''فنڈر اور دیگر عیسائی مشنریز نے بہت سی کتابیں اور رسائل مسلمانوں اور ان کے دین کے ردّ میں تالیف کیے اور مختلف شہروں کے عوام میں انہیں تقسیم کیا۔ سڑکوں، گلیوں اور میلوں ٹھیلوں میں ان لوگوں نے سرعام وعظ کہنا شروع کر دیا۔ مسلمان عوام ایک مدت تک ان کے وعظ کے سننے اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے متنفر رہے، لیکن اس دوران میں ہندوستان میں سے کسی نے ان رسائل اور کتابوں کا رد لکھنے کی طرف توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں سے بعض لوگوں کی نفرت میں کچھ کمی آنی واقع ہو گئی اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ بعض جاہل عوام کے قدموں میں کوئی لغزش پیدا نہ ہو جائے اور ان کے عقیدے کی عمارت میں دراڑیں پڑنی شروع نہ ہو جائیں۔
> جب حالات یہاں تک پہنچ گئے تو بعض علمائے اسلام نے ان

Marfat.com

کتابوں اور رسائل کے رد کی طرف توجہ کی۔'' (مقدمہ اظہار الحق: ص ۱)

برصغیر پاک و ہند کے بہت تھوڑے علماء نے عیسائیت کے رد میں کام کیا ہے۔ علماء ہند نے اپنی تمام تر توجہ علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس پر مرکوز کی ہوئی تھی اور باطل فرقوں کے عقائد باطلہ کے ردّ کی طرف کوئی توجہ مبذول نہیں کی تھی۔ خصوصی طور پر مسیحیت کا تو انہوں نے بہت ہی کم مطالعہ کیا ہوا تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ عیسائیت کی زیادہ تر کتب انگریزی زبان میں تھیں اور علماء انگریزی زبان سے اتنی آشنائی نہیں رکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ایک سامراجی قوت کی زبان تھی اور سامراجیت کی زبان سے کچھ قلبی طور پر نفرت پائی جاتی ہے۔ دوسرے ہندوستان میں یہ کتابیں کمیاب بلکہ نایاب تھیں اور انگریز وقتی سیاسی مصلحت سے ایسی کتابوں کو ہندوستان میں درآمد بھی نہیں کرتے تھے۔ کچھ لوگ انگلستان پڑھنے کے لیے گئے وہ وہاں سے چند کتابیں اپنے ساتھ لائے تھے۔

ان سب مشکلات کے باوجود ہندوستان میں کچھ علمائے اسلام ایسے بھی تھے جنہوں نے مسیحیت کے خلاف کتابیں لکھیں اور ان میں اعتراضات کے شافی جوابات دیئے جو انہوں نے دین اسلام پر کئے تھے۔ اس بارے میں انہوں نے مختلف کتابیں بھی لکھیں اور مختلف رسائل میں مضامین بھی لکھے۔ ان علماء نے باوجود اس بات کے کہ عیسائی علماء کی پشت پر استعماری طاقت تھی، لیکن پھر بھی انہوں نے انہیں للکارا اور مسیحی علماء کی کتابوں کا رد بغیر کسی خوف و خطر کے کیا۔ جن علماء نے عیسائیت کے خلاف کتابیں لکھیں ان میں سے چند ایک کے نام حسب ذیل ہیں۔

1- الشیخ احمد بن زین العابدین: آپ نے ایک کتاب جیروم کے ردّ میں ''انوار الالٰہیہ'' کے نام میں لکھی تھی۔ جیروم پہلا عیسائی مشنری ہے جس نے توحید و تثلیث، الوہیت مسیح اور کتب مقدسہ کے غیر محرف ہونے کے بارے میں لاہور میں بحث و جدال کا دروازہ کھولا تھا۔

2- سید محمد علی مونگیری: آپ نے چھ کتابیں تصنیف فرمائیں۔ (1) مرأۃ الاسلام۔ یہ کتاب پادری صفدر علی کی کتاب نیاز نامہ کے ردّ میں لکھی گئی تھی۔ (2) مرأۃ الیقین۔ یہ کتاب پادری عماد الدین کی کتاب ہدیۃ المسلمین کے ردّ میں لکھی گئی

تھی۔ اسی طرح آپ کی اور چار کتابیں (3) تکمیل الادیان (4) الرسالۃ المحمد یہ (5) دافع التلبیسات اور (6) تصدیق المسیح کے نام سے ہیں اور یہ چاروں بھی مسیحیت کے ردّ میں ہیں۔

3- ابو المنصور شیخ ناصر الدین بن محمد علی دہلوی نے بھی ردّ مسیحیت پر متعدد کتابیں لکھیں انہوں نے انگریزی زبان میں بھی مہارت تامہ حاصل کی تھی اور عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کا بھی بنظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ملت اسلامیہ کے دفاع میں مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

(1) عقوبۃ الضالین فی ردّ ہدایۃ المسلمین: یہ کتاب پادری عماد الدین کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی۔

(2) الاستیصال: یہ رام چندر کی کتاب المسیح الدجال کے جواب میں لکھی۔

(3) رقیمۃ الوداد: یہ پادری صفدر علی کی کتاب نیاز نامہ کے ردّ میں لکھی۔

(4) لحن داؤد: یہ کتاب پادری عماد الدین کی کتاب نغمہ طنبوری کے جواب میں لکھی۔

(5) الانعام العام: اس میں پادری رجب علی کی کتاب آئینہ اسلام کا ردّ ہے۔

(6) افحام الخصام: اس میں پروفیسر راجرس کی کتاب تفتیش الاسلام کا ردّ کیا گیا ہے۔

(7) تصحیح التاویل: یہ پادری عماد الدین کی کتاب تفسیر المکاشفات کا جواب ہے۔

(8) اعزاز القرآن: اس میں پادری رام چندر کی کتاب اعجاز القرآن کا ردّ ہے۔

(9) میزان المیزان: یہ پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق کا جواب ہے۔

علاوہ ازیں مصباح الابرار، تشویش القیس، نوید جاوید اور دولت فاروقی کے نام سے بھی کتابیں لکھیں۔

4- شیخ محمد علی مراد آبادی نے بھی ''کشف الاوہام''، ''شہادۃ النبیین برسالۃ سید المرسلین'' اور تائید القرآن نامی کتابیں تائید اسلام اور عیسائیت کے ردّ میں تصنیف کیں۔

5- مولانا فقیر محمد جہلمی: انہوں نے الاقاویل فی ترجیح القرآن علی الاناجیل نامی کتاب لکھی اور اس میں عیسائیت کا خاصا ردّ کیا۔

Marfat.com

6- مولانا علی غضنفر بن علی اکبر لکھنوی: انہوں نے الحق المبین فی الردّ علیٰ کتاب امہات المومنین تالیف کی، مولانا محمد آل حسن الموہانی، رئیس الاحرار حضرت مولانا حسرت موہانی کے جد امجد تھے۔ انہوں نے 1842ء میں پادری فنڈر کو پبلک مناظرے کا باقاعدہ چیلنج کیا علاوہ ازیں ''الاتیشار'' نامی کتاب تالیف کی جو 1259ھ میں زیور طباعت سے مزین ہوئی۔ ایک اور کتاب ''الاستفسار'' کے نام سے انہوں نے پادری فنڈر کی کتاب کے ردّ میں تالیف فرمائی۔ 1844ء میں سات ماہ تک وہ پادری فنڈر سے تحریری مناظرہ بھی کرتے رہے۔ بڑے صاحب علم تھے اور عیسائیت کا بھی کافی مطالعہ کیا ہوا تھا۔

8- مولانا ہادی علی نصیر آبادی: انہوں نے پادری فنڈر کی کتاب مفتاح الاسرار کے ردّ میں کشف الاستار کے عنوان سے ایک کتاب تحریر فرمائی۔ ان کی ایک کتاب ''تشخیص الحق'' کے نام سے بھی ہے۔

9- مولانا عباس علی جماجمی: انہوں نے صولۃ الضیغم علیٰ اعداء ابن مریم کے نام سے کتاب تالیف فرمائی۔

10- مولانا غلام نبی امرتسری: انہوں نے تصدیق الاسلام کے نام سے کتاب لکھی۔

11- مولانا عبدالباری: انہوں نے ''اعلام الاحبار'' کے نام سے کتاب تحریر کی اور پادری عمادالدین سے تحریری مناظرہ بھی کیا۔

12- مولانا چراغ علی حیدر آبادی: انہوں نے تحقیق الجہاد اور برکات الاسلام کے نام سے دو کتابیں تالیف کیں۔

13- مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی: انہوں نے ''البشریٰ'' کے نام سے دو جلدوں میں ردّ عیسائیت میں کتاب تحریر فرمائی۔

14- مولانا شرف الحق: انہوں نے پادری لیفرائی کے ساتھ دہلی میں مناظرہ کیا اور پادری روفیس سے غازی پور میں۔

15- شاہ جہان پور میں مسلمان علماء اور عیسائی مشنریز کے درمیان ایک مناظرہ ہوا۔

اگرچہ علماء کی یہ سب کوششیں بعد کی ہیں، کیونکہ ان سرگرمیوں سے قبل عیسائی مشنریز پورے ہندوستان میں اپنی دعوتی سرگرمیاں شروع کر چکے تھے۔ دوسری بات یہ کہ عیسائیت کے بارے علماء کی یہ جدوجہد بہت کم پیمانے پر تھی اور صرف چند گنے چنے علماء اس کام میں شریک تھے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ علماء مسیحیت کے اس خطرہ سے آگاہ ہو چکے تھے اور وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ چنانچہ پروفیسر آرنلڈ نے بھی اپنی کتاب Preaching of Islam کے صفحہ 488 پر لکھا ہے کہ انیسویں صدی میں مسلمان علماء کی ساری دعوتی سرگرمیاں اور ان کی تبلیغی کتابوں کی تدوین صرف ردّ نصاریٰ تک محدود تھیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی یہ بات بھی ہماری بات کی تائید اور تفصیل کے لیے کافی ہے جس میں آپ نے فرمایا:

> ”خدا نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر وزیر خان صاحبؒ (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رحم علی صاحب منگلوریؒ، مولانا عنایت رسول صاحب چڑیاکوٹیؒ اور مولانا سید محمد علی مونگیریؒ وغیرہ اشخاص پیدا کیے جنھوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیئے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خان صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کا وجود تو ردّ عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں۔ اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لیے ڈاکٹر وزیر خان جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود انہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا۔ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا۔“ (دیباچہ حیات شبلی)

Marfat.com

مولانا رحمت اللہؒ کی ردّ نصاریٰ میں تصنیفات:

سطور بالا میں ہم نے مختلف علماء کی عیسائیوں کے عقائد اور ان کے دعاوی کے ردّ میں مختلف تصانیف کا ذکر کیا، لیکن اس بارے میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ان سب کے سرخیل ثابت ہوئے۔ آپ نے ردّ نصاریٰ کے بارے میں مسلمانوں کو اپنی تصانیف کے ذریعہ وہ مواد مہیا کیا کہ آج تک پوری دنیائے اسلام ان کی مرہونِ منت ہے۔ اور آپ کی ان تصانیف کا جواب نہ ان کی زندگی میں عیسائی دنیا سے بن پڑا اور نہ انشاء اللہ تا قیامت بن پڑے گا۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ عیسائی مشنریوں کے اس خطرِ عظیم کو جلد ہی بھانپ گئے تھے، اور وہ دین اسلام کو غارت کرنے اور عوام الناس کو عیسائی بنانے کے بارے میں عیسائی پادریوں کی سرگرمیوں کو دین و ملت کے لیے نہایت نقصان دہ سمجھنے لگے۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے تو اپنی تعلیمی اور تدریسی سرگرمیوں کو خیرباد کہا (کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ یہ کام اور علماء بھی کر رہے ہیں اور کر سکتے ہیں) اور عیسائی مشنریوں کے خلاف انہوں نے قلم و زبان اور حجت و بیان سے جہاد کرنے کا عزم فرما لیا۔ دوسرے آپ نے اپنے کو دوسرے تمام کاموں سے فارغ کر کے عیسائیت کا اس کے اصلی مصادر اور بنیادی کتابوں سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ آپ اس وقت تک کے علماء میں سب سے زیادہ عیسائیت کے بارے میں ماہر اور ان کی کتابوں کے عالم ہو گئے۔ پھر آپ نے عیسائیت کے بارے میں تالیف و تصنیف کا کام کرنا شروع کر دیا اور عیسائیت کے بارے میں ایسی اعلیٰ اور لاجواب کتابیں لکھیں جن کا جواب آج تک عیسائی علماء نہیں دے سکے۔

اگرچہ عیسائیت کے اس خطرِ عظیم سے اور علماء بھی واقف و آشنا ہو چکے تھے اور اس کے ردّ کے لیے کام کر رہے تھے اور کام کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت مولانا کیرانویؒ دوسرے تمام علماء سے اس بارے میں سبقت لے گئے۔ چنانچہ اس بات کا ثبوت حضرت مولانا کیرانویؒ کی کتابوں سے بخوبی ملتا ہے۔ آپ نے عیسائی علماء کی کتابوں اور ان

کے اقوال سے عیسائیت کے خلاف حجت قائم کی اور ان کی کتابوں سے دلائل دے کر ان کی کتابوں کی تردید کی۔ پھر ان کی کتب مقدسہ میں تناقض ثابت کیا، ان کا محرف ہونا ثابت کیا یہاں تک کہ حضرت مولانا کیرانویؒ اپنے وقت میں تقابل ادیان، عقائد اسلام کے دفاع اور عقائد باطلہ کے ابطال میں تمام برصغیر پاک وہند میں سب سے بڑے عالم اور استاد سمجھے جانے لگے۔ اور یہ وہ وقت تھا جس میں مسلمان نہایت ذلت ونکبت میں تھے۔ ان کی حکومت ان کے ہاتھوں سے جانے کی وجہ سے نہایت ادبار اور بزدلی کی زندگی بسر کر رہے تھے جب کہ عیسائی اپنی شوکت وغرور کے آخری زینہ پر تھے اور نہایت جرأت وشجاعت کا اظہار کرتے ہوئے پورے ہندوستان میں دندناتے پھر رہے تھے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فتنۂ مسیحیت کے استیصال اور اس کی روک تھام کی غرض سے ردِّ نصاریٰ میں جو کتابیں تصنیف اور تالیف کیں وہ حسب ذیل ہیں:

1- ازالۃ الاوہام:

یہ حضرت مولانا کیرانویؒ کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو آپ نے نصاریٰ کے بارے میں تحریر فرمائی۔ اس کتاب میں آپ نے پادری فنڈر کی کتاب ''میزان الحق'' کے اعتراضات کے دندان شکن جوابات دیئے ہیں۔ یہ کتاب مولانا مرحوم نے فارسی زبان میں لکھی کیونکہ یہ اس زمانہ میں سرزمین پاک وہند کی علمی اور سرکاری زبان تھی۔ کتاب 564 صفحات پر مشتمل ہے اور یہ سید المطابع کوچہ بلاقی بیگم دہلی میں سید قوام الدین کے زیر اہتمام فارسی زبان میں 1269ھ میں بڑی تقطیع پر زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔

اس کتاب کے مقدمہ میں حضرت مولانا کیرانویؒ نے کتاب کی وجۂ تالیف اور اس وقت کے حالات پر ایک اجمالی تبصرہ کیا ہے اور اس میں نصاریٰ کے مطاعن کے جوابات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

ازالۃ الاوہام کا اردو ترجمہ ''دافع الاسقام'' کے نام سے حضرت مولانا نور محمد صاحب مہتمم مدرسہ حقانی، لدھیانہ، نے اخبار منشور محمدی، بنگلور میں قسط وار شائع کرنا

Marfat.com

شروع کیا۔ گویا یہ ایک ضمیمہ کے طور پر منشور محمدی کے شمارے میں شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ اس اخبار میں 25 رجب المرجب 1303ھ کے شمارہ میں اس ترجمہ کا اشتہار ان الفاظ میں شائع ہوا۔

''ازالۃ الاوہام'': یہ کتاب عالم اجل و فاضل اکمل جناب مولوی رحمت اللہ صاحب کی تصنیف ہے جو 1269ھ میں چھپ چکی ہے۔ اس کتاب کو دیکھنے کے لیے وہی شخص بے چین ہوگا جو کبھی مولانا کی دوسری تصنیفات کے ایک آدھ ورق پر بھی نظر دوڑایا ہو، اس کے تمام وکمال خوبی کے عوض مختصر یہ ہے کہ مولانا نے ہر ایک مسئلہ کی دلیل اور ایک سوال کا جواب اس بسط اور تفصیل سے لکھا ہے کہ کہیں بیس بیس چالیس چالیس دلیلیں اور حوالے دے کر بھی بس نہیں کی۔ اچھی طرح سے دروغگو کو اس کے گھر تک پہنچا دیا ہے۔ اس خوبی اور اس بسط اور تفصیل سے اب تک کوئی تصنیف نہیں دیکھی گئی۔ اس کتاب کے 572 صفحہ ہیں اور تقطیع اخبار منشور محمدی کے ہے۔ مگر یہ کتاب اب نہیں ملتی اور اتنی بڑی کتاب کا چھاپنا بھی ہر وقت ممکن نہیں۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اب جناب مولانا مولوی نور محمد صاحب، مہتمم صاحب مدرسہ حقانی، لدھیانہ نے اس کتاب کا ترجمہ سلیس اردو میں کر کے اخبار منشور محمدی میں چھپوانا شروع کیا اور اس کا نام ''دافع الاسقام'' رکھا۔ چنانچہ اسی (80) صفحہ تک ہدیۂ ناظرین ہو چکا ہے۔ اس کی خوبی اور عمدگی دیکھ کر علاوہ خریدارانِ اخبار منشور محمدی کے اور صاحبوں نے بھی اس کتاب کی خریداری کی درخواست کی۔ مگر چونکہ زائد نسخے نہ تھے اس لیے اس کی محرومی دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ یہ کتاب ازسرنو علیحدہ چھپوائی جائے تا کہ ہر ایک شائق اس سے فیض یاب ہو اور کوئی محروم نہ رہے اور نیز مولانا ممدوح مترجم کتاب ہذا نے اس پر جو اور حاشیہ چڑھایا ہے وہ بھی شامل کیا جائے اور صحت میں بھی حتیٰ الوسع کوشش ہو۔''

منشور محمدی میں ازالۃ الاوہام کا جو ترجمہ شائع کیا گیا وہ واقعی عام فہم اور سلیس

Marfat.com

اردو میں تھا۔ مترجم کا مقصد اس ترجمہ سے یہ تھا کہ جو لوگ فارسی میں شد بد نہیں رکھتے وہ حضرت مولانا کیرانویؒ کے دلائل ساطعہ اور براہین قاطعہ سے استفادہ حاصل کرسکیں کیونکہ عیسائی مشنریز عوام ہی کو اپنے دام تزدیر میں لانا چاہتے تھے۔ لہٰذا مولانا نور محمد صاحب نے عوام کے لیے وہ اردو ترجمہ کیا اور اس کو اپنے اخبار منشور محمدی میں بالاقساط شائع فرمایا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس ترجمہ کا عوام کو بہت فائدہ ہوا۔ اس کی ایک جھلک یہاں دکھائی جاتی ہے اس سے پتہ چلے گا کہ ترجمہ کتنا عام فہم تھا۔ زبان کا لب و لہجہ اگرچہ اس زمانہ کا ہے۔ لیکن آج بھی اس کی دلالت دل و دماغ کے دروازوں پر دستک دیتی ہے اور آدمی لطف اندوز ہوتا ہے:

کید سوم: عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ اہل اسلام یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی حالانکہ یہ محال ہے یونکہ آسمان خرق والتیام کو قبول نہیں کرتا یعنی آسمان کا پھٹنا یا اس میں کھڑکی، دروازہ یا سوراخ وغیرہ ہونا اور پھر جڑ جانا یہ سب باتیں غیر ممکن ہیں۔ پس وہاں کوئی کیونکر جا سکتا ہے علاوہ اس کے اس قدر مسافت کا طے کرنا اور ایک ہی رات میں لوٹ آنا کیونکر یقین آسکتا ہے۔"

جواب: یونانی حکماء جو خرق والتیام کے غیر ممکن ہونے کے قائل ہیں ان کی دلیلیں کامل نہیں۔ چنانچہ اپنی جگہ پر ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں ان لوگوں کے قواعد سے سند پکڑنی محض لغو ہے۔ پولوس قرنیتوں کے پہلے خط کے تیسرے باب 19 میں لکھتا ہے کہ اس جہاں کی حکمت خدا کے آگے بیوقوفی ہے کہ لکھا ہے وہ حکیموں کو انہیں چترائیوں میں پھنساتا ہے اور یہ کہ خداوند حکیموں کے قیاس کو جانتا ہے کہ باطل ہیں۔ انتہیٰ"

"اور اس سے قطع نظر اگر ان کی دلیلوں کے نتائج سچ ہوں تو لازم آئے گا کہ عالم قدیم ہو اور قیامت اور حشر اور نشر کا آنا بالکل باطل ہو۔ اور تعجب ہے کہ ان کے قواعد کو حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے میں کیوں لحاظ نہیں کرتے۔ اور شریعتوں میں سے کسی شریعت میں خرق والتیام کا ممتنع ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ اور متی کی انجیل کے تیسرے باب 16 اور مرقس کے پہلے باب 10 اور لوقا کے تیسرے باب

Marfat.com

22,21 میں لکھا ہے کہ یسوع بپتسمہ پا کے انہیں پانی سے نکل کے اوپر آیا اور دیکھو کہ اُس کے لیے آسمان کھل گیا اور اُس نے خدا کی روح کو کبوتر کی مانند اترتے اور اپنے اوپر آتے دیکھا۔ انتہیٰ

متی اور مرقس کے سولھویں باب 19 میں لکھا ہے کہ خداوند انہیں ایسا فرمانے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا اور خدا کے داہنے ہاتھ بیٹھا۔ انتہیٰ

اور یوحنا کے مکاشفات کے چوتھے باب میں لکھا ہے کہ بعد اس کے جو میں نے نگاہ کی تو دیکھو کہ آسمان پر ایک دروازہ کھلا ہے۔

پھر کتاب پیدائش کے ساتویں باب 11 میں طوفان کے حال میں لکھا ہے کہ بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ انتہیٰ

اور پھر اسی کتاب پیدائش کے آٹھویں باب اور 2 میں لکھا ہے کہ پانی ٹھہر گیا اور گھراؤ کے سوتے اور آسمان کی کھڑکیاں بند ہوئیں۔

اور اسی کتاب پیدائش کے اٹھائیسویں باب میں لکھا ہے کہ اس نے (یعقوب علیہ السلام نے) خواب میں دیکھا کہ ایک سیڑھی زمین پر دھری ہے اور اس کا سر آسمان کو پہنچا ہے۔ اور دیکھو خدا کے فرشتے اس پر سے چڑھتے اترتے ہیں۔ اور وہ ہراساں ہوا اور بولا کہ یہ کیا ہے؟ ڈرانا مقام ہے جو کچھ اور نہیں مگر خدا کا گھر اور آسمان کا آستانہ ہے۔ انتہیٰ

اور سلاطین کی دوسری کتاب کے دوسرے باب 11 میں ایلیا پیغمبر کے آسمان پر چڑھنے کے حال میں لکھا ہے کہ ایک آتشی رتھ اور آتشی گھوڑوں نے درمیان آ کے ان دونوں کو جدا کر دیا اور ایلیا بگولے میں ہو کے آسمان پر جاتا رہا۔ انتہیٰ

"اور بنی اسرائیل پر خدا تعالیٰ کی مہربانیوں کے حال میں اٹھترویں زبور کے 23ویں درس میں لکھا ہے کہ اس نے اوپر سے بدلیوں کو حکم کیا اور اس نے آسمان کے دروازے کھولے۔ انتہیٰ

(ازالۃ الاوہام کی عبارت یوں ہے کہ "افلاک را از بالا فرمان دادہ بود و درہائے آسمان را باز کردہ بود)

چونکہ آج کل کے نئے تعلیم یافتہ آسمان کے وجود کے منکر ہیں۔ رفتہ رفتہ کبھی

Marfat.com

ایک جگہ کبھی دوسری جگہ آسمان کا ترجمہ کہیں بدلیوں اور کہیں بلندی کا کرتے جائیں گے۔ پس اگر خرق والتیام محال ہو تو لازم آئے گا کہ آسمان کا پھٹ جانا اور اس کے دروازوں کا کھلنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر روح القدس کا اترنا اور ان کا اور ایلیا کا آسمان پر چڑھنا سب جھوٹے ہوئے۔ اور طوفان کے بارے میں توریت کی خبریں اور زبور کی خبر اور یوحنا کا مکاشفہ اور حضرت یعقوب کا خواب بھی باطل ہوئے۔ نعوذ باللہ من امثال ہذہ الخرافات۔

علاوہ ازیں پولوس قرنتیوں کے دوسرے خط کے بارہویں باب میں اپنے رسول ہونے کے بارے میں لکھتا ہے کہ بے شبہ اپنا فخر کرنا مجھے مناسب نہیں۔ میں خداوند کی رؤیتوں اور مکاشفوں کا بیان کیا چاہتا ہوں کہ چودہ برس گزرے ہوں گے کہ وہ تیسرے آسمان تک یکا یک پہنچایا گیا۔ اور میں ایسے شخص کو جانتا ہوں۔ اس نے وہ باتیں سنی جو کہنے کی نہیں اور جن کا کہنا بشر کا مقدور نہیں۔ وہ یا تو بدن کے ساتھ کہ یہ مجھے معلوم نہیں یا بغیر بدن کے کہ یہ بھی مجھے معلوم نہیں خدا کو معلوم ہے۔ انتہیٰ

پس عیسائی لوگ جب کہ بعض عیسائی شخصیتوں کے حق میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ پھر نہیں معلوم کہ اہل اسلام پر کیوں اس قسم کا طعن کرتے ہیں۔ ظاہراً اس کا منشاء محض تعصب ہے.........''

ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ نے کید سوم کے جواب میں دلائل کا ایک ایسا انبار لگا دیا کہ پوری عیسائی دنیا اس کا جواب دینے سے یک قلم قاصر ہے۔ ایسا ہی پوری کتاب میں ہے اور اردو ترجمہ میں مولانا مرحوم کے اس زور بیان کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ مترجم کی خوبی اور کمال ہے۔ اب ایک اور کید کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

کید چہارم: عیسائی کہتے ہیں کہ اہل اسلام دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزہ سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا اور اس کا یقین نہیں آتا کیونکہ اگر یہ بات سچ ہوتی تو تمام فرقوں مثلاً ہندوؤں اور عیسائیوں وغیرہ کی کتابوں اور تواریخوں میں لکھا ہوتا نہ کہ فقط اہل اسلام کی کتابوں میں، اور سارے جہاں میں دکھائی دیتا، اور تفسیروں سے ''اقتربت الساعۃ وانشق القمر'' کے معنوں کے

Marfat.com

بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند کا پھٹنا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے جو اس دن ظہور میں آئے گا۔ اس لیے بیضاوی اس کی تفسیر میں ینشق القمر یوم القیامۃ کہتا ہے یعنی قیامت کے دن چاند پھٹے گا۔ پس اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ جاننا قرآن شریف کا جھٹلانا ہے۔

جواب: اگر یہ معجزہ عیسائیوں کے دفتر میں عناد کے باعث موجود نہ ہو اور علیٰ ہذا القیاس ہندوؤں کے دفتر میں بھی اس سے اس خبر کا جھوٹ ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ حضرت مسیح کے تمام معجزے یہودیوں کی کتابوں میں کہاں لکھے ہیں بلکہ مخالف لوگ ایسی خبروں کے چھپانے اور باطل کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ اور عناد کی جہت سے اگر بچشم خود بھی دیکھیں انکار کرتے ہیں اور اُسے جادو وغیرہ کہتے ہیں۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ باوجود معجزوں کے دیکھنے کے یہودیوں نے کس قدر حضرت مسیح کے انکار کرنے میں کوشش کی اور جنوں دیوؤں کے نکالنے کو پریوں دیوؤں کے بادشاہ کی مدد سے جانتے تھے۔ اور اب تک کہتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت مسیح کے خوارق عادات ناپاک روحوں کے وسیلے سے تھے۔ اور جو تکلیفیں آل ذات مصدر حسنات کو پہنچائیں اور ایسا ہی آنجناب کے حواریوں کو بھی جو اذیتیں اور تکلیفیں دیں، حواریوں کے اعمال ناظرین پر پوشیدہ نہیں۔ پس کسی خبر کا سچا ہونا مخالفوں کے دفتر میں درج ہونے پر موقوف نہیں۔ اور اگرچہ یہ امر بدیہی اور ظاہر ہے، لیکن اس رسالہ کی عادت کے موافق مختلف واقعات مندرجہ کتب عہد عتیق و جدید کی چند مثالیں لکھتا ہوں جن کے واقع ہونے کی صورت میں ان حادثوں کا سارے جہاں میں یا اکثر میں مشاہدہ ہونا اور دیکھا جانا ضروری ہے، حالانکہ کتب مذکور کے سوا کسی فرقہ کی کتابوں میں ثابت نہیں۔

اول: یہ کہ نوح علیہ السلام کے طوفان کی خبر کتاب پیدائش کے ساتویں اور آٹھویں باب میں مفصل مرقوم ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چالیس دن اور چالیس رات زمین پر پانی کی جھڑی لگی رہی اور پانی بڑھ گیا اور کشتی زمین پر سے اٹھ

Marfat.com

گئی اور کشتی پانی کے اوپر بہتی رہی، اور پانی زمین پہ بے نہایت بڑھ گیا۔ اور سب اونچے پہاڑ جو آسمان کے نیچے چھپ گئے پندرہ ہاتھ پانی ان کے اوپر بڑھا اور سب جاندار جو زمین پر چلتے تھے، پرندے اور چرندے اور جنگلی جانور اور کیڑے مکوڑے جو زمین پر رینگتے تھے، اور سب انسان مر گئے۔ سب جن کی نتھنوں میں زندگی کا دم تھا ان میں سے جو خشکی پر رہے تھے، مر گئے، بلکہ سب موجودات جو روئے زمین پر جان رکھتی تھیں، مٹ گئیں فقط نوح اور جو اس کے ساتھ کشتی کے اندر تھے بچ رہے۔ اور پانی کی باڑ ڈیڑھ سو دن تک زمین پر رہی، پھر آسمان سے مینہ تھم گیا اور پانی زمین پر سے رفتہ رفتہ گھٹ جاتا تھا اور ساتویں مہینے کی سترویں تاریخ کو اراڑا کے پہاڑوں پر کشتی ٹک گئی اور پانی دسویں مہینے تک گھٹتا چلا جاتا تھا۔ اور دسویں مہینے کہ پہلی تاریخ کو پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آئیں۔ انتہی

دوم: یہ کہ آفتاب کے ٹھہرنے کی خبر یوشع کی کتاب کے دسویں باب میں لکھی ہے کہ جس دن خدا نے عموریوں کو بنی اسرائیل کے آگے لا کے ان کے قابو میں کر دیا اس یشوع نے خداوند کے حضور بنی اسرائیل کے سامنے یوں کہا کہ اے آفتاب! جیعون پر ٹھہرا رہ، اور اے ماہتاب! تو بھی وادئ ایلون کے درمیان۔ تب آفتاب کھڑا رہا اور مہتاب ٹھہر گیا یہاں تک کہ ان لوگوں نے اپنے دشمنوں سے انتقام لیا۔ کہ یہ کتاب الیاشر میں نہیں لکھا ہے۔ ازالۃ الاوہام میں اس کے بعد لفظ کے بیانیہ لکھا ہے یعنی الیاشر کی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کی عبارت یا مضمون یہ ہے جو 14 درس تک مرقوم ہے۔ یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ یہ مضمون الیاشر کی کتاب میں سے نقل کر کے لکھا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کتابؑ کا مصنف یشوع نہیں ہے کیونکہ اپنا حال لکھتے ہوئے کسی کتاب کا حوالہ دینے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اس عیب کو چھپانے کے واسطے مرزاپور کی بائبل میں لفظ کہ کی جگہ اور لکھا ہے اگرچہ ابھی تک وہ مطلب حاصل نہیں ہوا جو پادری صاحب نے چاہا۔ مگر تین کمیٹیوں

Marfat.com

میں آہستہ آہستہ کرلیں گے۔ اور آفتاب آسمان کے بیچوں بیچ ٹھہرا رہا۔ اور قریب دن بھر کے پچھم کی طرف مائل نہ ہوا۔ اور اس سے آگے ایسا دن کبھی نہ ہوا اور نہ اس کے بعد تھا۔ انتہیٰ۔

سوم: یہ کہ کتاب سلاطین کی دوسری کتاب کے بیسویں باب میں اور اشیعا کی کتاب کے اٹھتیسویں باب میں لکھا ہے کہ جب خرقیا بادشاہ نے مرض مہلک میں جناب خداوندی سے پانی شفا پانے کے لیے دعا مانگی اور اشیعا نبی کے معرفت اس کو قبولیت معلوم ہوئی تو پوچھا کہ میرے درست ہونے کی کیا دلیل ہے کہ خدا مجھے شفا بخشے گا۔ اشیعا نے کہا کہ یہ نشانی ہے کہ اگر تو کہے سایہ دس درجہ آگے بڑھ جائے۔ اور اگر تو کہے دس درجہ پیچھے ہٹے۔ خرقیا نے جواب دیا کہ یہ سایہ کا آگے بڑھنا ایک تھوڑی سی بات ہے۔ پس اس طرح نہ ہو بلکہ سایہ دس درجہ پیچھے لوٹ جائے۔ اشیعا نے دعا کی اور سایہ کو دس درجہ پیچھے لوٹایا۔ انتہیٰ

یسعیا کی کتاب میں اس طرح لکھا ہے۔ چنانچہ آفتاب جن درجوں سے کہ ڈھل گیا تھا ان میں کے دس درجہ پر چڑھ گیا۔ انتہیٰ

چہارم: یہ کہ انجیل متی کے دوسرے باب میں لکھا ہے کہ مجوسی پورب کی طرف سے جناب مسیح کا ستارہ دیکھ کر یروشلم میں آئے اور ہیرو بادشاہ سے اجازت لے کر یہودیہ بیت لحم کی طرف روانہ ہوئے۔ اور وہ ستارہ ان کے آگے آگے جاتا تھا یہاں تک کہ جہاں وہ لڑکا تھا وہ وہاں ٹھہر گیا۔

پنجم: یہ کہ متی کے تیسرے باب میں جناب مسیح کے واسطے آسمان کا پھٹ جانا اور روح القدس کا کبوتر کی شکل بن کر آنجناب پر نازل ہونا لکھا ہے۔ اور اس کی نقل مقدمہ کے دوسرے فائدہ میں گزر چکی اور تیسرے کید کے جواب میں بھی۔

ششم: یہ کہ جناب مسیح کے مصلوب ہونے کے حال میں انجیل متی کے ستائیسویں باب 51 اور مرقس کے پندرہویں باب اور لوقا کے تیئسویں باب 44 میں لکھا ہے کہ چھٹے گھنٹے کے قریب تھا کہ ساری زمین پر اندھیرا چھا گیا اور پون گھنٹے

تک رہا اور سورج تاریک ہو گیا۔ انتہی

بلفظ لوقا اور دیکھو ہیکل کا پردہ وہ اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر تڑک گئے اور قبریں کھل گئیں اور بہت لاشیں پاک لوگوں کی جو آرام میں تھیں اٹھیں اور قبروں میں سے نکل کر اور مقدس شہر میں جا کر بہتوں کو نظر آئیں۔ انتہی

ان خبروں میں سے پہلے تین خبریں تمام یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک اور پچھلی تین خبریں تمام عیسائیوں کے نزدیک ثابت اور صحیح ہیں۔ حالانکہ ان چھ خبروں میں سے کوئی سی بھی ہند کے کفاروں اور چین کے کفاروں اور آتش پرستوں کے دفتر میں ثابت اور مرقوم نہیں بلکہ پچھلی تین خبروں کا یہودیوں کے دفتر میں بھی کوئی اثر اور نشان نہیں۔ اور ہند کے کفار حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے منکر ہیں حالانکہ طوفان نوح ایسا بڑا حادثہ ہے کہ برس روز کے قریب تک رہا۔

اور وہ جو اعتراض کرتے ہیں کہ سارے جہاں میں دیکھا جاتا۔ میں کہتا ہوں اول تو سارے جہان میں دکھائی دینا کچھ ضروری نہیں کیونکہ احتمال ہے کہ بعض جگہ بادل ہوں، اور کبھی چاند بعض جگہ ظاہر ہوتا ہے اور بعض جگہ ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کو نظر نہیں آتا۔ اور ایسا ہی گہن بعضے شہروں میں دیکھا جاتا ہے بعضے شہروں میں نہیں۔ بعضے شہروں میں پورا گہن نظر آتا ہے اور بعضوں میں تھوڑا سا۔ بعضے شہروں میں جانتے بھی نہیں۔ مگر جو لوگ علم نجوم میں دخل رکھتے ہیں، مگر باوجود اس کے کوئی قطعی اور یقینی دلیل سارے جہان میں نظر نہ آنے کی نہیں بلکہ مسافروں نے ابوجہل کو خبر دی تھی۔ اور ایسا ہی ملیبار کا راجہ اس زمانہ میں اسی معجزہ سے ایمان لایا۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ کے گیارھویں مقالہ میں اس کا حال لکھا ہے۔ اس کی عبارت کا یہ ترجمہ ہے کہ سامری نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اپنے ملک میں چاند کا پھٹنا دیکھا۔ اس امر کی تحقیق کے لیے معتبر آدمی اطراف و جوانب میں بھیجے۔ بعدہ، جب معلوم ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کر کے شق قمر کو منجملہ اور معجزات کے ایک معجزہ ٹھہرایا ہے۔ تب سامری کشتی پر سوار ہو کر ملک حجاز میں گیا اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کر کے مسلمان ہو گیا۔ اور خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔"

یہ اقتباس ہم نے اس لیے دیا ہے تاکہ ایک ترجمہ کی سلاست اور دلالت کا

Marfat.com

اندازہ ہو سکے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے اس عبارت میں الزامی اور تحقیقی دونوں جوابات دیئے ہیں۔ اور یہ جوابات ایسے مسکت ہیں کہ پوری عیسائی دنیا مل کر بھی ان کے جوابات نہیں دے سکتی۔ ان جوابات سے حضرت مولانا مرحوم کی وسعت مطالعہ کا بھی پتہ چلتا ہے خصوصی طور پر بائبل پر آپ کی مطالعہ میں گیرائی بھی تھی اور گہرائی بھی۔

2-ازالۃ الشکوک:

یہ کتاب حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے عیسائیوں کے 29 سوالوں کے جواب میں اردو زبان میں تحریر فرمائی تا کہ اس کتاب سے علماء کے ساتھ ساتھ عوام الناس بھی مستفید ہوسکیں۔ اس کتاب کا دوسرا نام ''سوالات کرانجی'' بھی ہے۔ حضرت مولانا مرحوم نے اس کتاب کے مقدمہ میں اس کتاب کی تالیف کی وجہ یہ لکھی ہے کہ

> ''بھائی مسلمانوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ 1268 ہجری مطابق 1852 عیسوی (اٹھارہ سو باون عیسوی) میں ایک قطعہ بتیس سوال کا جو دلی اور آگرہ وغیرہما میں مشتہر ہوا تھا، میری نظر سے گزرا اور پھر انہیں سوالوں کو ایک ہندی رسالے کے آخر میں مندرج پایا اور معلوم ہوا کہ مسیحوں کی علت غائی اشتہار سے یہ ہے کہ کوئی ان کا جواب لکھے۔ اس پر میرے دل میں آیا کہ میں لکھوں، لیکن جب دیکھا کہ وہ سوال نئے نہیں بلکہ سائل نے انہیں قدیم سوالوں کو جو میزان الحق اور پادریوں کے رسالوں میں مندرج ہیں نقل کر لیا ہے۔ اور ان کے جواب بخوبی ادا ہو چکے ہیں، تو یہ دیکھ کر ان کے علیحدہ جواب لکھنے کو فضول سمجھ کر چپ ہو رہا۔ مگر 1269 ھ میں دو امر باعث ہوئے کہ ان کا جواب لکھوں۔ ایک یہ کہ بعض عیسائیوں نے ان سوالوں میں اصلاح دے کے اور چھ سوال اور بڑھا کے ان کو جناب مستطاب مرزا محمد فخر الدین ولی عہد بہادر کی خدمت بابرکت میں بھیجا اور جناب منعم الیہ نے مجھ

Marfat.com

سے درخواست کی کہ ان کا جواب لکھوں، اور ان کا امر ماننا پڑا۔ دوسرا یہ کہ میں نے سنا کہ وہ حضرات پادری جو اس امر کی تنخواہیں پاتے ہیں اور اسی بات کی روٹی کھاتے ہیں کہ جاہلوں کو بہکا دیں اور بھولے بھالوں کو پھسلا دیں، شور وغل مچاتے ہیں کہ مسلمان لوگ جواب نہیں دے سکتے۔ پس ان دو امر کا لحاظ کر کے جواب کے لکھنے میں مستعد ہوا لیکن اس لحاظ سے کہ جناب ولی عہد بہادر کا ایما یہ تھا کہ انتیس سوالوں کا جواب لکھوں جن کو بعض عیسائیوں نے ان کی خدمت میں بھیجا ہے۔ اور حقیقت میں ان کا جواب جو ان تیس سوالوں مشتہرہ کا بھی بلا تفاوت جواب تھا تو انہیں انتیس کا جواب لکھا۔ اور جو وہ سوال بے ترتیب تھے تو میں نے ان کی ترتیب اس طرح کر دی کہ جو معجزات سے تعلق رکھتے تھے ان کو ایک جا اور جو قرآن سے متعلق تھے ان کو ایک جا۔ اور اسی قیاس پر اور جا ذکر کیا۔ لیکن مسائل کی عبارت میں کچھ تبدیلی عمل میں نہیں آئی بلکہ جیسی تھی ویسے ہی حرفاً حرفاً منقول ہوئی۔ اور خدا کے فضل سے 1269ھ میں رمضان کے مہینے میں اس تحریر سے فراغت ہوئی اور فراغت کے بعد دلی میں اس کا چھپنا شروع ہوا، لیکن جو اسی عرصہ میں میرا جانا اکبر آباد ہوا اور مہتمم کی کچھ سستی کے سبب اور کچھ اس سبب سے کہ مسودہ سے کاتب بعض جگہ اچھا نہ پڑھ سکا اکثر غلط چھپا تھا۔ میں نے یہ معلوم کر کے وہاں سے لکھ کر چھپنا اس کا ملتوی اپنی مراجعت پر رکھا اور اکبر آباد میں مجھ کو دو سبب سے کچھ عرصہ تک رہنا پڑا۔ ایک یہ کہ اس جا میں نے کتاب اعجاز عیسوی کو کہ تحریف کے اثبات میں بہت ہی اچھی کتاب ہے، اور ناظر کو بڑا فائدہ بخشتی ہے، تالیف کی۔ دوم یہ کہ اس کی تالیف کے بعد میرا مباحثہ قسیس فنڈر صاحب میزان الحق کے مؤلف سے مجمع

Marfat.com

عام میں ٹھہر گیا اور یہ قرار پایا کہ جناب ڈاکٹر وزیر خان صاحب میرا شریک اور پادری فرنچ صاحب میزان الحق کے مؤلف کے شریک رہیں۔ اور دو روز متواتر مجمع عام میں وہ مباحثہ ہوا اور خدا کے فضل سے غلبہ ہماری طرف رہا جیسا کہ یہ حال ان لوگوں کے رسالوں سے جو مباحثہ کے جلسوں میں شریک تھے اور انہوں نے مباحثہ کی تقریر کو اپنے کانوں سے سن کر ضبط کیا ہے۔ اکثر خلق پر ظاہر بھی ہو گیا ہے۔ اور جب میں اکبر آباد سے دلی میں پھر آیا اور جواب کا چھپنا جو ملتوی تھا، پھر مقرر ٹھہرا تو بعض احباب نے درخواست کی کہ ہمارے نزدیک یوں مناسب ہے کہ تم ابطال التثلیث کو جو اس کے مقدمہ کے امر تیسرے میں مبین ہے، نکال کر اس کو رسالہ جداگانہ کر دو اور مواضع میں بقدر مناسب کے کچھ بڑھا دو، اور پھر از سر نو اول سے چھپواؤ۔ پس ان کی درخواست کے موافق میں نے اس ابطال التثلیث کو اس سے نکال کر کچھ اس میں اور بسط کر کے اس کو رسالہ جداگانہ کر دیا، اور نام اس کا ''احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث'' رکھا۔ اور جواب میں کہیں کہیں بقدر مناسب کے کچھ بڑھا کر از سر نو چھپوایا اور نام اس جواب کا ''ازالۃ الشکوک'' ہے۔ اللہ اپنے فضل سے اس کو سب عام و خاص کی خاطر کا مقبول کیجئے۔''

مقدمہ کی اس عبارت سے ایک تو اس کتاب کی تالیف کے اسباب اور وجوہات کا پتہ چلا۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کیرانویؒ کی کتاب ''احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث'' دراصل اسی کتاب ''ازالۃ الشکوک'' ہی کا ایک باب ہے جس کو آپ نے بعد میں لوگوں کے اصرار پر علیحدہ کتاب کی شکل دے کر زیور طباعت سے آراستہ کیا۔

علاوہ ازیں اس مقدمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت عیسائی پادریوں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے ہوئے تھے کہ انہوں مغلیہ تاجدار کے ولی عہد مرزا محمد فخر الدین کو

Marfat.com

بھی کچھ سوالات جن میں اسلام پر اعتراض کر کے دین مسیحیت کو ترجیح دی گئی تھی، بھیجے۔ دراصل یہ سوالات ایک دعوت تھی جو انہوں نے مرزا محمد فخر الدین ولی عہد کو عیسائیت قبول کرنے کی دی تھی۔ اسی وجہ سے ولی عہد موصوف نے حضرت مولانا کیرانویؒ کو ان سوالات کا جواب دینے کی درخواست کی۔ گویا کہ عیسائی پادریوں کی یہ ایک دیدہ دلیری تھی جو کہ اس وقت کے حالات کی ترشی کی غمازی کر رہی ہے۔

عیسائیوں کے جن 29 سوالات کے جوابات حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ نے اپنی اس کتاب میں دیئے ہیں، ان کو ملاحظہ فرمانے کے بعد اس کتاب کی اہمیت ایک قاری کی نگاہ میں اور بڑھ جاتی ہے۔ دوسرا ان سوالات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کی بے بسی نے عیسائی پادریوں کو اتنا زبان دراز بنا دیا تھا کہ وہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قرآن حکیم پر اس قدر گھناؤنے اعتراض کرتے جن کو ایک مسلم حکومت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن مغلیہ تاجدار کی بے بسی اور بے ہمتی یہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ بہرحال وہ 29 سوالات جن کا جواب اس کتاب مستطاب میں حضرت مولانا مرحوم نے دیا ہے، یہ ہیں:

1- معجزات محمدی کس طور سے ثابت ہوں گے۔ آیا قرآن شریف سے یا اور کتب سے؟

2- ثبوت ان کا قرآن ہی سے ضروری ہے کیونکہ معجزات اور انبیاء کے ان کی کتابوں سے ثابت ہیں۔

3- وہ معجزات جو قرآن میں مذکور ہیں آیا وہ معجزات ہیں یا بطریق اظہار عظمت الٰہی کے مرقوم ہیں۔ اگر بطریق اخیر لکھے ہیں تو ان کو پیغمبر صاحب سے کیا تعلق ہے؟

4- کوئی کتاب پیغمبر کے اصحاب کی تصانیف میں سے ایسے موجود ہے جس میں درباب معجزات کے کچھ لکھا ہو۔ اگر ہے تو نام اس کا اور مصنف کا، اور یہ امر کہ فلانی جگہ وہ کتاب موجود ہے، اور کتنے اشخاص نے اس بات میں تحریر کی ہے، بتاؤ؟

Marfat.com

5- اگر اور راویوں نے اصحاب کے اقوال میں سے کچھ لکھا ہے تو یہ سن کر لکھا ہے یا ان کے کتب میں سے، اگر نفس الامر میں ایسا ہی ہے تو ان کا لکھا کہاں ہے؟ اور زمانہ راوی اور اقوال مذکورہ میں کیا تفاوت ہے؟

6- اگر شق القمر کو معجزہ قرار نہ دو تو کوئی اور معجزہ جو چند اشخاص کے روبرو واقع ہوا ہو قرآن یا حدیث سے ثابت کر دو، مگر اس میں یہ بات بھی ہو کہ راوی اس کا فلانے زمانے کا ہے یا یہ امر منقول ہے اور شہادتیں اس کی فلانے امور ہیں۔

7- قرآن میں لکھا ہے کہ پیغمبر کو معجزات کے اظہار کے لیے نہیں بھیجا بلکہ محض وعظ کے لیے، اس صورت میں باوجود بے اختیاری کے ان سے اظہار معجزات کا کیونکر ہوا؟

8- یہ جو لکھا ہے کہ روز ولادت پیغمبر کے آتش کدہ منطفی ہو گیا، بت سب واژگوں ہو گئے۔ یہ تحریر آیا کسی مخالف کی ہے یا موافق کی؟

9- شق القمر کس نے دیکھا، اور جنہوں نے دیکھا آیا انہوں نے اپنی شہادت کو آپ قلمبند کیا یا وے نقل محض تھے، اور اوروں نے ان سے روایت کی ہے؟

10- اس کا کیا باعث ہے کہ انہوں نے خود نہ لکھا، آیا وہ بے علم تھے؟

11- راوی اس کے کس عصر میں بعد پیغمبر کے تھے۔ اس کے جواب میں زمانہ اس کا تحقیق کر کے لکھ دو۔

12- ان کی روایت کس طرح کی ہے؟ کیا محض سنی سنائی ہوئی بات کو لکھا ہے؟

13- جامع قرآن فقط حضرت عثمانؓ ہیں یا ان سے سابق حضرت ابوبکرؓ بھی جامع ہوئے؟

14- قرآن میں منسوخ آیتیں کیوں ہیں؟

15- نسخ کا وعدہ کون سی آیت میں پایا جاتا ہے؟

16- قرآن اگلی کتب سماوی کے مخالف کیوں ہے؟

17- توریت اور انجیل کی تحریف کی دلیل کیا ہے؟

18- یہ تبدل کب ظہور میں آیا؟

Marfat.com

-19 قرآن سے ثابت ہے کہ پیغمبر کے وقت تک کلام مجید سابق میں کچھ تحریف نہ ہوئی تھی۔ بعد ان کے اگر ہوئی ہو تو ثابت کرو؟

-20 کسی نے بچشم خود دیکھا کہ جبرئیل پیغمبر کے پاس وحی لاتا تھا؟

-21 کتب تاریخ کی جن کا تواتر قرآن کی طرح ثابت ہو، اصلیت کو مانو گے یا نہیں؟

-22 کتب مذکورہ کی اصلیت میں شبہ کرنے سے کیا تم پر لازم نہ آئے گا کہ قرآن کی اصلیت پر شبہ کرو؟

-23 کتب مذکورہ اور قرآن کے اختلاف میں کسے غلط کہو گے؟

-24 جب قرآن اور تواریخ دونوں تواتر سے ثابت ہیں تو اب بتلائے کہ دونوں میں شک کیجئے گا یا تواریخ میں یا اقرار کیجئے گا کہ قرآن کے مصنف حالات قدیمہ سے آگاہی نہ تھے۔

-25 اگر کوئی قرآن کو کلام اللہ تو مانے لیکن قرآن مروج کو جعلی اور محرف بتلائے کیونکہ اس میں نامعقول باتیں پائی جاتی ہیں تو اس کا جواب کیا دیجئے گا؟

-26 جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اور ایک کتاب بنا کر کلام اللہ قرار دے اور کتب سابقہ متواترہ کو محرف کہے تو صدہا سال کے بعد اس کے معتقد کس وجہ سے تحقیق کریں گے کہ ان کے نبی والی کتاب اصلی ہے یا جعلی؟

-27 اس نبی کے قول سے معتبر تاریخوں کا اعتبار جاتا رہے گا یا قائم رہے گا۔ یا دہریت پھیلے گی یا خدا پرستی؟

-28 انبیاء اور کلام الٰہی کا انکار اس پر مبنی ہے کہ کتب سابقہ متواترہ جعلی ہیں یا اس پر کہ ایسی کتابیں اصل اور درست ہیں۔

-29 ایک شخص بہت سی کرامات دکھلاتا ہے اور کہتا ہے کہ دو سو برس سے ہندوؤں میں ذاتوں کا رواج پڑا ہے۔ اس صورت میں تاریخ اور تواتر کو باطل کہو گے یا اس شخص کو کاذب؟

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پہلے سوال کے جواب میں قرآن مجید سے بیس تفصیلی اور دس اجمالی معجزوں کا ثبوت پیش کیا۔ پھر ان پر عیسائیوں کے

Marfat.com

اعتراضات اور ان کے جوابات بڑی تفصیل و شرح کے ساتھ قریباً تین سوصفحات میں دیئے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی سوال کر دینا ایک معمولی بات ہے لیکن اس سوال کا جواب دینا بہت بڑے علم کا تقاضا کرتا ہے۔ حضرت مولانا نے جو جوابات عیسائیوں کے ان سوالات کے دیئے ہیں، ان سے ان کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ اور جہاں جواب میں تفصیل کی ضرورت تھی حضرت کیرانویؒ نے وہاں بات ذہن میں ڈالنے کے لیے تفصیل ہی سے کام لیا ہے۔

معجزہ معراج اور معجزہ شق القمر کے جوابات بھی آپ نے نہایت معقول اور مدلل دیئے ہیں۔ ان کے جوابات حضرت کیرانویؒ نے اپنی کتاب ازالۃ الاوہام میں بھی دیئے ہیں جن کا گذشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ البتہ دو تفصیلی اور تین اجمالی معجزوں کا اقتباس آپ کی کتاب ازالۃ الشکوک سے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

(1) آیت سترھویں سورۂ انفال میں جو نویں سپارے کے سولھویں رکوع میں ہے یوں واقع ہوا:

﴿وما رميت اذ رميت ولكن الله رمىٰ﴾
''یعنی اور تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک جس وقت پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی۔''

اور حال اس کا یہ ہے کہ بدر کی لڑائی میں جب کفار نظر پڑے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی۔ اس پر جبرئیل نے آ کے کہا کہ ایک مٹھی خاک کی لے کے کفار کے لشکر کی طرف پھینک دو۔ جب دونوں لشکر بھڑے اور لڑائی گرم ہوئی، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی خاک کی لے کر کفار کے لشکر کی طرف پھینکی اور فرمایا ''شاهت الوجوه'' اللہ کی قدرت سے ہر کافر کی آنکھ میں وہ خاک پہنچی اور ان کی آنکھیں بھر گئیں۔ اور اس سے خوف کھا کر بھاگے۔ مسلمانوں نے پیچھا کر کے بہت کو قتل کیا اور بہت کو قید۔ اور جو ایک مٹھی خاک سے سب لشکر کفار کی آنکھوں کا بھر جانا محال عادی اور قدرت بشری سے خارج ہے۔ پس یہ ایک معجزہ ہوا اور حقیقت میں تین معجزوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ اس مٹھی

Marfat.com

کی خاک سب کی آنکھوں میں پہنچی۔ دوسرا یہ کہ اس تھوڑی سی خاک سے سینکڑوں کفار کی آنکھیں بھر گئیں۔ تیسرا یہ کہ خوف کھا کر سب بھاگ اُٹھے۔"

صاحب میزان الحق لکھتے ہیں "" ان کلمات میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ محمدؐ نے فلاں فلاں معجزہ کیا بلکہ بے تعین اور بے تفصیل صرف اتنا ہی کہا کہ تو نے نہیں ڈالا جس وقت ڈالا لیکن خدا نے ڈالا۔ سو دانشمندوں کے نزدیک ایسے غیر معین لفظوں سے معجزہ ثابت نہ ہوگا۔ ہاں مگر احادیث کے مضمون کے بموجب مفسرین یوں لکھتے ہیں کہ غزوۂ بدر یا غزوۂ حنین میں محمدؐ نے ایک مٹھی ریت کفار کے لشکر کی طرف ڈالی تھی............الخ"

"میں کہتا ہوں اس آیت سے بدلیل تاء خطاب کی اتنا صراحتاً اور نصاً معلوم ہوا کہ ایک امر خارق العادت حضرت کے ہاتھ سے بطریق رمی کے صادر ہوا۔ اور تعین اس کی احادیث صحیحہ اور تفاسیر ماثورہ معتبر سے یقینی ہے۔ پس اعتراض مذکور صرف توہم ہے اور بس، اور احادیث کا سند اور قابل دلیل کے ہونا دوسرے سوال کے جواب میں بیان کریں گے۔ پھر لکھتے ہیں کہ اگر بالفرض ہم قبول کریں کہ وہ حدیث صحیح اور فی الحقیقت محمدؐ نے دشمنوں کے لشکر کی طرف ریت ڈالی تب بھی اس سے معجزہ ثابت نہ ہوگا............الخ

میں کہتا ہوں یہ بات بہت ہی تعجب کی ہے کیونکہ جب پادری صاحب نے اس حدیث کو جو مفسرین نقل کرتے ہیں صحیح مان لیا۔ اس حدیث میں صاف مرقوم ہے کہ جبرئیل کے کہنے کے موافق حضرتؐ نے وہ مٹھی پھینکی تھی، اور اللہ کی قدرت سے ہر کافر کے آنکھ میں جو مخالف لشکر میں تھا اس ریت میں سے کچھ کچھ پہنچا تھا۔ تو کون عقل مند ہے کہ نہ کہے گا کہ یہ امر موافق وحی کے تھا اور ہر کافر کی آنکھ میں اس سے کچھ کچھ پہنچا اور پیغمبرؐ کا معجزہ ٹھہرا۔ اور وہ حدیث جو مفسروں نے نقل کی ہے وہ بیضاوی کی ہے، ترجمہ اس کا یوں ہے:

"مروی ہے کہ جب نکل آئے قریش ریت کے تودہ سے، فرمایا حضرت نے یہ قریش ہیں جو آئے ہیں غرور اور فخر کے ساتھ۔ جھٹلاتے ہیں رسول تیرے کو، اے خدا میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ چیز جس کا تو نے وعدہ کیا تھا۔ پس آئے جبرئیل حضرتؐ کے پاس

اور کہا ان کو لے تو ایک مٹھی خاک کی پس پھینک ان کی طرف۔
پس جب ملے دونوں لشکر، لی حضرتؐ نے ایک مٹھی کنکریوں اور خاک کی۔ پس پھینکا اس کو ان کے مونہوں کی طرف اور فرمایا بگڑ جایو یہ مونہہ۔ پس نہ رہا کوئی مشرک کہ نہ پہنچی ہو اس کی آنکھ میں۔
پس بھاگ اُٹھے اور مسلمانوں نے ان کا پیچھا کر کے ان کو قتل اور گرفتار کیا۔ پھر جب پھرے مسلمان فخر کرنے لگے۔ پس کہتا تھا ہر ایک کہ میں نے مارا اور گرفتار کر لیا۔ اور اس پچھلی بات سے اللہ صاحب نے مسلمانوں کو روکا جیسا کہ اسی آیت میں مذکور ہے۔

﴿فلم تقتلوھم ولکن اللّٰہ قتلھم﴾

''یعنی سو تم نے ان کو نہیں مارا لیکن اللہ نے ان کو مارا۔''

2- جب قریش کا قافلہ شام کے ملک سے ہٹا اور اس کے ساتھ تجارت کا مال بہت تھا اور چالیس سوار تھے۔ جبرئیل نے ان کے پھرنے کی خبر دی۔ اس پر حضرت نے ارادہ کیا۔ اور جب اس ارادہ کی خبر مکہ والوں کو پہنچی، ابوجہل لوگوں کو جمع کر کے لڑائی کے ارادے سے نکلا اور جبرئیل نے حضرتؐ کو آ کر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دو جماعتوں سے ایک جماعت کا وعدہ کیا ہے۔ چاہے قافلے والوں کا مال لو اور چاہو اس کافروں کے لشکر پر جو قافلے کی مدد کو آتا ہے، فتح یاب ہو۔ حضرتؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اپنی قلت اور بے سامانی پر نظر کر کے قافلے پر عزم کی صلاح دی۔ حضرتؐ کو یہ صلاح پسند نہ آئی۔ اس پر بڑے بڑے صحابیوں نے مہاجرین اور انصار سے عرض کیا کہ حضرتؐ کی رائے بہتر ہے۔ اور ہم دشمنوں کے مقابلے میں راضی ہیں۔ حضرتؐ نے کوچ کیا اور جب بدر میں پہنچے۔ حضرتؐ نے ستر کافروں کے مارے جانے کی جگہ جدی جدی ہاتھ رکھ کر معین کر دی۔ اس طرح پر کہ اس جا ابوجہل مارا جائے گا اور اس جا فلانا اور اس جا فلانا وعلیٰ ہذا القیاس۔ انسؓ کہتے ہیں کہ جس جگہ پر پیغمبرؐ نے ہاتھ رکھ کر اس کو مقتل کافر کا فرمایا اسی جگہ پر وہ

Marfat.com

کافر مارا گیا۔ چنانچہ اس کی تفصیل حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں مسطور ہے۔
اور اللہ تعالیٰ نے اس اپنے وعدہ کو جو جبرئیل کی معرفت فرمایا تھا اور صحابہؓ کے حال کو سورہ انفال کی ساتویں آیت میں یوں ارشاد کیا ہے:

﴿واذ يعدكم الله احدى الطائفتين انها لكم وتودون ان غير ذات الشوكة تكون لكم و يريدالله ان يحق الحق بكلماته ويقطع دابر الكافرين﴾

''یاد کرو اس کو جس وقت وعدہ دیا تھا تم کو اللہ نے دو جماعت میں سے (یعنی قافلہ اور کافروں کے لشکر سے) کہ ایک تم کو ہاتھ لگے، اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے۔ اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کرے سچ کو اپنے کاموں سے اور کاٹے پیچھا کافروں کا۔''

سو اللہ تعالیٰ نے جیسا وعدہ فرمایا تھا ویسا ہی کیا تھا جیسا اوپر گذرا معجزات اجمالی کے تین ثبوت۔

1- سپارے تیئسویں کے رکوع پانچویں میں سورہ صافات کی تیرھویں اور چودھویں آیت یوں ہے:

﴿واذا رأوا آيةً يستسخرون، وقالوا ان هذا الاّ سحر مبين﴾

''جب دیکھیں (یعنی مکے کے مشرک) کوئی معجزہ جو تیری نبوت پر دلالت کرتا ہے ہنسی میں ڈال دیتے ہیں، اور کہتے ہیں اور کچھ نہیں یہ (یعنی جس کو ہم نے دیکھا) مگر جادو ہے کھلا۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکے کے مشرک جب کوئی معجزہ دیکھتے تھے شقاوت ازلی سے ہنسی میں ڈال دیتے تھے اور کھلا جادو بتلاتے تھے۔ اور ان کی ہنسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی نسبت ایسی تھی جیسے فرعون اور اس کے تابعین کی ہنسی معجزات موسویہ کی نسبت۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سپارے پچیسویں رکوع گیارہ میں سورہ زخرف کی 47 آیت میں اس کو یوں نقل کیا ہے:

﴿فلما جاء هم بأياتنا اذا هم منها يضحكون﴾

Marfat.com

''پھر جب لایا موسیٰ ان کے پاس ہماری نشانیاں (یعنی معجزات مثل عصاوغیرہ کے) تو لگے اس پر ہنسنے۔''

اور ان مشرکوں کا یہ قول ''ان هـذا الاسـحـر مبين'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی نسبت ایسا تھا جیسا کہ کفار بنی اسرائیل کا قول حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کی نسبت جس کو اللہ صاحب نے سپارے ساتویں رکوع پانچویں میں سورۂ مائدہ ایک سو تیرھویں آیت کے اندر نقل کیا ہے:

﴿فقال الذين كفروا منهم ان هذا الاسحر مبين﴾

''تو کہنے لگے جو کافر تھے ان میں یعنی بنی اسرائیل میں اور کچھ نہیں یہ جادو ہے صریح۔''

اور یہ بات کہ کافر لوگ سچی بات کو اور سچے امر کو ہنسی میں ڈال دیتے ہیں۔ انجیل سے بھی ثابت ہے۔ دیکھو جب حواریوں پر مسیح کے عروج کے بعد روح القدس اترا اور وہ مختلف بولیاں بولنے لگے اس پر بعضے ہنسی اور مسخرا پن سے کہتے تھے کہ شراب کے نشے میں ہیں۔ اعمال کے دوسرے باب کی تیرھویں درس میں ہے فارسیہ 1816ء، 1828ء، 1841ء، 1842ء بعضے استہزاء کناں می گفتند کہ ایشاں از شراب تازہ مملوشدہ اند۔ ص ۲۰۴۔

2- سپارے ستائیسویں کے رکوع آٹھویں میں سورۂ قمر کی دوسری آیت یوں ہے:

﴿وَاَن يروا آية يعرضوا ويقولوا سحر مستمر﴾

''اور اگر دیکھیں کوئی نشانی ٹال دیں اور کہیں یہ جادو ہے چلا آتا۔''

یعنی ٹالنے کہنے لگتے ہیں کہ یہ بھی ایک ایسا جادو ہے جیسے اور جادو اس نے ہم کو دکھلائے ہیں۔ اس آیت کے موافق بھی معلوم ہوتا ہے کہ کافروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی معجزے تو دیکھے ہیں جس کے سبب پچھلے معجزے کو کہتے ہیں کہ اگلے جادوؤں کی طرح یہ بھی ایک جادو ہے۔

3- سپارے ستائیسویں کے رکوع دوسرے میں سورۃ ذاریات کی آیت بانویں یوں ہے:

Marfat.com

﴿کذالک ماأتی الذین من قبلهم من رسول الا قالوا ساحرٌ او مجنون﴾

''اسی طرح (یعنی جیسے تجھ کو تیری قوم جادوگر اور دیوانہ کہتی تھی اسی طرح) ان سے پہلوں کے پاس جو آیا رسول یہی کہا کہ جادوگر ہے (جب اس کا کوئی معجزہ دیکھا) یا دیوانہ۔''

اس آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے معجزے تو دیکھے لیکن ان کو جادوگر بتلایا جیسے اگلے انبیاء کے معجزات کو ایسا ہی بتلایا ہے۔ اور اسی سورت کے 38-39 آیات میں حضرت موسیٰ کا حال یوں مرقوم ہے

﴿وفی موسیٰ اذا ارسلناه الیٰ فرعون بسلطان مبین. فتولی برکنه وقال ساحر او مجنون﴾

''اور نشانیاں ہیں موسیٰؑ کے حال میں (ڈرنے والوں کے لیے)
جب بھیجا ہم نے اس کو فرعون کے پاس دے کر سند (عصا وغیرہ)
پھر اس نے مونھ موڑا اپنے زور پر اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ۔''

اور دوسرے مقام میں گزرا کہ یہود حضرت مسیح کو دغاباز بتلاتے تھے۔ اور اس انجیل میں مصرح ہے کہ ان کو دیوانہ بھی بتلاتے تھے۔ مثلاً یوحنا کے دسویں باب کے بیسویں درس میں ہے۔ ہندیہ 1814ء، 1846ء ''اور بہتیرے ان میں (یعنی یہودیوں میں) سے بولے اس کی (یعنی عیسیٰ کے) ساتھ دیو ہے، وہ دیوانہ ہے۔ تم اس کی کیوں سنتے ہو۔''

اور حق یہ ہے کہ جب آدمی کا دل کفر یا غرور یا شہوات نفسانیہ سے بھرا ہوتا ہے تو وہ عاقل ہی تو اس کو وہ سب باتیں جو اس کے عقیدے اور مرضی کے مخالف ہوتی ہیں، بیہودگی اور دیوانگی نظر آتی ہیں۔ گو نفس الامر میں کیسے ہی اچھی اور حق ہوں۔ چنانچہ یہی بات گرنتھیون کے نامہ اول باب کے 23 ورس اور باب دوم کے چودھویں ورس اور اعمال کے چھبیسویں باب کے چوبیسویں ورس سے سمجھی جاتی ہے۔

عیسائی مشنریوں کا دن رات یہی کام تھا کہ قرآن مجید اور احادیث نبوی کا مطالعہ کریں اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے قرآن مجید اور احادیث نبوی کو غلط طریقوں سے

پیش کریں۔ چنانچہ ساتواں سوال بھی اسی قسم کا تھا جس سے ذہن گمراہ کیا جا سکتا تھا۔ جو یہ تھا:

"قرآن میں لکھا ہے کہ پیغمبر کو معجزات کے اظہار کے لیے نہیں بھیجا بلکہ محض وعظ کے لیے۔ اس صورت میں باوجود بے اختیاری کے ان سے اظہار معجزات کیونکر ہوا؟"

چونکہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ عیسائیوں کی کتابوں اور ان کی تحریرات سے پوری طرح واقف و آشنا تھے بلکہ انہیں ان کی کتابیں نوک زبان تھیں اس لیے ان کے ہر مسئلہ سے پوری طرح آگہی رکھتے تھے، اس لیے ان کو انہی کی مقدس والہامی کتابوں کے حوالے دے کر قائل کر دیا کرتے تھے۔ یعنی الزامی اور تحقیقی دونوں قسم کے جوابات دیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اس سوال کا جواب بھی اسی انداز سے دیا۔ فرمایا:

"پہلے سوال کے جواب میں مشروحاً بیان ہو چکا کہ قرآن سے حضرتؐ کے معجزے تفصیل اور اجمال کی راہ سے ثابت ہیں۔ اور دونوں طریقوں سے ان کے ثبوت میں شک نہیں۔ اور قرآن کی کسی آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معجزہ صادر نہیں ہوا یا ہو گا۔ ہاں بعضی آیتوں میں بعضے ان خاص معجزات جن کو کافر لوگ محض عناد سے ہٹ کر طلب کرتے تھے، انکار مذکور ہے کہ انہیں کو پادری لوگ جاہلوں کو مغالطے دینے کو پیش کیا کرتے ہیں۔ شاید سائل نے بھی انہیں بعض آیات میں کسی آیت سے ٹھوکر کھائی ہو گی جو اپنے زعم میں معجزات کی نسبت ذاتِ رسالت کو ایسا سمجھا اور عنقریب واضح ہو جائے گا کہ ان آیتوں سے تمسک پکڑنا اور ان کو معجزے کی نفی کی دلیل سمجھنا غلط ہے۔ اور یہ امر ایسا ہے کہ کوئی آدمی انجیل کے بعضے ورسوں سے تمسک پکڑے کہ جناب مسیح سے بالکل معجزہ صادر نہیں ہوا۔ اور اسی طرح حواریوں کی کرامات کے ظہور کا بیان ہوا ہے، نظر سے ڈالے۔ اور ناظر کی تنبیہ کے لیے ایسے آٹھ موضع انجیل کی نقل کرتا ہوں۔

پہلا موضع: مرقس کے انجیل کے آٹھویں باب میں ہے:

"تب فردوسی نکلے اور اس سے حجت کر کے اس کے امتحان کے لیے کوئی آسمانی نشانی طلب کی۔ اس نے دل سے آہ مار کے کہا۔ اس زمانے کے لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں۔ میں تم سے سچ

Marfat.com

کہتا ہوں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان دکھایا نہ جائے گا۔
اور وہ اس سے جدا ہو کے پھر کشتی پر چڑھ کے پار گیا۔''

(نسخہ: ۱۸۳۹ء ۱۸۴۰ء ۱۸۴۴ء ۱۸۴۶ء)

اور یہ جملہ میں تم سے سچ کہتا ہوں اور ترجموں میں یوں ہے:
بدرستیکہ بہ شما میگویم کہ ہیچ آیت بایں طبقہ دادہ نخواہد شد۔

(فارسیہ: ۱۸۱۶ء ۱۸۲۸ء ۱۸۴۱ء ۱۸۴۲ء)

دیکھو، جناب مسیح نے فرداسیوں کو جو حجت اور امتحان کے طور پر کوئی آسمانی معجزہ مانگتے تھے نہ کوئی معجزہ دکھلایا اور نہ کسی اپنے اگلے معجزے کا حوالہ دیا بلکہ الٹا ایسا قول فرمایا کہ جس سے ظاہر میں یوں سمجھا جاتا ہے کہ اس فرمانے کے بعد جناب مسیح سے کوئی معجزہ کسی کے سامنے صادر نہ ہوا ہو۔ اس لیے یہ الفاظ اس زمانے کے لوگوں کو جناب مسیح کے سب ہم عہدوں کو کیا یہودی کیا غیر یہودی شامل ہیں۔ اور اسی طرح بے الفاظ کوئی نشان یا ہیچ آیت ہر معجزے کو جو کسی طرح کا ہو شامل ہے، اور اس قول کے ظاہر کے موافق لازم آتا ہے کہ بعض معجزات کا صدور جو مرقس نے اس کے بعد نقل کیا ہے صحیح نہیں، وگرنہ یہ قول میں تم سے سچ کہتا ہوں.......... الخ۔ سچ نہ ہوگا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ کبھی پیغمبر لوگ ایسے منکروں کو جن کی حجت اور امتحان ہو معجزہ نہیں دکھلاتے اور نہ ان کے جواب میں کسی اپنے معجزے پہلے دکھلائے ہوئے کا حوالہ دیتے ہیں۔ بلکہ الٹا ایسا انکار کرتے ہیں کہ ظاہر میں اوس سے دوام کے لیے سمجھا جائے۔

تیسرا موضع: لوقا کی انجیل کے تیسویں باب میں ہے:

''ہیرودیس یسوع کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ وہ بہت دن سے اُسے دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نے اس کی بہت سی باتیں سنی تھیں اور اس امید میں تھا کہ اُس کے کسی معجزے کو دیکھے۔ اس نے اس سے بہتیرے سوال کیے پر یسوع نے اس کو کچھ جواب نہ دیا۔ اور سردار اماموں اور کاتبوں نے کھڑے ہو کے اس پر بہت سی نالشیں کیں۔ تب ہیرودا اور اس کے لشکر نے اسے حقیر کر کے ٹھٹا کیا اور

Marfat.com

یہ جملہ اور اس امید میں تھا کہ اس کے معجزے کو دیکھئے۔"

(نسخہ: ۱۸۳۹ء ۱۸۴۰ء ۱۸۴۴ء ۱۸۴۶ء)

اور یہ جملہ پر یسوع نے اس کو............الخ۔ اور ترجموں میں یوں ہے:

(فارسیہ: ۸۱۶ء ۱۸۲۸ء ۱۸۴۱ء ۱۸۴۲ء)

امیدوار بود کہ از و معجزہ دیدہ باشد واو مطلقاً جوابش نداد............

دیکھو اس عبارت کے موافق جناب مسیح نے ہیرود کو باوجودیکہ ان کے دیکھنے سے بہت خوش ہوا تھا اور امیدوار اور مشتاق تھا کہ معجزانہ دیکھے، کوئی معجزانہ دکھلایا بلکہ اس کے کسی سوال کا جواب بھی نہ دیا کہ اس پر اس مردود نے اور اس کے لشکر نے جناب مسیح کو حقیر سمجھا اور ٹھٹا کیا اور اغلب یہ تھا کہ اگر کوئی معجزہ دیکھتا تو وہ اور اس کا لشکر اس بے ادبی سے باز رہتا اور نالشیوں کو الزام دیتا۔ پس اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کبھی انبیاء علیہم السلام باوجود اشتیاق اور امید منکروں کے ان کو معجزہ نہیں دکھلاتے گو اس پر ان کی بے عزتی بھی ہو جائے اور کافر استہزاء سے پیش آئیں۔

چوتھا موضع: متی کے انجیل کے چوتھے باب میں ہے:

"تب امتحان کرنے والے اُس کے پاس آ کر اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو کہہ کہ یہ پتھر روٹی بن جائیں۔ اس پر اُس نے ان کے جواب میں کہا کہ لکھا ہے کہ آدمی خالی روٹی سے نہیں بلکہ ہر حکم سے جو خدا کے منہ سے نکلتا ہے، جیتا ہے۔ اس وقت شیطان اسے شہر مقدس میں لے گیا اور بڑی عبادت گاہ کے کنگرے پر کھڑا کر کے اس سے کہا کہ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے آپ کو نیچے گرا دے کہ یوں لکھا ہے وہ فرشتوں کو تیرے لیے حکم کرے گا اور وہ تجھے ہاتھوں میں اٹھا لیں گے تا ایسا نہ ہو کہ تیرا پاؤں پتھر پر لگے۔ تب یسوع نے اس سے کہا یہ بھی لکھا ہے کہ تو اللہ کو جو تیرا خدا ہے امتحان مت کر۔"

دیکھو اس عبارت کے موافق جناب مسیحؑ نے شیطان کے جواب میں دونوں امر خارق اللعادۃ کے دکھلانے سے جس کا وہ طالب تھا، انکار کیا اور دوسرے میں عبودیت

Marfat.com

کے مقتضیٰ کے موافق یہ بھی فرمایا کہ بندے کو لائق نہیں کہ خدا کا امتحان کرے۔ اور یہ حق ہے اور اس میں نبی اور غیر نبی برابر ہیں۔ اور حضرت موسیٰؑ بھی کتاب استثناء کے چھٹے باب کے سولہویں ورس میں کہ جناب مسیح بھی غالباً اسی کا حوالہ دیتے ہیں، ایسا ہی کچھ فرما گئے ہیں۔ نسخہ ۱۸۲۲ء، ۱۸۲۹ء تم یہودہ اپنے خدا کو مت آزمائیو۔

ازالۃ الشکوک کی جلد اول میں بارہ سوالات کے جواب حضرت مولانا کیرانویؒ نے رقم فرمائے ہیں اور باقی سترہ سوالوں کے جوابات آپ نے جلدِ دوم میں دیئے ہیں۔ جلد دوم میں اکبر آباد (آگرہ) کے دو مناظروں کے حالات و واقعات بھی آپ نے کتاب میں درج فرمائے ہیں۔ اور بڑے مناظرے (المناظرۃ الکبریٰ) سے جو اثرات مرتب ہوئے تھے، اس کا ذکر بھی آپ نے جلد دوم میں تحریر فرمایا ہے اور خاص طور پر اکبر آباد کے چھوٹے مناظرے کا حال تو سوائے اس کتاب کے کسی دوسری اور کتاب میں نہیں ملتا۔ گویا یہ کتاب دو تین مناظروں کی یادداشت بھی ہے۔

انیسواں سوال ہے کہ

''کیا قرآن کی رو سے ثابت ہے کہ پیغمبر کے وقت کے کلام مجید سابق (تورات اور انجیل) میں کچھ تحریف ہوئی تھی۔ بعد ان کے اگر ہوئی تو ثابت کرو۔''

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ اس سوال کا تفصیلی جواب اپنے بڑے مناظرہ، اکبر آباد (المناظرۃ الکبریٰ) میں دے چکے ہیں۔ اپنی اس کتاب ازالۃ الشکوک میں بھی اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

قرآن حکیم کی بعض بعض آیتوں میں تصریح ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے بھی تحریف ہوئی۔ سورۂ بقرہ کی 75 آیت میں ہے۔

﴿افتطمعون أن يؤمنوا لكم وقد كان فريق منهم يسمعون كلام الله ثم يحرفونه من بعد ماعقلوه وهم يعلمون﴾

''اب کیا تم مسلمان توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات، اور ایک لوگ تھے ان میں کہ سنتے تھے کلام اللہ کا، پھر اس کو بدل

Marfat.com

ڈالتے تھے جان بوجھ کر۔ اور ان کو معلوم ہے کہ جھوٹے افترا باندھتے ہیں۔''

سو جب ان کے سلف کا یہ حال ہو تو ان سے تحریف کا ہونا کیا تعجب ہے؟ اس میں دیکھو کہ اُس بات کی تصریح ہے کہ اہل کتاب کے سلف کا ایک طبقہ تحریف کیا کرتا تھا۔ اگر خلف بھی کریں تو کچھ تعجب نہیں۔'' (صفحہ:۴۸۹)

بیسویں نمبر پر جو سوال ہے وہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس سے عیسائی مشنریز کی ابلہی اور خود فریبی بلکہ عوام فریبی کا پتہ چلتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ

''کسی نے بچشم خود دیکھا ہے کہ جبرئیل پیغمبر کے پاس وحی لاتا تھا اور اگر کسی نے دیکھا ہے تو گواہی اس کی کہاں ہے؟''

حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ نے اس کا جواب تحریر فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں:

جواب: اول تو دیکھنا کسی اور شخص کا جبرئیل یا اور فرشتے حامل وحی کو ضروری نہیں، بلکہ اس امر میں اس نبی کا جس کی نبوت سچی دلیلوں سے ثابت ہوتی ہو فقط فرما دینا کفایت کرتا ہے۔ حزقیل کی کتاب کے پہلے باب میں اس وحی کے بیان میں جو پہلے نہر خابوز کے کنارے حزقیل پر اتری تھی یوں ہے۔

نسخہ ۱۸۴۳ء اور میں نے نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اتر سے ایک طوفان آیا، ایک بڑا بادل اور آتش پیچان، اس کے گرد روشنی چمکتی تھی اور اس کے بیچ میں سے یعنی اس آتش میں سے کہربائی دکھلائی دیا۔ اور اس کے بیچ سے چار جانداروں کی ایک صورت نظر آئی۔ اور یہ ان کی شکل انہیں انسان کی قامت تھی۔ اور ان کے سروں پر آسمان کا سا فلک تھا جو مہیب بلور کی مانند دکھائی دیا، وہ اوپر ان کے سروں کے پھیلا تھا اور ان کے سروں پر کے فلک کے اوپر تنگ نیلم کی مانند ایک تخت کی صورت دکھائی دی۔ اور اس تخت کی صورت پر انسان کا سا قالب اوپر اس پر نظر آیا۔ اور جو قالب دیکھنے میں آیا سو کہربا جیسا بلکہ آگ سا بھیتر وار اور گردا گرد تھا۔ اور اس قالب کی کمر سے اوپر اور اس قالب کی کمر سے نیچے تک سارا اندام آگ کا سا میرے دیکھنے میں آیا۔ اور جلال اس کے گرد چمکتا تھا۔ وہ خداوند

Marfat.com

کے کبریا کی صورت کی نمائش تھی۔ اور دیکھتے ہی میں اوندھے منہ گرا اور بولنے والے کی آواز سنی۔ اور اسی کتاب حزقیل کے تیسرے باب کے 23 ورس میں ہے۔ نسخہ ۱۸۴۴ء:

''تب میں اُٹھ کر وادی میں گیا اور کیا دیکھتا ہوں کہ خداوند کا کبریا اس کبریا کی مانند جو میں نے نہر خابوذ کے پاس دیکھا تھا، کھڑا ہے۔ اور میں منہ کے بل گرا۔''

دیکھو یہ عجیب وغریب ماجرا حزقیل کے سوا اور کسی شخص نے نہیں دیکھا۔ اور یوحنا کے مشاہدات میں اس قسم کی باتیں کثرت سے ملیں گی۔ اور وہاں بھی یوحنا کے سوا کسی اور نے نہیں دیکھا، بلکہ حضرت موسیٰؑ کے سوا اور انبیاء پر ملا کیا پیغمبر تک اگر فرشتہ حامل وحی آیا ہے، اس کو ان انبیاء کے سوا بتلاؤ کس نے دیکھا ہے۔ اور اسباب میں جیسا ارشاد حضرت کا جبرئیل کے وحی لانے میں کافی ہے۔ اور قرآن میں کئی جا مصرح ہے۔

اس کے بعد حضرت کیرانویؒ نے قرآن کی کچھ آیات نقل فرمائی ہیں جن میں ہے کہ یہ وحی جبرئیل امین یعنی اللہ کا فرشتہ لے کر آتا تھا۔ یہ تو ایک حد تک الزامی جواب تھا۔ دوسرا جواب حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ نے تحقیقی دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''دوم یہ ہے کہ بہت اصحابؓ سے مثل حضرت عمروؓ، عبداللہ بن عباسؓ وسعدؓ بن ابی وقاص اور عائشہ صدیقہؓ وام سلمہؓ کے جبرئل کو آنحضرت کے پاس آتے دیکھا ہے۔ اور ان کے دیکھنے کی روایات صحاح کی کتابوں میں اسناد صحیحہ سے مروی ہیں۔ اور اس بات کی تحقیق حدیث صحیح سند اور اعتبار کے قابل ہے۔''

(صفحہ:۴۸۱)

پچیسواں سوال عیسائی مشنریز بڑے شدومد اور بانگ دہل کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ جو یہ تھا:

''اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میں قرآن کو کلام اللہ جانتا ہوں، لیکن جو قرآن کہ زمانۂ حال میں پایا جاتا ہے وہ اصلی نہیں ہے بلکہ جعلی اور محرف ہے کیونکہ اس میں نامعقول باتیں پائی جاتی ہیں، تو فرمایئے کہ اس شخص کو یہ جواب دو گے کہ اے برادر! یہ

Marfat.com

سوال دیگر ہے کہ تیرے زعم میں چند مسائل قرآن کے عقل کے خلاف ہیں، مگر یہ تحقیق ہے کہ علم تاریخ اور طریق تواتر سے بالکل ناواقف ہے۔ اور تیرا یہ قول کہ میں قرآن کو کلام اللہ جانتا ہوں محض غلط ہے۔ تو اپنے توہمات کے تابع ہے، اور اپنے وہم میں تو نے ایک اور قرآن فرضی قرار دے لیا ہے۔ یا یہ جواب دیجئے گا کہ یہ وہ قرآن جس کا زمانِ محمدی سے آج تک رواج ہے، بلاشبہ جعلی ہے۔ اور بیشک کوئی اور قرآن ہو گا گو اس کا اشارہ زمانِ سلف سے آج تک کسی نے نہیں کیا۔''

اس غیر معقول بلکہ واہیات سوال کا جواب مناظر اسلام حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی قدس سرہ نے یہ تحریر فرمایا ہے:

''قرآن کے سارے مجموعہ میں اول سے آخر تک کوئی ایسی بات نہیں کہ الوہیت کے مناقض یا خدا کی صفات کمالیہ کے مخالف یا انبیاء کی نبوت کے منصب کے منافی ہو یا برہان عقلی قطعی کے برخلاف ہو۔ سو اولاً اس شخص سے ان باتوں کو جنہیں وہ نامعقول سمجھتا ہے، اور تحریف کی دلیل بناتا ہے، دریافت کر کے برہان سے ثابت کیا جائے گا کہ وہ نامعقول باتیں نہیں۔ اور اے بھائی! بالکل تیرا زعم غلط ہے۔ اور جب دلیل اس کی اٹھ گئی تو پھر ثانیاً ثابت کیا جائے گا کہ یہ قرآن لفظاً لفظاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے آج تک تواتر قطعی سے ثابت ہے۔ اور اس کی عبارت اعجاز اور بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر ہے۔ اس میں کلام بشری ممکن نہیں کہ مل کر کھپ جائے۔ سو جتنا یہ کلام ہے وہ سب کا سب منزل من السماء ہے۔ اور اس کے حق میں خود خدا کا وعدہ یوں مرقوم ہے کہ

''تحقیق ہم آپ اس کے البتہ نگہبان ہیں۔''

یعنی ہر وقت میں زیادتی اور نقصان اور تبدیلی سے جیسا ان سب امروں کا بیان پہلے سوال کے جواب میں گزرا ہے۔ یہی وہ قرآن ہے جو محمدؐ پر نازل ہوا تھا اور آج تک ویسا ہی بلا زیادت و نقصان اور تحریف کے پایا جاتا ہے جیسا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا۔ اور قرآن کا حال ایسا نہیں جیسا عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں کا ہے کہ ان میں بعض باتیں تثلیثی مفسروں کی تفسیر کے موافق الوہیت اور صفات کمالیہ کے منافی ہیں۔ اور بہت باتیں نبوت کے منصب کے مخالف ہیں جیسا کہ بعضے پیغمبروں کا شراب کے نشوں

Marfat.com

میں متوالے بن کر دورات برابر اپنی بیٹیوں سے زنا کرنا اور بعضے پیغمبروں کا گوسالہ پرستی کرنا اور کروانا، اور بعضے پیغمبروں کا نبوت کے بعد مرتدین بن کر بت پرستی کرنا اور بت خانے بنوانا، اور بعضے پیغمبروں کا خود احکام تبلیغیہ اور وحی میں جھوٹ بولنا اور مانند ان کے، اور ان کی سند متصل نہیں، اور تواتر کما ینبغی سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ ان میں سے بعض کتاب تو ایسی ہیں کہ خود اہل کتاب کے بڑے بڑے عالم اس کو جھوٹی کہانی بتلاتے ہیں۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ ان کو ان کے عالم ایک ناپاک راگ اور راگ اوباشانہ واجب خراج کہتے ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں کہ چار سو برس تخمیناً تک مردود رہیں اور بعضی بعضے بڑے بڑے عالموں نے اسے ایک ملحد کی تصنیف بتلائی اور ان میں ہر قسم کی تحریف لفظی ہوئی جس کا اقرار اہل کتاب کے علماء سلفاً عن خلف کرتے چلے آتے ہیں۔ اور مخالف دوسری صدی سے چلاتے ہیں کہ عیسائیوں نے تین بار یا چار بار بلکہ اس سے بھی زائد اپنی انجیلوں کو بدلا ہے۔ اور ان میں یقیناً اختلافات معنوی اور غلطیاں بھی ہیں۔ اور خود ان کے علماء محققین کے اقرار کے موافق ہر معاملہ اور ہر گذارش ان کی الہامی بھی نہیں جیسا مشروحاً ان سب امور کا بیان سترھویں سوال کے جواب میں گذرا ہے۔

چھبیسواں سوال بھی عیسائی مشنریز نے اپنے خیال میں ایسا کیا تھا کہ اس کا جواب مسلمان نہیں دے سکیں گے لیکن حضرت مولانا قدس سرہ نے اس کا ایسا دندان شکن جواب دیا کہ عیسائیوں کو پھر اس سوال کے دہرائے کی جرأت نہ ہوئی۔ سوال یہ تھا:

> ”جو شخص دعوائے نبوت کرے اور کتاب بنا دے یا کہے اور اس کو کلام اللہ قرار دے، اور کتب سابقہ کو جو قرار واقعی تواتر سے ثابت ہوں محرف یا جعلی بتائے تو فرمایئے کہ صدہا سال کے بعد اس کے تابعین کس وجہ سے اس بات کی تحقیق کریں گے کہ ان کے نبی کے نام سے جو کتاب مشہور ہے وہ اصل ہے یا جعلی؟“

اس مغالطہ دینے والے سوال کا جواب حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے نہایت مختصر لفظوں میں ایسا دیا کہ عیسائی مشنریز بالکل خاموش ہو گئے۔ آپ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

Marfat.com

''اس قول سے کتب سابقہ کو جو قرار واقعی تواتر سے ثابت ہوں، سائل کی مراد اگر یہ ہے کہ ان کتابوں کی سند متصل ہے اور مصنف کے عہد سے آج تک تواتر کی راہ ہے۔ ہر ہر فقرہ اور ہر ہر لفظ ان کا منقول ہے اور برہان سے ثابت ہے کہ کسی طرح کی تحریف ان میں نہیں ہوئی تو ممکن نہیں کہ سچا نبی ایسی کتابوں کو جعلی اور محرف بتا دے۔ سو اس صورت میں ایسا فرض تو ایک لغو فرض ہے، التفات کے قابل نہیں۔ اور اگر مراد یہ ہے کہ فقط کسی شخص کی طرف نسبت اس کی مشہور ہوگئی ہو گو نفس الامر میں اس کی تصنیف ہو یا نہ ہو اور گو ہر ہر فقرہ اور ہر ہر لفظ اس کا تواتر کی راہ سے نہ منقول ہو بلکہ تحریف بھی اس میں ہر قسم کی یقیناً ہوئی ہو تو ممکن ہے کہ سچا نبی ایسی کتابوں کو محرف یا جعلی بتلا دے۔ اس معنے کر کے بعض کتاب تو حقیقت میں اس مصنف کی تصنیف نہیں جس کی طرف نسبت ہے۔ اور بعض کتاب گو اس کی تصنیف ہے مگر پیچھے سے اس میں تحریف ہوئی ہے۔ اور جب خارج سے یہ بات معلوم ہو اور اس نبی کی نبوت بھی معجزات اور دلائل حقہ سے ثابت ہو تو پھر یہ بات یقین اور واجب الاعتقاد ہو جائے گی۔ رہی اس نبی کی کتاب، اگر اس کا یہ حال ہو تو اس نبی کے عہد سے آج تک ہر ہر فقرہ اور ہر ہر لفظ اس کا تواتر کی راہ سے منقول ہو۔ اور اس کے علاوہ یہ بات بھی ثابت ہو کہ غیر کا کام اس میں نہیں مل سکتا۔ اور خدا کا وعدہ اس کی حفاظت کا بھی ہے۔ تو صدہا سال کے بعد کا کیا ذکر، ہزارہا سال کے بعد بھی نہایت آسانی سے ثابت کر سکیں گے۔ اور اگر اس کتاب میں بھی تواتر دوسری قسم کا ہو تو حقیقت میں وہ بھی اس کی اصلیت کا اثبات نہ کر سکیں گے۔

یہ تھا ایک اجمالی خاکہ ان جوابات کا جو حضرت مولانا کیرانویؒ عیسائی مشنریز کے سوالات کے دیئے۔ یہ کتاب دو جلدوں اور 1116 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ 1269ھ مطابق 1853ء میں حیطۂ تحریر میں لائی گئی یعنی جنگ آزادی سے قریباً چار سال قبل۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور آپ کے خاتم النبیین ہونے کو بھی دلائل ساطعہ اور براہین قاطعہ سے بیان کیا گیا ہے علاوہ ازیں جیسا کہ صفحات سابقہ میں بتایا گیا ہے عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کی کتابوں میں تحریف ثابت کی گئی ہے۔

حضرت مولانا کیرانویؒ کے شاگرد رشید شمس العلماء فاضل جلیل حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب دہلویؒ بانی مدرسہ الباقیات الصالحات مدراس نے اپنے اہتمام اور صرفہ

خاصہ سے مدراس میں اس کتاب کی جلد اول طبع کروائی تھی۔" دوسری جلد مولانا موصوف کے خلف ارشد مولانا ابوالفضل ضیاء الدین مرحوم نے مہتمم مدرسہ مذکورہ نے اپنی نگرانی میں طبع کروائی۔ جلد اول اور جلد دوم کی تصحیح وغیرہ خود شمس العلماء مولانا عبدالوہاب صاحبؒ نے ماہ شعبان 1288ھ میں مکمل فرمائی جس کے مطابق یہ دونوں جلدیں طبع ہوئیں۔

3۔اعجاز عیسوی:

یہ کتاب بھی حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے اردو زبان میں آگرہ میں لکھی۔ اس کا سن تالیف 1270ھ ہے اور 1271ھ میں مطبع منعمیہ چھیلی اینٹ آگرہ میں باہتمام محمد امیر خان زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اس کتاب کے صفحۂ اول پر ایک قطعۂ تاریخی تین اشعار کا چھپا ہوا ہے ۔

نسخۂ اعجاز چوں وحی فلک آمدہ
کز کلماتش خرد عیسوی اعجاز دید
عہد عتیق و جدید نقص ز عنوانش یافت
حجۂ تحریف ازد کوئی بآخر رسید
سال شروعش بگفت حضرۃ روح القدس
مقصلہ تحریف در عہد عتیق وجدید
۱۸۵۳ء

کتاب کا نام المسمی باعجاز عیسوی ایک لائن میں اور دوسری لائن میں الملقب بمصقلہ تحریف درج ہے۔ ان دونوں ناموں کے اردگرد یہ دو تاریخی شعر درج ہیں ۔

نظم دری نیز ہاں، خوش شدہ تاریخ لیک
۱۲۷۱ ۱۲۷۱ ۱۲۷۱
آیت تاجِ ہدی یہدی بہ من یشاء
۱۲۷۱
مد ظغرائی او، لوح تاریخ وے
۱۲۷۱ ۱۲۷۱
بو درہ روز ازل رسم کلام خدا
۱۲۷۱

Marfat.com

یہ کتاب 202 صفحات پر مشتمل ہے جس کے اختتام پر جناب منشی ابوالحسن صاحب مدرس اول فارسی، مدرسہ سرکاری آگرہ کے دو تاریخی قطعات درج ہیں ۔

این نسخۂ دین پناہ اعجاز طراز
کز نصر من اللہ است عنوانش بکام
تفسیر یحرفون بہ زین بنود
کز ہر حرفش باید الزام
چوں حلیۂ اختتام در برپو شد
می خواستمش دہم بتاریخ نظام
دل سال تمام او ز ہاتف نرسید
گفتا کہ بوے دلیل تحریف تمام
۱۲۷۱ھ

دیمک اعجاز عیسوی کہ دلیل
بہر تحریف ازد نیازی خوش
دل اعجاز را بدست آورد
فیض روح قدس بتاریخش
۱۲۷۱ھ

حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ نے اس کتاب میں مستند عیسائی محققین اور مصنفین کی کتابوں سے مروجہ مسیحیت اور مروجہ بائیبل کو بے نقاب کیا ہے۔ اس کتاب کا آپ کی گراں قدر تصانیف میں ایک خاص مقام ہے۔ آپ نے موجودہ بائیبل جس کی ترویج و اشاعت میں عیسائی مبلغین دنیا کے ہر گوشہ میں ساعی نظر آتے ہیں اور اُسے قرآن حکیم کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں، پر تفصیلی نظر ڈال کر اس میں وقتاً فوقتاً ہونے والی تحریفات کو نہ صرف ظاہر کیا ہے بلکہ اس کی تمام تحریفات اور اکاذیب کی دھجیاں بکھیر دی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے تحریف بائیبل پر سب سے زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے اور اس لحاظ سے اس کتاب کی کوئی نظیر و مثیل عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبان میں موجود نہیں اور نہ ہی کسی کتاب میں اتنے استقصاء کے ساتھ موجودہ

Marfat.com

انجیل کے تضادات، اغلاط اور تحریفات کا بیان ہے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے اعجاز عیسوی کن وجوہات اور کن اسباب کی بنا پر لکھی اس کا ذکر آپ نے اس کتاب کے ابتدایہ میں رقم فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''اگر فرقہ پروٹسٹنٹ کے پادری صاحبان صرف بائبل کے ترجمے بانٹنے اور سنانے پر اکتفا کرتے تو مسلمانوں کو اُن سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ لوگ اپنی تقریر وتحریر میں نہ صرف اصول اسلام پر طعن وتشنیع کرتے ہیں بلکہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات پر بھی زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اپنی تحریر وتقریر میں یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان اعتراضات کا جواب دے گا تو ہمیں کوئی رنج نہ ہوگا۔

جن مسائل میں ہمارا عیسائیوں سے اختلاف ہے اور جن پر ان کی طرف سے بحث ومباحثہ کا بازار گرم ہے، ان میں سے ایک اہم مسئلہ تحریف کا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ باقی تمام مسائل اسی کی فرع ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے اور اس میں عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں کا حال ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تاکہ اس سے مسلمانوں کے دعویٰ کی حقانیت بخوبی واضح ہو سکے۔

اب اس سلسلہ میں حضرت مولانا کیرانویؒ نے سب سے پہلے تحریف کا معنی اور مطلب بیان کیا ہے تاکہ قارئین کو تحریف کے معنی اور مفہوم معلوم ہو سکے۔ فرماتے ہیں:

''سب سے پہلے چند باتیں ذہن نشین کر لینی چاہیں:

1- ''تحریف'' کا مطلب ہے کسی بات کو بدل ڈالنا۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ''تحریف معنوی'' یعنی کسی عبارت کے الفاظ میں اپنی طرف سے ردوبدل تو نہ کیا جائے لیکن اس کے معنی بگاڑ دیئے جائیں۔ دوسری ''تحریف لفظی'' یعنی عبارت کے الفاظ ہی میں ترمیم کر دی جائے۔ پھر تحریف لفظی کی بھی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک لفظ کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا جائے۔ دوسری یہ کہ عبارت میں کوئی لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا جائے، اور تیسری یہ

Marfat.com

کہ عبارت کا کوئی لفظ حذف کر دیا جائے۔

-2 تحریف معنوی کے مسئلہ میں ہمارے اور عیسائیوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں یعنی عیسائی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بائیبل کی تشریح و تعبیر میں تحریف معنوی واقع ہوئی ہے، اور لوگوں نے ان کی عبارتوں کو من مانے مفہوم پہنانے کی کوشش کی ہے۔ البتہ تحریف لفظی کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔ عیسائی حضرات کہتے ہیں کہ بائیبل میں تحریف نہیں ہوئی۔ اور ہمارا دعویٰ ہے کہ ان میں تحریف ہوئی ہے۔ لہٰذا کتاب میں تحریف معنوی سے کوئی بحث نہیں ہو گی۔ اس کتاب میں ہمارا موضوع تحریف لفظی کا اثبات ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے تین مقصدوں میں اسی تحریف لفظی کو ثابت کیا جائے گا یعنی اصل موضوع تو اسی کا بیان ہوگا خواہ ضمناً کوئی دوسری بات بھی آ جائے۔

-3 اس کتاب میں خود عیسائی مذہب کے محقق علماء کے اعتراضات سے انشاء اللہ یہ بات بخوبی ثابت ہو جائے گی کہ ان کی مقدس کتابوں میں بعض جگہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے بدل دیا گیا ہے۔ بعض جگہ کوئی لفظ یا جملہ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا اور بعض جگہ سے کوئی لفظ یا جملہ سرے سے اڑا دیا گیا ہے۔ اور اسی کو ہم تحریف کہتے ہیں۔ خواہ عیسائی حضرات اس کی وجہ یہ بیان کریں کہ یہ تبدیلی بددیانت لوگوں کی شرارت سے قصداً ظہور میں آئی۔ خواہ یہ کہیں کہ اس کا سبب تواتر لفظی کا مفقود ہونا ہے۔ خواہ یہ کہیں کہ کاتبوں سے غلطی ہوگئی ہے اور خواہ یہ کہیں کہ اصلاح دینے والوں سے وہم ہوگیا ہے، کیونکہ ہمارے دعویٰ میں ''تحریف'' عام ہے خواہ وہ قصداً واقع ہوئی ہو یا بغیر قصد و ارادہ کے۔

-4 اس کتاب میں عیسائیوں کی جو بات بھی نقل کی جائے گی وہ پروٹسٹنٹ یا رومن کیتھولک فرقوں کی معتبر اور مستند کتابوں سے منقول ہو گی، مثلاً یوسی بیس کی تاریخ یا تفسیر ہارن مطبوعہ لندن 1822ء یا ہنری واسکاٹ کی تفسیر مطبوعہ لندن، یا لارڈنر کی تفسیر مطبوعہ لندن 1827ء (جو دس جلدوں پر مشتمل ہے) اور جارج ڈایلی اور رچرڈ مینٹ کی تفسیر مطبوعہ لندن 1848ء۔ لیکن چونکہ اردو اور

Marfat.com

انگریزی زبان کے محاوروں میں بڑا فرق ہے، اس لیے ان کتابوں کے اقتباسات مجموعی مفہوم اور حاصل مضمون کے مطابق ہوں گے۔ ان کا لفظی ترجمہ نہیں ہوگا۔

5- کتب مقدسہ (بائبل) کی عبارتوں کا وہ ترجمہ نقل کیا جائے گا جو فرقہ پروٹسٹنٹ کے پادریوں نے کیا ہے۔ یہ اقتباسات حسب ضرورت کبھی صرف اردو ترجموں سے لیے جائیں گے۔ کبھی اردو اور فارسی دونوں سے اور کبھی اردو، فارسی اور عربی تینوں سے، اور کبھی زیادہ ضرورت ہو گی تو انگریزی ترجموں کا حوالہ بھی دے دیا جائے گا، کیونکہ پروٹسٹنٹ حضرات کی عادت یہ ہے کہ جب بائیبل کی کوئی عبارت ان کے خلاف پڑتی ہے تو وہ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہاں مترجم نے ترجمہ غلط کیا ہے۔ حالانکہ وہ مترجم بھی انہیں کے فرقے کا ہوتا ہے۔ متعدد تراجم نقل کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ جب مختلف مترجموں کے ترجمے سامنے آئیں گے تو شاید وہ ایسا ارشاد نہ فرمائیں۔ اور اگر فرمائیں بھی تو فریق ثانی کو اس صورت میں کافی گنجائش ہوگی۔

6- چونکہ بائبل کے ترجمے بدلتے رہتے ہیں اس لیے یہاں ہم ان ترجموں کے حوالے درج کیے دیتے ہیں جن سے ہم نے اقتباس لیے ہیں:

(1) صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچ کتابوں (تورات) کا ترجمہ جو 1822ء میں شیورام پور کے چھاپہ خانہ میں چھپا ہے۔

(2) پورے عہد عتیق کا اردو ترجمہ جو کلکتہ سے دو جلدوں میں چھپا ہے پہلی جلد کتاب پیدائش سے لے کر کتاب آستر تک ہے۔ اور 1842ء میں طبع ہوئی۔ اور دوسری جلد کتاب ایوب سے کتاب ملاکیا (یا ملاکی) تک ہے اور 1843ء میں چھپی ہے۔

(3) فارسی ترجمہ جو پورے عہد عتیق پر مشتمل ہے اور چار جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ پہلی جلد کتاب پیدائش سے کتاب استثناء تک 1839ء میں لندن سے چھپی ہے۔

(4) فارسی ترجمہ جو پورے عہد عتیق پر مشتمل ہے اور دو جلدوں میں 1845ء مطابق

Marfat.com

1261ھ میں شہر ایڈنبرگ سے شائع ہوا ہے۔

(5) عربی ترجمہ عہد عتیق اور عہد جدید دونوں پر مشتمل ہے اور 1831ء میں لندن میں ایک ہی جلد میں چھپا ہے۔

(6) صرف عہد جدید کے اردو ترجمے جو 1839ء، 1841ء اور 1844ء میں کلکتہ سے شائع ہوئے ہیں۔

(7) صرف عہد جدید کا فارسی ترجمہ جو 1842ء میں کلکتہ سے شائع ہوا ہے۔

(8) پروٹسٹنٹ کے انگریزی تراجم جو 1811ء، 1830ء، 1835ء اور 1836ء میں چھپے ہیں۔

(9) رومن کیتھولک کا انگریزی ترجمہ جو 1840ء میں ڈبلن سے شائع ہوا۔

-7 اس کتاب میں بعض مقامات پر ہم کچھ ملحدین کی کتابوں سے بھی اقتباسات نقل کریں گے۔ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ہم خدانخواستہ ان ملحدوں کو اچھا یا ان کے کلام کو اچھا سمجھتے ہیں یا ان کی تحریریں ہمیں پسند ہیں۔ حاشا و کلا

"واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام ملحدین ہمارے نزدیک کافر اور مردود ہیں اور ان کی باتیں کافرانہ اور قابل نفرت ہیں کیونکہ ہم حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے دشمن کو ایسا ہی قابل نفرین سمجھتے ہیں جیسے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن کو۔ اور یہ عقیدہ ہمارے مذہب کے بنیادی عقائد میں سے ہے، لیکن ان ملحدوں کے اقتباسات ہم نے صرف اس لیے پیش کیے ہیں تا کہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ پروٹسٹنٹ فرقے کے پادریوں نے جو اعتراضات اسلام پر یا حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے ہیں وہ ان اعتراضات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو ملحدین نے تورات، انجیل اور دوسری کتب مقدسہ پر یا حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام پر کیے ہیں۔ بلکہ درحقیقت پروٹسٹنٹ فرقے نے ایسے بے سروپا اعتراضات انہیں ملحدوں سے سیکھے ہیں

اور بعض جگہ تو ان ہی کے اعتراضات کو جوں کا توں نقل کر دیا ہے۔"

یہ بات اس شخص پر مخفی نہیں رہ سکتی جس نے ملحدین کی کتابیں دیکھی ہوں، مثلاً اسپائی نوزا کی تصانیف، ٹولینڈ کی کتاب آمن ٹو مطبوعہ 1658ء، ولسٹن کے چھ رسالے جو 1827ء سے 1846ء تک چھپے ہیں۔ کتاب مورل فلاسفر جو 1744ء میں چھپی ہے، اور کتاچیب جو 1748ء میں چھپی ہے۔ کتاب اکسی ہومو مطبوعہ لندن 1813ء، کتاب ٹومس پین کے اور کتاب جے ہوا آن ویلڈ (یعنی یہوداہ کی نقاب کشائی) مطبوعہ لندن 1816ء، کتاب یولنجر جس کا ترجمہ جانسن نے کیا ہے اور 1819ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کلارک مطبوعہ لنڈن 1839ء، کتاب ڈیوٹ مطبوعہ بوسٹن 1843ء، کتاب لارڈ بولنگ بروک، کتاب مارس جو جرمنی زبان میں ہے کتاب الاہیومر، والٹیر کی تصانیف، روسو اور پالفری کی تصانیف، کتاب ریلس گریفتہ، کتاب اسمتھ اور کتاب نیومن فیزس آف فتیۃ وغیرہ جن کی تفصیل موجب طوالت ہے۔ اور ان میں سے اکثر ناموں کی فہرست پارکر کی کتاب کے آخر میں لگی ہوئی ہے۔ اور اس قسم کی اکثر کتابیں لندن کے چاپ مین پریس میں چھپی ہیں اور مسلسل چھپ رہی ہیں۔ غرض الحاد نے جرمنی میں نہایت زیادہ اور والس میں بکثرت سر اٹھایا ہوا ہے۔ اور لندن میں بھی اس قسم کے لوگوں کی کثرت ہوتی جا رہی ہے۔

اعجاز عیسوی میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے عہد عتیق اور عہد جدید پر ہر پہلو اور ہر زاویہ سے نہایت مدلل اور مسکت و لاجواب بحث فرمائی ہے۔ اور تحریف بائیبل کے بارے تمام ثبوت عیسائیوں کی معتبر کتابوں اور ان کی تاریخوں اور ثقہ علماء سے دیئے ہیں۔ اس تحریف کے سلسلہ میں جو مواد اس کتاب میں دیا گیا ہے وہ نہایت عرق ریزی، بے پناہ کدوکاوش اور بڑی تحقیق وجستجو کا مرہون منت ہے۔ اس کتاب نے عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا اور عیسائی مشنریز آج تک اس کتاب کا جواب نہیں دے سکے۔ حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ نے جن مسائل پر اس کتاب میں بحث کی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

1- پروٹسٹنٹ لوگوں نے کئی کتابیں جو کئی برس تک واجب التسلیم رہیں اور جنہیں

کونسل آف کارتھیج نے قانونی قرار دیا تھا، نکال ڈالیں۔

2- ان خرابیوں کے بیان میں جن کے سبب سے کتب مقدسہ میں تحریف ہونا آسان تھا۔

3- پانچ کتابیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف نہیں ہیں۔

4- وہ الہامی کتابیں جن کو اہل کتاب گم کر چکے ہیں۔

5- عیسائیوں کی وہ الہامی کتابیں ان مصنفین کی نہیں جن کی طرف وہ منسوب کی گئی ہیں۔

6- جوانا سوتھکٹ جو اپنے تئیں حضرت مسیحؑ سے حاملہ بتلاتی تھی۔

7- ان کتابوں کا ذکر جو سلف میں اناجیل و اعمال وغیرہ مشہور تھیں، اب ان کو عیسائی جھوٹی بتلاتے ہیں۔

8- عیسائیوں کے نزدیک حواری اور پیغمبر کبائر سے معصوم نہ تھے حتیٰ کہ وہ تبلیغ میں بھی جھوٹ بول دیا کرتے تھے۔

9- عیسائیوں کے نزدیک سب تحریریں پیغمبروں کی الہامی نہیں ہوتیں۔

10- اس الزام کا جواب جو شیعہ حضرات حضرت عثمانؓ پر لگاتے ہیں کہ انہوں نے قرآن مجید میں سے آیات قرآنیہ نکالی ہیں۔

11- عہد جدید میں صرف تین سو پچیس نسخے ملانے سے ڈیڑھ لاکھ اختلاف نکلے، اور کافی نسخے باقی ہیں جو ملائے نہیں گئے۔

12- عیسائیوں کی کتب مقدسہ کے ان اختلافات عبارت کا ذکر جن سے مسائل سے نقصان آیا۔

13- عہد عتیق میں حضرت عیسیٰ کی نسبت کوئی پیش گوئی صریح واضح نہیں ہے۔

14- جن پیش گوئیوں کا پادری لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق ذکر کرتے ہیں، ان میں کئی محرف ہو گئی ہیں۔

15- ان اعتراضات کا جواب جو پادری فنڈر نے صاحب استفسار پر کیے ہیں۔

16- دین عیسوی کی بہبودی کے لیے جھوٹ بولنا دوسری صدی میں پسندیدہ ہو گیا تھا۔

Marfat.com

17- دین عیسوی کی اصلاح کا ذکر شیطان کے مشورہ سے

18- جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کا اسپان ہمیس معترف تھا۔

19- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیش گوئی۔

کتاب کو حضرت مولانا کیرانویؒ نے دوحصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہٗ اول میں تو خالص بائیبل پر بحث کی ہے۔ اور عہدِ عتیق کی کتابوں اور ان کے مصنفین کو بتلایا ہے کہ وہ کون کون تھے۔ پھر عہد جدید کی کتابوں کے مصنفین کی نشان دہی کی ہے۔ حصہٗ اول میں کتب مقدسہ میں تحریف کے اسباب و وجوہ پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے، اور مختلف کتابوں کے الحاقی جملوں کی نشاندہی کی ہے، اور تضادات و اختلافات کی قریباً 135 مثالیں دی ہیں۔ عہد جدید کی کتابوں کے بارے میں بھی تحریف کو ثابت کیا گیا ہے اور ان کا غیر الہامی ہونا بتایا گیا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں مشہور عیسائی مشنری فنڈر کی کتاب ''میزان الحق'' کے باب اول کی تیسری فصل کا مفصل جواب دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں عیسائیوں کے تحریف قرآن کے دعوے کے الزامی اور تحقیقی جواب محکم دلائل کے ساتھ حضرت مولانا کیرانویؒ نے دیئے ہیں۔ مختصر یہ کہ اعجاز عیسوی تحریف بائیبل کے موضوع پر ایک کامل و مکمل (Comprehensive) کتاب ہے اور اس موضوع پر نہ اس سے قبل اور نہ اس کے بعد ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

اس کتاب کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں جن سے ایک قاری کو پتہ چل جائے کہ عیسائیت کی کتابوں پر حضرت کیرانویؒ کو کتنا عبور تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا مرحوم عہد عتیق کی کتابوں اور ان کے مصنفین پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''عہد عتیق (زمانۂ مسیح سے قبل جو کتابیں موجود تھیں) کی کتابیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ کتابیں جن کی صداقت کو تمام مسیحی اسلاف تسلیم کرتے ہیں۔ اور دوسری وہ کتابیں جن کی صداقت کے بارے میں اختلاف تھا۔ پہلی قسم میں اڑتالیس کتابیں ہیں۔ (ان میں پہلی پانچ کتابوں کے بارے میں عیسائی اور یہودی علماء کا

Marfat.com

دعویٰ یہ ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بذریعہ وحی لکھی تھیں۔ انہی پانچ کتابوں کو یہ لوگ تورات یعنی (Penta teuch) کہتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ پیدائش، خروج، احبار گنتی اور استثناء) عیسائی مصنفین ان کتابوں کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ یہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف ہیں، لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے تورات ہی سے تیرہ دلائل دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتابیں موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف نہیں ہیں۔

ان دلائل کے آخر میں حضرت مولانا فرماتے ہیں:

"غرضیکہ ابتدائے کتاب سے کتاب استثناء کے اختتام تک حالات و واقعات اسی انداز سے بیان کیے گئے ہیں۔ اگر ایسے تمام جملے جمع کیے جائیں تو آدھی تورات کو نقل کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جو بھی تورات کا مطالعہ کرے گا اس پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کا مصنف سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا ہی شخص ہے۔ تلاش و تتبع سے اسی طرح کی اور بھی کئی باتیں سامنے آسکتی ہیں۔

کتاب پیدائش باب 14 آیت 14 اور باب 13 آیت 18 کے بارے میں ہوران صاحب یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ:

"ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے لیس اور قریہ اربع ہی لکھا ہو اور کسی ناقل نے وضاحت کے لیے ان دونوں جملوں کو دان اور جبرون کے لفظوں سے تبدیل کر دیا ہو۔"

ہم کہتے ہیں کہ ان حضرات کے اعتراف کے بموجب جب ان کتابوں کی تصنیف کے کافی عرصہ گزر جانے کے بعد کاتب کی طرف سے ایسی سنگین تحریف کامیابی کے ساتھ تورات کے تمام نسخوں میں قبولیت حاصل کر گئی تو یقیناً گزشتہ دور میں بھی اسی طرح تحریف ہو جاتی اور قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی تھی۔

چنانچہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ملحدوں یا کاتبوں نے دوسرے مقامات

میں بھی تحریف کرنے کی شرارت کی ہو، لیکن اس تحریف کی نفی پر کوئی دلیل نہیں پائی گئی جیسا کہ مقدمہ کی تیسری فصل میں اس کا مفصل بیان گزر چکا ہے۔ عیسائی مؤرخین نے خود اس کا اعتراف یوں کیا ہے:

''ملحدوں کو تورات اور انجیل میں تحریف کرنے کا پورا پورا موقع میسر آیا۔''

ڈکشنری بائیبل مطبوعہ امریکہ 1837ء اور مطبوعہ لندن اور ہندوستان، جس کی تالیف کا آغاز کالمنٹ نے اور تکمیل رابٹ اور ٹیلر نے کی، اس میں بائیبل کی تفسیروں کے حوالہ سے یوں لکھا ہے:

''بعض جملے جو موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں پائے جاتے ہیں، وہ صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ ان کا کلام نہیں ہیں، مثلاً کتاب گنتی کے باب 32 آیت 40 اور کتاب استثناء کے باب 3 کی آیت 14 اور اسی طرح اس کتاب کی بعض دوسری عبارتیں موسیٰ علیہ السلام کے کلام کے محاورات کے مطابق نہیں ہیں۔ اور ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جملے اور یہ عبارتیں کسی شخص نے شامل کی ہیں۔ البتہ ظن غالب کے طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ عزرا نے ان کو شامل کیا ہے۔ جیسا کہ کتاب عزرا کے باب 9 اور 10 سے اور کتاب نحمیاہ کے باب 8 سے معلوم ہوتا ہے۔''

غور کیجئے کہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں الحاق کا کھلے لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں اور یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس کتاب کی بعض عبارتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسلوب نگارش کی مخالف ہیں، مگر عیسائی حضرات آج تک یقینی طور پر یہ متعین نہیں کر سکے کہ ان کو کس نے شامل کیا ہے۔ محض گمان کے درجہ میں عزرا علیہ السلام کی جانب الحاق کو منسوب کرتے ہیں۔ اور کتاب عزرا کے باب 9 اور باب 10 اور کتاب نحمیاہ کے باب مذکور کو اپنے گمان کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

Marfat.com

ظاہر ہے کہ یہ گمان محض بیکار ہے۔ اسے ظن غالب کا درجہ کسی صورت میں نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ کتاب عزرا کے ان دونوں بابوں سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے ناپسندیدہ افعال پر افسوس اور خطاؤں کا اعتراف کیا ہے۔ اور کتاب نحمیاہ کے آٹھویں باب سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ عزیر علیہ السلام نے اُن سب کو تورات پڑھ کر سنائی۔ اس کے علاوہ ''الحاق کے ہونے یا نہ ہونے کا اس میں سرے سے ذکر ہی نہیں۔''

کوئی بھی کتاب ہو اس کا کسی زبان میں بھی ترجمہ کیا جائے تو اس میں نمایاں تبدیلی آ جائے گی۔ پھر یہ سمجھا جائے گا کہ ترجمہ کرنے والا یا تو انتہائی نالائق ہے جس نے اتنا غلط ترجمہ کیا۔ یا یہ باور کیا جائے گا کہ اس نے اس کتاب کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ اپنی من گھڑت باتیں لکھ دی ہیں جو قابل اعتبار نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس نظریہ اور اصول کے تحت حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے اعجاز عیسوی میں کتب عہد عتیق و جدید کے عبرانی، سامری اور یونانی زبانوں کے نسخے دیکھے تو ان کے ترجموں میں بے پناہ فرق پایا جس کی بنا پر حضرت مولاناؒ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ ان کتابوں میں تحریف ہوئی ہے۔ اور اس بات کو ثابت کرنے کے لیے آپ نے حسب ذیل دلائل و ثبوت تحریر فرمائے:

''بائیبل کے عبرانی، سامری اور یونانی نسخوں میں اس قدر سنگین اختلاف ہے جس سے بائیبل میں تحریف کے واقع ہونے میں ذرہ برابر شک و شبہ نہیں رہتا۔ تمام اختلافات کو نقل کرنا تو محض تطویل کا باعث ہوگا، اس لیے ہم چند ایک کو بیان کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

1- پہلا اختلاف:

پیدائش سے آدمؑ سے طوفان نوحؑ کے زمانے کے بارے میں ان تینوں نسخوں میں اس قدر سنگین اختلاف ہے کہ جس کی کوئی معقول تاویل ممکن نہیں، تحریف کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ آدمؑ سے لے کر طوفانِ نوحؑ تک کا زمانہ عبرانی نسخہ کے مطابق 1656 سال ہے، پیشتر یونانی نسخوں کے مطابق 2262 سال

Marfat.com

بنتا ہے اور ایک یونانی نسخہ 2242 سال بتاتا ہے۔ اور سامری نسخہ کے مطابق 1307 سال ہے۔

''غور کیجیے! ان تینوں نسخوں میں ایک دو سال نہیں بلکہ سینکڑوں سال کا فرق موجود ہے جس میں تطبیق ممکن نہیں۔ پھر چونکہ تینوں نسخوں کے مطابق نوحؑ کی عمر طوفان کے وقت 600 سال متعین ہے اور آدمؑ کی 930 سال ہوتی ہے، اس لیے تورات کے سامری نسخہ کے مطابق لازم آتا ہے کہ آدم کی وفات کی وقت نوح کی عمر 223 کی تھی۔ اور یہ بات باتفاق مؤرخین غلط ہے، اور عبرانی اور یونانی نسخے بھی اس کی تکذیب کرتے ہیں، کیونکہ عبرانی نسخہ کے بیان کے مطابق نوحؑ کی پیدائش آدمؑ کی وفات کے 126 سال بعد اور اکثر یونانی نسخوں کے مطابق 732 سال بعد ہوئی۔ اور اسی فحش اختلاف کی بنا پر مشہور یہودی مؤرخ یوسی فس نے جو عیسائیوں کے نزدیک بھی معتبر ہے، ان میں سے کسی نسخہ کے بیان پر اعتماد نہیں کیا اور فیصلہ کیا کہ صحیح مدت 2256 سال ہے۔

''تینوں نسخوں کے اختلاف کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ہنری واسکاٹ کی تفسیر میں ایک جدول دی گئی ہے جس میں نوح علیہ السلام کے سوا ہر شخص کے نام کے سامنے اس کی وہ عمر لکھی گئی ہے جو اس کے لڑکے کی پیدائش کے وقت تھی۔ اور حضرت نوحؑ کے سامنے ان کی وہ عمر درج کی گئی ہے جو طوفان کے وقت تھی۔ نقشہ درج ذیل ہے:

نام	عبرانی نسخہ	سامری نسخہ	یونانی نسخہ
آدم علیہ السلام	130	130	230
شیث علیہ السلام	105	105	205
آنوش	90	90	190
قینان	70	70	170
مہلائیل	65	65	165
یاود	162	62	162
حنوک	65	65	165
متوسالح	187	67	187

Marfat.com

لامک	182	53	188
نوح علیہ السلام	600	600	600
میزان	1656	1307	2262

2- دوسرا اختلاف

لب التواریخ مطبوعہ کلکتہ 1829ء کے دفتر دوم صفحہ 341 میں ایک نقشہ دیا گیا ہے جس میں دنیا کی تخلیق سے لے کر مسیح علیہ السلام کی پیدائش تک کا زمانہ یوں لکھا ہے:

بائیبل کے عبرانی نسخہ کے مطابق 4004 سال، یونانی نسخہ کے مطابق 5872 سال اور سامری نسخہ کے مطابق 4700 سال ہے۔

ملاحظہ فرمائیے کہ پیدائش آدمؑ سے پیدائش عیسیٰ علیہ السلام تک کے زمانہ میں ان تینوں نسخوں کی روایت میں کتنا بین اختلاف موجود ہے۔ متقدمین عیسائی علماء بائیبل کے ان واضح اختلافات کا سبب یہودیوں کی طرف سے کی گئی تحریف کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق توریت میں یہ تحریف یہودیوں نے 130ء میں کی ہے۔ آگسٹائن جو کہ چوتھی صدی کا سب سے بڑا عیسائی عالم ہے، عبرانی نسخہ کو تحریف شدہ بتاتا ہے۔ چنانچہ ہنری واسکاٹ کی تفسیر کی جلد اص ۲۳۶ میں یوں لکھا ہے:

> ''علماء نے عہد عتیق میں مندرج واقعات و حالات کی تاریخوں کا جو حساب لگایا ہے اس میں زبردست اختلاف موجود ہے۔ خاص طور پر ابراہیم علیہ السلام سے پیشتر کے واقعات کی تاریخوں میں تو بہت ہی زیادہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ البتہ ان اختلافات کو عام مطالعہ کرنے والوں کو کوئی نقصان نہیں۔ آگسٹائن کہا کرتا تھا کہ یہودیوں نے ان اکابر کے حالات کے بیان میں جو طوفان سے قبل گزرے تھے یا اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے عہد تک ہوئے ہیں، عبرانی نسخہ میں تحریف کر ڈالی، اور یہ حرکت اس لیے کی تاکہ یونانی نسخہ کا اعتبار جاتا رہے اور اس لیے بھی کہ مذہب عیسوی سے ان کو سخت دشمنی تھی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین عیسائی بھی

Marfat.com

ایسا ہی کہا کرتے تھے۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ یہودیوں نے تورات میں تحریف 130ء میں کی ہے۔"

پھر اسی تفسیر میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

"محقق ہیلز نے یوسیفس اور تورات کے یونانی ترجمہ کا موازنہ کر کے اور ان کی بعض غلطیاں درست کر کے پیدائش عالم سے پیدائش مسیح تک کے زمانے کا اس طرح تعین کیا ہے کہ پیدائش عالم سے مسیح کا زمانہ 5411 سال اور طوفان سے پیدائش عیسیٰ کا زمانہ 3155 سال ہوتا ہے۔ اور اختلاف کا سبب یہ ہے کہ عبرانی نسخہ کے مقابلہ میں یونانی نسخہ میں ان بزرگوں کی تاریخ ولادت سو برس زائد بتائی گئی ہے جن سے ان کے والد کی عمر میں لامحالہ سو سال کا اضافہ ہوتا ہے۔ اگرچہ مجموعی اعتبار سے باپ بیٹے کی عمر میں تناسب ایک ہی جیسا رہا، مثال کے طور پر عبرانی نسخہ میں ایک بزرگ کی پیدائش کے وقت اس کے باپ کی عمر سو سال بتائی گئی تو یونانی نسخہ میں سو سال کی تصریح ہے۔"

دیکھیے، اس تفسیر میں کتنے کھلے الفاظ میں یہ تصریح موجود ہے کہ متقدمین کے نزدیک بھی عبرانی نسخہ تحریف شدہ تھا اور یونانی نسخہ کی صحت تسلیم کر لی گئی تھی، اور عبرانی نسخہ میں یہ تحریف یہودیوں نے 130ء میں کی تھی۔ نیز آگسٹائن بھی اس تحریف کا مجرم یہودیوں کو ہی قرار دیتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہودیوں کی مسلمہ بددیانتی سے تورات میں تحریف کر ڈالنا عقلاً کچھ بھی محال نہیں ہے۔"

اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے تورات میں اور عہد عتیق کی دوسری کتابوں میں جو عیسائیوں کے نزدیک مسلمہ حیثیت رکھتی ہیں، کئی اختلافات، تضادات اور فسادات بیان کیے ہیں۔ اور بدلائل قاطعہ یہ ثابت کیا ہے کہ عہد عتیق کی تمام کتابیں تحریف شدہ ہیں۔ چند صفحات کے بعد آپ لکھتے ہیں:

"قدیم عیسائیوں نے یونانی ترجمہ کو صحیح قرار دیا۔ حواریین کے زمانہ سے پندرہ

Marfat.com

سو سال تک اسی کو معتبر سمجھا جاتا تھا۔ وہی قابل تقلید اور واجب العمل تھا۔ یونانی اور لاطینی کلیسا اسی کو واجب التسلیم قرار دیتے تھے۔ دونوں کلیساؤں میں یہی ترجمہ پڑھا جاتا تھا اور یونانی کلیسا اسی کو مقدس کتاب مانتا تھا۔ چنانچہ یونانی اور تمام مشرقی گرجوں میں آج تک یہی یونانی نسخہ پڑھا جاتا ہے۔ عظیم محقق و مفسر اور عیسائی عالم آگسٹائن کا کہنا ہے کہ

> ''یہودیوں نے عہد عتیق کی کتابوں کے عبرانی نسخہ میں مندرج واقعات اور ان کی تاریخوں میں عیسائی مذہب سے دشمنی کی بنا پر جو تحریف کی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور اس کا ایک مقصد یونانی ترجمہ کو غیر معتبر بنانا تھا۔''

قدیم مسیحی علماء کا خیال ہے کہ یہ تحریف 130ء کے لگ بھگ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ یوسی بیس اپنی تاریخ کی کتاب 4 باب 18 میں لکھتا ہے:

> ''جسٹن (Justin) نے طریقون یہودی سے مناظرہ میں مسیح کے متعلق بہت سی پیش گوئیوں کو نقل کر کے دعویٰ کیا ہے کہ یہودیوں نے ان کو کتب مقدسہ سے نکال دیا ہے۔''

غور طلب بات یہ ہے کہ اگر جسٹن کا دعویٰ سچا ہے تو اس کے مطابق یہودیوں نے یقیناً ان پیش گوئیوں کو عبرانی نسخہ سے نکال دیا ہے، لہٰذا اس طرح تحریف واقع ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا۔ اور اگر اس کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عیسائیوں کا یہ روحانی پیشوا جس کو اسلاف میں نہایت معتبر شمار کیا جاتا ہے، بہت بڑا محرف تھا جس نے اپنے جھوٹے دعوے ثابت کرنے کے لیے اپنی طرف سے پیش گوئیاں گھڑیں اور پھر ان کو اللہ کا کلام اور الہامی کتابوں کی عبارت قرار دیتا ہے۔ جب اسلاف میں سے ان بزرگوں کا یہ حال ہو جن کو معتبر ترین قرار دیا جاتا ہے تو ان کے ان موجودہ متبعین کو کس مقام پر رکھا جائے۔ ہورن صاحب اپنی تفسیر کی جلد 4 صفحہ 62 میں لکھتے ہیں:

> ''جسٹن شہید نے (یہودیوں کے مقابلے میں) یہ ثابت کر دیا تھا

Marfat.com

کہ عزرا نے لوگوں سے یہ جملہ کہا تھا کہ ''عید فسح کا جشن ہمارے نجات دہندہ خداوند کا جشن ہے۔ اگر تم خداوند کو اس جشن سے افضل سمجھو گے اور اس پر ایمان لاؤ گے تو یہ زمین ہمیشہ آباد رہے گی۔ اور اگر تم اس پر ایمان نہ لاؤ گے اور اس کا وعظ نہ سنو گے تو تم قوموں کے مذاق کا نشانہ بنو گے۔'' یہودیوں نے اس جملے کو عبرانی نسخہ سے نکال دیا ہے۔ وائی ٹیکر، جسٹن شہید کے اس قول کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ غالباً یہ آیت کتاب عزرا کے باب 6 کی آیت 20 اور 21 کے درمیان تھی۔ ڈاکٹر اے کلارک نے جسٹن شہید کے اس قول کی تصدیق کی ہے۔''

وارڈ کیتھولک اپنی کتاب (مطبوعہ 1841ء) اغلاط نامہ کے مقدمہ کے صفحہ 17-18 میں لکھتا ہے:

''ڈاکٹر ہمفری نے اپنی کتاب کے صفحہ 178 پر کہا ہے کہ ''یہودیوں کے اوہام نے عہد عتیق کی کتابوں کے بعض مقامات پر ایسی تحریف کی ہے کہ پڑھنے والوں کو بآسانی پتہ چل جاتا ہے۔'' پھر کہتا ہے کہ ''یہودیوں نے مسیح کی بشارتوں کو بالکل ہی اڑا دیا۔'' پھر ایک پروٹسٹنٹ عالم نے بیان کیا کہ قدیم مترجم اس کو ایک نہج سے پڑھتا ہے اور موجودہ یہودی اس کو دوسرے طریقے سے پڑھتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ یہودی کاتبوں اور ان کے ایمان کی جانب غلطی منسوب کرنا بہ نسبت قدیم مترجم کی جہالت یا تساہل کی طرف منسوب کرنے کے زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ زبور کی حفاظت مسیح سے قبل بھی یہودیوں کے یہاں ان کے گانوں کی بہ نسبت کم تھی۔''

واٹسن اپنی کتاب کی جلد 3 صفحہ 283 مطبوعہ 1791ء میں یوں کہتا ہے:

''ایک مدت دراز تک آریجن ان اختلافات کی شکایت کرتا رہا۔

Marfat.com

اور مختلف اسباب کی جانب ان کو منسوب کرتا رہا، مثلاً کاتبوں کی غفلت یا شرارت اور بے پروائی، اسی طرح جیروم کہتا ہے کہ جب میں نے عہد جدید کے ترجمہ کا ارادہ کیا تو میں نے اس کا مقابلہ اس نسخہ سے کیا جو میرے پاس موجود تھا۔ تو ان میں عظیم الشان اختلاف پایا۔"

"مذکورہ بالا اقوال کی طرح دوسرے عیسائی علماء نے بھی بہت کچھ کہا ہے، جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ لوگ عبرانی نسخہ کے محرف ہونے کے قائل ہیں اور اس تحریف کا الزام یہودیوں پر لگاتے ہیں۔ اب تک رومن کیتھولک کا بھی یہی خیال ہے کہ عبرانی اور سامری نسخے تحریف شدہ اور غیر معتبر تھے۔"

یہ تو عہد عتیق کے بارے میں تھا۔ عہد جدید کی کتابوں کے بارے میں بھی حضرت مولانا کیرانویؒ نے تفصیل سے بحث کر کے ایک ایک کو محرف ثابت کیا ہے، چنانچہ مولانا مرحوم فرماتے ہیں:

"اناجیل اربعہ میں انجیل متی کو اول مقام حاصل ہے، مگر اس کی حالت بہت مخدوش ہے کیونکہ متی حواری نے تو اس کو عبرانی زبان میں تحریر کیا تھا، لیکن متاخرین عیسائی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اور یہ عبرانی نسخہ دنیا سے ناپید ہو چکا ہے۔ کسی نامعلوم شخص نے یونانی زبان میں اس کا ترجمہ کر دیا اور یہی ترجمہ عبرانی نسخہ کے بجائے تسلیم شدہ قرار پا گیا۔ اپی فینیس نے ثابت کیا ہے کہ متی نے انجیل کو عبرانی زبان میں تحریر کیا تھا، یونانی زبان میں نہیں۔ اور بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ متی نے عبرانی اور یونانی دونوں زبانوں میں انجیل لکھی تھی، بالکل غلط ہے۔

چند صفحات کے بعد حضرت کیرانویؒ فرماتے ہیں:

"لارڈنر اپنی تفسیر (کلیات) کی جلد 2 صفحہ 119 میں لکھتا ہے کہ پوپیاس نے لکھا ہے کہ متی نے اپنی انجیل عبرانی میں لکھی تھی اور ہر شخص نے اس کا ترجمہ اپنی لیاقت کے مطابق کیا۔ اسی کتاب کے صفحہ 170 پر کہتا ہے کہ ارنیوس نے لکھا ہے کہ متی نے یہودیوں

Marfat.com

کے لیے اپنی انجیل ان کی زبان میں اس وقت لکھی تھی جب کہ روم میں پولس اور پطرس وعظ کرتے پھرتے تھے۔ پھر صفحہ 217 پر یوسی بیس کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ پینٹی نس جب انڈیا آیا تو وہاں اُسے انجیل کا ایک عبرانی نسخہ ہاتھ لگا جو کہ وہاں کے باشندوں تک برتولما حواری کے ذریعہ پہنچا تھا، اور ان کے پاس اسی وقت سے محفوظ تھا۔ اور جیروم کا کہنا ہے کہ پینٹی نس نے وہ نسخہ وہاں سے اسکندریہ پہنچا دیا۔ لارڈنر، یوسی بیس کے اس قول کی تصدیق کرنے کے بعد مذکورہ کتاب کے صفحہ 574 پر رقمطراز ہے کہ آریجن کے تین جملے ہیں:

پہلا تو یہ جیسے یوسی بیس نے نقل کیا ہے کہ متی نے ایماندار یہودیوں کو عبرانی زبان میں انجیل عطاء کی تھی۔

دوسرا یہ کہ متی نے سب سے پہلے انجیل لکھی اور یہ انجیل عبرانیوں کو دی۔

تیسرا یہ کہ متی نے انجیل عبرانیوں کے لیے لکھی تھی جو اس شخص کے منتظر تھے جس کا وعدہ ابراہیم و داؤد (علیہما السلام) کی نسل سے کیا گیا تھا۔

پھر مذکورہ کتاب کی جلد 4 صفحہ 95 میں کہتا ہے کہ:

''یوسی بیس نے لکھا ہے کہ متی نے عبرانیوں کو وعظ سنانے کے بعد جب دوسری قوموں کے پاس جانے کا قصد کیا تو انجیل ان کی زبان میں لکھ کر ان کو عطاء کی۔''

اس سلسلہ حضرت مولانا کیرانویؒ نے بے شمار عیسائی علماء کے اقوال نقل فرمائے ہیں جن کو عیسائی دنیا میں سند مانا جاتا ہے۔ اور ثابت یہ کیا ہے کہ متی کی یہ انجیل جعلی ہے۔ اصل انجیل عبرانی میں تھی جو آج دنیا میں ناپید ہے۔

اسی طرح انجیل مرقس کے بارے میں بھی عیسائی علماء کے اقوال نقل کر کے

Marfat.com

حضرت مولانا مرحوم نے لکھا ہے کہ وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اصل کتاب لاطینی میں تھی۔ پھر یونانی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔ پھر ترجمہ میں بھی اچھی خاصی تحریف ہوئی۔ اسی طرح انجیل لوقا جو کہ لوقا کی تصنیف کہی جاتی ہے یہ بھی محرف ہے۔ چنانچہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے بانی اور عیسائی مذہب کے مشہور مصلح مارٹن لوتھر (Martin Luthar) کو ان مذکورہ تینوں انجیلوں کی صداقت میں شک تھا اور وہ ان کو ناکارہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ چار انجیلوں کے وجود کا قول جھوٹا، لغو اور واجب الرد ہے۔ صرف یوحنا کی انجیل ہی صحیح انجیل ہے۔

اب انجیل یوحنا کی حالت بھی ملاحظہ ہو۔ کیتھولک ہیرالڈ مطبوعہ 1844ء جلد 7 ص 205 میں لکھا ہے کہ اسٹاولن نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ بلا شک وشبہ پوری انجیل یوحنا اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تصنیف ہے۔ (یعنی حواری یوحنا کی تصنیف نہیں ہے) مشہور محقق عالم برطشیندر کہتا ہے کہ "یہ ساری انجیل اور اسی طرح یوحنا کے تمام رسالے اس کی تصنیف ہی نہیں ہیں۔ بلکہ دوسری صدی کے کسی عیسائی شخص نے تصنیف کر کے اس کی طرف منسوب کر دی ہے۔ جمہور مسیحی علماء نے اس انجیل کے ساتویں اور آٹھویں باب کی بعض آیات کا انکار کیا ہے۔"

چند سطور کے بعد حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"اناجیل اربعہ کی تالیف کے زمانہ میں مذکورہ شدید اختلافات سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ ان کتابوں کی کوئی بھی متصل سند نہیں ہے۔

ہورن اپنی تفسیر مطبوعہ 1822ء جلد 4 قسم 2 باب 2 میں لکھتا ہے:

"ہم کو مؤرخین کنیسہ کی معرفت انجیل کی تالیف کے زمانہ کے جو حالات پہنچے ہیں وہ ناقص اور غیر معین ہیں، جن سے کسی معین چیز تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اور مشائخ متقدمین نے واہیات روایتوں کی تصدیق کی اور ان کو قلم بند کر ڈالا۔ بعد کے آنے والے لوگوں نے ان کی لکھی ہوئی چیزوں کو ان مشائخ کی تعظیم کی وجہ سے قبول کر لیا۔ یہ سچی جھوٹی روایتیں ایک کاتب سے دوسرے کاتب تک پہنچتی رہیں۔ مدت مزید گزر جانے کی وجہ سے اب ان کی تنقید اور

Marfat.com

کھرا کھوٹا معلوم کرنا بھی دشوار ہو گیا۔"

اسی جلد میں دوسری جگہ لکھتا ہے

"پہلی انجیل 37ء یا 38ء یا 41ء یا 43ء یا 48ء یا 61ء یا 62ء یا 64ء میں تالیف کی گئی۔ دوسری انجیل 56ء یا اس کے بعد 65ء تک کسی وقت میں۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ 60ء یا 63ء میں تالیف ہوئی۔ تیسری انجیل 53ء یا 63ء یا 64ء میں تالیف کی گئی۔ اور چوتھی انجیل 68ء یا 70ء یا 98ء میں تالیف ہوئی۔"

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اعجاز عیسوی کے حصہ دوم میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" کے باب اول کی تیسری فصل کا جواب دیا ہے۔ اور پادری فنڈر نے تحریف قرآن کا جو دعویٰ کیا ہے، حضرت مولانا نے اس کے الزامی اور تحقیقی دونوں جوابات دیئے ہیں۔ قرآن حکیم کی تحریف کا اعتراض اس نے فرقۂ شیعہ سے لیا ہے جس کا عقیدہ صحابہ کرامؓ کا بارے میں اچھا نہیں ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں حضرت مولانا مرحوم نے ایک نہایت شاندار بحث صحابہ کرامؓ کے مومن ہونے کے بارے قرآن وسنت اور شیعہ حضرات کی کتابوں سے کی ہے۔

اعجاز عیسوی کو مکمل طور پر پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو عیسائیت، شیعیت اور خود اہل السنّت والجماعت کی کتابوں پر کس قدر عبور تھا۔ اور ایک مناظر ہونے کے ناطے آپ کی علمی وسعت کس قدر تھی۔

بہرحال یہ کتاب پہلی مرتبہ آگرہ میں طبع ہوئی اور دوسری مرتبہ 1271ھ مطابق 1854ء میں مطبعہ رضویہ دہلی میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اور اب تیسری مرتبہ حضرت مولانا محمد مسعود شمیمؒ نبیرہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اس کتاب کو از سرنو اور پہلے سے بہت بہتر طباعت اور اشاعت کا انتظام پاکستان میں کرایا، اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد تقی عثانی مدظلہ نے اس کو اپنی زیرنگرانی اسلوب جدید کے ساتھ اور اپنے نہایت قیمتی حواشی کے ساتھ 776 صفحات پر مشتمل لاہور سے طبع کروایا۔

چنانچہ اس کے اسلوب جدید کی وجہ سے اب اس کا نام ''اعجاز عیسوی جدید'' رکھا گیا کیونکہ موجودہ اردو دان نسل کے لیے جو عربی و فارسی سے ناواقف یا نسبتاً کم واقف ہے، اس کی عبارت کو مروجہ سلیس اور عام فہم اردو میں منتقل کر دیا گیا ہے تا کہ عوام اور کم لکھے پڑھے لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

4- احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث:

یہ کتاب حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ نے 1271ھ میں 70 صفحات پر مشتمل اردو زبان میں لکھی۔ اس میں آپ نے دلائل عقلیہ ونقلیہ سے تثلیث کا ابطال کیا ہے۔ یہ کتاب 1292ھ میں مطبعہٗ رضوی دہلی میں طبع ہوئی۔ بعض حضرات نے اس کتاب کو بعد میں ''اصح الاحادیث فی ابطال التثلیث'' کے نام سے طبع کیا۔

5- البروق اللامعہ:

یہ کتاب حضرت مولانا کیرانویؒ نے عربی زبان میں تالیف فرمائی۔ اس میں آپ نے بائبل کے حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔ یہ کتاب طبع نہ ہونے کی وجہ سے مفقود ہے۔

6- معدل اعوجاج المیزان:

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے یہ کتاب اردو زبان میں تالیف فرمائی۔ اس کی تالیف کا سبب یہ تھا کہ مولانا الفاضل سید آل حسن نے جب اپنی کتاب الاستفسار تالیف فرمائی اور پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق کا علمی انداز میں رد فرمایا۔ پادری فنڈر نے جب مولانا آل حسن کی کتاب پڑھی تو اُسے میزان الحق میں اپنی غلطیوں کا احساس ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب میزان الحق میں ترمیم اور حک واضافہ کیا۔ اس ترمیم کے بعد اس نے اس کو دوسری مرتبہ فارسی زبان میں طبع کیا۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے اس کے جواب میں ''معدل اعوجاج المیزان'' کے نام سے کتاب لکھی جس میں میزان الحق جدید اور قدیم دونوں نسخوں کا موازنہ فرمایا، لیکن مولاناؒ کی یہ کتاب طبع نہ ہو

Marfat.com

سکی۔ رسالہ ''نورافشان'' نمبر 30 جلد 12 مطبوعہ 24 جولائی 1884ء میں پادری صفدر علی کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ اس کے پاس ہے کیونکہ اس میں پادری صاحب نے اس کتاب کے حوالے دیئے ہیں۔

7- تقلیب المطاعن:

یہ کتاب مولانا مرحوم نے عربی زبان میں پادری اسمتھ (Smith) کی کتاب ''تحقیق الدین الحق'' مطبوعہ 1842ء کے جواب میں رقم فرمائی۔ یہ کتاب چھپی نہیں، لہٰذا مفقود ہے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے اپنی کتاب اظہار الحق کے آخری صفحہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ میری تین کتابیں البروق اللامعۃ، معدل اعوجاج المیزان اور تقلیب المطاعن جو کہ غیر مطبوعہ تھیں، 1857ء کی جنگ آزادی کے ہنگامہ میں ضائع ہوگئیں۔

8- معیار التحقیق:

یہ کتاب پادری صفدر علی کی کتاب تحقیق الایمان کے جواب میں حضرت کیرانویؒ نے لکھی۔ یہ کتاب بھی زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی، لہٰذا مفقود ہے۔

9- البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف:

1270ھ میں یہ کتاب حضرت مولانا مرحوم نے تحریر فرمائی۔ انجیل کی تحریف پر ایک نہایت مدلل، محققانہ اور لاجواب کتاب ہے۔ 56 صفحات اور متوسط تقطیع پر فخر المطابع دہلی نے اُسے شائع کیا۔

10- اظہار الحق:

خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالعزیز خان اور خیرالدین پاشا تونسی، صدر اعظم کی تحریک پر پادری فنڈر سے آگرہ میں مناظرہ کی مفصل کیفیت اور تمام مسائل کا نہایت بسط وشرح کے ساتھ بیان ہے۔ 16 رجب المرجب 1280ء میں قسطنطنیہ میں اس کتاب کی تالیف شروع اور آخر ذی الحجہ 1280ء گویا چھ ماہ میں یہ کتاب حضرت مولانا مرحوم نے مکمل کی۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے کتاب کے آخری صفحہ پر اس چیز کو لکھ بھی دیا ہے۔

Marfat.com

یہ کتاب سب سے پہلے 1281ھ میں قسطنطنیہ میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ شیخ خیر الدین پاشا تونسی صدر اعظم کے حکم سے ایک ترکی عالم نے اس کا ترکی میں ترجمہ کیا جب کہ اصل کتاب عربی زبان میں ہے۔ یہ ترکی ترجمہ ''ابراز الحق'' کے نام سے شائع ہوا۔

خلافت اسلامیہ کی طرف سے یورپ کی مختلف زبانوں میں اظہار الحق کے ترجمے کروائے گئے جن کو پادریوں نے خاص اہتمام اور کوشش سے تلف اور ضائع کر دیا تاکہ عیسائی دنیا تک یہ کتاب نہ پہنچ سکے۔ یہ کتاب مصر میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ حضرت مولانا سلیم الدین مرحوم نے اردو زبان میں اس کا ترجمہ کیا تھا جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی مولوی غلام محمد صاحب بھانجا راندیری نے بڑی محنت و جانکاہی سے اس کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔

اظہار الحق کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کے بعد ''ٹائمز آف لندن'' نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

> ''لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں عیسائی مذہب کی ترقی بند ہو جائے گی۔''

نواب حاجی محمد اسماعیل خان صاحب رئیس تاؤلی ضلع علی گڑھ نے مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا مرحوم کو ٹائمز آف لنڈن کا یہ تراشا اور اظہار الحق کے بارے میں اس کا مذکورہ بالا ریویو خاص طور پر دیا تھا۔ رد نصاریٰ میں صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے جس کا جواب آج بھی پوری عیسائی دنیا نہ دے سکی۔

اس کتاب کا تاریخی نام ''تائید الحق برحمۃ اللہ'' ہے۔ یہ ایک مقدمہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوان یہ ہیں:

1- باب اول: بیان و تفصیل کتب عہد قدیم و جدید
2- باب دوم: بیان و تفصیل اثبات تحریف انجیل
3- باب سوم: بیان و تفصیل اثبات نسخ انجیل
4- باب چہارم: بیان و تفصیل ابطال تثلیث

Marfat.com

5- باب پنجم: قرآن کا کلام اللہ ہونا

6- باب ششم: اثبات نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پادریوں کے اعتراضات کی تردید

حاشیہ پر ''المناظرۃ الکبریٰ'' یعنی مناظرہ اکبر آباد کا حال مولانا مرحوم نے تحریر فرمایا ہے۔

اظہار الحق کے جواب اور رد میں پروٹسٹنٹ مشنریز کی ایک جماعت نے 6 ضخیم جلدوں میں ایک کتاب ''الہدایۃ'' کے نام سے عربی زبان میں لکھی جو خفیہ طور پر مصر میں چھپی۔ اس میں نہ تو مطبع کا نام تھا اور نہ اس کا مقام اشاعت درج تھا۔ ایران کے ایک عالم نے اس ضخیم کتاب کا نہایت مسکت اور محکم رد دو جلدوں میں ''الہدیٰ الیٰ دین المصطفیٰ'' کے نام سے لکھا اور اُسے لبنان سے طبع کروایا۔ اس کتاب کا جواب پھر پادریوں کی ایک متحدہ جماعت نے قلمی رسالہ کی صورت میں نجی طور پر ایران کے اس عالم کو بھیجا۔ اس ایرانی عالم نے اس کے جواب میں بظاہر خاموشی اختیار کر لی لیکن نہایت اہتمام اور تدبیر کے ساتھ ایک مختصر کتاب یا جامع رسالہ ''التوحید والتثلیث'' کے نام سے شائع کیا جو لبنان (بیروت) میں طبع ہوا۔ پادری حضرات اس رسالہ کا جواب نہ دے سکے اور اس ایرانی عالم کے دشمن ہو گئے۔

اسی دوران میں پادریوں کی ایک جماعت نے ایک کتاب نہایت شان بان کے ساتھ ''میزان الحق فی الدیانۃ المسیحیۃ'' کے نام سے شائع کی جس کا مدلل رد ایک عربی عالم نے ''لسان الصدق علیٰ میزان الحق'' کے نام سے کیا۔ اس خاموش اور تصنیفی جنگ کے دوران بیروت کے ایک عالم علامہ شیخ محمد نے ایک سخت کتاب ''الوثنیۃ فی الدیانۃ النصرانیۃ'' کے نام سے تحریر کی جس کی عیسائی مشنریز تاب نہ لا سکے اور چراغ پا ہو کر انہوں نے لبنان کے کتب خانوں اور مکتبوں پر کھلم کھلا چھاپے مارے اور جہاں بھی ان کو اس کتاب کی موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا، اس کو لوٹ لیا، یہاں تک کہ جس پریس میں یہ کتاب چھپی تھی اس کو بھی نذر آتش کر دیا۔

مذکورہ بالا کتابوں میں جو رد نصاریٰ کے بارے میں چھپی تھیں جگہ جگہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کی کتاب اظہار الحق کے حوالے ملتے ہیں۔ اس سے

Marfat.com

یہ معلوم ہوتا ہے کہ ردعیسائیت میں اظہار الحق ایک بنیادی کتاب کا حکم رکھتی ہے۔ یہ تمام کتابیں لبنان اور شام میں علماء کے کتب خانوں میں اب بھی مل جاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ اظہار الحق اپنے موضوع پر ایک لاجواب اور بے مثال کتاب ہے جس کا نہ تو ابھی تک کوئی جواب لکھا گیا اور نہ اس کے حوالوں کو کوئی آج تک غلط ثابت کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی قریباً ہر بڑی زبان میں کیا گیا۔ اور آج جو لوگ بھی عیسائیت کے خلاف کام کر رہے ہیں ان کو حضرت کیرانویؒ اتنا بڑا مواد فراہم کر دیا ہے جو انہیں اور کسی کتاب میں میسر نہیں ہو سکتا۔

اس کتاب کا ایک خلاصہ ہم نے تیار کیا ہے جو الگ شائع کرنے کا پروگرام ہے۔ اس دور میں بھی جب کہ عیسائی مشنریز عیسائی حکومتوں کی پشت پناہی کی وجہ سے افریقہ اور دوسرے اسلامی ملکوں میں دندناتے پھر رہے ہیں اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت وقت کا اہم تقاضا ہے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کے کارناموں کو اگر مختصر طور پر بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کے دو بڑے کارنامے ہیں۔

ایک اظہار الحق اور دوسرے مدرسہ صولتیہ، مکۃ المکرمۃ۔

11- التنبیہات:

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ جب پہلی مرتبہ ترکی تشریف لے گئے تو آپ نے اپنے اس سفر میں ترکی میں دو کتابیں تالیف فرمائیں۔ ان میں ایک ''اظہار الحق'' تھی اور دوسری ''التنبیہات'' جو بعثت اور حشر ونشر کے اثبات میں مولانا مرحوم نے لکھی۔

التنبیہات آپ نے بغیر کسی مطالبہ کے خود اپنی مرضی سے لکھی اور یہ اظہار الحق کی تالیف سے فراغت کے چھ ماہ بعد لکھی، یعنی جمادی الآخرہ 1281ھ میں۔ اس کتاب کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ حضرت مولانا کیرانویؒ نے اپنے ترکی کے دورہ میں دیکھا کہ بعض ترکی نوجوان جو کہ مغربی ثقافت وتہذیب کے نخچیر ہیں، اسلام کے عقیدہ بعثت کے

Marfat.com

انکار کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ حضرت مولانا کو یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوا کہ ترکی نوجوان کفر کی طرف چلے جا رہے ہیں کیونکہ اسلامی عقائد میں سے ایک عقیدہ کا انکار بھی انسان کو کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ترکی نوجوانوں کے عقائد کو کفر سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کتاب کی تالیف کا بیڑا اٹھایا۔ اور چند ایام میں ''التنبیہات'' کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمادی جس مین آپ نے نوجوان نسل کو 12 تنبیہات کی ہیں۔

جناب خیرالدین تونسی رئیس الوزراء نے اس کتاب کی طباعت کی سعادت حاصل کی۔ یہ کتاب سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی طباعت کے بعد سلطان عبدالعزیز خان نے اس کو ترکی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم فرمایا ور پھر یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ کرنے کا فرمان صادر کیا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اس کتاب کو ترکی اور دوسرے بلاد عربیہ میں پھیلا دیا جائے تا کہ نوجوان نسل اس سے مستفید ہو سکے۔

یہ کتاب اظہار الحق کی ان قدیم طباعتوں پر بھی چھپی ہوئی ہے جو مصر سے شائع ہوئی تھیں۔

یہ دو کتابیں یعنی اظہار الحق اور التنبیہات مناظرہ آگرہ کے بعد ترکی میں لکھی گئیں جبکہ باقی کتابیں حضرت مولانا کیرانویؒ نے مناظرہ اکبر آباد سے پہلے قیام ہندوستان کے دوران لکھیں۔ ان کتابوں کی تالیف سے درج ذیل امور ثابت ہوئے۔

1- حضرت مولانا مرحوم نے 9 کتابوں کی تالیف رد عیسائیت میں کی اور یہ تالیفات عیسائیوں کے خلاف اس دینی عصبیت کے جذبہ کے تحت کی جس کا دور دورہ اس زمانہ میں ہندوستان میں تھا۔

2- ان کتابوں کی تالیف مولانا مرحوم نے یا تو اپنے ذاتی جذبہ کے تحت کی، یا مسلمانوں کے مطالبہ پر، یا کسی عیسائی پادری کی لکھی ہوئی کتاب کے رد اور جواب میں، یا پھر اسلام کے خلاف مشنریز کے اُٹھائے ہوئے سوالات اور اعتراضات کے جواب میں کی تھی۔

3- علمی حلقوں میں حضرت مولانا مرحوم کی ان کتابوں کی نہایت پذیرائی ہوئی۔ اسی وجہ سے علماء کرام اور ان کے تلامذہ نے ان کتابوں کی طباعت اور

Marfat.com

اشاعت میں ان کی خاص مدد کی۔

4- اس زمانہ میں ہندو پاک کے اہل اسلام کے حلقہ میں تین زبانوں، عربی، فارسی اور اردو کا رواج تھا۔ اور یہ تینوں زبانیں اچھی طرح سمجھی جاتی تھیں۔ حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ نے ان تینوں زبانوں میں تالیفات کیں جس سے مولانا مرحوم کی ان تینوں زبانوں میں گیرائی اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ اور آپ کے اس قلبی جذبہ کا پتہ بھی چلتا ہے کہ آپ کی یہ انتہائی خواہش تھی کہ ان تینوں زبانوں میں سے کسی زبان کو بھی جاننے والے تک حق کی آواز پہنچ جائے، خواہ وہ شخص مسلمان ہو یا عیسائی یا ہندو یا کسی اور دین و مذہب سے اس کا تعلق ہو۔ آپ کا یہ دلی جذبہ نبوت کے جذبہ سے مستنیر تھا۔

12- آداب المریدین:

حضرت مولانا نہ صرف قشری عالم تھے بلکہ روحانیت اور علم تصوف سے بھی آپ کا خاص تعلق تھا۔ بھلا جو شخص شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کے ساتھیوں میں سے ہو وہ تصوف سے کیسے محروم رہ سکتا ہے۔ ''آداب المریدین'' حضرت ضیاء الدین سہروردیؒ کی علم تصوف پر عربی زبان میں ایک نہایت شاندار تالیف تھی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا کیرانویؒ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے اصرار اور خواہش پر کیا۔ جس کی تکمیل 20 رمضان المبارک 1285ء میں مکہ مکرمہ کی پاک سرزمین میں ہوئی۔

اس عیسائی فتنہ سے سب سے پہلے متنبہ اور خبردار ہونے والے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک تو اپنے مدرسہ کی تمام ذمہ داریاں دوسرے شخص کے سپرد کر کے خود کو اس فتنہ کے استیصال کے لیے وقف کر دیا۔ دوسرے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کام ایک فرد واحد کا نہیں بلکہ اس کے لیے مختلف حضرات کی انجمنیں بنائی جائیں اور اجتماعی طور پر جدوجہد کر کے جلد از جلد اس فتنہ کا استیصال کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ذرا سی کوتاہی بھی امت مسلمہ کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔

چنانچہ اس مقصد کے لیے مرکز قائم کیے گئے جن میں عیسائیت کے عقائد وافکار سے علماء کو روشناس کرایا جاتا اور پھر اس کی تردید کی انہیں ٹریننگ دی جاتی۔ ٹریننگ دو قسم کی ہوتی۔ ایک سلبی اور دوسری ایجابی۔ سلبی سے یہ مراد ہے کہ عیسائیوں کے عقائد وافکار کا ردان کی اپنی کتابوں کی نقل سے یا پھر عام انسانی عقل سے کیا جاتا۔ اور ایجابی سے مراد یہ ہے کہ انہیں اسلامی عقائد وافکار سے آگاہ کیا جاتا تاکہ وہ جن لوگوں کے پاس جائیں انہیں صرف عیسائیت کے افکار ہی سے آگاہ نہ کریں بلکہ اسلام کی دعوت بھی پیش کر کے انہیں اسلام کے حلقہ میں لانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے دہلی اور آگرہ میں دو بڑے مرکز قائم کیے گئے۔ دہلی اور آگرہ میں عیسائی پادریوں کی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے مناظرے کیے گئے جن کے اثرات بڑے خوشگوار پڑے اور عیسائی دعوتی سرگرمیاں کافی حد تک رک گئیں۔ پھر ان دو بڑے مرکزوں کی ذیلی شاخیں ہندوستان کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں وہاں کے مسلمان باشندوں کے تعاون سے کھولی گئیں۔ اس طریقہ سے مشنری سرگرمیوں کو روکنے کے لیے حضرت مولانا مرحوم نے جو پلاننگ کی۔ اور وہ بڑی کامیاب رہی۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کے تلامذہ آگرہ اور دہلی کے دونوں مرکزوں میں کتب مقدسہ اور ان کی اُن تفاسیر کا جو مغربی علماء نے لکھی ہیں ناقدانہ مطالعہ کرنے کے لیے جمع ہوتے اور ان کتابوں کی تحریف اور تناقض وغیرہ کو بیان کرتے۔ حضرت مولانا اس طرح طالب علموں کو مناظرہ کی تعلیم دیتے اور عیسائیوں کے اعتراضات کے جوابات بھی سمجھاتے۔ پھر ان کو آپ مختلف گاؤں اور میلوں ٹھیلوں میں عیسائیوں سے بحث مباحثہ کرنے کے لیے بھیجتے۔ یہ ٹرینڈ شاگرد عیسائی پادریوں سے بڑی کامیابی سے مناظرہ کرتے۔ ان کے سوالوں کے جواب بھی دیتے اور ان سے اپنے سوالوں کے جواب بھی مانگتے۔ اور اگر کسی داعی یا مناظر کو کوئی مشکل پیش آجاتی تو وہ فوری طور پر آگرہ یا دہلی کے بڑے مرکز کی طرف رجوع کرتا۔ یہ مرکز اس کی مشکل کے حل کرنے کے لیے دوسرے علماء کو اس کی نصرت وتائید کے لیے بھیجتا۔

مولانا مرحوم کی اس تحریک کا ذکر پادری فنڈر اس طرح کرتا ہے کہ

Marfat.com

''یہاں آگرہ کے علمائے اسلام دہلی کے علماء کے ساتھ مل کر گذشتہ دو تین سال سے کتاب مقدس اور ہماری کتابوں اور مغربی علماء کی تنقیدی کتب اور تفاسیر کا مطالعہ کر رہے تھے تا کہ وہ کتاب مقدس کو غلط اور باطل کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے عالم مولوی رحمت اللہ (کیرانویؒ) نے دو کتابیں تصنیف کیں۔ جنوری 1854ء میں جب میں یہاں نہیں تھا، وہ آگرہ آیا تھا تا کہ اپنے احباب کے ساتھ ان کتب کو چھپوانے کا انتظام کرے۔ مباحثہ و مناظرہ ہوا۔ تقریباً ایک سو مسلمان علماء مولوی رحمت اللہ کی مدد کے لیے جمع تھے۔ اور دوسرے روز اس کی دوگنی تعداد تھی۔''

اسی طرح مولانا الطاف حسین حالی نے ہندوستان کے مختلف علماء کی عیسائیت کے خلاف کوششوں اور سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا کیرانویؒ کے بارے میں صاف لفظوں میں فرمایا کہ:

''حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ سے بہتر کون ثابت ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس کام کے لیے دہلی اور آگرہ کو مرکز قرار دیا۔ یہاں بھی مولاناؒ نے تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ ان کی جماعت میں ہندوستان کے انتہا پسند اور حضرت اسماعیل شہید کے فدائی مسلمان تھے جن کی تعداد کافی تھی۔''

یہ علماء بلا کسی معاوضہ کے ردنصاریٰ میں اپنا وقت صرف کرتے رہے اور ہر صوبہ اور ہر ضلع میں ان کے شاگرد ردّ نصاریٰ کا فرض ادا کرتے تھے۔ اگر کوئی خاص معاملہ یا مناظرہ ہوتا تھا تو مرکز سے علمائے کرام ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جاتے جس سے پادریوں اور عوام الناس پر خاطر خواہ اثر ہوتا تھا، جو ان کی رپورٹوں میں موجود ہے اگرچہ وہ مخالفانہ اور معاندانہ انداز میں ہے، لیکن واقعات کے ڈھنگ اور عیسائیوں کے طرز سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علمائے کرام ہر ضلع میں ان کے مدمقابل تھے اور ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ چنانچہ پادری فرنچ، انچارج ضلع ملتان، کی رپورٹ میں ہے۔

Marfat.com

''ملتان کے ملا سید اور مخدوم سب اس بات کے لیے کوشش کررہے تھے کہ خدا کی روشنی کو داخل نہ ہونے دیں۔ یہ دو مشہور شخصوں یعنی مولوی رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خان کے جنہوں نے اسلام کا طرفدار ہو کر ڈاکٹر فنڈر سے مباحثہ کیا تھا، دوست تھے۔''

جو مراکز حضرت مولانا کیرانویؒ نے ردّ عیسائیت کے لیے قائم کیے تھے ان میں سے کچھ آج بھی سرزمین پاک و ہند میں موجود ہیں۔ جن کی وجہ سے مولاناؒ کا نام آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔ اس سلسلہ میں جو انجمنیں بنائی گئیں جن کا مقصد وحید دفاع اسلام اور تردید عیسائیت تھی اور جو آج بھی ہندوستان کے مختلف شہروں میں موجود ہیں، پروفیسر آرنلڈ نے ان کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان میں سے ایک ''انجمن حمایت اسلام'' لاہور میں موجود ہے۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد بھی اسلام کی دعوت دینا اور عیسائیوں کے اعتراضات کا ردّ کرنا تھا، ان میں سے ایک انجمن تبلیغ الاسلام، کانپور ہے۔ اس کا مقصد بھی وہی تھا کہ اسلام کے دفاع کے لیے داعی تیار کرنا اور نصاریٰ کے اسلام پر حملوں کا جواب دینا۔ اور اسی طرح کی ایک انجمن اشاعت و تعلیم اسلام پنجاب میں ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ زیادہ تر انجمنیں انجمن ہدایت الاسلام دہلی کے زیر اثر تھیں کیونکہ وہی انجمن غیر مسلموں کے ساتھ مناظرات کا انعقاد کرتی اور اسلامی عقائد کے دفاع کے لیے کتابوں کی نشر و اشاعت کرتی۔

(پریچنگ آف اسلام: ص ۴۷۹)

مناظرہ کے لیے لوگوں کا تقاضا:

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ جب ازالۃ الاوہام کی طباعت کے لیے دہلی تشریف لے گئے تو وہاں آپ کی ملاقات ڈاکٹر وزیر خان صاحب سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب ایک درد دل رکھنے والے مسلمان تھے۔ انگریزی زبان سے خوب واقف تھے اور آپ جب ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے انگلستان گئے تھے، اس وقت وہاں سے عیسائی مذہب کے بارے بہت سی کتابیں انگریزی اور دوسری کئی زبانوں میں لائے تھے۔

ڈاکٹر وزیر خان صاحب نے مولانا کیرانویؒ کو آگرہ تشریف لانے کی دعوت دی جو آپ نے قبول فرمالی۔ آپ چند روز بعد آگرہ تشریف لے گئے اور سرائے جھلی میں قیام فرمایا۔ پادری فنڈر بھی آگرہ ہی میں رہتا تھا اور اپنی تقریروں سے مسلمانوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ علی الاعلان کہتا پھرتا تھا کہ کوئی مولوی میری کتاب ''میزان الحق'' کا جواب دے اور ان اعتراضات کا ردّ کرے جو میں نے اسلام پر کیے ہیں۔

حضرت مولانا کیرانویؒ کی ردّ عیسائیت پر مختلف کتابوں اور تقریروں نے آپ کو لوگوں میں روشناس تو کرا ہی دیا ہوا تھا اور لوگ عیسائیت کے مقابلہ میں آپ کو اسلام کا ایک بہت بڑا وکیل سمجھتے تھے۔ لہٰذا جب شہر میں لوگوں کو مولانا مرحوم کی آمد کی اطلاع ہوئی تو شہر کے اکثر وکلاء اور رؤساء آپ سے ملاقات کرنے کے لیے آئے۔ ملاقات میں انہوں نے آپ پر زور دیا کہ پادری فنڈر سے مناظرہ کیا جائے تاکہ اس کے یہ تعلّی آمیز دعوے اور بیانات ختم ہوں اور جو لوگ اس کی باتوں سے متذبذب ہو گئے ہیں ان پر صراط مستقیم واضح ہو۔

مولانا کی اپنی بھی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ کتابیں اور رسائل لکھنے کے بجائے ان پادریوں سے بالمشافہہ دو دو ہاتھ ہوں۔ لیکن آپ نے اپنے اجنبی ہونے اور غریب الدیار ہونے کا عذر کیا۔ لوگوں نے آپ کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا اور ہر ممکن امداد کا بھی وعدہ کیا۔ اس پر ڈاکٹر وزیر خان کے مشورہ سے آپ نے پادریوں میں سے خصوصی طور پر پادری فنڈر سے مناظرہ کرنے کا وعدہ فرما لیا۔ ڈاکٹر وزیر خان نے بھی آپ سے مناظرہ میں پورا تعاون کرنے کا یقین دلایا۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ڈاکٹر محمد وزیر خان دونوں نے مناظرہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ اس وقت تو آپ واپس آ گئے لیکن چند دنوں بعد واپس آگرہ گئے۔ اور پادری فنڈر سے مناظرہ کی شرائط طے کیں۔

Marfat.com

حضرت مولانا رحمت اللہؒ میدان مناظرہ میں

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ اور ڈاکٹر محمد وزیر خان نے 1854ء میں عیسائیوں کے ساتھ دو مناظرے کیے اور دونوں ہی آگرہ میں کیے۔ ایک مناظرہ تو پادری فرنچ کے بنگلہ پر ہوا اور ایک پبلک جگہ پر جس میں ہزار ڈیڑھ ہزار سے زائد لوگ موجود تھے جس میں حکومت کے آدمی بھی تھے اور پبلک کے بھی۔ اس لحاظ سے جو مناظرہ پادری فرنچ کے بنگلہ پر ہوا اس کو ہم ''چھوٹا مناظرہ'' کا نام دیتے ہیں۔ اور جو پادری فنڈر سے حکومت کی اجازت سے ہزار ڈیڑھ ہزار آدمیوں کی موجودگی میں ہوا اس کو ہم ''بڑا مناظرہ'' یا ''المناظرۃ الکبریٰ'' کا نام دیتے ہیں۔ یہ دونوں مناظرے ایک ہی سال میں ہوئے۔ دونوں میں عیسائی پادری مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی باتوں کا جواب دینے سے قاصر رہے۔ اس چھوٹے مناظرہ کی کاروائی بھی اس زمانہ میں چھاپی گئی لیکن وقت کی کروٹوں میں دب کر آج ناپید ہوگئی۔ مگر حضرت مولانا کیرانویؒ نے اس کی کچھ تفصیل اپنی کتاب ازالۃ الشکوک کی دوسری جلد میں نقل کی ہے۔ اس سے اس مناظرہ کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔

ربیع الآخر 1270ھ میں پادری فرنچ کی کوٹھی پر یہ مناظرہ ہوا۔ اس کے بارے میں ''پہلا مذہبی مباحثہ'' کے عنوان سے صفحہ 29 کے حاشیہ پر یہ عبارت درج ہے:

> ''جاننا چاہیے کہ گفتگو سابق سے وہ گفتگو مراد ہے جو پادری فرنچ کے بنگلہ پر پادری صاحب موصوف اور پادری کئی اور مولانا رحمت اللہ کے ساتھ میرے اور جناب محمد وزیر خان صاحب کے سامنے

Marfat.com

ہوئی تھی اور میں نے اس گفتگو کا ایک جدا رسالہ چھپوایا ہے۔''

یہ رسالہ جس کا ذکر کیا گیا ہے ناپید ہو گیا ہوا ہے لیکن مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی کتاب ازالۃ الشکوک میں اس کا ذکر کر کے اس کو محفوظ کر لیا اس مناظرہ کے کچھ ضروری حصص حسب ذیل ہیں:

1- دونوں پادری صاحبان یہ جانتے تھے کہ ہم میں سے کوئی انگریزی زبان نہیں جانتا۔ اس وجہ سے پادری کئی نے پادری فرنچ کو انگریزی زبان میں کہا:

''اس امر میں آپ ان لوگوں کو مدعی رکھیں اور تم لوگ معترض رہو (کیونکہ اعتراض کرنا آسان ہوتا ہے لیکن جواب دینا نہایت مشکل) اور تحریف کا ثبوت اِن سے طلب کرو۔''

ان کے جواب میں ڈاکٹر محمد وزیر خان نے کہا کہ ''کوئی قاعدہ مقرر کیا جائے تاکہ اس کو دونوں فریق تسلیم کر لیں پھر اسی کے مطابق تحریف کا ثبوت پیش کیا جائے۔'' پادری فرنچ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف یہی کہا کہ تحریف ممکن نہیں تھی کیونکہ تورات کا نسخہ موسیٰ علیہ السلام کا لکھا ہوا بخت نصر کے عہد تک محفوظ تھا، اور بڑی احتیاط کے ساتھ صندوق میں رکھا گیا تھا۔ جو بھی بادشاہ تخت نشین ہوتا وہ اس کو اپنا دستور العمل ٹھہراتا۔ ایسی حالت میں تحریف کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا ''وہ کون سے صندوق میں تھا۔ کیا اسی صندوق میں جس میں دو لوحیں رکھی ہوئی تھیں؟''

پادری فرنچ نے کہا ''ہاں۔''

مولانا کیرانویؒ نے فرمایا: ''اس میں تو حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بھی نہ تھا۔''

اس جواب پر دونوں پادریوں نے تعجب سے دریافت کیا کہ تم کس دلیل سے ایسا کہتے ہیں؟

حضرت مولاناؒ نے فرمایا:

''کتاب سلاطین اول باب 8 میں ہے۔''

پادری صاحبان نے کہا ''یہ کس جگہ ہے؟''

Marfat.com

حضرت مولانا کیرانویؒ نے اس باب کی آیت 9 نکال کر دکھایا جو حسب ذیل ہے:

''اور صندوق شہادت کے اندر ان دو لوحوں کے سوا کچھ نہ تھا جنہیں موسیٰ نے دریب پر اس میں رکھا تھا۔''

یہ آیت پڑھ کر دونوں پادری خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ پھر پادری فرنچ نے کہا ''یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ اس سے تحریف ثابت نہیں ہوتی۔'' مولانا کیرانویؒ نے جواب دیا کہ میں نے بھی اس کو اثبات تحریف کے لیے پیش نہیں کیا بلکہ آپ کے کہنے پر یہ عبارت پڑھی تھی کہ وہ نسخہ موسیٰؑ والا بخت نصر کے عہد تک تھا۔ تحریف کے دلائل تو اور ہیں۔

پادری فرنچ نے کہا کہ سلیمان کے باپ داؤد نے گواہی دی ہے کہ ان کے پاس خدا کا کلام تھا اور اس کو وہ پڑھتے تھے۔''

حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا ''کس جگہ ان کے کلام میں ہے کہ یہ سارا مجموعہ جو اب تورات کہلاتا ہے، ان کے پاس تھا۔ ہم تو اس مجموعہ کے بارے بات کر رہے ہیں۔ ہم اس پر مزید یہ کہتے ہیں اولاً عہد عتیق اور جدید کی کتابوں کی سند متصل نہیں ملتی۔ ثانیاً ان میں یقیناً الحاق بھی ہوا ہے۔ ثالثاً ان میں غلط روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ اور اکثر روایات مختلف بھی ہیں، مثل روایات احاد کے۔''

پادری فرنچ نے کہا کہ ان کی سند کتب اسناد میں لکھی ہوئی ہے۔''

اس پر مولانا کیرانویؒ نے فرمایا ''زیادہ تو نہیں آپ اس وقت مجھے کتاب ایوب اور کتاب نشید الانشاد کی سند دکھلائیے۔''

دونوں پادریوں نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا بلکہ ٹال مٹول کی اور عہد جدید کا ذکر کرنے لگے اور کہا برابر مشائخ کے کلام سے اس کی سند ملتی ہے۔''

مولانا مرحوم نے فرمایا کہ ''یوسی بئیس'' اپنی تاریخ کلیسا میں لکھتا ہے کہ نامۂ یعقوب، نامۂ یہود، نامہ پطرس دوم، نامۂ دوم، سوم یوحنا اور مشاہدات پر قدماء کی گفتگو تھی۔ اور بعضوں نے ''سرن تھیس'' ملحد کی تصنیف بتلایا ہے۔''

Marfat.com

پادری صاحبان نے کہا کہ ''تاریخ یوسی بینس'' کو جانے دیجئے اور مشاہدات کی سند لائیے۔'' پھر دونوں پادری انگریزی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ اس کے بعد بولے۔''سب کلیسا نے اس کو تسلیم کیا ہے۔''

ڈاکٹر محمد وزیر خان نے کہا: ''کلیسا آپ کے نزدیک کس چیز سے عبارت ہے؟ اگر تمام قدماء عیسائیوں سے ہے تو غلط ہے۔ اور اگر کونسل کارتھیج سے ہے تو تسلیم ہے، مگر وہ اس کو الہامی کتاب نہیں مانتے تھے۔ اور قطع نظر اس سے کونسل والوں نے تو کتاب جوڈتھ، کتاب وزڈم اور مقابیس کی دونوں کتابوں کو اور کتاب ٹوبیاس اور کتاب باروق کو بھی الہامی مانا تھا اور تم ان کو الہامی نہیں مانتے۔''

پادری فرنچ نے کہا کہ ''اس کونسل سے آگے کونسل نائس میں بھی اس کو الہامی مانا گیا ہے۔''

اس پر ڈاکٹر محمد وزیر خان نے کہا کہ کونسل نائس میں اس کا ذکر بھی نہیں آیا تھا بلکہ اس کے بارے تین اقوال ہیں۔ صاحب اکیسھو مولکھتا ہے کہ کونسل والے سب جھوٹی اور سچی کتابیں ایک مذبح پر رکھ کر نماز اور دعا میں مشغول ہوئے کہ جو سچی ہیں مذبح پر رہ جائیں اور جھوٹی گر جائیں۔ سو جو رہ گئیں وہ سچی اور جو گر پڑیں وہ جھوٹی مانی اور تصور کی گئیں۔ اور تمہارے علماء مثل لارڈنر نے لکھا ہے کہ اس کونسل میں ان کتابوں کا ذکر نہیں آیا۔ اور جو تھیوڈورٹ کے قول کی سند لاتے ہیں کہ کتابیں میز پر لا کر رکھی گئی تھیں اس کی کوئی سند نہیں۔ اور رومن کیتھولک کہتے ہیں کہ اس کونسل میں کتاب جوڈتھ الہامی ٹھہرائی گئی تھی۔ آپ ان تین اقوال میں سے کس کو مانتے ہیں۔'' اس بات کا بھی انہوں نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ کہنے لگے کہ ہم دکھلاتے ہیں اور دونوں صاحب اُٹھے اور کتاب ڈھونڈنے لگے۔ بہت تلاش کے بعد پیلی کی کتاب لائے مگر کونسل نائس کی جگہ کونسل لوڈلیسیا کا حال نکال کر پیش کیا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس میں لکھا تھا کہ اس کونسل میں مشاہدات خارج رہے۔ اس پر ڈاکٹر محمد وزیر خان نے کہا کہ یہ ہمارا عین قول ہے۔ اس پر دونوں پادری شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے۔

ان دونوں پادریوں نے پھر کہا کہ مشائخ کے کلام میں اس کی سند پائی جاتی

Marfat.com

ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ''یہ بات پہلے کس نے لکھی ہے؟''

پادری فرنچ نے پادری کئی سے انگریزی میں دریافت کیا اور کلیمنٹ کا نام لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ لارڈنر کے لکھنے کے مطابق کلیمنٹ کی ایک چٹھی پائی جاتی ہے اور اس چٹھی کا مضمون کئی جگہ پر انجیل سے ملتا ہے جس کے بارے عیسائی کہتے ہیں کہ اس نے انجیل سے ان مضمونوں کو نقل کیا ہوگا۔ اولاً ہم اسی کو نہیں مانتے کہ اس نے انجیل سے نقل کیا ہو کیونکہ اس میں صریح حوالہ نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مضامین بطور روایات زبانی کلیمنٹ تک پہنچے ہوں۔ اور اگر بالفرض اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی اس میں انجیل کا حوالہ نہیں۔ اور اس سے اس کا تواتر لفظی ثابت نہیں ہوتا۔''

اس پر پادری فرنچ نے کہا کہ ''آپ کے قرآن کا کیا حال ہے؟''

ڈاکٹر وزیر خان نے کہا کہ ''قرآن کے لفظوں کا تو کیا ذکر اس کی تو حرکات بھی تواتر سے منقول ہیں۔''

اس پر دونوں پادریوں نے کہا کہ ''قرآن کے بارے میں ہم کلام نہیں کرتے۔''

پھر بائیبل کی تحریف پر بات ہوئی جس کا کوئی جواب ان دونوں پادریوں کو نہ آیا۔ چنانچہ پادری کئی نے مباحثہ ختم کر دیا۔ اور دعائیہ جملوں پر ختم کیا۔ اور پادری فرنچ نے انگریزی میں کہا ''صاحب فرماتے ہیں کہ ہم تمہاری ملاقات سے بہت خوش ہوئے۔'' یہ بھی کہا کہ ہم نے تورات، انجیل، زبور اور قرآن چاروں کو بڑے غور سے دیکھا ہے اور تینوں کے شروع میں خدا کی صفات ایک ہی طرح کی پائی جاتی ہیں، مگر قرآن میں وہ بات نہیں۔''

یہ سن کر ڈاکٹر وزیر خان صاحب بیٹھ گئے اور فرمایا:

''قرآن کا جواب آپ ذکر کرتے ہیں تو سنیئے، انجیل میں خدا کی تقدیس اور پاکی کا وہ حال جو قرآن میں نہیں ہے، یہ ہے کہ تین خدا ہیں۔ ایک آسمان پر رہا۔ دوسرا مریم کے رحم میں 9 ماہ رہ کر مکان مخصوص سے نکلا اور زندگی بھر کھاتا پیتا رہا۔ اور تیسرا کبوتر کی

Marfat.com

شکل میں اس دوسرے خدا پر اترا۔''

اس کے بعد پادری کئی چلا گیا۔ حضرت مولانا کا ارادہ بھی چلے جانے کا ہوا لیکن پادری فرنچ نے کہا۔ ذرا ٹھہریئے! میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ واپس آئے تو بات چیت کے بعد مذہب کا ذکر آ گیا۔ ڈاکٹر وزیر خان نے سامنے سے متی کی انجیل کے پہلے باب کی آیت 17 پیش کی کہ اس کو دیکھئے۔ یہ مسیح کا نسب نامہ تھا جس میں بہت سی غلطیاں ہیں جس کی تفصیل جب ڈاکٹر صاحب نے پیش کی اور اس نسب نامہ سے بے شمار غلطیاں ثابت کیں۔ اور فرمایا کہ جب ایک نسب نامہ میں اتنی غلطیاں ہوں تو ساری کتاب میں کتنی ہوں گی۔ شاید متی نے عہد نامہ قدیم نہ پڑھا ہوگا جو ایک نسب نامہ میں اتنی غلطیاں کر گیا۔

حضرت مولانا کیرانویؒ اور ڈاکٹر وزیر خان جب چلنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا ''آپ کا نام کیا ہے؟'' پادری صاحب نے کہا ''فرنچ'' ڈاکٹر صاحب نے کہا ''اگر میں یہ کہوں کہ فرنچ صاحب کی عمر اس وقت 22 برس کی ہے، اور مولانا کیرانوی کہیں کہ نہیں 44 برس کی ہے تو یہ دونوں باتیں سچی ہوں گی یا جھوٹی؟'' پادری فرنچ نے کہا ''ہم ایمان نہ کھوئیں گے۔ ایسی بات تو بہت مشکل ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے کہا ''اگر ایسی بات بائیبل میں نکل آئے تو آپ اس کو کیا کہیے گا؟''

پادری فرنچ نے کہا ''یہ کہاں ہے؟''

ڈاکٹر صاحب نے مولانا کیرانوی کی طرف اشارہ کیا۔ مولانا کیرانویؒ نے اخبار الایام، کتاب دوم کے 22 باب کی آیت 2 اور کتاب سلاطین دوم کے باب 8 کی 26 آیت کی عبارت دکھائی۔ پہلی کتاب میں جلوس کے وقت اخذیا کی عمر 42 برس اور دوسری میں 22 برس کی لکھی ہے۔ اس پر پادری فرنچ نے انگریزی بائیبل میں دیکھا وہاں بھی ایسا ہی تھا۔ اور کہا کہ یہ غلطی عدد میں ہے۔

اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب آپ کی اس کتاب میں بہت سی غلطیاں ثابت ہو گئیں تو پھر کون سی دلیل ہے کہ اس ایک مقصود میں غلطی نہ ہو۔ اور ہم

Marfat.com

نے بائیبل میں سو سے زائد غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور آپ سے قرآن حکیم میں پانچ جگہ بھی ایسی نہیں نکل سکتیں۔ پھر آپ قرآن پر کیوں ایمان نہیں لاتے؟ پادری فرنچ نے کہا ''یہ بڑی بات ہے'' اور اسی پر اس مباحثہ کی گفتگو ختم ہوئی۔

چونکہ عصر کا وقت تنگ ہو گیا تھا لہٰذا مولانا کیرانوی اور ڈاکٹر صاحب رخصت ہو گئے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ازالۃ الشکوک: جلد ۲ ص ۴۴۱۔۴۴۷)

اس مختصر سے علمی مباحثہ سے عیسائی پادریوں کو اپنے علم اور اپنے دلائل کی حیثیت اور اہمیت کا پتہ چل گیا، اور انہوں نے اپنی شکست بھی تسلیم کر لی تھی، لیکن یہ سب کچھ ایک کمرے کی چار دیواری میں ہوا جس میں صرف چار پانچ آدمی موجود تھے عوام عیسائی پادریوں کی اس شکست اور اپنے مذہب کی تائید و توثیق میں ان کے بودے دلائل سے واقف نہ ہو سکے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی خواہش یہ تھی کہ آئندہ مناظرہ پبلک کے سامنے ہو تا کہ عوام الناس بھی ان کی علمی بے مائیگی سے آشنا ہو سکیں۔ دوسری خواہش یہ تھی کہ عام مناظرہ پادری فنڈر سے ہو کیونکہ اس کی کتاب میزان الحق پر عیسائی پادریوں کو بڑا ناز تھا اور وہ عوام میں اس کتاب کے بارے یہ پرچار کرتے تھے کہ مسلمان علماء اس کتاب کے جواب سے قاصر ہیں۔ دوسرے اس کتاب نے کئی مسلمانوں کو بھی ذہنی طور پر مرعوب کیا ہوا تھا، چنانچہ حضرت مولانا کیرانویؒ نے لکھا ہے:

''اب ان وجوہات کو بیان کرتا ہوں جس کے سبب یہ مناظرہ ہوا۔

1- اول یہ کہ پادریوں کا شور وغل روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور وہ زبانی اس بات کا بڑے زور شور سے پرچار کرتے تھے کہ مسلمانوں سے ہماری باتوں کا جواب نہیں بن پڑتا۔ اور اپنے رسالوں کے آخر میں ایسی ایسی باتیں بھی چھاپنے لگے تھے۔ اس پر میں نے چاہا کہ اپنی طاقت کے مطابق میں بھی ہاتھ ہلاؤں۔ شاید اللہ تعالیٰ کچھ اچھا ثمرہ دے۔''

2- دوم یہ کہ جس عیسائی سے میری کچھ ملاقات ہوئی اور اس سے کچھ مذاکرہ ہوا تو یہی پتہ چلا کہ اس کے نزدیک ''میزان الحق'' گویا ایک الہامی کتاب ہے اور پوری امت مسلمہ اس کا جواب دینے سے عاجز اور قاصر ہے۔ اور اگر ان

Marfat.com

(عیسائیوں) سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے یعنی مسلمان اس کتاب کا جواب دینے سے عاجز نہیں۔ میزان الحق کا کیا ذکر مسلمانوں کو اس کے مصنف سے بھی کچھ خوف نہیں۔ وہ جواب میں کہتے کہ جب تم کو اس سے پالا پڑے تب تم جانو۔

3- سوم یہ کہ ایک دفعہ جب میں اکبرآباد (آگرے) آنے کا ارادہ کر رہا تھا تو چلتے وقت ماسٹر رام چندر نے جو مجھ سے محبت رکھتا تھا، اور کچھ عرصہ سے عیسائیت قبول کر کے عیسائی پادریوں سے بھی زیادہ متعصب ہو گیا ہوا تھا اور پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق کا نہایت معتقد تھا، مجھ سے کہا کہ اگر اتفاق ہو تو پادری فنڈر اسے ضرور ملیے گا۔ سو اس کی باتوں سے بھی وہی بات سمجھی گئی۔ شاید اُسے بھی یہ گمان ہو کہ پادری فنڈر سے کچھ اس کو بھی ہدایت ہو جائے گی۔

4- چہارم یہ کہ جب میں اکبرآباد پہنچا تو بعض لوگوں کو متذبذب پایا۔ اگر ان کو سمجھایا گیا تو انہوں نے یہی کہا کہ اگر تمہارے پاس آتے ہیں تو تم ہم کو قائل کر لیتے ہو اور اگر کسی اچھے پادری کے پاس جاتے ہیں تو وہ بھی ہم کو لاجواب کر دیتا ہے۔ لہٰذا ہم اب کس طرح سمجھیں کہ تم حق پر ہو اور وہ باطل پر یا اس کے برعکس، بلکہ ہم تو ورطۂ حیرت میں غرقاب ہیں اور کوئی رستہ دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں اگر مقابلہ منہ در منہ اور بالمشافہہ ہو جائے تو ہماری یہ حیرانی بلکہ پریشانی کچھ رفع ہو جائے۔ (ازالۃ الشکوک: جلد۲ص۴۷۴)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ پہلے چھوٹے مناظرہ کی کامیابی نے مسلمان علماء کی دھاک عیسائی پادریوں کے دلوں میں بٹھا دی تھی اور عیسائی پادری خاصے خوفزدہ ہو گئے تھے ایسے ہی جیسے باطل حق سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ سوچ سمجھ کر یہ مناظرہ کرنا چاہتے تھے۔

Marfat.com

پادری فنڈرز سے مناظرہ

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ عیسائی مشنریز کس شدت کے ساتھ اسلام پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ عیسائیت اپنے پورے لاؤلشکر کے ساتھ میدان میں اتری ہوئی تھی۔ مشنریز کے حملے شدید بھی تھے اور پے در پے بھی۔ ان متواتر اور شدید حملوں کی وجہ سے مسلمانوں کی نوجوان نسل کی ایک اچھی خاصی تعداد دین کے بارے میں کچھ تشویش و پریشانی کا شکار ہو رہی تھی۔ خصوصی طور پر آگرہ کی کیفیت کچھ زیادہ پریشان کن تھی کیونکہ یہ اس زمانہ میں عیسائی مشنریز کا مرکز تھا۔ پادری فنڈر جو اس زمانہ میں عیسائی پادریوں کا زعیم اور بڑا سمجھا جاتا تھا، وہ بھی یہیں رہائش پذیر تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی یہ دلی خواہش تھی کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین ایک سر عام اور علی الاعلان مناظرہ ہونا چاہیے جس سے حق سامنے آئے اور مسیحی مشنریوں کا یہ غلبہ وشوکت ختم ہو، کیونکہ مشنریوں کی یہ دھما چوکڑی مسلمانوں کے لیے پریشان کن تھی۔ ان سب حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا کیرانویؒ نے مصمم ارادہ فرمالیا کہ پادری فنڈر کے ساتھ علی الاعلان مختلف مسائل پر مناظرہ کیا جائے، کیونکہ پادری علمائے اسلام کی خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ چنانچہ مولانا کیرانویؒ لکھتے ہیں:

> ''میں نے ہندوستان کے سب سے بڑے پادری جو علمائے مسیحین میں ممتاز حیثیت کا مالک اور ''میزان الحق'' کا مصنف تھا، سے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے ساتھ مجمع عام میں مناظرہ

Marfat.com

کرے تا کہ حق واضح ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ علمائے اسلام نے ان رسائل کی تردید اس لیے نہیں کی کہ وہ عاجز تھے بلکہ جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔" (اظہار الحق: ص ۴)

حضرت مولانا مرحوم کے ایک نہایت شفیق دوست مولوی محمد امیر اللہ میر مختار راجہ صاحب، بنارس، جو پادری فنڈر کے بھی دوست تھے، آپ ان کے ساتھ شرائط مناظرہ اور موضوعات مناظرہ طے کرنے کے لیے پادری فنڈر کے مکان پر تشریف لے گئے، لیکن پادری فنڈر اپنے گھر پر نہ ملے۔ چنانچہ حضرت مولانا مرحوم نے نہایت عجلت کے ساتھ مناظرہ کے بارے پادری فنڈر سے خط و کتابت شروع کر دی، کیونکہ انہیں دہلی واپس لوٹنے میں نہایت جلدی تھی حضرت مولانا کی غیر حاضری میں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ معطل ہو چکا تھا اور طلبہ کا حرج ہو رہا تھا۔

حضرت مولانا مرحوم نے پادری فنڈر کو پہلا خط 23 مارچ 1854ء کو لکھا۔ اس خط میں آپ نے پادری فنڈر کو لکھا کہ میں "اعجاز عیسوی" کی تالیف کے بعد آگرہ آیا تھا۔ میرے قلب میں یہ بات پختہ ہوگئی ہے کہ کتب مقدسہ (عہد نامہ عتیق اور عہد نامۂ جدید) منسوخ اور محرف ہیں۔ اس بارے میں میرے پاس قطعی دلائل اور براہین ساطعہ موجود ہیں۔ اور دین احمدی بالکل برحق ہے۔ میں نے دین مسیحیت کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے بعد میں نے اس کا جواب دیا ہے۔

"مولوی امیر اللہ صاحب کا کہنا ہے کہ جیسے آپ تحریری مناظرہ کو پسند کرتے ہیں ایسے ہی آپ کو زبانی اور تقریری مناظرہ سے بھی انکار نہیں۔ میں حسب حکم مولوی محمد امیر اللہ کی معیت میں آپ کے دولت خانہ پر حاضر ہوا لیکن شومیٔ قسمت سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میری خواہش ہے کہ میں اُن مسائل کے بارے میں جن پر میں نے اپنی کتاب "اعجاز عیسوی" میں بحث کی ہے چند مسلمان اور عیسائی حاضرین کے سامنے آپ کی تقریر سے مستفید ہونا چاہتا ہوں اور پھر میں ان امور پر اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔

جیسا کہ آپ نے اپنی کتابوں میں کہا ہے کہ کتب مقدسہ کی نسخ و تحریف کے مسائل مسلمانوں [illegible]

Marfat.com

کے علاوہ دیگر اختلافی مسائل پر میں آپ سے ایک تقریری مناظرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید واثق ہے کہ آپ میرے اس خط کا مثبت جواب دیں گے۔ اور اس مناظرہ کی دعوت کو قبول کریں گے۔''

پھر آپ نے اپنی مختلف کتابوں کا ذکر فرمایا جو پادری فنڈر کو آپ نے مختلف مواقع پر بھیجی تھیں۔ اور اُن میں جن مسائل پر بحث کی گئی تھی ان کا بھی ذکر فرمایا۔

فنڈر نے اس خط کے جواب میں کہا کہ میرے نزدیک زبانی مناظرہ کوئی مفید شئ نہیں ہے، لیکن میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔ آج دو تین بجے انگریز افسران سے مشورہ کر کے پھر آپ کو مزید تفصیل سے آگاہ کروں گا۔

آپس میں نو خطوں کا تبادلہ ہوا۔ اور کچھ شرائط مناظرہ آپس میں طے ہو گئیں مقام مناظرہ اور حاضرین کی تعداد وغیرہ سب باتیں طے ہو گئیں۔ مولانا مرحوم کے آخری خط کا جواب پادری فنڈر نے 8 اپریل 1854ء کو دیا۔ گویا قریباً 17 روز آپس میں خط و کتاب رہی۔

ان نو خطوط میں مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

1- حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پادری فنڈر کو طباعت کے فوراً بعد اپنی کتاب ''ازالۃ الاوہام'' ارسال فرمائی اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی فرمایا کہ جونہی میری کوئی کتاب چھپے گی اس کی مطبوعہ کاپی آپ کو ارسال کر دی جائے گی۔ آئندہ چھپنے والی کتابوں کے نام بھی حضرت مولاناؒ نے اُسے بتا دیئے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پادری فنڈر کے قلب میں حضرت مولاناؒ سے تقریری مناظرہ کا داعیہ اور جذبہ پیدا کیا جائے اور دوسرے اس کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ مولانا مرحوم کی کتابوں کا ردّ لکھے۔

2- حضرت مولانا کیرانویؒ کے دل میں پادری فنڈر سے مناظرہ کی بڑی خواہش تھی چنانچہ اسی وجہ سے وہ خود پادری مذکور کے گھر گئے اور اس سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی اس بارے میں شروع کیا۔ یہ بات ان کی ثقاہت علم اور دین و عقیدہ کی مضبوطی پر دلالت کرتی ہے۔

Marfat.com

3- حضرت مولاناؒ کو خدشہ تھا کہ پادری فنڈر کہیں تقریری مناظرہ سے انکار نہ کر دے، چنانچہ اس کے پہلے خط سے یہ بات مترشح بھی ہوتی تھی اور اس نے لکھا کہ ''اس زبانی مناظرہ میں کوئی فائدہ نہیں'' حالانکہ اس میں بڑا فائدہ پنہاں تھا۔ حضرت مولاناؒ نے اپنے تمام خطوں خاص طور پر اپنے چوتھے خط میں اپنے مختلف الفاظ کے ذریعہ (تم ایک عالی ہمت شخص ہو۔ اور دوسرے تمام مشنریز پر تمہیں خصوصی امتیاز حاصل ہے) اسے مناظرہ کرنے کی ترغیب دی، کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ اس مناظرہ سے اگرچہ فنڈر کو کوئی فائدہ نہ ہو گا لیکن حاضرین ضرور مستفید ہوں گے۔

4- پادری فنڈر بہت ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے تقریری مناظرہ کے لیے کچھ شرائط پیش کیں جن میں اہل اسلام کو فائدہ کی بجائے نقصان تھا۔ چنانچہ حضرت مولاناؒ نے اپنی ذہانت و ذکاوت سے ان شرائط کو قبول نہ کیا اور پھر بھی فنڈر کو مناظرہ پر راضی کر لیا۔

5- پادری فنڈر نے حضرت مولانا مرحوم کو پست ہمت کرنے کے لیے کچھ مشکل شرائط عائد کرنے کی کوشش کی اور اُسے پورا پورا یقین تھا کہ مولانا رحمت اللہ ان شرائط کو قبول نہ کریں گے اور مناظرہ کی یہ بلا ٹل جائے گی اور مجھے فرار کا موقع مل جائے گا لیکن حضرت مولاناؒ نے اُسے فرار نہ کرنے دیا اور مناظرہ ہو کر رہا۔

6- یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مشنریز اور انگریزی حکومت میں آپس میں کس قدر تعاون تھا۔ کیونکہ مناظرہ اور اس کی شرائط اور ترتیب کے لیے پادری فنڈر نے انگریز افسران سے کتنی بار صلاح و مشورہ کیا۔

7- دونوں پارٹیوں کے مابین اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ مناظرہ 10 اپریل 1854ء کو صبح کے وقت کٹہرہ عبدالمسیح، اکبر آباد (آگرہ) جو پہلے ایک مدرسہ تھا، میں ہو گا۔

8- اس بات پر بھی اتفاق ہو گیا کہ سب سے پہلے نسخ اور تحریف بائبل کے موضوعات زیر بحث آئیں گے۔ اور دوسرے موضوعات پر ان دو کے بعد بحث ہو گی۔

Marfat.com

9- اس بات پر بھی اتفاق کامل ہو گیا کہ نسخ و تحریف بائیبل اور تثلیث اور الوہیت مسیح کے مسائل پر مولانا رحمت اللہ مرحوم اعتراض کریں گے اور پادری فنڈر کی حیثیت مجیب کی ہو گی۔ اور اثبات نبوت اور اعجاز القرآن کے موضوعات پر فنڈر کی حیثیت معترض کی ہو گی اور حضرت مولاناؒ فنڈر کے اعتراضات کے جوابات دیں گے۔

10- اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ جب تک مسئلہ پر بحث ختم نہ ہو جائے اس وقت تک دوسرا کوئی مسئلہ زیر بحث نہیں آئے گا۔ اور اگر کچھ امور بحث میں رہ جائیں جو دونوں طرف میں سے کوئی پوچھنا چاہیے تو وہ امور مناظرۂ تقریری کے بعد تحریری مباحثہ میں حل کیے جائیں گے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ انگریزی زبان سے ناآشنا تھے لہٰذا ان کے لیے انگریزی میں بات کرنا مشکل تھا جب کہ پادری فنڈر اور پادری فرنچ صرف انگریزی میں بات کر سکتے تھے، لہٰذا ایک ایسے سچے اور صادق مسلمان ترجمان کی اشد ضرورت تھی جو دینی لحاظ سے بھی مخلص ہو اور غیر جانبدار ہو۔ اس کے بارے میں یہ خدشہ بھی نہ ہو کہ وہ کلام میں تحریف کر دے گا یا الفاظ و عبارات سے کھیلے گا۔ علاوہ ازیں اُسے عیسائی حضرات کی کتابوں کے بارے میں بھی کچھ آشنائی ہو اور انگریزی زبان میں بطریق احسن بات بھی کر سکتا ہو تا کہ وہ دونوں فریق کے مابین ترجمان کے فرائض انجام دے سکے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم کے جاننے والوں میں سوائے ڈاکٹر محمد وزیر خان اکبر آبادی [1] کے اور کسی میں یہ سب شرائط نہیں پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ

ا۔ ڈاکٹر محمد وزیر خان نے تعلیم لندن میں حاصل کی۔ آپ کو انگریزی اور یونانی زبان میں مہارت تامہ حاصل تھی اور عیسائیت کا مطالعہ انہوں نے اس کی بنیادی کتابوں سے کیا تھا۔ اور انگلستان سے واپسی پر اپنے ساتھ اصلی زبان میں ان کی کتابوں کا ایک ذخیرہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کے اس جہاد علمی میں ڈاکٹر وزیر خان بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر خان نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت کی پھر مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت کی اور مدینۃ الرسولؐ میں وفات پائی۔

(عبدالحی الحسنی: الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۲۲۶ وغیرہ)

Marfat.com

ڈاکٹر محمد وزیر خان کو شریک مناظرہ کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب صرف مترجم ہی نہیں تھے بلکہ وہ عملی طور پر شریک مناظرہ تھے اور ترجمانی کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔

اس طریقے سے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے پادری فنڈر کے ساتھ زبانی اور تقریری مناظرہ طے کیا۔ جس کا انعقاد اکبر آباد (آگرہ) میں 11 رجب 1270ھ مطابق 10 اپریل 1854ء کو ہوا۔ انعقادِ مناظرہ سے قبل مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور پادری فنڈر کے مابین جو خط و کتابت ہوئی جس کا ذکر ہم گذشتہ سطور میں کر چکے ہیں، وہ مناظرہ کی مطبوعہ روداد میں موجود ہے جس کو دکتور محمد عبدالقادر خلیل نے ''المناظرۃ الکبریٰ'' میں نقل کیا ہے۔ اور اس کا عربی ترجمہ ''البحث الشریف'' کے نام سے شیخ رفاعی خولیؒ نے کیا ہے جو اظہار الحق مطبوعہ استنبول 1315ھ کے حاشیہ پر چھپا ہے۔

مناظرہ کا انعقاد

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے اس مناظرہ کا جو انعقاد کیا وہ ایک یادگار چیز تھی۔ اس سے حضرت مولانا مرحوم اور ان کی کتابوں کا نام ہر خاص و عام کی زبان پر جاری ہو گیا۔

مناظرہ کا انعقاد بروز پیر مورخہ 11 رجب المرجب 1270ھ مطابق 10 اپریل 1854ء ساڑھے چھ بجے صبح کے وقت کٹہرہ عبدالمسیح اکبر آباد (آگرہ) میں ہوا۔ حضرت مولانا رحمت اللہؒ کے ساتھ ڈاکٹر محمد وزیر خان مرحوم اور پادری فنڈر کے ساتھ پادری فرنچ بطور معاون تھے۔ مناظرہ میں شرکت کے لیے مسلمان، ہندو اور عیسائی سبھی مذہبوں کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ انگریز حکام، فوجی اور ہر شعبۂ زندگی کے لوگ موجود تھے۔ اخباری نمائندگان اور علماء وغیرہ کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ پہلے روز کی نشست میں پانچ سو سے زائد لوگ مناظرہ میں شریک ہوئے۔ جن میں چند لوگ حسب ذیل ہیں۔

مجلس مناظرہ میں مسلمانوں کی طرف سے حافظ ولی حسن، حافظ خدا بخش، حافظ فضل حسین، مفتی محمد ریاض الدین، مولانا فیض احمد سرشتہ دار صدر بورڈ، جناب عبداللہ اکبر آبادی، نائب مترجم حکومت انگلیشیہ، اکبر آباد (انہوں نے مناظرہ کو اردو زبان میں مدون کیا تھا) سید وزیر الدین بن شرف الدین (انہوں نے مناظرہ کو فارسی زبان میں مدون کیا تھا) مولانا حضور احمد، مولانا محمد امیر اللہ مختار وکیل راجہ بنارس یعنی نائب امیر شہر بنارس (ان کی معیت میں حضرت مولانا رحمت اللہ پادری فنڈر کے گھر گئے

Marfat.com

تھے لیکن وہ گھر میں موجود نہیں تھا) مولانا محمد قمر الاسلام امام جامع مسجد اکبرآباد، محمد جعفر بخش قاری اور محمد عبدالشہید کولوی شریک تھے۔

مدیران جرائد کی طرف سے جناب خادم علی مہتمم مطلع الاخبار، ایڈیٹر انچیف اخبار مطلع الاخبار اور محمد سراج الحق بن فیض احمد، نمائندہ اخبار نے شرکت کی۔ حکومت انگریزی کی طرف سے مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی، مسٹر کرسچن مشیر نظارت مالیہ، مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقۂ فوج مسٹر لیڈلی، ترجمان انگریزی حکومت، پادری ولیم گلین وغیرہ شریک مجلس ہوئے۔ عوام کو اس مناظرہ سے بے حد دلچسپی تھی، لہٰذا ایک روایت کے مطابق چھ سو کے قریب مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی اس مجلس مناظرہ میں موجود تھے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ مناظرہ کے لیے چھ موضوع طے پائے تھے۔ تحریف بائیبل، وقوع نسخ، تثلیث، الوہیت مسیح، اثبات نبوت محمد ﷺ اور حقانیت قرآن اور شرط یہ طے پائی کہ اگر مناظرہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ جیت گئے تو فنڈر مسلمان ہو جائے گا اور اگر فنڈر غالب آ گیا تو مولانا کیرانویؒ عیسائی ہو جائیں گے۔

مناظرہ شروع ہوا تو سب سے پہلے پادری فنڈر نے کھڑے ہو کر حاضرین کو اونچی آواز سے کہا:

> ''حاضرین! یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ مناظرہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی استدعاء اور خواہش وکوشش کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ میرے نزدیک اس میں فائدہ کی کوئی خاص صورت نظر نہیں آتی۔ بہرحال میری خواہش ہے کہ میں عیسائی مذہب کا حق ہونا مسلمانوں کے سامنے ثابت کروں۔ یہ مناظرہ نسخ وتحریف اناجیل، الوہیت مسیح، تثلیث، نبوت محمد (ﷺ) اور حقیقت قرآن کے موضوعات پر ہوگا۔ پہلے چار موضوعات پر میں جواب دوں گا اور مولانا فاضل رحمت اللہ کیرانویؒ اعتراض کریں گے۔ اور آخری دو مسائل پر میں اعتراض کروں گا اور مولانا رحمت اللہ جواب دیں گے۔''

یہ کہہ کر پادری فنڈر بیٹھ گیا اور حضرت مولانا کیرانویؒ کھڑے ہوئے اور آپ

Marfat.com

نے فنڈر کی کتاب ''میزان الحق'' کے باب اول فصل ثانی کی دو عبارتوں پر اعتراض کیے۔ پہلی عبارت جو میزان الحق مطبوعہ 1850ء (اردو) کے صفحہ 17 پر یوں ہے کہ ''قرآن اور مفسرین قرآن نسخ کے بارے میں مدعی ہیں کہ جس طرح زبور کے نازل ہونے سے تورات منسوخ ہو گئی اور انجیل کے نزول سے زبور منسوخ ہو گئی اسی طرح قرآن حکیم کے نازل ہونے کے ساتھ انجیل منسوخ ہو گئی۔''

دوسری عبارت میزان الحق صفحہ 24 پر یوں مرقوم ہے کہ:

''ایک مسلمان کے اس دعویٰ کی کوئی اصل نہیں ہے کہ زبور تورات کی ناسخ ہے اور انجیل ان دونوں کی ناسخ ہے۔''

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ ''پادری صاحب! آپ نے اپنے اس دعویٰ (تورات، زبور کے نزول سے منسوخ ہو گئی اور انجیل کے نزول سے تورات اور زبور دونوں منسوخ ہو گئیں) کی نسبت قرآن حکیم اور مفسرین قرآن کی طرف کی ہے۔ حالانکہ اس بات کا ذکر نہ تو قرآن حکیم میں ہے اور نہ ہی کسی مفسر قرآن کی تفسیر میں۔ بلکہ تفاسیر میں اس دعویٰ کے خلاف مذکور ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی تفسیر فتح العزیز میں سورۂ بقرہ کی 87 آیت (وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ) میں لکھا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد بہت سے رسول آئے جیسے سیدنا یوشعؑ، سیدنا الیاسؑ، سیدنا عزیرؑ، سیدنا حزقیلؑ، سیدنا داؤدؑ، سیدنا سلیمانؑ، سیدنا ذکریاؑ، سیدنا یحییٰ وغیرہم علیہم السلام جن کی تعداد چار ہزار بتائی جاتی ہے۔ یہ سارے کے سارے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر تھے۔ ان کے دنیا میں تشریف لانے کا مقصد صرف شریعت موسویہ کے ان احکام کا اجراء اور ان پر عمل کرنا تھا، جو بنی اسرائیل کی سستی اور تکاسل کی وجہ سے قریباً ختم ہو گئے تھے اور علماء سو کی تحریفات کے سبب متغیر و متبدل ہو گئے تھے، چنانچہ تفسیر حسینی میں سورۂ نساء کی آیت نمبر 163 (و آتینا داؤد زبوراً) کے تحت لکھا ہے کہ ''ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی جو کہ حق تعالیٰ کی حمد و ثنا پر مشتمل تھی اور اس میں کوئی حکم شرعی نہ تھا۔ اور سیدنا داؤد علیہ السلام کی شریعت ''شریعت موسویہ'' تھی'' اسی قسم کی بات دوسری تفاسیر میں لکھی ہوئی ہے۔ گویا کہ اس بات پر اجماع ہے کہ

Marfat.com

زبور نے تورات کی شریعت کو منسوخ نہیں کیا۔ کیونکہ زبور کی کتاب تو صرف دعاؤں پر مشتمل ہے اس میں احکام شریعت نہیں ہیں۔ اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد جس قدر نبی بھی اس دنیا میں تشریف لائے وہ سارے کے سارے شریعت موسویہ پر تھے۔ چنانچہ امام قرطبیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ

> ''زبور سیدنا داؤد علیہ السلام کی کتاب تھی۔ اسی میں 150 سورتیں (دعائیں) تھیں لیکن اس میں حلال و حرام کا کوئی حکم نہیں تھا، بلکہ اس میں صرف حکمتیں اور وعظ و نصیحت کی باتیں تھیں۔''

(تفسیر قرطبی: جلد ۶ ص ۱۷)

شوکانی اور دوسرے تمام مفسرین نے بھی یہی کچھ لکھا ہے۔

اس پر پادری فنڈر نے کہا ''کیا آپ انجیل کو منسوخ سمجھتے ہیں یا نہیں؟

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا: ''ہمارے نزدیک انجیل ان معنوں میں منسوخ ہے جس کا ابھی میں ذکر کروں گا۔''[۱] لیکن یہاں میرا مقصد اس بات کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ ان دونوں مقامات پر آپ کا دعویٰ بالکل غلط ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن حکیم اور مفسرین قرآن پر افتراء ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی ایسا نہیں کہا ہے۔

پادری فنڈر نے کہا: کہ میں نے بعض مسلمانوں سے ایسا سنا ہے جن سے مجھے بحث کرنے کا اتفاق ہوا۔''

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا:

> ''عدل و انصاف کے تقاضا سے یہ چیز بالکل برعکس ہے کہ آپ ایک شی کسی مسلمان سے سنتے ہیں تو اس کو قرآن اور مفسرین

۱۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ نسخ عملی احکام کے بارے میں اوامر و نواہی پر وارد ہوتا ہے جیسے طاعات فعلیہ اور عبادات جسمیہ، اخبار و قصص اور عقائد و امثال پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ (ملاحظہ ہو الاحکام فی اصول الاحکام لابن حزم اندلسی: جلد ۲ ص ۴۴۸، ارشاد الفحول الی تحقیق من علم الاصول: ص ۱۵۸، الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح شیخ الاسلام ابن تیمیہ: جلد ۱ ص ۳۸۰)

قرآن کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ لہٰذا بلا شک و شبہ یہ بات سراپا غلط ہے۔''

پادری فنڈر نے کہا کہ ''ہاں یہ تو واقعی درست ہے۔''

حضرت مولانا کیرانویؒ نے سمجھا کہ یہ شخص تو نسخ کے اصطلاحی معنوں ہی سے نا آشنا ہے۔ لہٰذا آپ نے اس سے پوچھا کہ آپ کو اس اصطلاحی نسخ کے معنوں سے واقفیت ہے جو مسلمانوں کے مابین رائج ہیں؟''

پادری فنڈر نے کہا کہ ''آپ اصطلاحی نسخ کے معانی بیان فرمائیں۔''

اس کے جواب میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا:

''ہمارے نزدیک یہ نسخ صرف اوامر و نواہی پر وارد ہوتا ہے جیسا کہ امام بغوی نے اپنی تفسیر معالم التنزیل میں فرمایا ہے کہ ''نسخ اخبار پر وارد نہیں ہوتا بلکہ صرف اوامر و نواہی پر وارد ہوتا ہے۔'' اس کا حاصل یہ ہے کہ اس کا اطلاق قصص و اخبار پر نہیں ہوتا بلکہ صرف اوامر و نواہی پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا اعتقاد بھی یہی ہے کہ نسخ کا اطلاق نہ تو قصص و اخبار پر ہوتا ہے اور نہ ہی امور عقلیہ قطعیہ پر جیسے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہیں۔ اور نہ ہی امور حسیہ پر ہوتا ہے جیسے کہ صبح کی روشنی اور رات کی تاریکی۔ اور اوامر و نواہی پر جو اس کا اطلاق ہوتا ہے اس کے بارے میں بھی تفصیل ہے کہ اس کا تعلق ایسے عملی حکم سے ہوتا ہے جس میں وجود و عدم وجود کا احتمال ہو۔ بس یا تو حکم واجب ہو جیسے ایمان باللہ یا حکم ممتنع ہو جیسے شرک و کفر۔ یہ احکام محل نسخ نہیں ہیں۔''

مولانا کیرانویؒ نے پادری فنڈر کو مخاطب کر کے فرمایا:

''پادری صاحب! وہ عملی احکام جو وجود اور عدم وجود دونوں کا احتمال رکھتے ہیں، دو اقسام پر منقسم ہیں:

1- مؤید: جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

Marfat.com

﴿ولا تقبلوا لهم شهادة ابداً﴾ (سورۃ النور: ۴)
یہ محل نسخ نہیں ہوتے۔

2- اور دوسری قسم ان احکام کی غیر مؤید ہے۔ پھر اس غیر مؤید کی بھی دو قسمیں ہیں۔

1- مؤقت: جیسے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:
﴿فاعفوا واصفحوا حتی یاتی الله بامره﴾ (البقرہ: ۱۰۹)
یہ بھی وقت معین سے قبل محل نسخ نہیں ہے۔

2- غیر مؤقت: اور اس کا نام "حکم مطلق" ہے اور یہ محل نسخ ہے۔ اور اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ یہ حکم فلاں وقت تک انسانوں کے لیے باقی رہے گا پھر منسوخ ہو جائے گا۔ پس جب وہ وقت آئے گا تو دوسرا حکم لاگو ہوگا جو پہلے حکم کے مخالف ہوگا۔ اس سے پہلے حکم کی انتہا معلوم ہو جائے گی۔

خلاصہ یہ کہ نسخ صرف ان احکام میں واقع ہو سکتا ہے جو علمی اور وجود اور عدم وجود دونوں کا احتمال رکھتے ہوں۔ نہ دائمی ہوں اور نہ کسی وقت کے ساتھ مخصوص کیے گئے ہوں۔ ایسے احکام کو "احکام مطلقہ" کہا جاتا ہے۔ ان میں یہ بات ضروری ہے کہ زمانہ اور مکلّف اور صورت متحد نہ ہوں بلکہ تینوں میں اختلاف ہو یا بعض میں۔ مطلب یہ کہ جس زمانہ میں جس شخص کو جس صورت کے ساتھ ایک کام کا حکم دیا گیا یہ ناممکن ہے کہ اسی زمانہ میں اسی شخص کو اسی صورت میں منع کر دیا جائے، بلکہ نسخ میں یا زمانہ بدلے گا یا وہ شخص یا صورت یا تینوں۔"

حضرت مولانا کیرانویؒ نے نسخ کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے پادری فنڈر سے فرمایا:

"نسخ اصطلاحی کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ پہلے خدا نے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دے دیا، مگر اس کا انجام حق تعالیٰ کو معلوم نہ تھا۔ پھر خدا کی رائے اس کے خلاف قائم ہوئی۔ اس لیے پہلے حکم کو ختم کر دیا کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کا جاہل ہونا لازم آئے یا

Marfat.com

پہلے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا۔ پھر ان کو تینوں باتوں میں اتحاد کے باوجود منسوخ کر دیا۔ اگر چہ ہم یہ کہیں کہ خدا تعالیٰ کو انجام معلوم تھا تب بھی اس سے خدا کی شان میں قباحت کی نسبت لازم آتی ہے۔ (والعیاذ باللہ منہ)

چنانچہ ایسا نسخ ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس عیب سے بلند و بالا ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ یہ حکم انسانوں پر فلاں وقت تک باقی رہے گا پھر منسوخ کر دیا جائے گا۔ پھر جب وہ وقت آ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرا حکم بھیج دیتا ہے جس سے کمی یا بیشی ہونی یا بالکل حکم ختم ہو جانا معلوم ہوتا ہے تو در حقیقت یہ صرف پہلے حکم کی مدت و انتہا کا بیان و اظہار ہے، لیکن چونکہ بندوں کے سامنے پہلے حکم میں وقت اختتام کا ذکر نہیں کیا گیا اس لیے دوسرے حکم کے آنے پر ہم اپنی کوتاہی فہم کی بنا پر یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ حکم میں تبدیلی ہوئی ہے۔"

پھر حضرت مولانا کیرانویؒ قدس سرہ نے پادری فنڈر کو نسخ کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے مثالیں دے کر سمجھایا تا کہ پادری فنڈر اور حاضرین مناظرہ صحیح طریقے سے اس بات کو ذہن نشین کر لیں۔ آپ نے فرمایا:

"بلا شبہ اس کی مثال ایسی سمجھ لیجئے کہ آپ اپنے کسی ایسے خادم کو جس کے حالات سے آپ پورے طور پر باخبر ہیں، کسی خدمت کا حکم دیتے ہیں اور اپنے دل میں یہ ارادہ اور نیت کر لیتے ہیں کہ اس کام پر مثلاً اس کو ایک سال رکھوں گا اور آئندہ سال مجھ کو اس سے دوسرا کام کرانا ہے، مگر آپ نے اپنی اس نیت اور ارادے کا اظہار خادم پر نہیں کیا۔ اب ایک سال پورا ہونے پر جب آپ نے دوسری خدمت کا اس کو حکم دیا تو ظاہر میں خادم کے نزدیک بھی اور

Marfat.com

ہر ایسے شخص کے نزدیک جس کو آپ کے ارادے اور نیت کا حال معلوم نہیں ہے، آپ کا یہ دوہرا حکم ترمیم و تبدیلی سمجھا جائے گا، لیکن حقیقت میں اور آپ کے نزدیک یہ ہرگز تبدیلی نہیں ہے۔

اس معنی کے لحاظ سے نہ تو خدا کی ذات کی نسبت اور نہ اس کی کسی صفات کے لیے استحالہ لازم آ سکتا ہے۔ پس جس طرح موسموں کے بدلنے میں کہ کبھی بہار ہے اور کبھی خزاں، کبھی سردی ہے اور کبھی گرمی، بے شمار حکمتیں ہیں۔ دن رات کی تبدیلی اور انسان کے حالات بدلنے میں، تنگدستی، دولت مندی اور بیماری وصحت کے آنے جانے میں بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، خواہ ہم کو ان کا علم ہو یا نہ ہو، بالکل اسی طرح احکام کی منسوخی میں خدا کی بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں مکلفین اور زمان و مکان کے حالات کے پیش نظر ہوتی ہیں۔

دوسری مثال اس کی یوں سمجھئے کہ ایک ماہر طبیب دواؤں اور غذاؤں میں تغیر و تبدل کرتا ہے جس کا منشاء مریض کے حالات اور دوسرے اسباب ہوتے ہیں، جو مصلحتیں اس وقت ہوتی ہیں ان کے پیش نظر طبیب کے اس فعل کو کوئی بھی عقلمند بیکار اور فضول اور اس طبیب کو جاہل اور بے وقوف کہنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔ پھر کوئی سمجھدار انسان اس حکیم مطلق کی نسبت جو اپنے قدیم ازلی و ابدی علم کی بدولت اشیاء کے تمام احوال کو جانتا ہے، یہ تصور کیسے کر سکتا ہے۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے اس کی ایک اور مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ:

”اس بات کو ایک اور مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ حکام وقت موسم گرما میں اہل دربار کو دربار میں حاضر ہونے کے لیے صبح کا وقت دیتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ حکم موسم

Marfat.com

گرما کے اختتام تک باقی رہے گا اگرچہ وہ ظاہر میں اس بات کی وضاحت نہ کریں۔ لہٰذا جب موسم گرما ختم ہو جائے گا تو دوسرا حکم خود بخود لاگو ہو جائے گا۔ پس یہ دوسرا حکم درحقیقت پہلے حکم کا مغیر نہیں ہے بلکہ اس کی انتہاء کا مبین ہے۔"

حضرت مولانا کیرانویؒ کی نسخ کے بارے میں یہ تفصیل سن کر پادری فنڈر نے مولانا مرحوم کو مخاطب کر کے کہا کہ:

"اس معنی میں انجیل کا کون سا حکم آپ کے نزدیک منسوخ ہے؟"

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا:

"جیسے طلاق کی حرمت وغیرہ" کیونکہ موسوی شریعت میں جائز تھا کہ ہر شخص اپنی بیوی کو کسی بھی وجہ سے طلاق دے سکتا تھا اور یہ بھی جائز تھا کہ اس مطلقہ کے پہلے شوہر کے گھر سے نکلتے ہی دوسرا شوہر فوراً نکاح کر سکتا تھا جس کی تصریح کتاب الاستثناء کے باب 24 آیت 1-2 میں موجود ہے جب کہ شریعت عیسوی میں سوائے زنا کے ارتکاب کے عورت کو طلاق دینے کی اور کوئی معقول وجہ تسلیم نہیں کی گئی۔ اسی طرح شریعت عیسوی میں مطلقہ سے نکاح کرنا زنا کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ (متی باب ۵ آیت ۳۱-۳۲) چنانچہ انجیل میں ہے کہ جب فریسی (یہودی علماء) نے سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس مسئلہ پر احتجاج کیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے تو طلاق کو جائز قرار دیا تھا، تو آپ نے فرمایا "موسیٰ نے تمہاری سخت دلی کے سبب سے تم کو اپنی بیویوں کو چھوڑ دینے کی اجازت دی، مگر ابتداء سے ایسا نہ تھا، اور میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرامکاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی چھوڑی ہوئی (مطلقہ) سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے۔" (متی باب ۱۹ آیت ۸-۹)

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے اس جواب سے پتہ چلا کہ طلاق کے حکم میں دو مرتبہ نسخ واقعہ ہوا۔ ایک مرتبہ شریعت موسوی میں (جیسا کہ سیدنا عیسیٰؑ کے جواب سے کہ موسیٰؑ نے تمہاری سخت دلی کے سبب سے تم کو تمہاری بیویوں کو طلاق دینے کی اجازت دی تھی لیکن ابتداء سے ایسا نہ تھا) کہ اس میں طلاق دینا جائز نہ تھا پھر یہ حکم منسوخ ہو کر طلاق دینا مباح ہو گیا۔ اور دوسری مرتبہ شریعت عیسوی میں۔"

پادری فنڈر نے کہا:

"آپ کے ان بیان کردہ معنوں کی رو سے پوری انجیل تو منسوخ نہیں ہے؟"

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پادری فنڈر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"نہیں، پوری انجیل منسوخ نہیں ہے، کیونکہ انجیل کے بعض احکام یقیناً منسوخ نہیں ہوئے۔ مثلاً مرقس باب 12 آیت 29-31 میں ہے کہ:

"یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے کہ اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ اور تو خداوند اپنے خدا سے، اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔ دوسرا یہ کہ تو اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ اس سے بڑا کوئی حکم نہیں۔"

مولانا کیرانویؒ کا یہ جواب سن کر پادری فنڈر کہنے لگا:

"انجیل میں کسی قسم کا کوئی نسخ ممکن ہی نہیں، کیونکہ انجیل لوقا کے باب 21 آیت 33 میں سیدنا مسیح علیہ السلام کا قول منقول ہے کہ:

"زمین و آسمان ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں ہرگز نہ ٹلیں گی۔"

اس پر ڈاکٹر محمد وزیر خان نے فنڈر کو جواب دیا کہ "سیدنا مسیح علیہ السلام کا یہ

Marfat.com

قول عام نہیں ہے بلکہ اس حادثہ کے بارے میں مخصوص ہے جس کی خبر سیدنا مسیح علیہ السلام نے اس آیت سے پہلی آیات میں دی ہے، اور اس کا معنی یہ ہے کہ

''اگر بالفرض زمین و آسمان ٹل بھی جائیں لیکن اس حادثہ کے بارے میں جو خبر میں نے دی ہے وہ ہرگز نہیں ٹلے گی۔''(۱)

(وہ حادثات جن کی خبر سیدنا مسیح علیہ السلام نے دی ہے وہ متی باب 24 آیت 3-35، مرقس باب 13 آیت 2-31، لوقا باب 21 آیت 5-33 میں مذکور ہیں۔ اس فقرہ کو نفیاً اور اثباتاً نسخ میں کوئی دخل نہیں ہے)

پادری فنڈر نے کہا کہ:

''یہ قول خاص نہیں بلکہ عام ہے۔''

ڈاکٹر محمد وزیر خان نے جواب دیا:

''پادری صاحب! میں پھر کہتا ہوں کہ انجیل متی باب 24 آیت 35 میں اور انجیل لوقا باب 21 آیت 33 میں سیدنا مسیح علیہ السلام کا جو قول نقل کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میرا کوئی قول اور حکم منسوخ نہیں ہوسکتا، ورنہ عیسائیوں کی اناجیل کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا بلکہ الفاظ ''میری باتیں'' سے وہ مخصوص بات مراد ہے جس میں آپ نے آئندہ پیش آنے والے واقعات کی خبر دی ہے جو اس قول سے پہلے اناجیل میں مذکور ہیں۔ (اس قول سے پہلے قیامت کی بعض علامات ذکر کی گئی ہیں اور ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ ''جب تک یہ سب باتیں نہ ہولیں یہ نسل ہرگز تمام نہیں ہوسکتی۔'') اس لیے ''میری باتیں'' میں اضافت عہدی ہے نہ کہ استغراقی۔''

ڈاکٹر محمد وزیر خان صاحب نے فرمایا:

۱۔ یہ توحید کا مسئلہ ہے اور توحید کا تعلق چونکہ عقائد سے ہے اور عقائد میں کوئی نسخ نہیں ہوتا اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت اور فضائل اخلاق وغیرہ میں بھی کوئی نسخ نہیں ہوتا۔

Marfat.com

''یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ عیسائی مفسرین نے بھی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کو ہمارے بیان کردہ معنی پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ ڈی۔ آئلی اور رچرڈ منٹ کی تفسیر میں انجیل متی کی عبارت کی شرح کے ذیل میں یوں کہا گیا ہے کہ:

''پادری ببروس کہتا ہے کہ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ جن واقعات کی میں نے پیش گوئی کی ہے وہ یقیناً واقع ہوں گے۔'' ڈین اسٹاین ہوپ کہتا ہے کہ ''آسمان و زمین اگرچہ دوسری چیزوں کی نسبت تبدیل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے، لیکن ان واقعات کو آئندہ کی خبروں کے مقابلہ میں جن کی میں نے خبر دی ہے، آسمان و زمین مضبوط نہیں ہیں۔ پس آسمان و زمین بھی سب مٹ سکتے ہیں لیکن میری بیان کردہ پیش گوئیاں نہیں مٹ سکتیں، بلکہ جو بات میں نے اب کہی ہے اس کی مراد اور مطلب سے ایک انچ بھی تجاوز نہیں ہوگا۔''

پادری فنڈر نے کہا کہ ''ان دونوں مفسرین کی عبارتیں جو آپ نے پیش کی ہیں، ہمارے دعویٰ کے منافی نہیں ہیں، کیونکہ ان دونوں نے یہ نہیں کہا کہ:

''میری باتیں ان حوادث کے بارے میں نہیں ٹلیں گی اور دوسروں کی ٹل جائیں گی۔''

اس پر ڈاکٹر وزیر خان نے کہا کہ:

''آیت مذکورہ کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ ان دونوں مفسروں نے لکھا ہے۔''

پادری فنڈر نے پھر کہا کہ

''نہیں، سیدنا مسیح علیہ السلام کا قول عام ہے۔''

ڈاکٹر وزیر خان نے کہا کہ:

''ہم نے اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لیے دو گواہ (دو عیسائی مفسرین) پیش کیے اور تم عمومیت کے دعویٰ پر بغیر کسی گواہ کے

Marfat.com

اصرار کر رہے ہو۔"

یہ سن کر پادری فنڈر خاموش ہو گیا اور اس بات کا کوئی جواب نہ دیا، بلکہ کہا:

"پطرس نے اپنے خط کے باب اول آیت 23 میں کہا ہے (کیونکہ تم فانی تخم سے نہیں بلکہ غیر فانی سے، خدا کے کلام کے وسیلے سے جو زندہ اور قائم ہے) اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہمیشہ باقی رہتا ہے، کبھی منسوخ نہیں ہوتا۔"

اس پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

"کتاب یسعیاہ باب 40 آیت 8 میں بھی یہی کچھ کہا گیا ہے جو پطرس کے کلام میں ہے اور آپ نے اُسے میزان الحق جلد ا ص ۸۹، طبع ثانی میں پطرس کے کلام کے ساتھ نقل بھی کیا ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ

"گھاس مرجھا جاتی ہے، پھول کملا جاتا ہے پر ہمارے خدا کا کلام ابد تک قائم ہے۔"

لہٰذا اگر "کلام کے زندہ اور قائم" ہونے سے اس کا کبھی منسوخ نہ ہونا لازم آتا ہے تو آپ کو تورات کے بارے میں بھی یہ کہنا چاہیے کہ وہ منسوخ نہیں ہو سکتی حالانکہ اس کے سینکڑوں احکام کو آپ خود منسوخ کہتے ہیں۔

پھر حضرت مولانا کیرانویؒ نے تورات میں سے نسخ کی مثالیں پادری فنڈر کو دیں کہ آدم علیہ السلام کے عہد میں بھائی بہنوں کے درمیان شادیاں ہوئیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سیدہ سارہؓ بھی ان کی علاتی بہن (باپ شریک) تھیں جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس قول سے جو پیدائش باب 20 آیت 12 میں درج ہے، سمجھ میں آتا ہے کہ

"اور فی الحقیقت وہ میری بہن بھی ہے کیونکہ وہ میرے باپ کی بیٹی ہے، اگرچہ میری ماں کی بیٹی نہیں۔ پھر وہ میری بیوی ہوئی۔"

حالانکہ بہن سے نکاح کرنا خواہ وہ سگی بہن ہو یا باپ شریک ہو یا صرف ماں

Marfat.com

شریک ہو، مطلقاً حرام ہے اور زنا کے برابر ہے، اور نکاح کرنے والا ملعون ہے اور ایسے میاں بیوی کو قتل کر دینا واجب ہے۔ چنانچہ کتاب احبار باب 18 آیت 9 میں کہا گیا ہے کہ

''تو اپنی بہن کے بدن کو چاہے وہ تیرے باپ کی بیٹی ہو چاہے تیری ماں کی اور خواہ وہ گھر میں بیٹھی ہوئی ہو خواہ کہیں اور، بے پردہ نہ کرنا۔''

ڈی آئلی اور رچرڈ منٹ کی تفسیر میں اس آیت کی شرح کے ذیل میں یوں لکھا ہے کہ

''اس قسم کا نکاح زنا کے برابر ہے۔''

نیز کتاب احبار ہی کے باب 20 آیت 17 میں کہا گیا ہے کہ:

''اور اگر کوئی مرد اپنی بہن کو جو اس کے باپ کی یا اس کی ماں کی بیٹی ہو، لے کر اس کا بدن دیکھے تو یہ شرم کی بات ہے۔ وہ دونوں اپنی قوم کے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے قتل کیے جائیں۔ اس نے اپنی بہن کے بدن کو بے پردہ کیا، اس کا گناہ اسی کے سر لگے گا۔''

نیز استثناء باب 27 آیت 22 میں کہا گیا ہے کہ:

''لعنت اس پر جو اپنی بہن سے مباشرت کرے خواہ وہ اس کے باپ کی بیٹی ہو خواہ ماں کی..........، اور سب لوگ کہیں آمین۔''

اب اگر آدم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کی شریعتوں میں اس قسم کے نکاح کو جائز نہ مانا جائے تو تمام انسانوں کا زنا کی اولاد ہونا اور شادی کرنے والوں کا ذاتی ہونا اور واجب القتل ہونا اور ملعون ہونا لازم آتا ہے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کی شان میں ان باتوں کا کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس سے لامحالہ یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ایسا نکاح دونوں کی شریعت میں جائز تھا پھر منسوخ ہو گیا۔(۱)

۱۔ نسخ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ نسخ کہ جو کسی نئے نبی کی شریعت میں کسی پہلے نبی کی شریعت کے حکم کی نسبت ہو۔ اور دوسرا وہ نسخ جو خود اس نبی کی شریعت کے کسی سابقہ حکم کی نسبت جاری ہو۔ ان دونوں نسخ کی مثالیں عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید دونوں میں بے شمار ہیں۔ یہ مثال پہلی قسم کے نسخ کی ہے۔

Marfat.com

دوسری مثال یہ دی کہ کتاب پیدائش باب 9 آیت 3 میں اللہ تعالیٰ کا قول سیدنا نوح علیہ السلام اور ان کی اولاد کو خطاب کرتے ہوئے اس طرح مرقوم ہے کہ:

''ہر چلتا پھرتا جاندار تمہارے کھانے کو ہوگا۔ ہر سبزی ترکاری کی طرح میں نے سب کا سب تم کو دے دیا۔''

معلوم ہوا کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی شریعت میں سبزیوں اور ترکاریوں کی طرح تمام حیوانات بھی حلال تھے، حالانکہ شریعت موسویہ میں بہت سے جانور جن میں خنزیر بھی ہے، حرام کر دیئے گئے۔'' جس کی تصریح کتاب الاحبار باب 11 آیت 7، استثناء باب 14 آیت 7 میں موجود ہے۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے فنڈر کو مزید مثالیں دیں ان میں سے ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا۔ ''پادری صاحب! بہت سے حیوانات کا استعمال شریعت موسوی میں حرام تھا، لیکن شریعت عیسوی میں ان کی حرمت منسوخ کر دی گئی۔ اور پولوس کے فتویٰ کے مطابق تو عام اباحت ثابت ہوگئی۔ چنانچہ رومیوں کے نام پولوس کے خط کے باب 14 آیت 14 میں کہا گیا ہے کہ

''مجھے معلوم ہے بلکہ خداوند یسوع مسیح میں مجھے یقین ہے کہ کوئی چیز بذاتہٖ حرام نہیں، لیکن جو اُسے حرام سمجھتا ہے اس کے لیے حرام ہے۔''

نیز طِطس کے نام خط باب 1 آیت 15 میں ہے کہ:

''پاک لوگوں کے لیے سب چیزیں پاک ہیں، مگر گناہ آلودہ اور بے ایمان لوگوں کے لیے کچھ بھی پاک نہیں بلکہ ان کی عقل اور دل دونوں گناہ آلود ہیں۔''[1]

حضرت مولانا کیرانویؒ نے پادری فنڈر کو مخاطب کر کے فرمایا ''پادری

1۔ یہ دونوں اصول بھی عجیب وغریب ہیں کہ کسی شی کو ناپاک سمجھنے والے ہی کے لیے وہ چیز ناپاک ہو۔ اور یہ کہ پاک لوگوں کے لیے ہر چیز پاک ہے۔ شاید غریب بنی اسرائیل پاک نہیں تھے۔ اسی لیے ان کی قسمت میں عام اباحت نہیں ہوئی اور عیسائی سب کے سب پاک تھے، اس لیے ان کو اباحت کی نعمت عطا فرمائی گئی کہ ہر شے ان کے لیے پاک کر دی گئی۔

صاحب! تورات کے تو سارے احکام ہی منسوخ ہیں، کیونکہ حواریوں نے کامل مشورہ کے بعد تورات کے جملہ عملی احکام منسوخ کر دیئے ماسوائے چار احکام کے یعنی بت کا ذبیحہ، خون، گلہ گھونٹا ہوا جانور اور زنا۔ ان چاروں کی حرمت باقی رکھی۔ اس سلسلہ میں تمام گرجوں کو ہدایات دے دی گئیں جو کتاب اعمال کے باب 15 میں منقول ہیں۔ اور اس کی بعض آیات یہ ہیں:

''روح القدس نے اور ہم نے مناسب جانا کہ ان ضروری باتوں کے سوا تم پر اور بوجھ نہ ڈالیں کہ تم بتوں کی قربانیوں کے گوشت سے اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ اگر تم ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھو گے تو سلامت رہو گے۔ والسلام (کتاب اعمال: باب ۱۵ آیت ۲۸۔۲۹)

ان چار چیزوں کی حرمت بھی صرف اس لیے باقی رکھی گئی کہ وہ نو مرید یہودی جو ابھی ابھی عیسائی ہوئے تھے، بالکل متنفر نہ ہو جائیں جو تورات کے احکام اور اس کے طریقوں کو اب بھی محبوب جانتے تھے۔ پھر جب کچھ عرصہ کے بعد پولوس نے یہ اطمینان کر لیا کہ اب یہ رعایت ضروری نہیں ہے تو پہلے تین احکام کو بھی اسی عام اباحت کے فتویٰ کے ذریعہ منسوخ کر دیا اور اب تورات کے عملی احکام میں سے زنا کی حرمت کے علاوہ کوئی اور حکم باقی نہیں رہا۔ اور چونکہ شریعت عیسوی میں زنا کے لیے کوئی شرعی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے اس لیے عملاً یہ حکم بھی منسوخ ہی ہو گیا۔ نتیجتاً شریعت عیسوی کے ذریعہ ان تمام عملی احکام کا نسخ مکمل ہو گیا، جو شریعت میں چلے آ رہے تھے خواہ وہ ابدی اور دوامی ہوں یا غیر ابدی۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے فنڈر کو ختنہ اور سبت کی مثالیں بھی دیں۔ جن کا پادری فنڈر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ حضرت مولانا مرحوم کے دلائل سے لاجواب ہو کر پادری فنڈر نے مولاناؒ سے کہا:

''یہ درست ہے کہ تورات منسوخ ہے لیکن ہماری بحث تورات کے بارے میں نہیں ہے بلکہ انجیل کے بارے میں ہے۔'' (یہ بات

Marfat.com

بھی دراصل پادری فنڈر نے اپنے مسلک کے خلاف کہی تھی، یہاں تو اس نے تورات کے نسخ کا اعتراف کرلیا، لیکن اپنی کتاب میزان الحق کی باب اول کی دوسری فصل میں صاف لکھا ہے کہ

''تورات اور انجیل کبھی بھی منسوخ نہیں ہوئیں۔''

حضرت مولانا کیرانویؒ نے پادری فنڈر کو جواب دیا کہ:

''پادری صاحب! پطرس کے جس کلام سے آپ انجیل کے منسوخ نہ ہونے کا یقین کرتے ہیں بعینہ اسی قسم کا جملہ تورات کی کتاب یسعیاہ میں بھی مذکور ہے لیکن آپ تورات کے منسوخ ہونے کا اعتراف کررہے ہیں۔

پادری فنڈر! میں نے پطرس کا قول سند کے طور پر نقل کیا ہے اور ہماری دلیل مسیحؑ کا قول ہے

اس پر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''یہ قول مذکورہ خبر کے بارے میں ہے، اور حالت یہ ہے کہ تورات کے احکام کا نسخ آپ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پھر انجیل کا نسخ تسلیم کرنے میں آپ کو کیوں ہچکچاہٹ ہے؟''

پادری فنڈر نے جواب دیا کہ:

''ہماری بات تورات کے بارے میں نہیں ہے۔''

اس پر ڈاکٹر محمد وزیر خان نے فرمایا:

''آپ کی بحث تورات کے بارے میں کیوں نہیں جبکہ ہمارے نزدیک تورات اور انجیل دونوں برابر ہیں، اور آپ نے خود بھی اپنی کتاب میزان الحق باب اول فصل ثانی میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ انجیل اور عہد عتیق کی تمام کتابوں میں نسخ نہیں ہے۔'' (ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مقصد یہ تھا کہ جس دلیل سے آپ انجیل کا غیر نسخ ثابت کررہے ہیں اسی دلیل سے آپ تورات کے

Marfat.com

احکام کے نسخ کا اعتراف کر رہے ہیں۔ یہ کیا تماشا ہے؟)

پادری فنڈر نے جواب دیا کہ:

''یہ درست ہے کہ میں نے اپنی کتاب میں ایسا ہی لکھا ہے، لیکن میری اس وقت اپنے فاضل دوست سے صرف انجیل کے بارے میں بحث ہے۔''

ڈاکٹر وزیر خان نے مولانا کیرانویؒ کے جواب کو پھر دہرایا کہ:

''حواریوں نے اپنے زمانے میں بتوں کی قربانی، خون، گلا گھونٹے ہوئے جانور اور زنا کے سوا تمام چیزوں کو حلال کر دیا تھا (مطلب یہ کہ تورات کے تمام احکام کو منسوخ کر دیا تھا سوائے چار احکام کے) ان میں اب صرف زنا حرام رہ گیا ہے باقی تین چیزیں بھی حلال ہوگئی ہیں، اسی طرح انجیل میں بھی نسخ واقع ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمد وزیر خان کے جواب سے پادری فنڈر سٹپٹایا اور کہا کہ:

''ان اشیاء کی حرمت میں ہمارے علماء کا اختلاف ہے۔ بعض ان کو منسوخ سمجھتے ہیں اور بعض منسوخ نہیں سمجھتے۔ اور ہم بتوں کی قربانی کو اب تک حرام سمجھتے ہیں۔''

اس پر مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ

''آپ کے مقدس پولوس نے رومیوں کے نام خط کے باب 14 اور آیت 14 اور طِطس کے نام خط باب اول آیت 15 کی عبارتیں پیش کر کے فرمایا کہ

''ان دونوں عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشیاء بھی حلال ہیں۔ بلکہ یہ دونوں آیات ان کے حلال ہونے میں نص صریح ہیں، لہٰذا ان کی حلیت کے مختلف فیہ ہونے کا کیا مطلب؟ اور پادری صاحب! آپ بتوں کی قربانی کو کیسے حرام قرار دیتے ہیں (جبکہ یہ دونوں آیات اُسے حلال قرار دے رہی ہیں)

Marfat.com

مولانا مرحوم کے منہ سے یہ جواب سن کر پادری فنڈر سخت حیران ہوا اور کہنے لگا:

''ان آیات کے پیش نظر ہمارے بعض علماء نے ان چیزوں کی حلیت پر فتویٰ دیا ہے۔''

(یہ بات بھی پادری فنڈر نے بالکل غلط کہی تھی کہ ہمارے بعض علماء نے ان چیزوں کی حلیت پر فتویٰ دیا ہے جبکہ یہ جمہور علمائے پروٹسٹنٹ کا مذہب ہے جیسا کہ خود پادری فنڈر نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اس مناظرہ کی مطبوعہ کاروائی ص ٦)

اس پر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو فرمایا تھا کہ:

''ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور اُن کو حکم دے کر کہا غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔''

(متی باب ١٠ آیت ٦٥)

انجیل متی کے باب 15 آیت 24 میں مسیح علیہ السلام کا قول خود اپنے حق میں اس طرح لکھا ہے کہ:

''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اپنے رسولوں کو صرف بنی اسرائیل کی طرف بھیجا کرتے تھے، لیکن انجیل مرقس باب 16 آیت 15 میں سیدنا مسیح علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ

''تم تمام دنیا میں جا کر ساری خلق کے سامنے انجیل کی منادی کرو۔''

پادری فنڈر نے مولانا کیرانویؒ کی اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ:

''مسیحؑ نے خود پہلے حکم کو منسوخ کیا ہے۔''

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

Marfat.com

''اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ سیدنا مسیحؑ کے کلام میں نسخ جائز ہے اور انہوں نے خود اپنے کلام کو منسوخ کیا ہے۔ جب نسخ پر ان کی قدرت ثابت ہو گئی تو ان کے باپ یعنی اللہ تعالیٰ کو تو ان سے زیادہ قدرت حاصل ہے کیونکہ مسیح علیہ السلام کے اپنے اعتراف کے مطابق وہ (باپ) بیٹے یعنی سیدنا مسیح علیہ السلام سے بڑا ہے۔

چنانچہ یوحنا باب 14 آیت 28 میں سیدنا مسیح علیہ السلام کا قول ہے کہ:

''اہل اسلام یہ کہتے ہیں کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کا باپ جو ان کی اپنی شہادت کے مطابق ان سے بڑا ہے، اس نے انجیل کے احکام کو قرآن حکیم سے منسوخ کر دیا۔ ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انجیل کے احکام کو منسوخ کیا، لہٰذا اس بات میں کوئی بعد نہیں ہے، اور آپ کا یہ استدلال کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کا یہ فرمان کہ:

''آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں ہرگز نہ ٹلیں گی۔''

قطعی طور پر باطل ہے اور اس کا وہی معنی صحیح ہے جو عیسائی مفسرین ڈی آئلی اور رچرڈ منٹ وغیرہ نے کیا ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا

''پادری صاحب! آپ کے پولوس نے تو اپنے خطوط میں شریعت موسوی کا جو حشر کیا ہے وہ آپ کو بھی معلوم ہے اور مجھ کو بھی اس کا پتہ ہے۔ بہر حال میں حاضرین کی خاطر آپ کو پھر یاد دلاتا ہوں کہ گلتیون کے نام خط باب 2 آیت 20 میں پولوس کہتا ہے کہ

''میں مسیح کے ساتھ مصلوب ہوا ہوں اور اب میں زندہ نہ رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے، اور میں جو اب جسم میں زندگی گزارتا ہوں تو خدا کے بیٹے پر ایمان لانے سے گزارتا ہوں جس نے مجھ سے محبت رکھی ہے اور اپنے آپ کو میرے لیے موت کے حوالے کر دیا۔ میں خدا کے فضل کو بیکار نہیں کرتا کیونکہ راستبازی اگر شریعت

(شریعت موسوی) کے وسیلہ سے ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا۔''

ڈاکٹر ہمنڈ آیت 20 کی شرح میں کہتا ہے کہ:

''میرے لیے اپنی جان دے کر مجھے موسیٰ کی شریعت سے رہائی بخشی۔''

اور آیت 21 کی شرح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

''اس نے اس آزادی کو اسی لیے اختیار کیا اور مجھ کو نجات کے معاملہ میں موسیٰ کی شریعت پر کوئی اعتماد نہیں ہے، اور میں موسیٰ کے احکام کو ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ یہ چیز ہماری انجیل کو بے فائدہ بنانے والی ہے۔''

ڈاکٹر وٹ بی آیت 21 کی شرح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

''اور اگر ایسا ہوتا تو نجات کو موت کے ذریعہ خریدنا ضروری نہ ہوتا اور نہ ایسی موت میں کوئی خوبی ہوسکتی ہے۔''

اور یایل کہتا ہے کہ:

''اگر یہودیوں کی شریعت اور ہماری نجات اور عصمت کا ذریعہ ہوتی تو پھر عیسیٰ کو جان دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اگر یہ شریعت ہماری نجات کا عوض ہے تو پھر مسیح کی موت اس کے لیے کافی نہ ہوگی۔

یہ تمام اقوال اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ موسیٰؑ کی شریعت مکمل طور پر منسوخ ہو چکی ہے۔

پھر اسی خط کے باب 3 آیت 10-13 میں کہا گیا ہے کہ

''جتنے شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ شریعت کے وسیلہ سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راست باز نہیں ٹھہرتا۔ مسیح جو ہمارے لیے لعنتی بنا اُس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔''

لارڈ اپنی تفسیر کی جلد 9 صفحہ 487 میں ان آیات کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے

Marfat.com

''خیال یہ ہے کہ اس موقع پر حواری کا مقصد یہی ہے جس کو اکثر لوگ سمجھے ہیں یعنی شریعت منسوخ ہو چکی ہے۔ یا کم از کم مسیح کی موت اور ان کے سولی پانے کی وجہ سے بیکار ہو گئی ہے۔''

اس سے چند سطر آگے کہتا ہے کہ:

''حواری نے اس موقع پر صاف واضح کر دیا ہے کہ عیسیٰ کی موت کا نتیجہ شریعت کے مقررہ احکام کی منسوخی ہے۔''

پھر اسی خط کے باب 3 آیت 23-25 میں پولوس کہتا ہے کہ

''ایمان کے آنے سے پیشتر شریعت کی ماتحتی میں ہماری نگہبانی ہوتی تھی اور اس ایمان کے آنے تک جو ظاہر ہونے والا تھا ہم اس کے پابند رہے۔ پس شریعت مسیح تک پہنچانے میں ہمارا استاد بنی تاکہ ہم ایمان کے سبب سے راست باز ٹھہریں۔ مگر جب ایمان آ چکا تو ہم استاد کے ماتحت نہ رہے۔'' (۲۳۔۲۵)

اس میں مقدس پولوس صاف کہہ رہا ہے کہ سیدنا عیسیٰؑ پر ایمان لانے کے بعد اب توریت کے احکام کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔ ڈی آئلی اور رچرڈ منٹ کی تفسیر میں دین اسٹائن ہوپ کا قول یوں نقل کیا گیا ہے کہ:

''شریعت کے طریقے، عیسیٰ کی موت اور انجیل کے شائع ہونے پر منسوخ ہو گئے۔''

عبرانیوں کے نام خط میں ہے کہ:

''اور جب کہانت بدل گئی تو شریعت کا بھی بدلنا ضروری ہے۔''

اس آیت میں امامت کے تبدل اور شریعت کے تبدل میں لزوم ثابت کیا گیا ہے۔ اس تلازم کے پیش نظر اگر مسلمان بھی شریعت عیسوی کو منسوخ مانیں تو ان کی بات درست ہوگی نہ کہ غلط۔

پھر اسی باب کی آیت 18 میں یوں کہا گیا ہے کہ

''غرض پہلا حکم کمزور اور بے فائدہ ہونے کے سبب سے منسوخ ہو گیا۔''

اس آیت میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ تورات کے احکام کی منسوخی کا سبب یہ ہے کہ وہ کمزور اور بے فائدہ ہو گئے تھے۔

پھر اس خط کے باب 8 آیت 7 میں پولوس کہتا ہے کہ:

''کیونکہ اگر پہلا عہد بے نقص ہوتا تو دوسرے کے لیے موقع نہ ڈھونڈا جاتا۔''

پھر آیت 13 میں لکھتا ہے کہ:

''جب اس نے نیا عہد کیا تو پہلے کو پرانا ٹھہرایا۔ اور جو چیز پرانی اور مدت کی ہو جاتی ہے وہ مٹنے کے قریب ہوتی ہے۔''

اس قول میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ تورات کے احکام عیب دار اور فرسودہ ہونے کی وجہ سے منسوخ ہونے کے لائق ہیں۔

ڈی آئلی اور رچرڈ منٹ کی تفسیر میں آیت 13 کی شرح کے ذیل میں پایل کا قول یوں نقل کیا گیا ہے کہ:

''یہ بات خوب اچھی طرح صاف اور واضح ہے کہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ پرانے اور ناقص کو جدید اور عمدہ پیغام کے ذریعہ منسوخ کر دے۔ اس لیے یہودی مذہب کو منسوخ کرتا ہے اور عیسوی مذہب کو اس کے قائم مقام بناتا ہے۔''

یہ عبارات پیش کرنے کے بعد حضرت مولانا کیرانویؒ نے پادری فنڈر سے کہا کہ:

''پادری صاحب! آپ کا مقدس پولوس تورات کو عیب دار، عدیم النفع، بے فائدہ اور فاسد وغیرہ کہتا ہے۔ پادری فنڈر یہ سن کر خاموش ہو گیا اور اس نے مولانا کیرانویؒ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

مولانا کیرانویؒ نے پھر فرمایا:

''پادری صاحب! آپ نے یہ جو چند صفحات اپنی کتاب میزان الحق میں امتناع النسخ کو ثابت کرنے کے لیے لکھے ہیں، ان کو کتاب سے نکال پھینکنا چاہیے کیونکہ

ان کو مسلمانوں کے اصطلاحی معنی (یعنی نسخ) کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔

اس پر پادری فرنچ نے کہا کہ:

''ہم نے مناظرہ صغریٰ (یہ مناظرہ ربیع الاول 1270ھ مطابق 1854ء میں پادری فرنچ کے گھر میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور پادری کئی کے درمیان ہوا تھا۔ اور یہی مناظرہ دراصل اس بڑے مناظرہ کا سبب بنا جو کہ اس کے تین ماہ بعد آگرہ میں منعقد ہوا) میں کہا تھا کہ تورات کے وہ احکام یقیناً منسوخ ہو گئے ہیں جو مسیحؑ کے ساتھ تعلق رکھتے تھے اور ان کا منسوخ ہونا مناسب اور ضروری بھی تھا کیونکہ مسیحؑ ان مسائل کی تکمیل کے لیے آیا تھا۔ البتہ وہ بشارات اور پیش گوئیاں جو تورات میں مسیحؑ کے بارے میں ہیں وہ منسوخ نہیں ہیں۔'' پھر پادری فرنچ نے بائبل پکڑ کر عبرانیوں کے نام خط باب 10 آیات 1-6 پڑھنی شروع کیں..........

یہ آیات پڑھ کر اس نے کہا کہ تورات اور دوسری کتابوں کا اس بات سے مسیحؑ کی طرف اشارہ ہے اور یہ باتیں مسیح کے آنے سے مکمل ہوئیں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ قربانیوں سے راضی نہیں تھا۔ اور انجیل میں اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ انجیل اس کے آنے سے منسوخ ہو گئی۔''

اس پر ڈاکٹر محمد وزیر خان نے کہا کہ

''اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ سیدنا مسیحؑ کے آنے سے تورات کے احکام مکمل ہوئے، تو پھر ان احکام کے نسخ کا اقرار بھی ضروری ہے جو مسیح علیہ السلام کی تشریف آوری سے قبل منسوخ ہو گئے تھے۔

پادری فرنچ نے کہا کہ:

''وہ کون سا حکم ہے؟''

ڈاکٹر محمد وزیر خان نے جواب دیا کہ:

''ذبح کا حکم'' مثال کے طور پر کتاب احبار باب 17 آیت میں ہے کہ:

Marfat.com

''اسرائیل کے گھرانے کا جو کوئی شخص بیل یا برّہ یا بکرے کو خواہ لشکر گاہ میں یا لشکر گاہ کے باہر ذبح کرے اُسے خیمۂ اجتماع[1] کے دروازہ پر خداوند کے مسکن کے آگے خداوند کے حضور چڑھانے کو نہ لے جائے، اس شخص پر خون کا الزام ہوگا کہ اُس نے خون کیا ہے، اور وہ شخص اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے۔'' (احبار: باب ۱۷ آیت ۳-۴)

اس کے برخلاف کتاب استثناء باب 12 آیت 15 میں ہے کہ:

''پر گوشت کو تو اپنے سب پھاٹکوں کے اندر اپنے دل کی رغبت اور خداوند اپنے خدا کی دی ہوئی برکت کے موافق ذبح کر کے کھا سکے گا۔''

آگے آیت 20 سے 23 میں ہے کہ:

''جب خداوند تیرا خدا اس وعدہ کے مطابق جو اُس نے تجھ سے کیا ہے، تیری سرحد کو بڑھائے اور تیرا جی گوشت کھانے کو کرے اور تو کہنے لگے کہ میں تو گوشت کھاؤں گا تو جیسا تیرا جی چاہے گوشت کھا سکتا ہے۔ اور اگر وہ جگہ جسے خداوند نے اپنے نام کو وہاں قائم کرنے کے لیے چنا ہو تیرے مکان سے بہت دور ہو تو اپنے گائے بیل اور بھیڑ بکری میں سے جن کو خداوند نے تجھ کو دیا ہے، کسی کو ذبح کر لینا اور جیسا میں نے تجھ کو حکم دیا ہے تو اس کے گوشت کو اپنے دل کی رغبت کے مطابق اپنے پھاٹکوں کے اندر کھانا جیسے چکارے اور ہرن کو کھاتے ہیں، ویسے ہی تو اُسے کھانا۔ پاک اور ناپاک دونوں طرح کے آدمی اُسے یکساں کھا سکیں گے۔''

اس میں کتاب احبار کے حکم کو سفرِ استثناء کے حکم سے منسوخ کر دیا گیا۔ ہورن

۱۔ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو خانہ بدوشی کی زندگی میں خدا کی طرف سے ایک خیمہ بنانے کا حکم دیا گیا تھا جو ایک گشتی (Mobile) عبادت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس وقت اُسے وہی اہمیت حاصل تھی جو بعد میں بیت المقدس کو ہوئی۔ اسی خیمہ کو بنانے اور قائم کرنے کے تفصیلی احکام کے لیے ملاحظہ ہو خروج: باب ۳۵، ۴۰، ۱۲ وغیرہ۔

Marfat.com

اپنی تفسیر کی جلد 1 ص 619 میں ان آیات کو نقل کرنے کے بعد یوں کہتا ہے کہ:

''بظاہر ان دونوں مقامات میں تعارض ہے، مگر جب یہ دیکھا جائے کہ شریعت موسویہ میں بنی اسرائیل کے حالات کے مطابق کمی بیشی ہوتی رہتی تھی اور وہ ایسی شریعت نہیں تھی کہ جس میں تبدیلی ممکن نہ ہو تو پھر یہ بہت آسان ہے۔''

پھر کہتا ہے کہ:

''موسیٰ ؑ نے ہجرت کے چالیسویں سال فلسطین کے داخلہ سے پہلے اس حکم کو سفر استثناء کے حکم سے صاف اور صریح طور پر منسوخ کر کے یہ حکم دیا تھا کہ فلسطین میں داخل ہونے کے بعد ان کے لیے جائز ہوگا کہ جس جگہ چاہیں گائے بکری ذبح کریں اور کھائیں۔''

یہ مفسر نسخ کا صاف اعتراف کرتا ہے اور اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ شریعت موسویہ میں بنی اسرائیل کے حالات کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔

پادری فرنچ نے جب ڈاکٹر وزیر خان کی یہ عبارت سنی تو خاموش ہو گیا۔

ڈاکٹر محمد وزیر خان نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ:

''اس وقت ہماری اس بحث کا مقصد صرف امکان نسخ کو ثابت کرنا ہے کہ کلام اللہ کا نسخ محال نہیں ہے۔ پس اس کا امکان ثابت ہو گیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے بعد انجیل میں اس کا بالفعل نسخ بھی ثابت کیا جائے گا۔ اور امکان نسخ اور وقوع نسخ بالفعل میں بہت فرق ہے۔

اس پر پادری فنڈر نے کہا کہ ''ہم بھی امکان نسخ اور وقوع نسخ بالفعل میں فرق کرتے ہیں۔'' ان دونوں کو ایک نہیں سمجھتے۔''

مدون مناظرہ استاد عبداللہ اکبر آبادی فرماتے ہیں: نسخ کی بحث تو یہیں ختم ہو گئی اب اس کے بعد تحریف بائبل کی بحث شروع ہوئی۔

Marfat.com

تحریف بائیبل پر مناظرہ

گذشتہ صفحات میں نسخ پر جو کچھ بحث ہوئی، وہ ساری بحث مناظرہ کے پہلے روز ہوئی جس میں آخر کار پادری فنڈر نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے کلام سے نسخ کی مثالوں کو تسلیم کرلیا، اور یہ تسلیم کیا کہ انجیل کے احکام کا منسوخ ہونا ممکن ہے البتہ نسخ کے وقوع کو تسلیم نہ کیا۔ اس پر حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ فی الحال ہم آپ سے یہی چاہتے ہیں کہ آپ نسخ کے امکان کو تسلیم کرلیں، رہا اس کا وقوع تو اس کا اثبات ہم بعد میں کریں گے۔

پادری فنڈر نے کہا کہ اب دوسرے مسئلہ یعنی تحریف بائیبل کو لے لیجئے۔ چنانچہ اب نسخ کو چھوڑ کر تحریف کی بحث شروع ہوئی۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے سب سے پہلے فنڈر سے پوچھا کہ میں کون سی قسم کے شواہد آپ کے سامنے پیش کروں کہ آپ اُسے تسلیم کرسکیں؟''

پادری فنڈر نے مولانا مرحوم کے اس واضح سوال کا واضح جواب نہ دیا۔

اب حضرت مولانا کیرانویؒ نے اپنے اس سوال کو دوسرے انداز میں پوچھا:

''پادری صاحب! یہ بتایئے کہ بائیبل کے عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں کے بارے میں آپ کا کیا اعتقاد ہے؟ کیا کتاب پیدائش سے لے کر کتاب مکاشفہ (کتاب المشاہدات) تک ان کا ہر فقرہ اور ہر لفظ الہامی اور اللہ کا کلام ہے؟''

پادری فنڈر نے کہا کہ:

''ہم ہر لفظ کے بارے میں کچھ نہیں کہتے، کیونکہ ہمیں بعض

Marfat.com

مقامات پر کاتب کی غلطی کا اعتراف ہے۔''

حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''میں اس وقت کاتب کی غلطیوں سے صرف نظر کر کے ان کے علاوہ دوسرے فقرات، جملوں اور الفاظ کے بارے میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں؟''

پادری فنڈر مولانا کیرانویؒ کے سوال پر کھسیانا ہو کر کہنے لگا کہ

''میں بائبل کے ایک ایک لفظ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

اس پر حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''مؤرخ یوسی بیس نے اپنی تاریخ کی جلد چہارم کے اٹھارہویں باب میں لکھا ہے کہ جسٹن شہید نے طریفون یہودی کے مقابلہ میں بعض بشارتوں کی عبارتیں نقل کر کے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہودیوں نے بائبل کے عہد نامۂ قدیم سے یہ بشارتیں ساقط کر دی تھیں۔ (۱)

واٹسن نے بھی جلد سوم صفحہ 32 پر لکھا ہے کہ:

''مجھے اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں کہ جسٹن نے طریفون یہودی کے مقابلہ میں بعض عبارتوں کے بارے میں جو کہا تھا کہ یہودیوں نے ان کو ساقط کر دیا ہے، یہ بالکل درست ہے، کیونکہ

۱۔ جسٹن کی ان بشارات سے مراد مسیح کے بارے میں بشارات تھیں لیکن فی الواقع وہ جناب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بشارات تھیں، اور یہود نے ان میں کچھ اس طرح سے تحریف کر دی تھیں کہ وہ بنی اسماعیل کے نبی پر دلالت نہ کر سکیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے حسد کی بنا پر کیا تھا۔ عیسائیوں نے ان بشارات کو سیدنا مسیح علیہ السلام پر چسپاں کر دیا تا کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے فرار کیا جا سکے۔ ہم جسٹن سے اس بات پر تو اتفاق کرتے ہیں کہ یہود نے ان میں تحریف کر دی تھی لیکن اس بات سے مطلق اتفاق نہیں کرتے کہ وہ بشارتیں سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہیں۔ (ملاحظہ ہو الجواب الصحیح: جلد ا ص ۱۸۴، اظہار الحق: ۲۶۴ وغیرہ)

جسٹن اور ارینیوس کے زمانہ میں عبرانی نسخہ اور اس کے ترجمہ سبعینیہ
اور کتاب مقدس کے بعض اجزاء میں یہ عبارتیں موجود تھیں، لیکن
آج یہ عبارات ان نسخوں میں نہیں ملتیں۔

اسی طرح ہوران نے بھی جلد 4 صفحہ 62 پر جسٹن کے دعویٰ کی تصدیق کی ہے۔اس کے علاوہ آئرینوس، کریب، سپلر جیس، وائی ٹیکر اور کلارک وغیرہ نے بھی جسٹن کی تصدیق کی ہے۔اس کے بعد حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''چونکہ اتنے لوگ جسٹن کے دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں لہٰذا ظن غالب یہ ہے کہ یہ عبارات نسخۂ عبرانیہ اور ترجمہ سبعینیہ میں موجود تھیں۔اب اس سے دو باتیں لازم آتی ہیں

جسٹن نے جو عبارتیں ذکر کی ہیں اور ان کے کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ کر کے یہودیوں پر انہیں ساقط کرنے کا الزام لگایا ہے، اس میں یا تو وہ سچا ہے یا جھوٹا، اگر وہ اس دعویٰ میں سچا ہے تو جو ہم کہتے ہیں وہ ثابت ہو گیا یعنی بائبل میں یہود کی تحریف ثابت ہو گئی۔

اور اگر وہ جھوٹا ہے تو نہایت افسوس کی بات ہے کہ جسٹن جو آپ کا اتنا بڑا عالم ہے وہ جھوٹا تھا اور اتنا بڑا جھوٹا تھا کہ اُس نے اپنی طرف سے چند جملے گھڑ کر انہیں خدا کا کلام ثابت کرنے کی جسارت کی ہے۔

اس پر پادری فنڈر نے کہا کہ جسٹن ایک انسان تھا اس سے اس معاملہ میں بھول ہو گئی۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''ہنری واسکاٹ کی تفسیر جلد اول میں لکھا ہے کہ آگسٹائن کہا کرتا تھا کہ یہودیوں نے اکابر کی عمروں میں تحریف کی ہے۔[1] اکابر

۱۔ اس کی مثال یہ ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر طوفانِ نوح تک زمانہ عبرانی نسخہ کے مطابق 1656 سال ہے۔ یونانی نسخہ کے مطابق 2362 سال بنتا ہے اور سامری نسخہ کے مطابق 1307 سال ہے۔ ان نسخوں میں مذکورہ مدت کے بیان میں بے شمار فرق موجود ہے۔اور اتنا شدید

کے حالات کے بیان میں جو طوفان نوح سے قبل گزرے تھے یا اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے عہد تک ہوئے ہیں، عبرانی نسخہ میں یہودیوں نے تحریف کر ڈالی۔ اور یہ حرکت اس لیے کی کہ یونانی نسخہ کا اعتبار جاتا رہے اور اس لیے بھی کہ مذہب عیسوی سے ان کو سخت دشمنی تھی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین عیسائی علماء بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ یہودیوں نے یہ تحریف تورات میں 130ء میں کی ہے۔"

فنڈر نے جواب دیا کہ:

"ہنری و اسکاٹ کے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ دونوں حضرات بائبل کے مفسر تھے۔ ان دونوں کے علاوہ بائبل کے سینکڑوں مفسر ہیں۔

﴿حاشیہ صفحہ گذشتہ﴾ اختلاف ہے کہ اس میں تطبیق ممکن نہیں ہے۔ اور چونکہ تینوں نسخوں کے مطابق نوح علیہ السلام کی عمر طوفان کے وقت 600 سال کی متعین ہے۔ اور آدم علیہ السلام کی عمر 930 سال کی ہوئی، اس لیے سامری نسخہ کے مطابق لازم آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی وفات کے وقت سیدنا نوح علیہ السلام کی عمر 213 سال کی تھی، اور یہ بات باتفاق مؤرخین غلط ہے۔ اور عبرانی اور یونانی نسخے بھی اس کی تکذیب کرتے ہیں، کیونکہ پہلے نسخہ کے بیان کے مطابق نوح علیہ السلام کی پیدائش آدم علیہ السلام کی وفات کے 26 سال بعد اور دوسرے نسخہ کے مطابق 732 سال بعد ہوئی ہے۔ اور اسی فحش اختلاف کی بنا پر مشہور یہودی مؤرخ یوسیفس نے جو عیسائیوں کے نزدیک بھی معتبر ہے، ان میں سے کسی نسخہ پر اعتماد نہیں کیا اور فیصلہ کیا کہ صحیح مدت 2256 سال ہے۔

بعض نسخوں کی رو سے ان عمروں میں اختلاف کا اقتضاء یہ ہے کہ سیدنا آدمؑ نے سیدنا نوحؑ کو دیکھا اور سیدنا نوحؑ نے سیدنا ابراہیمؑ کو دیکھا جو کہ دنیا کے مؤرخین کے اتفاق سے باطل ہے پادری فنڈر کا زعم باطل یہ ہے کہ اکابر کی عمروں کا یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسے قرآن حکیم کی قرأت کا اختلاف ہے۔

(میزان الحق ص ۱۳۵)

Marfat.com

مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''یہ درست ہے کہ ان کے علاوہ بھی سینکڑوں مفسر ہیں، لیکن یہ دونوں اپنی رائے نہیں لکھ رہے بلکہ جمہور علمائے متقدمین کا مذہب بیان کرر ہے ہیں۔

پادری فنڈر نے کہا کہ:

''مسیحؑ نے انجیل یوحنا باب 5 آیت 46، لوقا باب 24 آیت 27، باب 16 آیت 31 میں عہد نامۂ قدیم کی حقانیت کی شہادت دی ہے اور یسوع مسیح سے بڑھ کر کسی کی شہادت نہیں ہوسکتی۔''

اس پر ڈاکٹر محمد وزیر خان نے فرمایا کہ:

''نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ اسی کتاب سے استدلال کر رہے ہیں جو ابھی تک متنازع فیہ ہے اور ہم اس کی تحریف کے مدعی ہیں۔ جب تک بائبل کی اصلیت اور اس کا غیر متنازع فیہ

﴿حاشیہ صفحہ گذشتہ﴾ چنانچہ اس نے اپنی کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں اکابر کی عمروں کے اختلاف کی طرف اشارہ تک نہیں کیا، کیونکہ وہ اس کو قرآن حکیم کی قرأت کے اختلاف کی طرح تورات کی قرأت کا اختلاف سمجھتا ہے۔

طوفان نوح سے سیدنا ابراہیمؑ تک اختلاف بھی اس قدر شدید اور فحش ہے کہ ان نسخوں میں کسی طرح تطبیق ممکن نہیں۔ اور چونکہ عبرانی نسخہ کے مطابق ابراہیمؑ کی پیدائش طوفان کے 292 سال بعد معلوم ہوتی ہے، اور نوح علیہ السلام طوفان کے بعد 350 سال زندہ رہے جس کی تصریح پیدائش باب 9 آیت 28 میں موجود ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ سیدنا ابراہیمؑ کی عمر سیدنا نوح علیہ السلام کی وفات کے وقت 58 سال کی ہو جو کہ باتفاق مؤرخین غلط ہے اور یونانی اور سامری نسخے بھی اس کی تکذیب کرتے ہیں کیونکہ پہلے نسخہ کے مطابق سیدنا ابراہیمؑ کی پیدائش نوح علیہ السلام کی وفات کے 722 سال بعد ہوئی اور دوسرے نسخہ کے مطابق 592 سال بعد (اظہار الحق ص ۲۰۶۔۲۰۷، الجزیری: ادلۃ الیقین: ص ۱۵۸۔۱۶۰، موریس بوکائی: دراسۃ الکتب المقدسہ: ص ۴۰۔۵۰)

Marfat.com

ہونا ثابت نہ ہو جائے آپ اس کی کسی عبارت سے اس کی اصلیت پر کیسے استدلال کر سکتے ہیں؟ اور اگر فرض کیجیے اس وقت ہم اس پہلو سے قطع نظر بھی کر لیں تو اناجیل کی جو تین آیات آپ نے پیش کی ہیں، اس سے صرف اتنی بات ہی ثابت ہوتی ہے کہ یہ کتابیں سیدنا مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھیں، لیکن بائیبل کے الفاظ کا متواتر ہونا اس سے ثابت نہیں ہوتا۔ محقق پیلی نے بھی اپنی کتاب (جس کا ذکر آپ نے حل الاشکال میں کیا ہے) مطبوعہ لندن 1850ء کی قسم سوم، باب سوم میں اقرار کیا ہے کہ ان عبارتوں سے اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ عہد قدیم کی یہ کتب یسوع مسیح کے زمانہ میں موجود تھیں، لہٰذا ان سے ان کتابوں کے ہر ہر جملہ اور ہر ہر لفظ کے صحیح ہونے کی تصدیق نہیں ہوتی۔

فنڈر نے ڈاکٹر وزیر خان صاحب کی اس بات کے جواب میں کہا کہ:

''ہم اس بارے میں پیلی کی بات نہیں مانتے۔''[1]

حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''پادری صاحب! اگر آپ پیلی کی بات نہیں مانتے تو ہم آپ کی بات نہیں مانتے کیونکہ ہمارے نزدیک پیلی کی بات آپ سے

1۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے جب دیکھا کہ پادری فنڈر عیسائی علمائے متقدمین کا انکار کر رہا ہے تو انہوں نے سب سے پہلے محقق پیلی کا ذکر فنڈر کے سامنے کیا، کیونکہ فنڈر کے نزدیک پیلی نہایت معتبر اور معتمد تھا، اسی وجہ سے اس نے اس کی کتابوں سے حوالے بھی نقل کیے اور اپنی کتابوں خصوصی طور پر ''حل الاشکال'' میں اس کی تعریف بھی کی۔ مولانا کیرانویؒ کو یقین تھا کہ پادری فنڈر پیلی کی بات ضرور مانے گا، لیکن نہایت تعجب کی بات ہے کہ پادری فنڈر نے پیلی کا بھی اسی طرح انکار کر دیا جس طرح اس نے پہلے عیسائی علماء کی باتوں کا انکار کیا تھا۔''

Marfat.com

زیادہ معتبر ہے۔"(۱)

اس پر پادری فنڈر کھسیانا ہو گیا۔ بہر حال تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد فنڈر نے حضرت مولانا کیرانویؒ کو کہا کہ:

"میں نے عہد نامۂ عتیق (تورات) کی اصلیت کے لیے سیدنا مسیح علیہ السلام کی شہادت پیش کی ہے، اگر آپ انجیل کو درست نہیں سمجھتے تو اس کا محرف ہونا دلائل سے ثابت کیجئے۔"

۱۔ ملاحظہ فرمائیں کہ محقق پیلی نے کتنی وضاحت کے ساتھ یہ بات لکھی ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ: "اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے شفیع (یسوع) کا قول ہے کہ تورات خدائی کتاب تھی اور میں یہ بات مستبعد سمجھتا ہوں کہ اس کا آغاز اور وجود خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہو بالخصوص اس بنا پر کہ یہودی جو مذہبی میدان کے مرد اور دوسرے کاموں مثلاً فنون جنگ و صلح میں طفل مکتب تھے، وہ توحید سے چمٹے ہوئے تھے۔ ان کے مسائل خدا کی ذات و صفات کی نسبت بہترین ہیں بخلاف دوسرے لوگوں کے جو بے شمار معبودوں کے قائل تھے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہمارے شفیع نے عہد عتیق کے اکثر کاتبوں کی نبوت بھی تسلیم کی ہے۔ ہم عیسائی لوگوں کا فرض ہے کہ ہم اسی حد تک جائیں۔ رہی یہ بات کہ عہد عتیق کل کی کل یا اس کا ہر ہر فقرہ حق و صحیح ہے اور اس کی ہر کتاب کی کوئی اصل ضرور ہے یا یہ کہ اس کے مؤلفین کی تحقیق واجب نہیں ہے، اگر ان معاملات میں مسیحی مذہب کو مدعی بنایا جائے تو میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کروں گا کہ اس شکل میں پورے سلسلہ کو بلا ضرورت مصیبت میں ڈالنا پڑے گا۔ یہ کتابیں عموماً پڑھی جاتی تھیں۔ اور جو یہودی ہمارے شفیع کے ہم عصر تھے وہ ان کو مانتے تھے۔ حواری اور یہودی ان کی طرف رجوع کرتے اور عمل کرتے تھے، مگر اس رجوع و استعمال سے اس نتیجہ کے سوا اور کوئی بات اخذ نہیں کی جاسکتی کہ جب مسیح علیہ السلام کسی بشارت کی نسبت صراحت کے ساتھ یہ فرمادیں کہ یہ منجانب اللہ ہے تب تو بے شک اس کا الہامی ہونا ثابت ہو جائے گا ورنہ صرف اتنی بات ثابت ہوگی کہ یہ کتابیں اس عہد میں مشہور و مسلم تھیں، لہٰذا اس صورت میں ہماری کتب مقدسہ یہود کی کتابوں کے لیے بہترین شاہد ثابت ہوں گی، مگر اس شہادت کی خاصیت کو سمجھنا ضروری ہے، اور یہ خاصیت اس خاصیت کے برعکس ہے جس کو میں

Marfat.com

اس پر ڈاکٹر محمد وزیر خان مرحوم نے فرمایا کہ:

''اگرچہ آپ کی یہ بات غلط ہے، لیکن اگر آپ انجیل کی تحریف کے دلائل سننے کے شوقین ہیں تو سنیئے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے انجیل اٹھائی اور انجیل متی باب 1 آیت 17 پڑھنی شروع کی جس میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے نسب نامہ کے سلسلہ میں بڑی فحش غلطیاں تھیں۔

پادری فنڈر نے کہا کہ

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ آپ یہ ثابت کریں کہ یہ عبارت سب نسخوں میں اسی طرح پائی جاتی ہے یا نہیں؟''

﴿حاشیہ صفحہ گذشتہ﴾ نے بعض اوقات بیان کیا ہے کہ ہر واقعہ کی ایک مخصوص علت اور فطرت ہوتی ہے جو اس کے ثبوت کو مستحکم کرتی ہے۔ یہ فطرت، اگرچہ مختلف ہوتی ہے، لیکن تمام گوشوں پر نگاہ کیجیے تو چیز ایک ہی ہے، مثلاً یعقوب اپنے خط میں کہتا ہے کہ ''تم نے ایوب کے صبر کا حال تو سنا ہی ہے اور خداوند کی طرف سے جو اس کا انجام ہوا اُسے بھی معلوم کر لیا۔'' حالانکہ مسیحی علماء کے درمیان کتاب ایوب کی حقانیت بلکہ اس کے وجود کی نسبت نزاع و اختلاف چلا آتا ہے۔ یعقوب کی شہادت نے صرف اس قدر سمجھا دیا کہ یہ کتاب اپنے وقت میں موجود تھی اور یہودی اس کو تسلیم کرتے تھے۔ پولوس تمتھیس کے نام دوسرے خط میں کہتا ہے کہ ''جس طرح ینیس اور یمبرس نے موسیٰ کی مخالفت کی تھی اسی طرح یہ لوگ بھی حق کی مخالفت کرتے ہیں۔'' حالانکہ یہ دونوں نام عہد عتیق میں موجود نہیں ہیں۔ اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ پولوس نے ان دونوں ناموں کو جھوٹی کتابوں سے نقل کیا ہے، یا روایت کی بنا پر معلوم کیا ہے، لیکن کوئی شخص بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ اگر یہ واقعہ لکھا ہوا ہوتا تو پولوس اس کو کتاب سے نقل کرتا اور خود اپنے کو روایت کی سچائی ثابت کرنے کے لیے مدعی نہ بناتا، چہ جائیکہ وہ ان سوالات کے چکر میں اس طرح پھنستا کہ اس کی تحریر اور خط دونوں اس تحقیق پر موقوف ہو گئے کہ ینیس اور یمبریس نے موسیٰؑ کی مخالفت کی تھی یا نہیں۔''

(محقق پیلی کی کتاب مطبوعہ لندن: ۱۸۵۰ء، لندن، قسم ۳ باب ۳ بحوالہ اظہار الحق)

Marfat.com

ڈاکٹر محمد وزیر خان مرحوم نے جواب دیا کہ

"موجودہ نسخوں میں تو سب میں پائی جاتی ہے، لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ قدیم نسخوں میں بھی یہ پائی جاتی تھی کہ نہیں۔"

پادری فنڈر نے کہا کہ

"غلطی اور شے ہے اور تحریف دوسری شے۔"

اس پر ڈاکٹر وزیر خان مرحوم نے کہا:

"اگر پوری انجیل الہامی ہے تو اس میں غلطی کی کوئی گنجائش نہ ہونی چاہیے، لہٰذا اگر اس میں کوئی غلطی پائی جاتی ہے تو لازمی طور پر وہ تحریف کا نتیجہ ہوگی۔"

پادری فنڈر نے کہا کہ:

"تحریف اس وقت ثابت ہوگی جب کسی عبارت کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ وہ قدیم نسخوں میں نہیں پائی جاتی تھی اور جدید نسخوں میں پائی جاتی ہے۔"

اس پر ڈاکٹر وزیر خان مرحوم نے یوحنا کے پہلے خط باب 5 آیت 7-8 کا حوالہ دیا، جس میں لکھا ہوا ہے کہ:

"اس لیے کہ آسمان میں گواہی دینے والے تین ہیں۔ باپ، کلمہ اور روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں۔ اور زمین میں گواہی دینے والے بھی تین ہیں۔ روح اور پانی اور خون اور یہ تینوں ایک ہی بات پر متفق ہیں۔"

ان دونوں آیتوں میں اصل عبارت عیسائی محققین کے خیال میں صرف اس قدر تھی:

"اور گواہی دینے والے تین ہیں، روح، پانی اور خون، اور یہ تینوں ایک ہی بات پر متفق ہیں۔"

"پادری صاحب معتقدین تثلیث نے یہ عبارت اپنی طرف سے بڑھا دی ہے کہ

Marfat.com

''آسمان میں گواہی دینے والے تین ہیں، باپ، کلمہ اور روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں اور زمین میں..............''

''یہ عبارت الحاقی ہے اور کریسباخ اور شولز اس کے الحاقی ہونے پر متفق ہیں ہورن باوجود اپنے تعصب کے کہتا ہے کہ یہ الحاقی اور واجب الترک ہے۔ ہنری و اسکاٹ کے جامعین نے بھی ہورن اور آدم کلارک کے قول کو ترجیح دی، اور اس کے الحاقی ہونے کی طرف مائل ہیں۔ آگسٹائن نے جو چوتھی صدی عیسوی کا سب سے بڑا عالم شمار کیا جاتا ہے اور جو آج تک اہل تثلیث کے نزدیک معتبر و مستند مانا جاتا ہے، اس خط کے اوپر دس رسائل لکھے ہیں، اور ان میں سے کسی رسالہ میں بھی یہ عبارت نہیں لکھی، حالانکہ وہ تثلیث کا معتقد اور عاشق ہے اور ہمیشہ ایرین فرقہ کے ساتھ جو تثلیث کے منکر تھے، مناظرے کیا کرتا تھا۔ اگر یہ عبارت اس کے زمانہ میں موجود ہوتی تو وہ اس سے استدلال کرتا اور نقل بھی کرتا۔

یوحنا کی عبارت میں تحریف کا انکار کرنے والا سوائے ہٹ دھرم کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

ہنری واسکاٹ کی تفسیر کے جامعین نے لکھا ہے کہ:

''ہورن نے دونوں فریق کے دلائل لکھے ہیں اور پھر مکرر لکھے ہیں۔ دوسری تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اس عبارت کا جھوٹا ہونا ثابت کرتے ہیں ان کے چند دلائل ہیں

-1 یہ عبارت ان یونانی نسخوں میں سے کسی میں بھی موجود نہیں جو سولھویں صدی سے قبل لکھے ہوئے تھے۔

-2 یہ عبارت ان نسخوں میں نہیں پائی جاتی جو پہلے زمانہ میں بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ طبع ہوئے ہیں۔

Marfat.com

3- یہ عبارت سوائے لاطنی ترجمہ کے اور کسی ترجمہ میں موجود نہیں ہے۔
4- یہ عبارت اکثر قدیم لاطینی نسخوں میں بھی موجود نہیں ہے۔
5- اس عبارت سے نہ متقدمین میں سے کسی نے کبھی استدلال کیا ہے اور نہ گرجا کے کسی مؤرخ نے۔
6- فرقہ پروٹسٹنٹ کے مقتداؤں اور اُن کے مصلحین مذہب نے یا تو اس کو کاٹ دیا ہے یا اس پر شک کی علامت لگا دی ہے۔"

ڈاکٹر محمد وزیر خان کی یہ دلیل سن کر پادری فنڈر نے کہا کہ:

"اس جگہ واقعی تحریف ہوئی ہے۔ اور اسی طرح دوسرے ایک دو اور مقامات پر بھی۔ دیوانی عدالت کا صدر جج اسمتھ (Smith) جو پادری فرنچ کے برابر میں بیٹھا تھا، جب اس نے یہ سنا تو اس نے پادری فرنچ سے انگریزی مین پوچھا کہ:

"یہ کیا بات ہے؟"

پادری فرنچ نے جواب دیا کہ

"ان لوگوں نے ہورن وغیرہ کی کتابوں سے چھ سات مقامات ایسے نکالے ہیں، جن میں تحریف کا اقرار موجود ہے۔"

اس کے بعد پادری فرنچ نے ڈاکٹر محمد وزیر خان کو مخاطب کر کے اردو زبان میں کہا کہ:

"پادری فنڈر بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سات آٹھ مقامات پر تحریف ہوئی ہے۔"

اس پر مولانا قمر الاسلام، امام جامع مسجد، آگرہ، اور دوسرے کئی ایک حضرات نے جناب خادم علی، مہتمم "مطلع الاخبار" سے کہا کہ

"آپ کل کے اخبار میں پادری صاحب کا یہ اعتراف شائع کر دیں کہ سات آٹھ مقامات پر واقعی تحریف ہوئی ہے۔"

پادری فنڈر نے یہ سن کر کہا کہ:

Marfat.com

"ہاں، شائع کر دیں، لیکن اس قسم کی معمولی تحریفات سے بائبل کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ خود مسلمان انصاف کے ساتھ اس کا فیصلہ کر لیں۔ کبھی سہو کاتب کی وجہ سے عبارات کا اختلاف ہو جاتا ہے۔"

اب ڈاکٹر محمد وزیر خان مرحوم نے پھر کہا کہ:

"بعض حضرات کے نزدیک بائبل میں اختلاف عبارات ایک لاکھ پچاس ہزار کے قریب ہے اور بعض کے نزدیک تین ہزار۔ آپ ان دونوں اقوال میں سے کس کو اختیار کرتے ہیں۔"

پادری فرنچ نے جواب دیا کہ

"تحقیق شدہ امر یہ ہے کہ یہ اختلافات عبارات چالیس ہزار ہے۔"

لیکن پادری فنڈر یہی کہتا رہا کہ کتب مقدسہ میں اس بات سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ خود مسلمان اور مسیحی ایک ساتھ مل کر اس کا فیصلہ کر لیں۔ پھر اس نے مفتی ریاض الدین کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ

"مفتی صاحب! آپ انصاف فرمائیں۔"

اصل میں فنڈر جس انداز سے بات کرتا تھا اس سے اس کا مطلب مسلمانوں سے عہد عتیق و جدید کی کتابوں کے الہامی ہونے کا اقرار کروانا تھا۔ اس طریقے سے ان کتابوں کی طرف تحریف کی نسبت کو غلط ثابت کرنا چاہتا تھا۔"

مفتی ریاض الدین صاحب نے پادری فنڈر کو جواب میں کہا:

"پادری صاحب! اگر کسی وثیقہ میں ایک جگہ جعل ثابت ہو جائے تو وہ وثیقہ قابل اعتماد نہیں رہتا، اور آپ تو سات آٹھ جگہوں پر تحریف کا اقرار کر رہے ہیں، پھر بائبل کیسے قابل اعتماد رہے گی؟ اس بات کو وہ جج صاحبان جو ہمارے اس جلسہ میں موجود ہیں اچھی طرح سمجھیں گے۔"

پھر آپ نے اسمتھ (Smith) کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہا کہ "آپ ان سے پوچھ لیں"، لیکن اسمتھ نے اس معاملہ کے بارے میں کچھ نہ کہا۔

Marfat.com

پھر مفتی ریاض الدین صاحب نے فرمایا کہ
"جب عبارات کا اختلاف آپ کے نزدیک مسلم ہے، لہٰذا جب آپ کو دو مختلف عبارات ملیں تو آپ ان میں سے کس کے لیے حتمی طور پر یہ فیصلہ کریں گے کہ یہ کلام اللہ ہے اور دوسری اللہ کا کلام نہیں ہے۔ جب آپ حتمی فیصلہ کسی عبارت کے لیے نہیں کر سکتے تو پھر دونوں مشکوک ہو گئیں۔"
پادری فنڈر نے کہا کہ:
"واقعی ہم دونوں میں سے کسی ایک کا حتمی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔"
اس پر مفتی ریاض الدین صاحب نے فرمایا کہ:
"مسلمانوں کا دعویٰ یہی تو ہے کہ بائیبل کو یقینی اور حتمی طور پر اللہ کا کلام نہیں کہا جا سکتا۔ اور آپ کے اقرار سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔"
اس پر پادری فنڈر نے (خلط مبحث کرتے ہوئے) کہا کہ:
"اجلاس کا وقت آدھا گھنٹہ زائد ہو چکا ہے۔ باقی بحث کل ہو گی۔"
اب حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ فرمانے لگے کہ:
"آپ نے آٹھ جگہ تحریف کا خود اقرار کیا ہے۔ کل ہم انشاء اللہ پچاس ساٹھ مقامات پر تحریف ثابت کریں گے جس کا اقرار مسیحی علماء نے بھی کیا ہے۔" اگر اس بارے میں مزید بحث مقصود ہو تو تین باتوں کا خیال رکھیے:

1- ایک تو یہ کہ ہم آپ سے بائیبل کی بعض کتابوں کی سند متصل کا مطالبہ کریں گے۔
2- دوسرے ہم جن پچاس ساٹھ مقامات پر تحریف ثابت کریں گے جن کا اقرار مسیحی علماء نے بھی کیا ہے، آپ کے ذمہ لازم ہو گا کہ یا تو آپ ان مقامات

Marfat.com

کی تحریف تسلیم کریں یا اس میں کوئی تاویل کریں، ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ ہورن کا قول طوعاً و کرہاً ضروری تسلیم کریں لیکن یہ ضرور ذہن میں رکھیں کہ آپ ہورن سے علم میں زیادہ نہیں بلکہ کم ہی ہیں۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ پہلے ان مقامات کے بارے ہماری بات غور سے سنیں پھر یا تو اس کی تحریف کو تسلیم کریں یا تاویل کریں۔

3- تیسری بات یہ ہے کہ جب تک آپ ان پچاس ساٹھ مقامات کی تحریف کو تسلیم کرنے یا ان کی تاویل کرنے سے فراغت حاصل نہ کریں آپ بائبل کی کسی عبارت سے استدلال نہیں کریں گے۔''

پادری فنڈر نے کہا کہ

''مجھے آپ کی تمام شرطیں منظور ہیں لیکن میری بھی ایک شرط ہے کہ آپ بھی کل بتائیں گے کہ آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں کون سی انجیل تھی؟''

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''ہم آپ کی اس شرط کو دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور انشاء اللہ کل یہ بتا دیں گے۔''

ڈاکٹر محمد وزیر خان نے فرمایا:

''اگر آپ فرمائیں تو یہ بات مولانا کیرانویؒ ابھی بتا دیں؟''

پادری فنڈر نے کہا:

''اب تو بہت دیر ہوگئی ہے۔ کل ہی سنیں گے۔''

مدون مناظرہ مولانا عبداللہ اکبر آبادی کا بیان ہے کہ اس بات کے ساتھ ہی دونوں فریق مناظرہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پہلے دن کی نشست برخاست ہوگئی۔

Marfat.com

مناظرے کا دوسرا روز

دوسرے روز 12 رجب 1270ھ مطابق 11 اپریل 1854ء منگل کے دن صبح کے وقت مناظرہ پھر شروع ہوا جس میں دوسرے لوگوں کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات بھی شریک ہوئے۔

مسٹر اسمتھ صدر دیوانی، مسٹر ریڈ صدر بورڈ، مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج، پادری ولی گبن، پادری ہارلی، مفتی ریاض الدین صاحب، مفتی اسد اللہ صاحب، صدر الصدور، مولوی فیض احمد صاحب، سرشتہ دار صدر بورڈ، مولوی حضور احمد صاحب، مولوی امیر اللہ صاحب، مختار راجہ صاحب، بنارس، مولانا قمر الاسلام صاحب، امام جامع مسجد، اکبر آباد، مولوی امجد علی صاحب وکیل، مولوی سراج الحق صاحب، منشی خادم علی صاحب مہتمم "مطلع الاخبار" مولوی امیر علی شاہ صاحب، مولوی قمر الدین خان صاحب مہتمم "اسعد الاخبار" مولوی مظفر علی شاہ صاحب، جعفری قادری، سید صفدر علی صاحب، شکوہ آبادی، پنڈت جگل کشور، مولوی فیض احمد صاحب بدایونی، مولوی امیر اللہ صاحب وکیل، مولوی معین الدین صاحب، سید باقر علی صاحب، ناظم محکمہ دیوانی، مولوی کریم اللہ خان صاحب بچھڑا یونی، سید حافظ حسین صاحب، حافظ خدا بخش صاحب ہمدانی، راجہ بلوان سنگھ کاشی، مولوی سید مدد علی صاحب تپش، مرزا زین العابدین

Marfat.com

صاحب، عابد، ڈاکٹر مکند لال، حکیم فرحند علی گوپا موی، سید فضل حسین صاحب، ڈاکٹر وزیرالدین صاحب، فرخ آبادی، حکیم جواہر لال صاحب، غلام محمد خان صاحب، خلیفہ گلزار علی صاحب اسیر، غلام قطب الدین صاحب باطن، مولوی سراج الاسلام صاحب اور دوسرے علمائے اسلام اور رؤسائے شہر موجود تھے۔

پہلے دن کے مناظرے کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی، اس لیے دوسرے روز حاضرین کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی۔ انگریز حکام، عیسائی مسلمان، ہندو اور سکھ عوام بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ اس اجلاس میں تحریف انجیل کی بقیہ بحث جاری رہی۔

مناظرہ کو مدون کرنے والے جناب عبداللہ اکبرآبادی فرماتے ہیں کہ مناظرہ شروع ہوتے وقت پادری فنڈر اٹھا اور اس نے میزان الحق کو ہاتھ میں پکڑ کر اس کی وہ عبارتیں پڑھنی شروع کیں جن میں قرآن کی کئی آیات تھیں۔ (یہ عبارتیں میزان الحق کے باب اول کی پہلی فصل سے تھیں) لیکن وہ آیات کی عربی غلط پڑھتا تھا۔ آیات قرآنیہ کی غلط قرأت پر قاضی القضاۃ حضرت مولانا محمد اسداللہ صاحب نے پادری فنڈر کو کھڑے ہو کر کہا ”پادری صاحب! آپ صرف قرآنی آیات کا ترجمہ پڑھیں کیونکہ آپ آیات کی عربی غلط پڑھ رہے ہیں اور الفاظ کے تبدیل ہونے سے معانی تبدیل ہو جاتے ہیں۔“

پادری فنڈر نے کہا:

”معاف فرمائیے یہ ہماری زبان کا قصور ہے۔“ مطلب یہ کہ میں چونکہ یورپ کا رہنے والا ہوں لہٰذا عربی عبارت صحیح نہیں پڑھ سکتا۔“

پھر پادری فنڈر نے قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیات پڑھیں:

سورۃ الشوریٰ	آیت 15
سورۃ العنکبوت	آیت 46
سورۃ المائدۃ	آیت 5

ان آیات قرآنیہ کو پڑھ کر پادری فنڈر نے کہا کہ ”امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فرد پر یہ بات عیاں ہے کہ وہ فرقے جن کو کتاب عطاء کی گئی اور قرآن میں انہیں ”اہل

کتاب'' کا لقب عطاء کیا گیا، وہ مسیحی اور یہود ہیں، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں ان کے بارے میں کہا گیا ہے۔

﴿وَهُم یتلون الکتاب﴾

''اور وہ کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔''

اور قرآن سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہود اور مسیحین کو جو کتابیں عطاء کی گئی تھیں، ان کا نام تورات اور انجیل ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں مرقوم ہے:

﴿وَاَنزَلَ التورَاۃ وَالانجیل من قَبلُ هُدی للنّاس﴾

''اور نازل کیا تورات اور انجیل کو اس سے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے''

پادری فنڈر نے پھر کہا کہ ان آیات میں ''کتاب'' اور ''اہل کتاب'' دونوں کا ذکر ہے اور ''اہل کتاب'' سے مراد ''یہود و نصاریٰ'' ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ''تورات اور انجیل دونوں محمد ﷺ کے زمانہ میں موجود تھیں، اور مسلمان ان دونوں کتابوں کو مانتے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ محمد ﷺ کے زمانہ تک ان دونوں کتابوں میں تحریف نہیں ہوئی تھی۔''

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے جواب دیا کہ

''ان آیات سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ گذشتہ زمانوں میں جو اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوا تھا اس پر ایمان لایا جائے۔ اور تورات اور انجیل دونوں پہلے زمانوں میں نازل ہوئی تھیں اور وہ دونوں محمد ﷺ کے زمانہ میں موجود تھیں۔ لیکن ان آیات سے یہ کسی صورت ثابت نہیں ہوتا کہ محمد ﷺ کے زمانہ تک ان دونوں میں کوئی تحریف نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کئی جگہوں پر تحریف کرنے کی وجہ سے اہل کتاب کی بہت مذمت کی ہے۔ لہٰذا جس طرح ہم قرآنی آیات کے حکم سے اس کلام اللہ پر جو گذشتہ زمانوں میں نازل ہوا، ایمان لاتے ہیں، اسی طرح ہمارا یہ

Marfat.com

بھی ایمان ہے کہ ان میں تحریف ہوئی ہے کیونکہ قرآن نے ان کی تحریف کا ذکر کیا ہے۔اور اسی لیے حدیث میں ہے کہ ”اہل کتاب کی باتوں کی نہ تو تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب کرو۔“

(بخاری کتاب التفسیر: باب ۱۱ نمبر ۴۴۸۵، کتاب اعتصام: بالسنۃ باب ۲۵، نمبر ۷۳۶۲، کتاب التوحید: باب ۵۱ نمبر ۷۵۴۲)

”وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کے پاس تورات اور انجیل دونوں محرف ہیں۔“

پادری فنڈر نے کہا:

”اس وقت آپ حدیث کا ذکر نہ کریں بلکہ قرآنی آیات کا ذکر کریں۔“

حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا:

”پادری صاحب! قرآنی آیات سے بھی وہی کچھ ثابت ہوتا ہے جو حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔یعنی قرآن سے بھی یہی دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔“

اول یہ کہ تورات اور انجیل دونوں گذشتہ زمانوں میں نازل ہوئیں۔

دوم یہ کہ یہ دونوں محرف ہیں۔ اور ان کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود ہونا اس بات پر ہرگز دلالت نہیں کرتا کہ ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قبل تحریف نہیں ہوئی۔

جیسا کہ پادری صاحب، آپ نے بھی اپنی کتاب میزان الحق میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

پادری فنڈر نے کہا:

”سورۃ البینہ کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قبل ان کتابوں میں تحریف نہیں ہوئی تھی۔“

پھر اس نے اپنی کتاب میزان الحق کے باب اول کی تیسری فصل سے یہ آیات پڑھیں:

﴿لم یکن الذین کفروا من اهل الکتاب والمشرکین منفکین حتی تاتیهم البینة. رسول من الله یتلو صحفاً مطهرة فیها کتب قیمة. وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الامن بعد ماجاء تهم البینة﴾

"جولوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے (قبل بعث نبویہ) کافر تھے وہ (اپنے کفر سے ہرگز) باز نہ آنے والے تھے جب تک کہ اُن کے پاس واضح دلیل نہ آئی یعنی ایک اللہ کا رسول جو (ان کو) پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں درست مضامین لکھے ہوں۔ اور جولوگ اہل کتاب تھے وہ اس واضح دلیل کے آنے ہی کے بعد (دین میں) مختلف ہوگئے۔"

یہ آیات پیش کر کے اس نے کہا کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت اور دعوت سے قبل تحریف نہیں کی تھی بلکہ بعد میں کی تھی۔

مولانا آل حسن نے اپنی کتاب الاستفسار صفحہ 448 میں بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا:

"پادری صاحب! آپ ان آیات کا مطلب غلط بیان کر رہے ہیں۔ اس کا صحیح مطلب وہ ہے جو مولانا عبدالقادر دہلویؒ نے بیان کیا ہے کہ تمام اہل ملل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل گمراہ ہوگئے تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی غلطی کے بارے میں دھوکے میں تھا۔ ان کو کسی حکیم، ولی اور سلطان عادل کے واسطہ سے ہدایت حاصل ہونا ممکن نہ تھا جب تک کہ ان کے پاس کوئی عظیم الشان رسول نہ آئے، اور اس کے ساتھ اللہ کی طرف سے مدد قوی کے طور پر ایک کتاب بھی ہو، پھر چند ہی سالوں میں یہ اقالیم

Marfat.com

ایمان سے بھر جائیں گی۔

ان آیات سے صرف اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین اپنی رسومات قبیحہ سے باز آنے والے نہیں تھے جب تک کہ ان کے پاس ایک عظیم الشان رسول نہ آتا اب جس نے اس رسول کی بعثت کے بعد اس کی مخالفت کی اس نے تعصب اور عناد کی وجہ سے اس کی مخالفت کی۔

پس ان آیات سے آپ کا استدلال کرنا کسی صورت بھی صحیح نہیں ہے۔ باقی رہا آپ کا مولانا آل حسن کی کتاب الاستفسار سے استدلال، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اس کتاب سے آپ کا استدلال ہی صحیح نہیں ہے۔

دوم اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو بشارات بائیبل میں منقول ہیں ان میں تحریف نہیں کی گئی، نہ یہ کہ عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں میں کسی جگہ بھی تحریف نہیں ہوئی، بلکہ صاحب الاستفسار تو اپنی پوری کتاب میں ببانگ دہل کہہ رہے ہیں کہ بائیبل میں تحریف ہوئی ہے۔"

پادری فنڈر نے کہا کہ:

"اب آپ یہ بیان فرمائیں کہ وہ انجیل جس کا ذکر قرآن حکیم میں ہے، وہ کون سی انجیل تھی؟"

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

"کسی ضعیف یا قوی روایت سے اس چیز کی تعیین نہیں ہوتی کہ وہ کون سی انجیل تھی متی یا یوحنا یا کسی اور شخص کی تصنیف۔ اور نہ ہی ہم اس بات کے لیے مامور ہیں کہ ہم اس کو جانیں۔"

پادری فنڈر نے انگریز امراء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ سب اہل کتاب بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے پوچھیں کہ وہ کون سی انجیل تھی؟"

Marfat.com

اس پر ڈاکٹر محمد وزیر خان نے کہا:

''قرآن حکیم سے صرف اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ انجیل سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون سی انجیل تھی؟''

''اور اس زمانہ میں بے شمار اناجیل موجود تھیں جیسے برناباس وغیرہ کی انجیل۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کون سی انجیل مراد ہے۔''

''اس زمانہ میں کئی ایسے فرقے بھی تھے جو ان تمام اناجیل کو نہیں مانتے تھے جو آج مشہور ہیں یعنی متی، لوقا، یوحنا اور مرقس کی اناجیل۔ اس زمانہ میں ایک ایسا عیسائی فرقہ بھی تھا جو یہ کہتا تھا کہ خدا تین ہیں: باپ، بیٹا اور مریم، شاید یہ باتیں ان کتابوں میں لکھی ہوں کیونکہ قرآن ان سب چیزوں کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ بات کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتی کہ رسولوں کے اعمال، ان کے خطوط اور کتاب المشاہدات وغیرہ بھی انجیل میں شامل ہیں۔''

اس پر پادری فنڈر تو نہ بولا البتہ پادری فرنچ نے کہا کہ:

''آپ اس انجیل میں شامل کتابوں کو تسلیم نہیں کرتے حالانکہ ''مجلس لوڈیشیا'' نے ان کتابوں کو تسلیم کیا ہے، اور ہمارے معتبر اور ثقہ علماء کرام جیسے کلیمنس، اسکندریانوس اور ٹرٹولین وغیرہ نے بھی کتاب المشاہدات سمیت سب کتابوں کو تسلیم کیا ہے، لیکن ان کتابوں کی سند متصل جو پہلے زمانوں میں موجود تھی اب فتنوں اور باہمی جھگڑوں کی وجہ سے مفقود ہے۔''

ڈاکٹر وزیر خان نے فرمایا کہ

''کلیمنس کس زمانہ میں ہوا ہے؟''

پادری فرنچ نے جواب دیا ''دوسری صدی عیسوی کے آخر میں۔''

ڈاکٹر محمد وزیر خان نے کہا کہ:

''کلیمنس کے کتاب المشاہدات کے دو فقرے نقل کرنے سے

Marfat.com

صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ کلیمنس نے اس بات کو تسلیم کیا ہے
دوسری صدی کے اواخر میں یوحنا کی تصنیف ''کتاب المشاہدات''
موجود تھی لیکن اس کی سند متصل اس سے پہلے بھی موجود نہیں تھی۔
چنانچہ تمام کتابوں کا تواتر لفظی سے ثابت ہونا صرف دو فقروں سے
ثابت نہیں ہوتا۔''

پادری فنڈر نے کہا کہ:

''یہ بات اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔ ہماری بحث اس وقت اس انجیل کے بارے میں ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھی۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''ہم نے اس بارے میں اپنا مذہب ظاہر کر دیا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اہل اسلام کا یہ مذہب نہیں ہے تو یا تو آپ اس کے خلاف دلیل پیش کریں یا پھر اس کو تسلیم کریں۔ ہم اس بات کا پورا پورا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل کی شکل میں نازل ہوا لیکن اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں عہد جدید کے نام سے جو مجموعۂ کتاب موجود ہے، وہ وہی کلام اللہ تھا، اور ہم اس بات کو بھی نہیں مانتے کہ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا۔ اور حواریوں کا کلام ہمارے نزدیک انجیل میں شامل نہیں ہے بلکہ انجیل صرف وہ ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہو نہ کہ وہ کلام جو حواریوں نے بعد میں جمع کیا۔

شیخ ابوالبقاء صالح بن حسین نے اپنی کتاب تخجیلمن حرف الانجیل کے دوسرے باب میں ان مشہور اناجیل کے بارے میں لکھا ہے ''یہ وہ صحیح اناجیل نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں۔''

اس نے پھر اسی باب میں لکھا ہے کہ ''صحیح انجیل وہ ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ

Marfat.com

السلام کی زبان سے نکلی تھی۔" پھر نویں باب میں صفحہ 129 پر لکھا ہے کہ "پولوس نے مکروفریب کے ساتھ ان سے یہ چھین لی، جب اس نے دیکھا کہ ان کی عقلیں اس کی ہر شے کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں تو اس نے تورات کی تمام رسومات تباہ و برباد کر کے رکھ دیں۔"

امام قرطبیؒ نے اپنی کتاب الاعلام بماعند النصاریٰ من الفساد والاوہام کے باب ثالث میں لکھا ہے کہ:

"وہ کتاب جو عیسائیوں کے ہاتھوں میں ہے اور جس کو وہ انجیل کے نام سے پکارتے ہیں وہ اصل میں وہ انجیل نہیں ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہا تھا

﴿وانزل التوراة والانجيل من قبل هدى للناس﴾

"اور نازل کیا تورات اور انجیل کو اس سے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے"

اسی طرح دوسرے سلف وخلف کے علماء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے۔

یہ بات کسی روایت سے بھی ثابت نہیں ہوتی کہ فلاں انجیل میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے اقوال لکھے ہوئے ہیں، لہٰذا ہم کسی طرح بھی اس بات کی تعیین نہیں کر سکتے۔ اور ان اناجیل اربعہ میں جو کچھ منقول ہے، اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ احادیث احاد کی ہے، لیکن قرن اول سے یہ نقل متواتر سے منقول نہیں ہے۔

اس بات پر پادری فرنچ نے غضبناک ہو کر کہا کہ "آپ نے ہماری انجیل کی طرف بہت بڑا عیب منسوب کیا ہے۔"

پادری فرنچ کا یہ کہنا تھا کہ پادری فنڈر بھی بول پڑا اور اس نے سیدنا امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے قرآن حکیم کے ان بعض نسخوں کے جلانے کا تذکرہ شروع کر دیا۔"

حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا "پادری صاحب! یہ خلط مبحث ہے، لیکن اگر آپ نے اس کا تذکرہ شروع کر ہی دیا ہے تو پھر اس کا جواب بھی سن لیں۔"

Marfat.com

پادری فنڈر نے جواب دیا کہ:

''چونکہ آپ نے انجیل پر اعتراض کیا لہٰذا میں نے قرآن پر اعتراض کر دیا۔ پس اب آپ اصل مطلب کی طرف رجوع فرمائیں۔''

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا:

''ہماری بات شروع ہی سے دونوں عہد ناموں (عہد عتیق اور عہد جدید) کے بارے میں ہے نہ کہ صرف انجیل کے بارے میں۔ ہم آپ سے عہد عتیق اور عہد جدید کی صرف بعض کتابوں کی سند متصل کا مطالبہ کرتے ہیں۔''

پادری فنڈر نے جواب دیا کہ:

''آپ صرف انجیل کے بارے میں بات کریں۔''

لیکن مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ

''ہم مجموعہ (تورات و انجیل) کی بات کرتے ہیں۔ انجیل کی تخصیص بالکل لغو ہے۔

مدون مناظرہ مولانا عبداللہ اکبر آبادی فرماتے ہیں کہ ''پادری فنڈر بالکل خاموش ہو گیا کیونکہ اس کے پاس ان کتابوں کی سند متصل نہیں تھی، لہٰذا اس نے انجیل و تورات کی تحریف کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

پھر پادری فرنچ نے اپنی نوٹ بک نکالی اور اُس کو پڑھنا شروع کیا جس کا خلاصہ یہ تھا:

کہ ہمارے علماء نے عبارات کے بہت اختلافات کتب مقدسہ میں پائے جن کی تعداد تیس ہزار یا چالیس ہزار تھی، لیکن یہ اختلافات ایک نسخہ میں نہیں بلکہ بہت سے نسخوں میں ہیں۔ اگر ہم انہیں سب نسخوں میں تقسیم کریں تو ایک نسخہ کے حصہ میں چار سو یا پانچ سو اختلاف آتا ہے۔ ان میں سے بعض اغلاط تو مبتدعین کے تصرفات کی وجہ سے ہیں۔ ڈاکٹر کریسباج نے صرف متی کی انجیل میں تین سو ستر آیات اور الفاظ کے سہو معلوم کیے ہیں جن میں 17 تو بہت شدید ہیں اور 32 اگرچہ شدید ہیں لیکن پہلوں کے مقابلہ

Marfat.com

میں خفیف ہیں اور باقی خفیف اختلافات ہیں۔ اور ہمارے علماء نے اکثر جگہوں پر ان اغلاط کو درست کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ بات قریب القیاس ہے کہ جس کے بہت سے نسخے ہوں ان کی تصحیح آسان ہوتی ہے لیکن جس کا صرف ایک نسخہ ہو اس کی تصحیح مشکل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد وزیر خان مرحوم نے پادری فرنچ کے اس سوال کا جواب دینا چاہا لیکن پادری فنڈر نے ان کو جواب دینے سے روک دیا۔ اور جب بھی ڈاکٹر محمد وزیر خان پادری فرنچ کو جواب دینے کی کوشش کرتے پادری فنڈر انہیں روک دیتا اور کہتا نہیں، نہیں۔ پھر پادری فنڈر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کی طرف متوجہ ہوا۔ پادری فنڈر انہیں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مولانا مفتی ریاض الدین صاحب یوں گویا ہوئے:

"سب سے پہلے "تحریف" کے معنی بیان کیے جائیں، پھر مسئلہ تحریف پر بحث ہو تاکہ حاضرین صحیح حقیقت حال سے آگاہ ہو سکیں۔"

پادری فنڈر اس بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مفتی ریاض الدین صاحب نے کہا کہ یہ آپ کے ذمہ نہیں بلکہ ان لوگوں کے ذمہ ہے جو بائیبل میں تحریف کے مدعی ہیں۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ سن کر پادری فنڈر کی طرف ملتفت ہوئے اور فرمایا کہ

"ہمارے ہاں تحریف کے معنی اللہ تعالیٰ کے کلام میں تبدیلی اور تغیر کے ہیں، خواہ وہ تبدیلی زیادتی میں ہو یا کمی میں، خواہ بعض الفاظ کو بعض کی جگہ تبدیل کیا جائے۔ خواہ اس تبدیلی کی غرض شرارت اور خبث ہو خواہ اپنے وہم کی وجہ سے اصلاح ہو۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

"تحریف کی دو قسمیں ہیں:

(1) تحریف لفظی اور (2) تحریف معنوی

تحریف لفظی کا مطلب یہ ہے کہ اصل الفاظ میں تبدیلی کر دی جائے، خواہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ کر یا کسی لفظ کو حذف کر کے یا کوئی لفظ بڑھا کر۔

Marfat.com

تحریف معنوی کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ میں تو کوئی تبدیلی نہ کی جائے مگر عبارت کی کوئی من مانی تفسیر کی جائے جو اصل معانی کے خلاف ہو۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے تحریف کی مزید تفصیل بیان کی۔ اور فرمایا کہ:

''ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ کتب مقدسہ میں ان تمام امور کے لحاظ سے تحریف واقع ہوئی ہے۔ اگر آپ حضرات انکار کرتے ہیں تو اس کا ثبوت ہمارے ذمہ ہے۔''

پادری فنڈر نے کہا کہ

''ہمیں اس چیز کا اعتراف ہے لیکن کتب مقدسہ میں یہ جو کچھ بھی ہے ''سہو کاتب'' ہے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''ہمارے نزدیک سہو کاتب یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص ''لام'' لکھنا چاہتا ہے اور اس کی جگہ وہ ''میم'' لکھ دے یا وہ ''میم'' لکھنا چاہتا ہے لیکن اس کی جگہ ''نون'' لکھ دے۔

کیا آپ کے نزدیک بھی سہو سے یہی مراد ہے یا سہو میں یہ باتیں بھی شامل ہیں کہ حاشیہ کی عبارت متن میں شامل کر دی جائے یا جملوں میں جان بوجھ کر کچھ الفاظ کا اضافہ یا کمی کر دی جائے۔''

پادری فنڈر حضرت مولانا کیرانویؒ کے منہ سے ''جملوں'' کے لفظ سن کر بہت گھبرایا شاید اس نے ''جملوں'' کے لفظ سے پوری کتاب سمجھ لی ہو لہٰذا اس نے مولانا کیرانویؒ سے کہا کہ ''جملوں'' کا لفظ استعمال نہ کریں بلکہ کہیں کہ کچھ آیات کا اضافہ یا کمی کر دی ہو۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ

''ہمارے نزدیک جملہ سے مراد یہ ہے جیسے ''زید کھڑا ہے۔'' لیکن میں آپ کے کہنے سے یہ لفظ استعمال نہیں کرتا اور وہی الفاظ استعمال کرتا ہوں جو آپ کہتے ہیں۔''

Marfat.com

پادری فنڈر نے کہا کہ

"ہمارے نزدیک یہ سب چیز سہو کاتب میں شامل ہیں، خواہ ان کا وقوع قصداً ہو یا سہواً، جہالت سے ہو یا علم سے۔ اس قسم کا سہو صرف پانچ یا چھ آیات میں پایا جاتا ہے، لیکن الفاظ میں بہت جگہ پایا جاتا ہے۔"

اس پر حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ

"پادری صاحب! آپ کی اصطلاح کے مطابق جب آیات کی زیادتی اور کمی اور بعض الفاظ کی بعض الفاظ سے تبدیلی، قصداً اور سہواً، سہو کاتب میں داخل ہے اور اس قسم کا سہو کتب مقدسہ (بائیبل) میں واقع ہے، تو اسی شے کا نام ہمارے ہاں تحریف ہے۔ اب ہمارے اور آپ کے درمیان نزاع صرف لفظی ہے۔ کیونکہ جس تحریف کے ہم دعویدار ہیں اس کو آپ سہو کاتب کہتے ہیں۔ اختلاف صرف تعبیر اور اسم میں ہے، معبر عنہ اور مسمیٰ میں کوئی اختلاف نہیں۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ "اس کی مثال اور نظیر یہ ہے کہ ایک شخص نے چار مساکین کو ایک درہم دیا۔ ان چار مساکین میں سے ایک رومی تھا، دوسرا حبشی، تیسرا ہندی اور چوتھا عربی تھا۔ انہوں نے چاہا کہ چاروں مل کر اس سے کوئی چیز خریدیں۔ رومی نے کہا کہ انگور خریدیں لیکن اس نے انگور کا نام اپنی زبان میں لیا۔ حبشی نے کہا کہ نہیں بلکہ نام اس نے بھی انگور کا لیا لیکن اپنی زبان میں، ہندوستانی نے کہا کہ نہیں بلکہ انگور خریدیں لیکن انگور کا نام اس نے بھی اپنی زبان میں لیا۔ اب عربی بولا کہ نہیں بلکہ عنب خریدیں کیونکہ عربی میں انگور کو عنب کہتے ہیں۔

اب جس طرح ان چاروں مین صرف لفظی نزاع تھا، اس وجہ سے کہ وہ ایک دوسرے کا مفہوم نہیں سمجھ رہے تھے، مقصود چاروں کا ایک تھا یعنی انگور۔ یہی معاملہ "سہو کتاب" اور "تحریف" کا ہے کیونکہ جس شی کو ہم "تحریف" کہتے ہیں آپ نے اس کا نام

Marfat.com

''سہو کاتب'' رکھ دیا ہے۔''

پھر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اونچی آواز سے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

''پادری صاحب اور ہمارے درمیان جو نزاع ہے وہ صرف نزاع لفظی ہے، کیونکہ وہ تحریف جس کے ہم مدعی ہیں اس کو پادری صاحب نے بھی قبول کرلیا ہے لیکن انہوں نے اس کا نام سہو کاتب رکھ لیا ہے۔''

پادری فنڈر نے کہا کہ ''اس سہو سے متن میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔''

اس پر قاضی القضاۃ مولانا محمد اسد اللہ نے حیران ہو کر کہا کہ ''بڑی عجیب بات ہے کہ متن کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔''

اس پر پادری فنڈر نے بڑے غصے سے جواب دیا کہ ''میں نے اس چیز کو کئی دفعہ بیان کیا ہے۔ اب کتنی دفعہ اور بیان کروں۔''(۱)

پادری فنڈر نے پھر کہا کہ ''الوہیت مسیح، تثلیث، کفارہ وغیرہ مسائل پر تحریف کا کوئی اثر نہیں یعنی یہ اہم مسائل غیر محرف ہیں۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''ہنری واسکاٹ کی تفسیر کے جامعین کا دعویٰ بھی یہی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں کہ ان اغلاط اور اس تحریف کی وجہ سے مقصود اصلی میں کوئی فرق نہیں پڑا، لیکن ہم اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ جب تحریف ثابت ہوگئی تو پھر اس بات کی کیا دلیل ہے کہ وہ نو یا دس آیات جن سے تثلیث ثابت ہوتی ہے، ان پر اس تحریف کا اثر نہیں ہے۔''

۱۔ پادری فنڈر نے جو اپنے مباحثہ کی غلط کاروائی مطبع اسکندرہ، اکبرآباد سے 1855ء میں چھپوائی تھی اس میں بھی صفحہ 50 پر لکھا ہے کہ:

''ہم تحریف کے وقوع کا انکار نہیں کرتے لیکن یہ کہتے ہیں کہ اہم مضامین اس تحریف سے تبدیل نہیں ہوتے۔''

Marfat.com

پادری فنڈر نے کہا کہ:

''متن کی تحریف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انجیل کے پرانے نسخہ میں الوہیت مسیح کا ذکر نہ ہو اور متداول میں اس کا ذکر ہو، اسی طرح قدیم نسخہ مین کفارۃ المسیح کا تذکرہ نہ ہو اور نئے نسخہ میں اس کا ذکر موجود ہو۔''

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ:

''ہمارے ذمہ صرف اس قدر ہے کہ بائیبل کے اس نسخہ کو مشکوک ثابت کریں۔ سو وہ الحمدللہ ہم نے ثابت کر دیا۔ چنانچہ اس اثبات سے پوری کتاب مشکوک ہوگئی ہے۔''

لیکن جب آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ بائیبل کے بعض مقامات پر تحریف ہوئی بھی ہے۔ اب جن مقامات کو آپ تحریف سے محفوظ سمجھتے ہیں ان کی حفاظت کا اثبات آپ کے ذمہ ہے نہ کہ ہمارے ذمہ کیونکہ ان مقامات کے محفوظ اور غیر محرف ہونے کے مدعی آپ ہیں۔''

''اب ایک بات آپ سے اور پوچھنی ہے وہ یہ کہ کیا آپ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ وہ سہو یا سہوات جو آپ کے نزدیک مسلم ہیں اور وہ سہوات ہمارے نزدیک تحریفات ہیں، وہ سب نسخوں میں موجود ہیں یا نہیں؟''

پادری فنڈر نے کہا کہ:

''ہاں، اس قسم کے سہو تمام نسخوں میں پائے جاتے ہیں''

اس پر پادری فرنچ نے اعتراض کیا، لہٰذا پادری فنڈر نے کہا:

''میں غلطی پر ہوں اور پادری فرنچ کی رائے مجھ سے بہتر ہے۔''

اس پر قاضی القضاۃ مولانا محمد اسد اللہ نے فرمایا کہ ''اب آپ کا اپنے پہلے قول سے رجوع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ آپ کا پہلا قول معتبر اور حقیقت حال کے مطابق ہے۔''

Marfat.com

پادری فنڈر نے کہا ”میری بات غلط تھی اور جو کچھ میں نے پہلے کہا تھا وہ حتمی اور یقینی نہیں تھا۔ شاید یہ سہو عبرانی متن میں نہ ہو بلکہ یونانی متن میں ہو یا عبرانی میں ہو اور یونانی میں نہ ہو۔“

اس پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پادری فنڈر سے پوچھا ”اگر ہم وہ بعض مقامات آپ پر عیاں کر دیں جن کے بارے میں آپ کے مفسرین نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ پہلے زمانہ میں ایسے تھے، لیکن اب عبرانی متن میں جو کہ آپ کے نزدیک معتبر ہے، وہ عبارت یا نظریہ نہیں پایا جاتا، تو آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

پادری فنڈر نے جواب دیا ”اس سے متن میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔“

اس پر ڈاکٹر محمد وزیر خان نے کہا کہ

”اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے مقصود اصلی میں بڑا خلل پڑتا ہے جبکہ عبارات کے اختلافات بہت زیادہ ہوں۔“

ڈاکٹر محمد وزیر خان نے مزید فرمایا کہ ”اس بات کو اس مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں کہ ”فرض کر لیں کہ گلستانِ سعدی کے مختلف نسخوں میں بعض مختلف عبارات پائی جائیں اور ان بعض عبارات کی بعض عبارات پر ترجیح ثابت نہ ہو۔ اس صورت میں ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ سعدی کی عبارت یہ ہے اور یہ نہیں ہے۔ اسی طرح جب انجیل کے مختلف نسخوں میں عبارات کا اختلاف پایا جائے اور کسی ایک کی دوسری پر کوئی وجہ ترجیح نہ ہو تو بلا شک وشبہ مقصود اصلی میں تغیر کا وقوع ممکن ہے۔ ہمارے ہاں انجیل نام ہے قول مسیح کا اور وہ مشتبہ ہو جاتی ہے۔“(1)

پادری فنڈر نے کہا کہ ”آپ مجھے اختصار سے جواب دیں کہ کیا آپ متن کو غیر محرف تسلیم کرتے ہو یا نہیں؟ اگر تسلیم کرتے ہو تو آئندہ ہفتے بحث ہوگی۔ اور ہم باقی مباحثہ میں اس کتاب (انجیل) سے دلائل نقلیہ سے استدلال کریں گے۔ اور ہم جانتے

1۔ اصل میں ہمارے نزدیک انجیل نام ہے کلام اللہ کا نہ کہ کلام مسیح کا۔ شاید ڈاکٹر محمد وزیر خان کا مطلب قول مسیح سے یہ ہے کہ کلام اللہ جو سیدنا مسیح پر نازل ہوا۔

Marfat.com

ہیں کہ عقل کتاب کی محکوم ہے نہ کہ کتاب عقل کی۔''(۱)

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا کہ ''جب آپ کی کتب مقدسہ میں زیادتی و نقصان ثابت ہو گیا اور آپ نے بھی اس کا اعتراف کر لیا۔ اور اس طریقہ سے انجیل میں تحریف ثابت ہو گئی تو اس وجہ سے یہ ہمارے نزدیک مشکوک ہو گئی اور ہم اس بات کو بالکل نہیں مانتے کہ متن میں کوئی تحریف اور غلطی نہیں ہوئی، لہٰذا اب آپ کا آئندہ مباحثہ یعنی تثلیث اور الوہیت مسیح کے مسائل میں، ان کتابوں سے استدلال کرنا کسی طرح جائز اور درست نہیں ہے، کیونکہ اب آپ کی یہ کتب مقدسہ اور ان سے استدلال ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔''

پادری فرنچ نے کہا کہ ''آپ نے یہ ساری تحریفات اور اغلاط ہماری تفسیروں سے نکالی ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری تفاسیر آپ کے نزدیک معتبر ہیں۔ چنانچہ ان مفسرین نے جیسے ان تحریفات اور اغلاط کے بارے میں لکھا کہ فلاں فلاں مقامات پر تحریف ہوئی ہے، لہٰذا پتہ چلا کہ ان کے تمام اقوال معتبر ہیں۔ چنانچہ یہی مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ تثلیث وغیرہ کے عقائد تحریف سے محفوظ رہے ہیں۔''

یہ دلیل سن کر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فوراً پادری فنڈر کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا ''آپ نے بھی تفسیر بیضاوی اور کشاف کے حوالے دیئے تھے۔''

پادری فنڈر نے کہا کہ ''ہاں۔''

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے فرمایا:

''پادری صاحب! ان دونوں مفسرین کی وہ باتیں جو آپ کے مفید

۱۔ آدابِ مناظرہ میں سے یہ بھی ہے کہ دونوں مناظر اس کتاب سے استدلال کریں جس کو دونوں فریق مانتے ہوں۔ اسی وجہ سے مولانا کیرانویؒ نے قرآن و حدیث سے استدلال نہیں کیا کیونکہ پادری فنڈر قرآن اور حدیث کو نہیں مانتا تھا۔ اسی طرح پادری فنڈر کو بھی چاہیے تھا کہ وہ بھی اناجیل کے غیر محرف ہونے کے اثبات سے پہلے ان سے استدلال نہ کرتا، لیکن وہ اناجیل کو غیر محرف کیا ثابت کرتا اس نے تو خود اس کے محرف ہونے کا اقرار کر لیا لیکن اس کا نام ''سہو کاتب'' رکھ لیا۔ اسم کی تبدیلی سے مسمی میں تبدیلی نہیں آتی۔

Marfat.com

مطلب تھیں وہ آپ نے نقل کر دیں، لیکن ان دونوں نے اور ان کے علاوہ دوسرے تمام مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ انجیل میں تحریف ہوئی ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور آپ کے منکر کافر ہیں اور بلا شک وشبہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ تو کیا ان کی یہ باتیں بھی آپ مانتے ہیں؟''

پادری فنڈر نے کہا کہ ''نہیں۔''

اب حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ ''اسی طرح ہم آپ کے علماء کی یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ بائیبل میں اتنی ساری تحریفات کے باوجود عقیدۂ تثلیث وغیرہ تحریف سے یقینی طور پر محفوظ ہے۔''

پادری فنڈر نے پھر کہا کہ ''مجھے ''ہاں'' یا ''نہ'' میں جواب دو کہ تم متن کے تحریف سے محفوظ ہونے کو تسلیم کرتے ہو یا نہیں؟''

حضرت مولانا کیرانویؒ نے جواب دیا کہ ہم اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے کہ بائیبل میں اتنی ساری تحریفات کے باوجود عقیدۂ تثلیث وغیرہ تحریف سے یقینی طور پر محفوظ ہے۔ کیونکہ وہ متن جو آپ کے نزدیک مقصود اصلی ہے وہ ہمارے نزدیک تحریف کے سبب مشکوک ہوگیا ہے۔ اور آپ نے پہلی مجلس میں اس کا خود اعتراف کرلیا کہ سات آٹھ مقامات پر تحریف ہوئی ہے۔ اور دوسری مجلس میں آپ نے یہ تسلیم کیا کہ بائیبل کی عبارات کا چالیس ہزار اختلاف ہے جس کو آپ نے ''سہو کاتب'' کا نام دیا حالانکہ ہمارے نزدیک یہ تحریف کتاب ہے۔ اس بارے میں ہم نے یہی ثابت کرنا تھا جو کر دیا۔

چنانچہ ہم نے عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں کو اللہ کے فضل وکرم سے مشکوک اور محرف ثابت کر دیا ہے۔ اور متن یعنی مقصود اصلی کو غیر محرف ثابت کرنا یہ آپ کے ذمہ ہے۔ اور ہم اس مسئلہ پر متواتر دو ماہ تک آپ سے مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن ہم آپ کو اب بائیبل سے استدلال نہیں کرنے دیں گے۔ کیونکہ محرف ثابت ہونے کے بعد یہ اب ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔

اب اگر تثلیث اور نبوت کے بارے بائیبل کے علاوہ کوئی اور دلیل ہے تو وہ

پیش کریں، ہم اُسے پوری توجہ سے سننے کے لیے تیار ہیں۔

پادری فنڈر نے کہا کہ:

''بہر حال عقیدۂ تثلیث وغیرہ میں تحریف نہیں ہوئی اور اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوا۔ اس لیے جب تک آپ اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے میں آگے بحث نہیں کروں گا۔ کیونکہ تثلیث کے عقیدے میں ہم بائبل ہی سے استدلال کریں گے۔''

اب حاضرین میں سے مولانا فیض احمد نے اُٹھ کر کہا کہ:

''یہ عجیب بات ہے کہ آپ ایک کتاب کے اتنے بڑے حصے میں تحریف کا اقرار کرتے ہیں، اس کے باوجود آپ کو اس پر بھی اصرار ہے کہ اُسے بے نقص مانا جائے۔ اس بات پر بحث ختم ہوگئی۔ اور دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کو رخصت کیا۔

اس مناظرے کی عالمگیر شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ کے شیخ رفاعی خولی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے اس مناظرے کا حال مکہ مکرمہ میں اُن بے شمار لوگوں سے سنا جو اس مناظرے کے بعد حج کے لیے آئے۔ یہاں تک کہ یہ بات تواتر معنوی کی حد تک پہنچ گئی کہ پادری فنڈر اس میں مغلوب ہوا تھا۔'' (البحث الشریف علیٰ ہامش اظہار الحق: جلد ا ص ۵)

Marfat.com

تحریری بحث

جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے کہ دوسرے روز کے مناظرے میں حاضرین کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ اس اجلاس میں بھی تحریف انجیل کی بحث جاری رہی لیکن پادری صاحبان (فنڈر اور فرنچ) ہر موقع پر مناظرے سے گریز کرتے رہے۔ کبھی خلط مبحث کر کے اور کبھی خواہ مخواہ ناراض ہو کر۔ شکست خوردہ کی برافروختگی طبعی امر ہے، اس لیے پادری فرنچ ہر موقع پر ترش روئی کا اظہار کرنے لگے۔ چنانچہ یہ مناظرہ بھی بلا اختتام بحث ختم ہوا، مگر پادری فنڈر نے اس مناظرے اور مجمع عام میں گفتگو سے پہلوتہی کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد وزیر خان سے مراسلت جاری رکھی۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا دعویٰ تھا کہ جس مذہب کی تم دعوت دیتے ہو اس کی آسمانی کتاب اپنی اصلی حالت میں نہیں ہے اور جس کتاب کو تم مذہبی کتاب کہتے ہو وہ ناقابل اعتبار ہے۔ مذہب عیسوی کے پیشواؤں نے انجیل میں بہت تحریف کر دی ہے، بدیں وجہ آج دنیا میں دین عیسوی کی بنیاد بالکل کھوکھلی ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ مناظرۂ اکبر آباد میں یہ شرط خاص اہمیت کی حامل تھی کہ اگر حضرت مولانا رحمت اللہ قدس سرہ پادری فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے تو مذہب عیسوی اختیار کر لیں گے اور اگر پادری فنڈر حضرت مولانا کیرانویؒ کے سوالات کا جواب نہ دے سکا تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔ اس مناظرہ میں پادری فنڈر کے ذمہ نسخ و تحریف بائیبل کا رد اور اثبات تثلیث تھا جبکہ حضرت مولانا کیرانویؒ کے ذمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات، قرآن حکیم کا آج تک تحریف اور تغیر سے بالکل محفوظ

Marfat.com

آسمانی کتاب ہونا اور ابطال تثلیث کے ساتھ تحریف انجیل کا مدلل ثبوت پیش کرنا تھا۔ حضرت مولاناؒ نے اپنی خداداد قابلیت اور تائید غیبی سے دو روز کے مناظرہ میں اس کو ثابت کر دیا کہ موجودہ اناجیل جن پر ان پادریوں اور عیسائیوں کو ناز ہے، تحریف شدہ ہے جس کا اقرار پادری فنڈر نے جلسۂ عام میں کرلیا۔

تیسرے روز مناظرہ نہ ہوا اور پادری فنڈر نے مجمع عام کے سامنے آنے کی بجائے اپنی خفت مٹانے کے لیے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو خط لکھا کہ:

> ''آپ نے مناظرہ میں جن عبارتوں کے حوالے دیئے ہیں، آپ کے کہنے پر میں نے سمجھ لیا کہ ایسا ہی ہوگا، لیکن میں ''حل الاشکال'' بھیج رہا ہوں، اس میں ملاحظہ کیجیے۔ وہ مقصد نہیں ہے جو جناب نے بیان کیا ہے۔''

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے اس گریز کا بڑا مدلل اور معقول جواب دیا۔ حضرت مولانا کیرانویؒ اور پادری فنڈر کے مابین یہ خط و کتابت یکم مئی 1854ء سے شروع ہوئی اور 16 اگست 1854ء کو ختم ہوئی۔

اس مناظرہ کی پوری کیفیت اور روئیداد ''البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف'' کے نام سے وزیر الدین صاحب نے مرتب کی جو حافظ محمد عبداللہ صاحب کے اہتمام سے 1270ھ میں ''فخر المطابع'' شاہجہان آباد (دہلی) میں کتابی شکل میں چھپی اور ولی عہد مرزا فخر الدین بن سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے حکم سے چھپ کر اور انہی کے حکم سے ہندوستان کے اکناف و اطراف میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کتاب صرف مناظرۂ اکبر آباد اور حضرت مولانا مرحوم اور پادری فنڈر کے آخری خطوط کا مجموعہ ہے۔

مناظرہ اکبر آباد (آگرہ) کو چھوٹی تقطیع پر حصہ اول ''مباحثہ مذہبی'' اور دوسرا حصہ ''مراسلات مذہبی'' کے نام سے سید عبداللہ صاحب اکبری آبادی نے منشی محمد امیر صاحب کے اہتمام سے ''مطبع منعمیہ'' اکبر آباد 1271ھ میں چھپوایا۔ پہلا حصہ فارسی میں تقریری مناظرہ کی روئیداد ہے۔ جبکہ دوسرے حصے میں ڈاکٹر محمد وزیر خان صاحب اور پادری فنڈر کا تحریری مناظرہ اردو میں ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ ''اظہار الحق'' کے حاشیہ پر چھپا

Marfat.com

ہوا ہے۔ جو مطبعۂ محمودیہ قاہرہ میں 1317ھ میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ یہ مناظرہ بلا اختتام بحث ختم ہوا اور پادری فنڈر نے عام اجلاس میں گفتگو سے پہلوتہی کرتے ہوئے حضرت مولانا کیرانویؒ سے خط و کتابت شروع کردی۔ اس سے قبل پادری فنڈر نے ڈاکٹر وزیر خان سے بھی مراسلت جاری کی تھی اور اس میں بھی پادری فنڈر لاجواب ہوگیا تھا، اس لیے ڈاکٹر وزیر خان نے اپنے پہلے خط میں پادری فنڈر کو لکھا تھا کہ:

> ''پہلے آپ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی باتوں کا جواب دیجیے، اس کے بعد اگر مباحثہ کرنا ضروری ہے تو اپنی کتب دینیہ سے ہاتھ دھو کر اور اس کو موافق اصلاح اہل اسلام کے منسوخ و محرف مان کر تثلیث کے میدان میں قدم رکھیے۔ جب یہ مسئلہ طے ہو جائے گا تو حضرت خاتم الرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے عنوان پر گفتگو کی جائے گی۔''

اب جو پادری فنڈر اور حضرت مولانا کیرانوی کے درمیان مراسلت ہوئی وہ صرف آٹھ خطوط پر مشتمل ہے۔ چار خط پادری فنڈر نے حضرت مولاناؒ کو لکھے اور ان خطوط کے جواب میں مولانا مرحوم نے چار خط پادری فنڈر کو ارسال فرمائے۔ پادری فنڈر نے پہلا خط اسی روز لکھا جس روز دوسرے دن کے مناظرے کا اجلاس ختم ہوا۔ یہ خط و کتابت 12 رجب 1270ھ مطابق 11 اپریل 1854ء کو شروع ہوئی 24 رجب 1270ھ مطابق 23 اپریل 1854ء تک جاری رہی۔ اس قلمی بحث میں بھی پادری فنڈر اپنی ہٹ دھرمی پر جما رہا اور ان حضرات کے اتمام حجت کر دینے کے باوجود وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ یہ مراسلت بھی ''البحث الشریف'' میں محفوظ ہے۔

حضرت مولانا امام الدین صہبائی شہید فرنگ نے حسب ذیل تاریخ اس مناظرۂ کبریٰ کے بارے میں کہی تھی

یافتہ در آگرہ محفل بحث انعقاد
مومن و ترسا بہم آمدہ در گفتگو

Marfat.com

حرف نصاریٰ کہ ما در رہِ حق می رویم
تابرند از میان گوئے علو از غلو
زاں طرف اندر کلام پادریٔ نکتہ سنج
زیں طرف اندر سخن فاضل انصاف گو
ہادم بنیانِ شرک، ماحی آثار کفر
واقف ہر برگ و ساز و از ہر رنگ و بو
ہر دو بانداز بحث ساختہ ساز سخن
ہر دو بقصد ستیز آمدہ در گفتگو
کردہ در آں تنگنا عالم و جاہل ہجوم
صف بصف استادہ خلق منتظر از ہر دو سو
دعویٔ تحریف را کامدہ برروئے آب
تا بزنندش بہم رفتہ بسے جستجو
لیک بتائید حق نصرت ایں رخ نمود
شاہد مطلب شتافت برحسب آرزو
پادری آمد بگفت ایں کہ در انجیل ما
حرف غلط چل ہزار آرے گو آوردہ رو
زیں سپس آوازہ داد من بمیاں عاجزم
برد بمیدان علم حضرت مخدوم گو
ہاتفے گفتا کہ تو سال پئے فتح دیں
پادری الزام خورد از مدد حق بگو

(ازالۃ الشکوک: جلد۲ص۴۷۶)

اس مناظرہ کے بعد 11 اپریل 1854ء سے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور پادری فنڈر کے مابین اس امید پر کہ دوبارہ مناظرہ کیا جائے گا، خط و کتابت شروع ہوئی۔ یہ مراسلت آٹھ خطوط پر مشتمل ہے۔ چار خط پادری فنڈر نے حضرت مولانا

Marfat.com

کیرانویؒ کو لکھے اور ان خطوط کے جوابات میں مولانا کیرانویؒ نے چار خط پادری فنڈر کو ارسال فرمائے۔ اس مراسلت کے چند ضروری اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں تاکہ پادری فنڈر کی دیانت داری کی حقیقت آشکار ہو سکے۔ پادری فنڈر نے 18 اپریل 54ء کو حضرت مولانا کیرانوی کو یہ خط لکھا:

''اولاً مناظرہ اسی قاعدے اور ترتیب پر رہے گا جس پر دونوں فریق پہلے اپنی رضامندی ظاہر کر چکے ہیں۔

ثانیاً پہلی شرط سے جس کا ذکر جناب نے اب کے خط میں کیا ہے، اس سے نہ مجھے اور نہ پادری فرنچ کا کوئی انکار ہے۔ اگرچہ سبب تطویل ہو گی لیکن مباحثہ دونوں گذشتہ اجلاس میں ہم لوگوں کے نزدیک بدیں مضمون تمام ہوا یعنی ہم اقرار کرتے ہیں کہ توراۃ میں اصول ایمانیہ میں بلکہ صرف فروعات میں نسخ ہوا ہے، اور پھر صرف اس مضمون سے کہ فروعات نے مسیح کے ظہور سے انجام و اختتام پایا۔ اور انجیل کی بابت ہماری بات یہ تھی کہ نہ منسوخ ہوئی نہ ہو گی، مسیح کے اس قول کے مطابق جو انجیل میں یعنی لوقا کے 21 باب آیت 33 میں مرقوم ہے۔

پھر ادعائی تحریف کے جواب میں ہمارا موقف یہ تھا کہ تحریف و تبدل از سہو کاتبان وغیرہ نقطوں اور حروف اور بعض لفظوں اور آیتوں میں بھی ہوا ہے۔ اور یہ کہ ہمارے علماء نے قدیم نسخوں سے تیس ہزار غلطیاں اس طرح کی نکالی ہیں مگر نہ یہ کہ ہر نسخہ میں اتنی غلطیاں واقع ہوئی ہوں، بلکہ قدیمی نسخوں سے جو شمار میں چھ سو پچاس سے کچھ اوپر ہیں، مذکورہ غلطیاں نکال دی ہیں، اور بعض میں کم اور بعض میں زیادہ غلطیاں پائی گئیں۔ (اور اگر ان تیس ہزار غلطیوں کو چھ سو پچاس نسخوں پر بحساب مساوی تقسیم کریں تو فی نسخہ چھیالیس غلطیاں نکلتی ہیں نہ زیادہ) اور یہ بھی ذکر ہوا کہ ان سب

نسخوں کا مقابلہ کرنے سے اکثر غلطیاں صحیح کی گئیں۔ چنانچہ اب صرف تھوڑے الفاظ اور صرف چند آیات مشتبہ رہی ہیں۔
پھر یہ کہ ہم نے ان عالموں کی گواہی جنہوں نے قدیمی نسخے مقابلہ کرنے میں اپنی ساری عمر صرف کی ہے، پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ باوجود سہو کاتبان وغیرہ انجیل کے اصل متن یعنی اصل مطلب میں کچھ بھی فرق نہیں پڑا بلکہ وہ اپنی اصل پر ہے۔ چنانچہ سب تعلیمات اور احکام انجیل اب بھی بعینہ وہی ہیں جو پہلے تھے۔ اور یہ بات ان علماء کی گواہی کے مطابق یہ ہے کہ انجیل کے جو نسخے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں موجود تھے، ان سے اگر ان نسخوں کا مقابلہ کیا جائے تو یہی بات معلوم ہوتی ہے۔"

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پادری فنڈر کو اس کے اس خط کا حسب ذیل جواب ارسال فرمایا:

"آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا، لیکن نو مقامات پر اجمال اور ابہام کی وجہ سے مطلب واضح نہیں ہو سکا، لہٰذا تفصیلی جواب لکھنے سے قبل ان مقامات کی وضاحت اور ایک اور بات کا تعین ضروری ہے۔ لہٰذا ان مقامات کی تشریح کر دیں اور اب کہ بار اجمال و ابہام سے کام نہ لیجئے گا۔

توریت میں اصول ایمانیہ میں نہیں بلکہ صرف فروعات میں نسخ ہوا ہے۔ جو کلام اب کے جلسوں میں اس نسخ پر ہوا تھا، جو مصطلح اہل اسلام ہے اور فقط اوامر و نواہی میں آتا ہے، اور اسی کی تشریح و تفصیل میں نے اجلاس اول میں کی تھی، اور اسی کے اثناء ذکر میں احکام تورات کی منسوخیت آپ کی زبان پر آئی تھی، اور اسی کے موافق میں نے پہلے عریضہ میں بھی لکھا تھا۔ تو غالباً اس جگہ نسخ سے مراد آپ کی وہی ہوگی، گو اس کا نام تکمیل بھی رکھیں، لیکن اس کی تصحیح

Marfat.com

کر دیجئے۔ اور یہ بھی بتلا دیجئے کہ اس معنی کر کے جس میں ہمارا کلام ہی آپ کے نزدیک وہ اصول ایمانی ہیں جن پر وہ نسخ طاری نہیں ہوتا، تمام تورات موسیٰؑ میں سوائے احکام عشرہ کے کچھ اور بھی ہیں۔ اگر ہیں تو ان کی تفصیل بیان کیجیے۔

''تحریف وتبدیل از سہو کاتبان وغیرہ نقطوں اور حروف اور لفظوں میں اور بعض آیتوں میں ہوا ہے'' اس میں غالباً لفظ وغیرہ کا عطف سہو پر ہوگا اور یہی آپ کی مراد ہوگی کہ سہو کاتبان اور غیر سہو سے یعنی قصداً جیسا کہ آپ نے اجلاس دوم میں بھی کہا تھا۔ اور تحریف قصدی اہل بدعت بلکہ تحریف قصدی دیندار عیسائیوں کا بھی طریقہ ہے اس کا بعض عیسائی محققین نے اقرار بھی کیا ہے۔ اگر آپ کی یہی مراد ہے تو تصریح کر دیجئے۔ اور اسی طرح اس بات کی بھی تصریح کر دیجئے کہ بعض آیتوں سے وہی آٹھ آیتیں مراد ہیں جن میں اس تحریف کو جس کے ہم مدعی ہیں، آپ نے قبول کیا تھا یا اس سے زائد بھی ہیں۔ اگر اتنی ہی ہوں تو ان جگہوں کو حیطۂ تحریر میں لائیں کہ فلاں فلاں آیت ہے تاکہ ہم آپ کے موقف سے آشنا ہوں اور طرفین کے دستخط ہو جانے کے بعد دوسری آیتوں کو جو ان کے علاوہ ہیں اور ہم نے ان کو نکال رکھا ہے، اگلے اجلاس میں پیش کر کے ان کے حسن وقبح پر مطلع ہو جائیں۔ اور اگر لفظ بعض پچاس ساٹھ کو بھی شامل ہے تو اس کی تصریح بھی کر دیجئے۔ اور اس صورت میں بھی اگر آپ سے سب کی تفصیل نہ ہو سکے تو دس بڑے بڑے مقامات کی تفصیل کر دیجئے۔ یہ بات کہ ''ہمارے علماء نے تیس ہزار غلطیاں.........'' اس سے کیا مراد ہے؟ آیا یہ سب مشہور مصححین جنہوں نے اٹھارویں صدی میں دوسرے نسخوں سے مقابلہ کر کے آج تک اتنی ہی غلطیاں نکالی ہیں یا یہ کہ بعض

Marfat.com

مصححین نے بعض اوقات میں اور اسی طرح چھ سو پچاس نسخے سے کیا مراد ہے؟ آیا یہ کہ آج تک اتنے ہی نسخوں سے مقابلہ کیا گیا ہے یا یہ کہ بعض اوقات میں اتنوں سے کیا گیا ہے؟ گو اس وقت میں بھی اور سے مقابلہ کر کے غلطیاں نکالی ہوں۔ اور دوسری صورت میں اس مقابلہ کرنے والے کا نام کیا تھا؟

اور یہ مقام ''اب صرف تھوڑے الفاظ اور صرف چند آیات مشتبہ رہی ہیں۔'' جو کل تیس ہزار تھا تو اکثر کا اطلاق نصف سے کچھ زیادہ پر ہو سکتا ہے۔ پس تھوڑے الفاظ سے کیا مراد ہے؟ آیا ہزاروں جو پندرہ ہزار سے کم ہوں یا سینکڑوں یا دس بیس اور اسی طرح چند آیات سے کیا مراد ہے؟ اگر تھوڑے الفاظ اور چند آیات سے دس بیس الفاظ اور دس بیس آیات ہیں تو اس کی تفصیل فرما دیجئے۔

اور یہ مقام کہ ''سب تعلیمات اور احکام انجیل بعینہ وہی ہیں......''

اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟ آیا یہ کہ کوئی فقرہ کسی حکم یا تعلیم کا منحرف نہیں ہوا یا یہ کہ گو بعض جگہوں میں ایک فقرہ یا کئی فقرے بگڑ گئے ہوں گے۔ مگر جو وہی مطلب اور جگہ سے نکل سکتا ہے تو اصل مطلب میں آپ کے نزدیک کچھ نقصان نہیں آیا............''

پادری فنڈر نے اس خط کا جواب 21 اپریل 1854ء میں حسب ذیل دیا:

''عنایت نامہ موصول ہوا۔ جواب یہ ہے کہ آپ کے سوالات کے جوابات میں کتاب لکھنی پڑے گی نہ کہ خط کیونکہ ایک خط میں اس کی گنجائش کسی طرح نہیں۔ مگر ان سوالات کا جواب اس وقت ضروری بھی نہیں۔ اس لیے کہ آپ کے بعض سوالات ان مسئلوں سے منسوب ہیں جن پر مباحثہ ہو چکا ہے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ اگر آپ چاہیں تو ان کو آئندہ مباحثہ میں پیش کریں۔

میں نے تو صاف لکھا کہ پادری فرنچ صاحب کی اور میری دانست

Marfat.com

میں مباحثہ کس وجہ سے اور کس مقام تک اختتام پایا۔ اور یہ کہ وہ بات جو نسخ اور تحریف کے مباحثہ میں باقی رہی یہ ہے کہ آپ اپنے اس دعویٰ کو کہ انجیل کا مضمون بدل گیا، ثابت کیجیے۔

اور میں نے یہ بھی تحریر کیا کہ اگر مباحثہ پھر شروع ہو تو اسی بات سے شروع ہونا چاہیے نہ کہ کسی اور بات اور موضوع سے، مگر جناب نے اس کا کوئی جواب تحریر نہیں کیا بلکہ اور سوالات پیش کر دیئے۔ پس فرمائیے کہ آپ کو منظور ہے کہ مباحثہ اسی بات سے شروع ہو یا نہیں؟ اگر آپ کی بھی یہی مرضی ہے کہ مباحثہ پھر شروع ہو تو جو بات اس مسئلہ کی شامل ہے، آپ اُسے پیش کیجیے اور ہم سکون و تامل سے سن کر اس کا جواب دیں گے۔ لیکن مباحثہ سے پہلے جواب دینا ضروری اور لازم نہیں سمجھتے۔ اور اگر آپ کی رضامندی اس بارے میں نہ ہو تو مباحثہ موقوف رہے گا۔ اور میرے پہلے خط میں اس بات کی طرف اشارہ تھا۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے مذکورہ بالا خط کا جواب 23 اپریل 1854ء کو دیتے ہوئے آئندہ خط و کتابت سے پادری فنڈر کو منع فرما دیا، لہٰذا یہ تحریر مباحثہ بھی اس خط کے ساتھ ختم ہو گیا۔ مولانا کیرانویؒ نے پادری فنڈر کے خط کا جو جواب دیا اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

"عنایت نامہ ملا۔ پڑھ کر نہایت تعجب ہوا۔ افسوس کہ آپ گفتگو موقوف کرنے کے لیے ایک عذر لنگ بار بار زبان پر لاتے ہیں۔ بھلا جب آپ نے علیٰ رؤس الاشہاد اس مجموعہ اناجیل میں آٹھ مقامات پر آیات کی تحریف جن میں ایک مقام یوحنا کا پانچواں خط باب 8 آیت 17 بھی ہے، تسلیم کر لی اور سہو کاتب کی ایسی تفسیر کی جس کا وہی معنی ہے جس کے ہم مدعی ہیں، لہٰذا سہو کاتب کے ایک فرد بن گئے۔ اس لحاظ سے امکان تحریف کا کیا ذکر آپ کے نزدیک تو وقوع تحریف بالفعل مسلم ہو گیا۔ پھر جو آپ عدم تحریف مقصود اصلی

Marfat.com

اس مجموعہ کی واجب التسلیم کراتے ہیں کیا یہ صحیح انصاف ہے۔
غور فرمایئے جس قبالہ میں سات آٹھ جگہ جعل سازی پکڑی جائے اور صاحب قبالہ اس کو قبول بھی کرلے اور پھر دعویٰ کرے کہ اور جگہ اگرچہ ہم نے جعل سازی کی ہے مگر مقصد میں ہم نے جعل سازی نہیں کی، تو اس کی کون یہ بات تسلیم کرے گا۔ علاوہ ازیں جیسا کہ قبل ازیں بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہمارا کام آپ کے عنایت ناموں کے مطابق مسئلہ نسخ، مسئلہ تحریف اور مسئلہ تثلیث پر اعتراض کرنا ہے اور آپ کا کام ان اعتراضات کا جواب دینا ہے۔ پس انصاف فرمایئے کہ عدم تحریف کو ثابت کرنا یقیناً آپ کے ذمہ ہے۔ اور ہم نے تو اس مجموعہ میں مشکوکیت اور محرفیت اپنے دعویٰ اور منصب سے زیادہ ثابت کر دی ہے اور آٹھ مقامات پر مختلف آیات میں آپ نے اس کو تسلیم بھی کرلیا۔ لہٰذا ہم اپنے کام اور مقصد سے فارغ ہو گئے ہیں اب جواب اور عدم تحریف آپ کے ذمہ ہے۔ اور اب ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے جو اس مجموعہ کو مشتبہ کہیں۔ اور یہ مشتبہ کیوں نہ ہو کیونکہ جملوں اور آیات کا کیا ذکر اس کی اکثر کتابوں کی نسبت عیسائی علماء کو سلفاً اور خلفاً یہ شبہ رہا ہے اور بہت سے عیسائی علماء نے اقرار بھی کیا ہے کہ پطرس کا دوسرا خط، اور یعقوب کا خط اور یہودا کا خط اور یوحنا کا دوسرا اور تیسرا خط اور مشاہدات یوحنا انجیل نویسوں کے لکھے ہوئے نہیں جیسا کہ ان علماء کے اقوال کی تشریح رسالہ اعجاز عیسوی میں انشاء اللہ عنقریب آپ کے ملاحظہ سے گزرے گا، ہم نے کر دی ہے۔ پس اگر سند متصل اس مجموعہ اناجیل کی ہوتی تو ہرگز جید اور معتبر علماء ایسا نہ کہتے اور یہ اختلاف نہ ہوتا۔ اور اسی طرح انجیل متی جو کہ سب سے پہلی انجیل تصور کی جاتی ہے، اس کی بھی کوئی سند متصل نہیں۔ اور متقدمین کے

Marfat.com

مختار مذہب کے مطابق وہ عبرانی میں تھی۔ اور وہ اب صفحۂ دنیا سے گم ہے اور اس کا اب صرف یونانی ترجمہ پایا جاتا ہے اور وہ بھی بے سند کہ آج تک اس کے مترجم کا نام اور حال قطعی طور پر کسی کو معلوم نہیں۔ پس ایسی انجیل کو ہم کس طرح کلام اللہ تسلیم کریں۔ اور ترجموں کا حال تو زمانۂ قدیم سے اہل کتاب میں بہت ہی خراب چلا آ رہا ہے۔ یقینی طور پر اس کے مترجم نے بھی بہت کچھ خرابی کی ہوگی۔ شاید اسی وجہ سے ہم اس کو کئی جگہوں پر بہت غلط پاتے ہیں۔ پہلے باب ہی میں چھ فاحش غلطیاں اس میں موجود ہیں۔

عہد قدیم کی کتابوں کے بے سند ہونے کا ہم کیا ذکر کریں۔ پس ہم پر یہ سب بے سند کتابیں جن کے مصنفین کا بھی قطعی طور پر علم نہیں ہے، ہمارے لیے حجت نہیں ہوسکتیں۔ اور جو آپ نے اپنے دونوں خطوط میں کہا ہے کہ ایک ہی شرط پر گفتگو کریں گے اور بس، ہمارے نزدیک وہ شرط بالکل خلاف آداب مناظرہ ہے۔ یہ سب کچھ سمجھ کر آپ نے ایک عذر لنگ سے گفتگو موقوف کرنے کا حیلہ کیا ہے۔ ہم بھی مباحثہ کو قطعاً ختم کرتے ہیں، اور یہ ہمارا آخری خط ہے۔ ہم اس کے بعد آپ کو کوئی خط نہ لکھیں گے اور آپ بھی نہ لکھئے گا۔ لیکن اگر آپ یہ مباحثہ حیطۂ تحریر میں لا کر چھپوا دیں تو ضرور دو باتوں کو ذہن میں رکھئے گا۔ ایک تو یہ کہ ہمارے معنی اصطلاحی نسخ کے جن کی تشریح میں نے جلسہ اول میں کر دی تھی، تفصیل سے لکھ دیجئے گا۔ دوسرے جبکہ سب خطوط، اپنے اور میرے جو زبانی گفتگو سے قبل اور بعد میں تحریر ہوئے، اس مباحثہ کی کاروائی کے ساتھ چھپوا دیجئے گا تاکہ ناظر اس کو خود ہی معلوم کرلے گا کہ کون غالب رہا اور کون مغلوب، اور کون آداب مناظرہ کے خلاف کہتا تھا اور کون موافق.........." (البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف: ص ۸۵)

Marfat.com

پادری فنڈر سے مزید خط وکتابت:

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ سے اس خط و کتابت کے بعد پادری فنڈر اور ڈاکٹر محمد وزیر خان صاحب کے درمیان مزید خط و کتابت بھی تحریف بائبل کے سلسلہ میں ہوئی۔ اور اس مسئلہ کے سلسلہ میں مناظرہ اکبر آباد میں جو باتیں رہ گئی تھیں ڈاکٹر صاحب نے ان خطوط میں انہیں پادری فنڈر سے تسلیم کرایا۔ یہ خط و کتابت 15 مئی 1854ء تا 17 اگست 1854ء یعنی تین ماہ تک ہوئی۔ یہ خط و کتابت سید محمد عبداللہ شاہ صاحب اکبر آبادی نے کتابی شکل میں مباحثہ مذہبی حصہ اول کے نام سے مطبع منعمیہ، اکبر آباد میں باہتمام منشی محمد امیر خان 1271ھ میں طبع کرایا۔ یہ روئیداد فارسی زبان میں 188 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پادری فنڈر کے تیرہ اور ڈاکٹر وزیر خان کے چودہ خطوط ہیں۔ چنانچہ سید عبداللہ شاہ صاحب نے اس کتاب کے پیش لفظ (دیباچہ) میں اس کا ذکر کیا ہے:

> ''باوجودیکہ کسی اہل اسلام کے دل میں کبھی کسی طرح کا شک یا شبہ کسی زمانہ میں (اسلام کے بارے میں) ذرا سا بھی نہ آیا تھا۔ پھر تیرھویں صدی میں جب کہ پادریوں نے پھر اس تیرگی اور گمراہی کو اکسایا اور جہاں میں نقارہ علی الاعلان آنکھیں بند کر کے خلاف ہدایت کا بجایا، تب یہ بھی اسی نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے کہ اولاً عادل حقیقی نے مباحثہ تقریری میں مخالفین کو زک دی۔ اور جن باتوں کو ایک مدت سے پادری لوگ اپنی چالا کی سے چھپاتے اور مخفی کرتے چلے آتے تھے، ان کا اقرار کروایا۔ اور پھر بعض بعض باتیں جو اس مباحثہ کے وقت یونہی رہ گئی تھیں اور ان کا ذکر نہ آنے پایا تھا، اب ان خطوط کے ذریعہ ان کا بھی اقبال کرا دیا۔ علی الخصوص مسئلہ تحریف جو عمدہ مسائل متنازعہ فیہ میں سے ہے۔ مخالفین کی تحریر و تقریر سے بخوبی تمام کالشمس فی النہار پایۂ ثبوت کو

پہنچایا۔ اب بفضلہٖ وعنایتہٖ ہر ادنیٰ او اعلیٰ پر یہ بات واضح وآشکارا ہو جائے گی کہ یہ اناجیل اربعہ جو آج کل عیسائیوں میں مشتمل اور ان کی معتقد علیہ ٹھہرا رہی ہے، بے شک موضوعی ومصنوعی ہیں اور ہرگز بتامہا خدا کا کلام نہیں ہوسکتیں کیونکہ ان کے معتقدین اس بات پر متفق ہیں کہ آیتیں کی آیتیں اس میں سے نکالی گئیں اور آیتیں کی آیتیں مخالفین کے تصرفات سے اس میں بڑھا دی گئیں۔"

ان خطوط میں صرف تحریف انجیل پر ہی بحث چلی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد وزیر خان صاحب نے اپنے دوسرے خط میں پادری فنڈر کو مندرجہ ذیل اعتراضات تحریر کیے تھے۔

ڈاکٹر وزیر خان نے پادری فنڈر کو لکھا:

"میں چند اعتراض جو ڈاکٹر اسٹراس صاحب نے فقط اول ہی باب متی پر کیے ہیں، لکھتا ہوں۔ آپ ان کا جواب مہربانی کر کے لکھ دیجیے۔

اول: یہ کہ آیت 17 باب امتی میں یوں لکھا ہے کہ سب پشتیں ابرہام سے داؤد تک چودہ پشتیں ہیں۔ اور داؤد سے اس وقت تک کہ بابل کو اٹھا کر چلے گئے تھے چودہ پشت ہیں۔ اور بابل کے اُٹھ جانے سے مسیح تک چودہ پشتیں ہیں۔ پس اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نسب نامہ میں چودہ پشتوں کی تین قسمتیں ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ اگر نام گنے جائیں تو حضرت ابراہیم اور حضرت داؤد تک تو البتہ چودہ ہوتے ہیں کہ حضرت ابراہیم اور حضرت داؤد دونوں اسی قسمت اول میں داخل ہوں اور قسمت دوم میں یہکیدیا کو لے کر پورے ہوتے ہیں، لیکن قسمت سوم میں سب نام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سمیت صرف تیرہ ہیں۔ بس متی نے سہو سے ایک نام چھوڑ دیا۔ کس لیے کہ کاتب کے سہو کا تو گمان نہیں ہو سکتا اس لیے کہ "پورفری" نے بھی یہ اعتراض کیا تھا۔"

Marfat.com

''دوسرا: یہ کہ قسمت دوم میں جو حضرت سلیمانؑ سے شروع اور یہکیاہ پر ختم ہوتی ہے، متی چودہ پشتیں بتلاتا ہے۔ حالانکہ تواریخ کی اول کتاب کے باب تیسرے کو ملاحظہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یعنی حضرت سلیمان سے یہکیاہ تک اٹھارہ پشتیں ہوتی ہیں۔ اور اسی باب میں نیومن صاحب تاسف کی راہ سے کہتا ہے کہ دین عیسوی میں ایک اور تین کو ایک ماننا پڑا تھا۔ اب 14-18 کو بھی ایک ہی کہنا پڑا کیونکہ کتب مقدسہ میں تو غلطی کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا۔

تیسرا: یہ کہ متی آیت 8 میں ''عوزیا'' کو ''یورام'' کا بیٹا لکھتا ہے حالانکہ وہ اس کے پڑپوتے کا بیٹا ہے۔ اور جناب متی نے غلطی سے تین بادشاہوں کو چھوڑ دیا ہے۔ جیسا کہ آیت 11-21 باب 3 کتاب اول سے ظاہر ہے۔

چوتھا: یہ کہ ورس 11 میں متی نے یہکیاہ کو یوشیا کا بیٹا لکھا ہے حالانکہ وہ اس کا پوتا تھا۔ اور یہاں بھی متی سے ایک نام چھوٹ گیا ہے۔

پانچواں: متی نے یہکیاہ کے بھائی لکھے ہیں حالانکہ عہد عتیق کی کتابوں سے اس کا کوئی بھائی ثابت نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ البتہ اس کے باپ کے تین بھائی تھے۔

چھٹا: متی زور بابل کو شلتانیل کا بیٹا لکھتا ہے حالانکہ وہ اس کا بھتیجا اور فدایا کا بیٹا تھا۔

ساتواں: متی نے ابیور کو زور بابل کا بیٹا لکھا ہے حالانکہ اس کے بیٹوں میں یہ کسی کا بھی نام نہ تھا۔

پس جب ایک نسب نامہ میں جناب متی نے اتنی غلطیاں کی ہیں تو ان کی کتاب میں تو خدا جانے کتنی غلطیاں ہوں گی۔ لہٰذا سٹراس صاحب کہتے ہیں کہ جب یہ ثابت ہوا کہ مؤرخ کی تحقیق میں فتور ہے تو اس کا کلام قابل اعتبار نہیں۔

Marfat.com

اس کے علاوہ اسٹراس صاحب نے نسب نامہ پر اور بھی اعتراض کیے ہیں مگر بسبب خوف طوالت اتنے ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ آپ کے اخلاق سے امیدوار ہوں کہ اس کے جواب سے مطلع فرمایئے۔''

پادری فنڈر اول تو ان اعتراضات کا جواب دینے سے گریز کرتے رہے لیکن جب ڈاکٹر وزیر خان نے ان پر زور دیا تو بالآخر مجبور ہو کر انہوں نے 2 جون 54ء کو چوتھے خط میں یہ جواب دیا۔

''..........ان اعتراضوں کے جواب میں مذکور کروں گا جن کو آپ نے متی کے نسب نامہ کی بابت مسطور کیے ہیں۔

اولاً: جان لیجیے کہ نسب نامہ تفصیلاً بھی لکھا جاتا ہے اور اختصاراً بھی۔ چنانچہ تورات میں مثلاً روت کی کتاب کے آخری باب کی آخری آیتوں میں ایک نسب نامہ اختصار سے مرقوم ہے۔ اب متی حواری نے اختصاراً لکھ کر کئی ایک نام قصداً چھوڑ دیے، مثلاً وہ نام جن کا ذکر آپ نے کیا اور ایسا ہی پانچویں آیت میں بھی سلموں کے بعد کتنے نام چھوڑ دیئے گئے ہیں جن کو آپ نے ذکر نہیں کیا۔ اور آپ کی دریافت میں نہیں آئے۔ اب اختصاراً ذکر کرنے کا سبب متی حواری نے نہیں بتایا ہے۔ مگر ماورائے اور سبب کے ایک یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین قسم کے سبب چودہ چودہ پشت پر انہوں نے ایسے ہی کیا ہے۔

ثانیاً: لفظ بیٹا عبرانی میں بن اور لفظ بھائی عربی اخ دونوں زبان عبرانی ہیں۔ اور تورات کی بہت سی آیات میں خاص و عام دونوں معنی سے آیا ہے۔ پس بن بیٹا اور پوتا اور پڑپوتا اور آل اور نسل کے معنی اور اخ بھائی اور خویش اور اقرباء بھی معنی رکھتا ہے۔ اور اہل زبان اور انجیل دان کو معلوم ہے کہ الفاظ بیٹا ار بھائی انجیل کے اکثر مقاموں میں عبرانی محاورہ پر آئے ہیں۔ اور لفظ ''پیدا ہوا'' بھی ایسے عام معنوں میں آیا ہے یعنی کہ اس کی نسل سے ہے۔

Marfat.com

پس یہ ان اعتراضوں کا جواب ہے جن کو آپ الفاظ بیٹا اور بھائی کی نسبت بیچ میں لائے۔

ثالثاً: یہ کہ آپ کہتے ہیں کہ ان تین تقسیم پر ہر ایک کے واسطے چودہ پشت نہیں آتی ہیں، اور اس بات کو ایک بڑی غلطی بتاتے ہو۔ تو ظاہر ہے کہ متی حواری بھی کچھ عدد جانتا تھا اور پشتوں کا عدد اس طرح سے ہے کہ داؤد کا نام پہلی تقسیم کے آخیر اور پھر دوسری تقسیم کے شروع میں گننا چاہیے۔ اور اسی سبب سے ہے کہ وہ یہودیوں کا بڑا بادشاہ تھا اور اس کو یہ خاص وعدہ بھی دیا گیا تھا کہ مسیح اس کی اولاد سے پیدا ہوگا۔ اور پشت اصل یونانی میں گھنیا ہے نہ صرف ایک شخص یا ایک نسل سے بلکہ دو اور تین شخص سے بھی مراد ہے۔

رابعاً: رہی آپ کی ساتویں بات اور وہ یہ ہے کہ متی نے بیوو کو زور بابل کا بیٹا لکھا ہے حالانکہ اسی کے بیٹوں میں یہ کسی کا نام نہ تھا۔ تو آپ کی اس بات پر صرف اتنا ہی سچ ہے کہ اس کا ذکر تورات میں نہیں آیا۔ یہ کہ اس کا کوئی ایسا بیٹا یا پوتا یا رشتہ دار نہ تھا۔ آدم کے اور شیث اور انوس وغیرہ کے بھی سب بیٹوں کے نام مسطور نہیں ہوئے ہیں۔ دیکھئے پیدائش کے پانچ باب اور پھر وہ سب نام جو زور بابل کے بعد مذکور ہیں، وہ بھی تورات میں کہیں نہیں پائے جاتے ہیں، تو آپ کے قول کے موافق متی حواری نے ان کو بھی غلط لکھا ہوگا۔''

اس غیر معقول جواب کا ڈاکٹر محمد وزیر خان صاحب نے دلائل کے ساتھ 8 جولائی 1854ء کے چوتھے خط میں جواب الجواب حسب ذیل دیا:

''.......... آپ کا یہ قول کہ متی حواری نے اختصاراً لکھ کر کئی ایک نام قصداً چھوڑ دیئے.......... الخ۔

''عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کیونکہ اب تک ان پشتوں کا چھوٹ جانا

Marfat.com

صرف متی کے سہو پر حمل کیا جاتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ متی نے پاس سخن کے لیے قصداً چھوڑے، لہٰذا کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اسی طرح اس نے پاس سخن کے واسطے بالکل انجیل تیار کی ہوگی۔ پس آپ نے بیچارے متی کی دیانت میں فرق ڈالا۔ بستم یہ کہ آپ کے قول سے اور ایسا ہی پانچویں آیت میں بھی سلمون کے بعد کتنے نام چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ آپ نے ذکر نہیں کیا اور آپ کی دریافت میں نہیں آیا.......... الخ۔ آپ کی سعادت مندی ظاہر ہوتی ہے۔ جو بیچارے متی نے نہیں کیا، وہ بھی آپ اس کے سرتھوپ دیتے ہیں۔ اور صاحب اگر غلطی ہوئی تھی اور نام چھوڑے تھے تو کتاب اول اخبار الایام کے مصنف نے کیونکر اس کتاب کے دوسرے باب میں لکھا ہے..........

پس متی نے یہیں سے نقل کر لیا ہوگا۔ کیا آپ کے خیال میں متی نے عہد عتیق بھی نہ پڑھی تھی۔ ہاں اگر اعتراض ہے تو اس پر یہ ہے کہ چار سو برس کے عرصہ میں چار پشتیں ہوئیں۔ اور یہ قیاس سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ البتہ ہارٹلی صاحب نے یہ تو لکھا ہے کہ متی نے بعد زور بابل کے لیے نام چھوڑ دیئے ہیں۔

بست و یکم یہ کہ آپ کے اس قول سے کہ بن بیٹا، پوتا اور پڑپوتا اور آل اور نسل کے معنی اور اخ بھائی اور خویش اور اقربا بھی معنی رکھتا ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مسیح ہونا بھی مشکل پڑا، کیونکہ عہد عتیق سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسیح تو داؤد کی صلبی نسل سے ہیں۔ اور جب یہاں بن کا لفظ ایسا عام ہو گیا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مسیح اور داؤد میں کہیں دور کا رشتہ ہوگا۔

بست و دویم یہ کہ قول آپ کا اور پشتوں کا عدد اس طرح سے ہے کہ داؤد کا نام پہلی تقسیم کے آخیر اور پھر دوسری تقسیم کے شروع میں گننا

Marfat.com

چاہیے'' کچھ نیا جواب نہیں۔ یہ تو اوروں نے بھی لکھا ہے بلکہ ایسی پانچ توجیہیں اور بھی کی گئی ہیں کہ آپ کو نہیں معلوم، بھلا یہ کیا جواب ہے کہ ایک شخص کو دو دفعہ گن کے عدد پورا کرنا چاہیے۔ ایسے تو تیرہ کے 26 اور 39 ہو سکتے ہیں کیونکہ اس صورت میں دوسری قسمت میں جو یہکینیا پر ختم ہوئی ہے، پندرہ پشت ہو جائیں گی نہ یہ کہ قسمت سوم میں تیرہ کے چودہ ہوں۔ اس سے بہتر تو میں تمہیں ایک توجیہہ گھڑ دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ نے یوں کیوں نہ کہہ دیا کہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق مسیح میں دو صفتیں ہیں۔ الوہیت کی اور انسانیت کی، لہٰذا ان کو دو پشتیں لکھنا چاہیے۔ پس اس صورت میں تیرہ کے چودہ ہو جائیں گے۔''

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے بھی اپنے خطوط میں جب بھی پادری فنڈر کو یہ لکھا کہ تم نے انجیل میں آٹھ نو جگہ تحریف کو تسلیم کیا ہے تو انہوں نے اس کا یہی جواب دیا کہ آٹھ نو جگہ نہیں بلکہ تین چار جگہ سہو کاتب کی وجہ سے تحریف ضروری ہوئی ہے، لیکن ان سے عبارت کے مفہوم اور مطلب میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ چنانچہ یہی بات پادری فنڈر نے ڈاکٹر محمد وزیر خان کو بھی لکھی۔ اور اس کے سوا پادری فنڈر اور لکھ بھی کیا سکتا تھا۔ اس پر انہوں نے 8 جولائی 1854ء کے خط میں حسب ذیل مثالیں دے کر یہ ثابت کیا کہ اس تحریف سے صرف مطلب ہی خبط نہیں ہوا بلکہ احکام کے سمجھنے میں بھی فرق پڑا ہے۔

''قول آپ کا (پادری فنڈر کا) باوجود سہو کاتبان کے انجیل اسی مضمون اور مطلب پر ہے جو ہمیشہ تھی ...... الخ۔ عجیب حیرت افزا ہے، کیونکہ ذرا خیال کرنے کی بات ہے کہ جب کتب مقدسہ میں ایسے اختلافات عبارت کے جو آپس میں ایک دوسرے کے متناقض ہوں، پائے جائیں اور ان میں کسی کو بالجزم نہ کہا جا سکے کہ یہی اصل مصنف کی عبارت ہے بلکہ دونوں پر صدق اور کذب کا احتمال ہو تو بھلا اس صورت میں اس مسئلہ پر کہ جس سے وہ عبارتیں

متعلق ہیں کیونکر حکم قطعی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا بہت سے مسئلوں میں شبہ رہا، مثلاً حلت وحرمت کے مسئلے ہیں۔ اب نہیں معلوم ہوسکتا کہ کون سے جانور بنی اسرائیل پر حلال تھے۔ آیا وہ کہ جن کی پچھلی ٹانگیں اگلے پاؤں سے لپٹی ہوئی تھیں یا وہ کہ جن کی پچھلی ٹانگیں اگلے پاؤں سے لپٹی ہوئی نہ تھیں۔ اس طرح کی آیت 21 باب 11 کتاب احبار کی دو عبارتیں موجود ہیں۔ ایک وہ جو متن میں ہے، سو یہ ہے۔

"پر تم سب رینگنے والے پرندوں میں سے جو چار پاؤں سے چلتے ہیں اور ان کی پچھلی ٹانگیں اگلے پاؤں سے لپٹی ہوئی نہیں ہیں، وہ اُن سے کود کر زمین پر چلتے ہیں تم ان میں سے کھاؤ"

اور اس جملہ کے عوض اور ان کی پچھلی ٹانگیں اگلے پاؤں سے لپٹی ہوئی نہیں ہیں..........الخ۔ عبرانی نسخوں کے حاشیہ پر اور نسخوں سے عبارت لے کر لکھی ہے اور ان کی پچھلی ٹانگیں اگلے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہیں۔ اور اسی حاشیہ کی عبارت کو اب عیسائی لوگ ترجمہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ترجمہ انگریزی مہری و ترجمہ ہندی و فارسی میں یہی عبارت ترجمہ ہوئی ہے۔ یا لونڈی کے مسئلہ میں کوئی شخص اُسے آزاد کرے۔ آیا وہ شخص جس نے اُسے اپنے لیے نامزد کرلیا ہے یا وہ شخص جس نے اُسے نامزد نہیں کیا۔ کیونکہ کتاب خروج کے باب 21 کی بھی دو عبارتیں منقول ہیں۔ ایک جو متن میں ہے وہ یہ ہے اگر وہ آقا اس کا جو اُسے نامزد نہیں کر کے رہ گیا، ناراض ہو تو اس کا فدیہ دے..........الخ۔ اور حاشیہ پر عبرانی نسخہ کی یوں عبارت نقل کی ہوئی ہے۔ اگر وہ آقا اس کا جو اُسے اپنے لیے نامزد کر کے رہ گیا ناراض ہو تو اس کا فدیہ دے کے..........الخ۔ اور پہلی عبارت ترجموں میں لکھی جاتی ہے۔ یا حضرت مسیح کی زانیہ عورت کو بے سزا دیئے چھوڑ دیئے جانے کا مسئلہ جو یوحنا کی انجیل کے آٹھویں باب میں مرقوم ہے کیونکہ اس میں بھی بہت سے اختلافات عبارت کے ہیں، بلکہ بہت سے عیسائی علماء نے ان ورسوں کی صداقت پر گفتگو کی ہے۔ اور اسی طرح سے اور بہت سے مسئلے مشتبہ ہیں لیکن بخوف طوالت میں اتنوں پر ہی اکتفا کرتا

Marfat.com

ہوں۔ پس آپ سے مجھے تعجب آتا ہے کہ باوجود ایسے اختلافات عبارت کے آپس میں متناقض ہیں۔ پھر آپ اس منہ سے کہتے ہیں کہ باوجود سہو کاتبان کے اب انجیل اسی مضمون اور مطلب پر ہے جو ہمیشہ تھی۔"

پادری فنڈر نے ڈاکٹر وزیر خان کے ان حقائق کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ تحریری مباحثہ کو ختم کرنے کے لیے 16 اگست 1854ء کو حسب ذیل خط ڈاکٹر صاحب کو تحریر کیا:

"فنڈر ڈاکٹر محمد وزیر خان سے عرض کرتا ہے کہ میں نے اپنے آخری خط میں اس بات کا اشارہ کیا اور اب صاف لکھتا ہوں کہ ان صاحب سے نہ کوئی اور خط قبول کروں گا اور نہ ان کو خط لکھ بھیجوں گا۔ کیونکہ صاحب موصوف غیر مناسب اور بے جا بات لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے بلکہ طعن و بہتان بھی علاوہ کیا ہے۔ پس اس کے لائق نہ ٹھہرے کہ آئندہ ان سے یہ رسم خط و کتابت جاری و برقرار رہے۔ لہٰذا ان کا خط بے کھولے اور بے پڑھے واپس کر دیتا ہوں۔ اور صاحب ممدوح پھر خط میرے پاس نہ بھیجیں کہ میں قبول نہ کروں گا۔ جو ان صاحب کے خط کا ضروری جواب تھا سو میرے اخیر خط میں ادا ہوا ہے۔ اور اگر وہ صاحب چاہیں کہ اور جو کچھ لکھیں تو لکھ کر چھپوا دیں۔ اور اگر جواب کے لائق ہو گا تو میں بھی چھاپے کی راہ سے جواب دوں گا۔"

پادری فنڈر کے اس خط کے جواب میں ڈاکٹر وزیر خان صاحب نے خط لکھا کہ نہ میں نے کوئی بہتان لگایا ہے اور نہ ہی کوئی سخت بات اپنے خطوط میں لکھی ہے۔ اور جس طرح آپ نے میرا خط واپس کیا ہے میں بھی آپ کا خط واپس کرتا ہوں۔ چنانچہ اس طریقے سے یہ خط و کتابت ختم ہو گئی۔

روئیداد اور مناظرہ کی تدوین:

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر کے مابین آگرہ میں جو

Marfat.com

مناظرہ ہوا اس کی روئیداد کو منضبط اور مدون کرنے کے لیے اس مجلس میں دو آدمی موجود تھے جنہوں نے ساری بحث کو حیطۂ تحریر میں لا کر حاضرین مناظرہ سے اس پر تصدیقی دستخط کروائے تا کہ کسی کو اس کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہ ہو۔

اس سلسلہ میں پہلی شخصیت مولانا وزیر الدین ولد شرف الدین کی تھی۔ جو دونوں اجلاس میں موجود تھے اور نسخ اور تحریف کے بارے میں دونوں مناظرین کے مابین جو بحث ہوئی، اس کو مدون کیا۔ اور مناظرہ سے قبل اور اس کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ اور پادری فنڈر کے مابین اور ڈاکٹر محمد وزیر خان اور پادری فنڈر اور اس کے شریک مناظر کے مابین جو بھی خط و کتابت ہوئی، اس کو بھی منضبط کیا۔ مناظرہ کی اس ساری روئیداد اور مراسلت کی تدوین کو ''البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف'' کا نام دیا گیا اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر، سلطان دہلی کے صاحبزادے اور ولی عہد سلطنت مرزا فخر الدین نے اس کو 1270ھ میں مطبع فخر المطالع دہلی سے اپنے خرچ پر طبع کروا کر ہندوستان کے طول و عرض میں اس کی کاپیاں بھیجیں تا کہ وہ لوگ جو اس مناظرہ میں شریک نہیں ہو سکے تھے، وہ بھی اس سے مستفید ہوں۔ اور دوسری غرض اس کی نشر و اشاعت سے یہ تھی کہ عیسائیت کا جو فتنہ حکومت کی سرپرستی میں ہندوستان کے قریباً سبھی شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اس کی اصل حقیقت سے لوگ واقف ہو جائیں اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ڈاکٹر محمد وزیر خان مرحوم نے آگرہ کے اس اہم مناظرہ میں عیسائیت کے بنیادی مسائل کی جس طرح دھجیاں بکھیری ہیں، سارے ہندوستان کے علماء اور خواص بلکہ عوام بھی ان دلائل سے آشنائی حاصل کر کے اپنے اپنے شہروں میں عیسائی پادریوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے آگرہ میں فتنۂ عیسائیت کے تار و پود کو جس طرح بکھیرا اور ہندوستان کے سب سے بڑے پادری فنڈر کو جو شکست فاش دی، اس کی صدائے بازگشت نہ صرف ہندوستان میں سنی گئی بلکہ پوری دنیا میں اس سے عیسائیت پر ایک ضرب کاری لگی۔ چنانچہ اس مناظرہ نے پوری دنیا میں عیسائی پادریوں کا ساز و رشور ختم کر کے رکھ دیا۔

1270ھ کو اس مطبوعہ روئیداد اور مناظرہ میں تعلیقہ کے طور پر جناب محمود جان

Marfat.com

کے استفتاء کا وہ جواب بھی لگایا گیا ہے جس میں انہوں نے مسلمان علماء سے پوچھا تھا کہ جو انجیل آج عیسائی دنیا میں موجود ہے اور جس کو آج تمام عیسائی عہد نامۂ جدید کا نام دیتے ہیں۔ کیا اسی انجیل کا تذکرہ قرآن حکیم میں ہے یا وہ کوئی اس سے مختلف انجیل تھی؟ اس ''البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف'' نامی روئیداد کے ساتھ مولانا امین الدین ولد فرید الدین کا حاشیہ بھی ہے اور فضل حسین کے تین سوالوں کے جوابات بھی ضمیمہ کے طور پر اس میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں حاضرین مناظرہ کی وہ تصدیقی شہادتیں بھی ہیں کہ یہ ساری روئیداد درست اور صحیح ہے۔ یہ ساری بحث 155 صفحات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ یہ فارسی روئیداد زیور طباعت سے آراستہ ہو کر ہندوستان کے علاوہ چاردانگ عالم میں پہنچی، خصوصی طور پر مراکز اسلامیہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور ترکی میں سلاطین عثمانیہ کی خدمت میں بھی اس کو پہنچایا گیا۔

اسی طرح مولانا عبداللہ اکبر آبادی جو کہ دارالحکومت اکبر آباد میں حکومت برطانیہ کی طرف سے نائب مترجم تھے، اور اس مناظرہ کے دونوں روز موجود رہے اور اس کی پوری کاروائی اپنے کانوں سے سنی، انہوں نے بھی اس مناظرہ کی روئیداد اور دونوں فریقوں کی مراسلت کو اردو زبان میں بدون کیا۔ یہ روئیداد دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی جلد ثانی جس میں مناظرہ کی تفصیل ہے اس کا نام ''مباحثہ دینی'' رکھا گیا اور جلد اول جس میں فریقین کی مناظرہ سے قبل اور مناظرہ کے بعد کی خط و کتابت موجود ہے اور یہ فارسی میں ہے، اس کا نام ''مراسلت دینی'' رکھا گیا۔

جلد ثانی جس میں مناظرہ کی تفصیل ہے وہ پہلے تو اردو زبان میں تھی لیکن بعد میں اس کا بھی فارسی میں ترجمہ کر کے ان دونوں جلدوں کو صحافی محمد امیر کی زیر نگرانی 1270ھ میں اکبر آباد کے مطبعۃ منعمیہ سے طبع کروایا گیا۔ چنانچہ شیخ رفاعی خولی نے رسالۂ مناظرہ کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ

''مجھے اردو زبان میں ایک کتاب موصول ہوئی جس کو سید عبداللہ اکبر آبادی، نائب مترجم، حکومت برطانیہ، دارالحکومت اکبر آباد نے تالیف کیا تھا۔ یہ کتاب 1270ھ میں اکبر آباد میں طبع ہوئی تھی۔

اس کتاب میں مناظرہ کی پوری روئیداد مذکور تھی جو پادری فنڈر اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مابین آگرہ میں ہوا تھا۔ پھر تھوڑے عرصہ کے بعد مجھے ایک اور کتاب فارسی زبان میں موصول ہوئی جو پہلی کتاب کے بعد طبع ہوئی تھی۔ اس میں بھی اس مناظرہ کی پوری تفصیل مذکور تھی۔ یہ دونوں کتابیں مناظرہ کے اصل حقائق کے عین مطابق ہیں اور روئیداد مناظرہ کے بارے میں نہایت معتبر ہیں، کیونکہ ان کا مؤلف دارالحکومت اکبرآباد میں انگریزی حکومت کی طرف سے نائب مترجم کے عہدے پر فائز تھا، اور مجلس مناظرہ میں خود موجود تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا اپنے کانوں سے سن کر لکھا، کسی دوسرے سے سن کر نہیں لکھا۔ پھر مناظرہ کے بعد ان دونوں کتابوں کو اسی شہر سے چھپوایا جس میں یہ مناظرہ ہوا تھا، کیونکہ اس شہر کے اور بھی بہت لوگ اور انگریزی حکام اس مناظرہ میں موجود تھے۔ چنانچہ اگر یہ کاروائی اور روئیداد مناظرہ غلط ہوتی تو وہ ضرور اس کی تائید کرتے۔ اسی طرح مولانا وزیرالدین ولد شرف الدین نے بھی فارسی زبان میں اس مناظرہ کی روئیداد ''البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف'' کے نام سے اسی سال دہلی سے شائع کی۔ یہ بھی حاضرین مناظرہ میں سے تھے۔ یہ کتاب بھی مضمون اور کاروائی کے لحاظ سے ان دونوں کتابوں کے عین مطابق ہے جو کہ اس روئیداد کی صحت اور صدق پر دلیل واثق ہے۔''

مولانا سید محمد عبداللہ اکبرآبادی کی مدون کردہ روئیداد کو دوسری روئیداد پر اس لحاظ سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی اردو زبان میں تدوین کردہ روئیداد میں حاضرین مناظرہ کی شہادتیں اور اُن کے دستخط بھی کروائے ہیں۔ گویا ان حضرات نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ یہ روئیداد مناظرہ واقعہ کے عین مطابق ہے۔

پادری فنڈر نے اپنی شکست کی خفت مٹانے کے لیے اپنی خواہش کے مطابق

Marfat.com

تحریف شدہ روئیداد مناظرہ شائع کی جس میں حسب عادت جھوٹ اور مکاری سے ایسی کتر و بیونت کی جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔اس نے اس روئیداد میں وہ وہ باتیں درج کیں جن کے بارے میں ایک حرف بھی وہاں نہ کہا گیا۔وہ تمام باتیں خذف کردی گئیں جن سے پادری فنڈر کی شکست نمایاں ہوتی تھی۔اس محرف روئیداد مناظرہ کو طبع کر کے پورے ہندوستان میں بھیجا گیا تا کہ لوگ پادری فنڈر کو شکست خوردہ کی بجائے ایک کامیاب مناظر تصور کریں، لیکن جس طرح کاغذ کے پھولوں سے خوشبو کی توقع نہیں کی جا سکتی اور بناوٹ کے اصولوں سے سچائی نہیں چھپ سکتی اسی طرح پادری فنڈر کی محرف روئیداد مناظرہ سے اس کی شکست نہ چھپ سکی، اور مناظرہ کے اختتام کے بعد فوری طور پر پورے ہندوستان کے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ پادری فنڈر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ سے شکست کھا گیا ہے۔

دوسری طرف مولانا عبد محمد عبداللہ اکبر آبادی نے جب اپنی مدون شدہ روئیداد مناظرہ حاضرین کی شہادتوں اور دستخطوں سے شائع کی تو لوگوں پر پادری فنڈر اور اس کے شریک مناظرہ ساتھیوں کی کذب بیانی، تحریف اور دروغ گوئی اور دروغ بافی عیاں ہو گئی۔حضرت مولانا محمد عبداللہ اکبر آبادی کی جرأت ایمانی بھی قابل داد اور قابل ستائش ہے کہ انہوں نے اپنی ملازمت کو خطرہ میں ڈال کر یہ روئیداد شائع کی۔اس روئیداد کی اشاعت وطباعت میں نہ تو انگریز کی سطوت حائل ہوئی اور نہ ہی اس کا دبدبۂ حکومت مانع ہوا۔مولانا عبداللہ صاحب نے اپنی مصلحت کو مسلمانوں کی مصلحت کے تابع رکھا اور حاضرین کی شہادتوں اور دستخطوں کے ساتھ بالکل صحیح صحیح روئیداد مناظرہ شائع فرما کر آئندہ نسلوں کو بھی عیسائیت کے دام فریب سے محفوظ فرمالیا۔یہ کوئی معمولی بات نہ تھی بلکہ ایک بہت بڑا جہاد تھا خصوصی طور پر اس شخص کے لیے جو انگریزی حکومت کا ملازم بھی ہو۔ چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اظہار الحق کے مقدمہ (صفحہ 26 طبع اول) میں لکھا ہے کہ:

''میں نے اس روئیداد مناظرہ میں جو پادری فنڈر نے تحریف تام کے بعد اکبر آباد سے شائع کی تھی، اپنی آنکھوں سے وہ جھوٹی باتیں

دیکھیں جو میری طرف غلط منسوب کی گئی تھیں۔ اس وجہ سے مولانا سید محمد عبداللہ اکبر آبادی نے اس بات کی اشد ضرورت محسوس کی کہ وہ اولاً اردو میں اور پھر فارسی زبان میں اس مناظرہ کی ایک روئیداد مرتب کر کے شائع کریں۔ چنانچہ انہوں نے اکبر آباد سے یہ دونوں روئیدادیں شائع کیں اگرچہ وہ حکومت انگریزی کے ملازم تھے، لیکن حاضرین مناظرہ میں سے بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے جو روئیداد شائع کی اس کو حاضرین مناظرہ کی شہادتوں اور ان کے دستخطوں اور مہروں سے اس کو مزین کیا تاکہ صحیح حقیقت حال لوگوں پر واضح ہو چنانچہ ان کی یہ بات بڑی مفید ثابت ہوئی۔"

اس روئیداد کے اختتام پر حضرت مولانا سید محمد عبداللہؒ نے لکھا کہ:

"الحمدللہ کہ مباحثہ و مناظرہ کی روئیداد اختتام پذیر ہوئی۔ چونکہ یہ بندہ عاجز (سید محمد عبداللہ اکبر آبادی) دونوں اجلاسوں میں موجود تھا اور اس نے یہ پوری کاروائی اپنے کانوں سے سن کر لکھی۔ لیکن پادری فنڈر نے جو روئیداد شائع کی ہے وہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں اکثر باتیں ایسی منقول ہیں جو دونوں طرف سے اس وقت کسی نے بھی نہیں کہیں۔ اور بہت سی باتیں جو اس وقت ہوئی تھیں ان کو عملاً حذف کر دیا گیا ہے، اور بہت سی باتوں کے جوابات میں تحریف کر دی گئی ہے۔

اس وجہ سے یہ کتاب ان حضرات کی خدمت میں ارسال کی گئی جو اس وقت شریک جلسہ تھے تاکہ وہ اس کاروائی کو پڑھیں اور اگر واقع کے مطابق ہو تو اس کو اپنی شہادتوں سے مزین فرما دیں۔ اور شہادت کو چھپانا نہیں چاہیے۔"

چنانچہ جن لوگوں کے پاس اس روئیداد کو مرتب کر کے تصدیق کے لیے بھیجا گیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ ان حضرات نے اس کو بڑے غور سے پڑھ کر اپنی

Marfat.com

شہادت اس پر لکھی اور دستخط کیے۔ بعض حضرات نے شہادت عربی زبان میں لکھی، بعض نے فارسی میں اور بعض نے اردو میں۔ مولانا فیض احمد اور ان کے صاحبزادے محمد سراج الحق، مرزا امام الدین بیگ اور خادم علی نے تو عربی میں شہادت لکھی، جناب امیر اللہ نے فارسی میں اور دوسرے تمام حضرات نے اردو میں شہادت کے الفاظ لکھ کر دستخط کیے۔

1- وکیل راجہ (امیر) بنارس محمد امیر اللہ
2- مولانا فیض احمد رئیس نظارۃ مالیہ
3- محمد سراج الحق بن الفاضل فیض احمد قادری
4- محمد اسد اللہ، قاضی القضاۃ اکبر آباد
5- مفتی محمد ریاض الدین
6- محمد امجد علی، وکیل حکومت انگریزی
7- سید حافظ ولی حسن
8- حافظ خدا بخش
9- مرزا امام الدین بیگ
10- محمد قمر الاسلام، خطیب جامع مسجد، اکبر آباد
11- محمد جعفر بخش قادری
12- خادم علی، مہتمم اخبار ''مطلع الاخبار''
13- محمد قمر الدین مہتمم اخبار ''اسعد الاخبار'' پرنسپل مشنری کالج
14- محمد عبد الشہید کولوی
15- سید حافظ فضل حسین

جب مولانا سید محمد عبد اللہ اکبر آبادی کی مدون کردہ روئیداد مباحثہ، حاضرین کی شہادتوں اور دستخطوں کے ساتھ طبع ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی، تو پادری فنڈر کی محرف روئیداد کے متعلق جو اس نے اس سے قبل اپنی خفت مٹانے کے لیے شائع کی تھی، لوگوں نے اسے اور پادری فرنچ کو ملامت و مذمت کے بہت سے خط لکھے۔ یہ خطوط صرف ایک شہر ہی سے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ پورے ہندوستان سے یہ مذمتی خطوط ان

Marfat.com

دونوں پادریوں کو لکھے گئے۔ علاوہ ازیں خود مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ڈاکٹر محمد وزیر خان نے بھی ان دونوں کو خط لکھے جن میں اس محرف شدہ روئیداد کی طباعت پر ان دونوں پادریوں کو سخت لعنت ملامت کی گئی۔

مولانا وزیرالدین ولاشرف الدین کی فارسی کتاب مناظرہ اور مولانا سید محمد عبداللہ اکبرآبادی کی اردو میں روئیداد مناظرہ طبع ہو کر تمام ہندوستان میں پھیل گئیں، لیکن انگریزی حکومت اپنے غلبہ اور اقتدار کے باوجود ان کی اشاعت اور انتشار کو نہ روک سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حق و باطل میں امتیاز واضح ہو گیا۔ ان دونوں کتابوں کے نسخے ہر گھر میں پہنچے اور ان کے مؤلفین کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں شرف و بزرگی اور اپنے ہاں اجر جزیل سے نوازا۔

جب شیخ سید رفاعی خولی کو فارسی اور عربی روئیدادوں کا پتہ چلا اور انہیں ان دونوں کے مضامین میں کوئی فرق نظر نہ آیا تو انہوں نے مولانا سید محمد عبداللہ کے رسالہ اردو کو ترجیح دی کیونکہ اس میں حاضرین کی شہادتیں اور دستخط بھی موجود تھے، لہٰذا انہوں نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا اور اس عربی ترجمہ اور اصل اردو کتاب کو ترکی کے کتب خانہ جامع بایزید میں رکھ دیا تاکہ جو کوئی حقائق سے آشنا ہونا چاہے وہ اس کا مطالعہ کر لے۔ پھر انہوں نے اظہار الحق کے پہلے تین ایڈیشنوں (1309ھ، 1316ھ، اور 1317ھ) میں حاشیہ پر اس کو طبع کر دیا۔

اس کے ترجمہ کے مقدمہ میں سید رفاعی خولیؒ فرماتے ہیں کہ:

''میں نے اس مناظرے کا حال مکہ مکرمہ میں ان بے شمار لوگوں سے سنا جو اس مناظرے کے بعد حج بیت اللہ کے لیے آئے۔ یہاں تک کہ یہ بات تواتر معنوی کی حد تک پہنچ گئی کہ پادری فنڈر اس مناظرہ میں مغلوب ہوا تھا، لہٰذا میں نے اس مناظرہ کی روئیداد کا عربی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تاکہ مسلمانوں کے تمام اہل علم کو اس سے آشنائی ہو۔ اور وہ جان لیں کہ مؤلف اظہار الحق وہ شخصیت ہے جس نے علی الاعلان نسخ اور تحریف کے مسائل پر اس شخص کو للکارا جس کی زبان اہل اسلام کے خلاف بہت لمبی تھی (یعنی پادری فنڈر اسلام اور

Marfat.com

اہل اسلام پر شدید معترض ہوتا تھا) چنانچہ میں نے اس اردو رسالہ کا کسی اضافہ اور نقصان کے بغیر ترجمہ کیا۔'' (اظہار الحق: صفحہ ۵)

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ پادری فنڈر اور اس کے حواریوں کی طرف سے بھی اس مناظرہ کی ایک روئیداد طبع ہوئی اور اس میں انہوں نے اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا اور مسلمانوں کو شکست دینے کا اظہار کیا۔ عیسائیوں کے مناظرہ کی غلط کاروائی کا جواب دینے کے لیے ایک کتابچہ ''محاکمہ'' کے نام سے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے ایک شاگرد مولانا امین الدین ابن فرید الدین نے فخر المطابع دہلی میں باہتمام سید عبداللہ صاحب طبع کرایا جو 56 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا امین الدین صاحب لکھتے ہیں:

''اپریل کے مہینے 1854ء مطابق رجب کے مہینے 1270ھ میں فی مابین حامی دین متین ناصر شریعت سید المرسلین مولانا محمد رحمت اللہ صاحب بن خلیل الرحمٰن کیرانوی اور جناب کشیس فنڈر صاحب، صاحب میزان الحق کے درمیان شہر اکبر آباد کے اندر مجمع عام میں مباحثہ دینی دو روز متواتر ہوا تھا۔ اور خدا کے فضل سے دونوں روز غلبہ اور حق جانب مولوی صاحب کے رہا تھا۔ اور جناب کشیس نے بناچاری علیٰ رؤس الاشہاد نسخ اور تحریف کا اقرار کیا تھا۔ اور دونوں ''مباحثہ کا یہ فائدہ ہوا کہ پادریوں کا زور شور بہت حد تک کم ہو گیا اور وہ جو کثرت کے ساتھ کتابیں اور رسائل لوگوں میں تقسیم کرتے تھے، وہ قریباً قریباً ختم ہو گئے یا بہت حد تک کم ہو گئے۔ اور مسلمانوں سے یہ الزام اٹھ گیا کہ وہ پادریوں کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے۔ اور عیسائیوں کا وہ غرور اور تکبر ختم ہو گیا کہ ان کا مذہب بہت اعلیٰ اور ناقابل اعتراض ہے۔ اور مذبذبین کا تذبذب ختم ہو گیا اور حقیقت حق و باطل ان کے سامنے آشکار ہو گئی۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

مجھ کو اس مباحثہ اور مناظرہ سے نہ تو نام و نمود مقصود تھا اور نہ کوئی منصب اور عہدہ حاصل کرنا تھا بلکہ محبت اسلامی سے اللہ تعالیٰ پر

بھروسہ کر کے اس بات پر قدم رکھا تھا۔ اور میں حق تعالیٰ سبحانہ سے یہ امید رکھتا ہوں کہ مجھ عاجز سے ایک لسانی اور زبانی مقابلہ میں دین محمدی کی تائید کروا دی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہزارہا درجہ زیادہ مقابلہ ان لوگوں سے کروا دے۔ اور جیسا ان کا مذہب کے بارے میں زور شور مدہم پڑا ویسے ہی ان کی حکومت کا زور شور بھی ٹوٹے اور پھیکا پڑے اور ان کا تکبر اور غرور خاک میں ملے اور مسلمان ان پر غالب آئیں۔ اگر ان دنوں میں جو رجب کا مہینہ اور 1271ھ ہے ان کی حکومت کے زور شور کو دیکھ کر جہلاء کا اعتقاد یہ ہے کہ قبل خروج مہدی کے یہ تسلط ان کا ختم نہ ہوگا۔ اور ان کے ان قوانین محکمہ اور مضبوط تدابیر سے سوائے ترقی کے اور کچھ نہ ہو گا۔ لیکن اللہ کی قدرت و طاقت سے کچھ بعید نہیں کہ نمرود، شداد، فرعون اور بخت نصر کی طرح ان کے زور اور ان کی طاقت کو بھی ملیامیٹ اور نیست و نابود کر دے اور ان کے تنزل کو ہماری زندگی میں ہماری آنکھوں سے دکھا دے۔ (آمین)

اللھم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم وجعلنا منھم واخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منھم

(ازالۃ الشکوک: جلد۲ ص ۴۷۶)

اثرات مناظرہ:

اس سے قبل ہندوستان کے مختلف شہروں میں عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے ساتھ مسلمانوں کے بہت سے مناظرے ہوئے، لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور پادری فنڈر کے مابین یہ جو مناظرہ ہوا، اس کے اثرات کچھ اور ہی تھے۔ اس لیے یہ کئی لحاظ سے سب سے بڑا مناظرہ کہلانے کا مستحق ہے، کیونکہ اس سے قبل جتنے بھی مناظرے ہوئے وہ یا تو تحریری تھے جو کتابوں اور کاغذات کے پلندوں میں دب کر رہ گئے اور ان

Marfat.com

اوراق پر صرف چند لوگوں کی نگاہیں پڑیں۔ وہ ان سے کس قدر محظوظ ہوئے یہ وہ خود ہی جانتے ہیں یا پھر وہ مناظرے اور اُن کی آواز چار دیواری کے اندر محصور ہو کر رہ گئی، چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور پادری کئی کے مابین جو مناظرہ ہوا اور وہ ''مناظرہ صغریٰ'' کے نام سے موسوم ہے، اس کی حیثیت کچھ اسی طرح کی تھی۔ اس مناظرہ کی آواز صرف چند کانوں تک پہنچی اور اس کے بعد دب کر رہ گئی۔ پھر وہ سب مناظرے یا تو جلدی میں ہوئے یا بغیر کسی موضوع کے تعین کے ہوئے، مثلاً کوئی پادری بازار میں کھڑے ہو کر عیسائیت کا وعظ کر رہا تھا کہ کسی مسلمان عالم نے اس کو ٹوک دیا اور پھر وہیں اس سے بحث ہو گئی۔ وہ چند لوگ جو وہاں کھڑے تھے صرف انہوں نے اس کو سنا، یہاں تک کہ اس شہر میں بھی اس بحث اور مناظرے کا پتہ نہ چلا۔ پھر نہ ان کا موضوع متعین کیا گیا، نہ ان کا پہلے کوئی اعلان ہوا، نہ لوگوں کو ان میں آنے کی دعوت دی گئی اور نہ ان کو مدون کر کے باقاعدہ نشر و اشاعت کی گئی۔

لیکن یہ مناظرہ جو آگرہ (اکبر آباد) میں پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مابین ہوا، ان میں ان سب چیزوں کی تلافی کی گئی جو ماضی میں نہ ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس علمی مناظرے کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے بذریعہ تحریر اس کے موضوعات متعین فرمائے جس پر فریقین کے باقاعدہ دستخط ہوئے تاکہ کسی کو راہِ فرار نہ ہو۔ پھر اس کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ لوگوں کو اس میں آنے کی دعوت دی گئی۔ اس کی تدوین و ترتیب کے لیے باقاعدہ لوگوں کو متعین کیا گیا اور پھر اس کو لوگوں کی شہادتوں اور دستخطوں کے ساتھ طبع کروا کر ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر اور قریہ میں بھیجا گیا۔ اور لوگ ان دلائل سے مستفید ہوئے جو حضرت مولانا کیرانویؒ نے عیسائیت کی تردید میں پیش کیے تھے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دلائل و براہین سے پادر فنڈری کو اس طرح ذلیل و خوار کیا کہ وہ ہر اس بات کو اپنی زبان سے خود بخود تسلیم کرتا رہا جس کو مولانا کیرانویؒ اس سے منوانا چاہتے تھے۔ پھر اس نے اپنی شکست کو خود تسلیم کیا جیسا کہ اس کی مراسلت سے عیاں ہوتا ہے جو اس نے مناظرہ کے بعد

حضرت مولاناؒ سے کی۔ وہ شخص جو اپنے علمی غرور و نخوت سے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو للکار رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ مسلمان علماء نہ تو اس کی کتاب کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے زبانی دلائل کے آگے ٹھہر سکتے ہیں، حضرت مولانا کیرانویؒ نے دو ہی روز کے اندر اس کو میدان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا یہاں تک کہ وہ چند ہی روز میں ہندوستان ہی سے بھاگ گیا، اور پھر کبھی اُسے ہندوستان واپس آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بلکہ دنیا کے کسی اور ملک میں بھی اگر وہ گیا تو وہاں بھی اُسے جب مولانا مرحوم کی آمد کا پتہ چلا تو فرار کے سوا اُسے اور کوئی پناہ نہ ملی۔

اس مناظرہ کی اہمیت کچھ اس وجہ سے بھی زیادہ ہوئی کہ اس میں شرط یہ تھی کہ جو فریق ہار جائے وہ غالب فریق کے دین کو قبول کر لے گا۔ چنانچہ حضرت مولانا کیرانویؒ نے توکلاً علی اللہ اس شرط کو قبول فرما لیا کیونکہ آپ کے دل میں یہ طمع تھی کہ پادری فنڈر بالفعل اسلام کو قبول کر لے۔

اس نازک وقت میں اتنے بڑے مناظرہ کا اہتمام کرنا حضرت مولانا کیرانویؒ کا ایک بہت بڑا مجاہدانہ کارنامہ ہے، کیونکہ جس شخص سے مناظرہ ہو رہا تھا وہ ایک غالب قوم کا اہم فرد تھا۔ اقتدار اور تسلط اس کے ہاتھ میں تھا۔ شکست کی صورت میں وہ مولانا مرحوم کے ساتھ ہر قسم کا ظلم و ستم کروا سکتا تھا۔ لیکن جب مناظرہ ہوا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ غالب قوم کا فرد ذلیل و خوار ہو رہا تھا۔ شکست کی جھاگ اس کے منہ سے بہ رہی تھے اور ایک مغلوب قوم کا فرد اس کے بھاگنے کی ساری راہیں مسدود کر رہا تھا۔

اس مناظرہ سے ایک اہم بات یہ ثابت ہوئی کہ زبانی مناظرہ ہر لحاظ سے تحریری بحث سے زیادہ لوگوں کے لیے مفید ہوتا ہے، کیونکہ کتابوں کو پڑھنے کے لیے ایک تو اچھا خاصہ وقت درکار ہوتا ہے۔ دوسرے جو بات ایک مناظر کے منہ سے سن کر نہاں خانۂ ذہن میں آتی ہے وہ کتاب اور رسائل کو پڑھ کر سمجھ میں نہیں آتی، چنانچہ اس وجہ سے بھی اس مناظرہ نے لوگوں کے ذہنوں پر بڑے گہرے نقوش و اثرات چھوڑے۔

انگریز اور دیگر عیسائی حضرات عیسائیت کے بارے کتابوں کو حقائق پر مبنی تصور کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کتابوں میں جو کچھ مرقوم ہے وہ بالکل حق اور سچ ہے،

Marfat.com

خصوصی طور پر پادری فنڈر کی کتاب کو تو وہ ایک الہامی کتاب کا درجہ دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ''میزان الحق'' واقعی حق کی میزان ہے اور اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ ناقابل تردید ہے اور کوئی شخص ان باتوں کو ردّ نہیں کر سکتا، لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اس مناظرہ میں نہ صرف میزان الحق کے بلکہ عیسائیت کی مختلف تفاسیر اور دیگر کتابوں کا ایسا پوسٹ مارٹم کیا کہ ان لوگوں کو اپنی ان کتابوں میں منقول عقائد کی بنیاد بیٹھتی ہوئی نظر آنے لگی اور جن باتوں کو وہ ناقابل تردید تصور کرتے تھے وہ زمین بوس ہوتی نظر آنے لگیں۔

اس تقریری مناظرہ نے سامعین اور حاضرین کے دلوں میں نہایت تھوڑے وقت میں حق کی آواز اُن کے دلوں میں پہنچا دی اور مخالف کے دلائل و براہین کا باطل ہونا انہیں سمجھا دیا۔ یہ گویا کہ دین الحق کی ایک شاندار فتح تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ تعصب و عناد کے دبیز پردے بعض حضرات کے دلوں پر پڑے ہوئے تھے اور وہ قبول حق سے باز رہے لیکن ان کے دلوں میں ایک دفعہ تو حق کا خلجان پیدا ہوا۔

اس دو روز کے متواتر مناظرے نے علماء اور مسلمان طالب علموں کو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے ذریعہ عیسائیوں کے عقائد کا ردّ اور عیسائیوں کے افترآت کا علم سکھا دیا، اور عیسائی پادریوں خصوصی طور پر پادری فنڈر کو یہ بتا دیا کہ مسلمان علماء جو اتنے عرصہ سے خاموش تھے وہ اس وجہ سے نہ تھے کہ عیسائیوں کے سوالات کے جوابات ان کو نہ آتے تھے بلکہ اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ اور حضرت مولانا کیرانویؒ کے مسکت دلائل نے انہیں تمام ہندوستان کے مسلمان علماء اور عوام کی مبارک باد کا مستحق بنا دیا۔ چنانچہ ان کے مابین فتح و نصرت کے شادیانے بجے اور انہوں نے اپنے گھروں اور مساجد میں عام اور خاص قسم کے اجتماعات کیے۔ علاوہ ازیں حضرت مولانا کیرانویؒ کے اس مناظرے نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور وہ جرأت سے کام لے کر عیسائیت کے طوفان کے سامنے ڈٹ گئے۔

دو متقابل شخصیتیں

اس مناظرہ میں دو مختلف مذاہب کی دو شخصیتیں آپس میں ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔ سیدنا عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جو صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے آئے تھے، ان کا دین (عیسائیت) اور سیدنا ومولانا، سید المرسلین و خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم جو "کافۃ للناس" یعنی قیامت تک ساری دنیا کے آنے والے لوگوں کے لیے آئے تھے، ان کا دین (اسلام) آگرہ میں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ عیسائیت کی راہ نمائی پادری فنڈر کر رہا تھا جب کہ دین اسلام کے موقف کی قیادت حضرت العلامہ فضیلۃ الشیخ رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کر رہے تھے۔ پادری فنڈر کا دعویٰ تھا

Mihgt is Right and Right is White.

جب کہ حضرت مولانا کیرانویؒ اس موقف کے علمبردار تھے کہ اب نبوت محمدی کا زمانہ ہے اور اب درست وہی ہے جس پر اسلام کی چھاپ ہے۔ گویا کہ ان دونوں شخصیتوں میں بہت فرق تھا۔ دونوں باہم متناقض تھیں۔

حضرت مولانا کیرانویؒ اسلام، اس کی کتاب قرآن حکیم اور شریعت اسلامیہ کے ترجمان تھے اور پادری فنڈر اہل کتاب ان کی تعلیمات اور ان کی محرف کتابوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ حضرت مولاناؒ کا تعلق مغلوب قوم سے تھا اور پادری فنڈر کا غالب اور صاحب اقتدار قوم سے جو صرف تین سال بعد پورے ہندوستان پر بلا شرکت غیرے قابض ہو گئی، لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی شخصیت نقص اور تناقض سے خالی تھی جب کہ اس کے مقابلہ میں پادری فنڈر کی شخصیت نفسیاتی طور پر متناقض اور محرف تھی جس

Marfat.com

طرح اس کی اپنی کتاب بائیبل محرف اور اس کے عقائد فاسد تھے، گویا کہ ان دونوں کی کتابوں اور عقائد کا ان شخصیتوں میں بہت بڑا اثر تھا۔

پادری فنڈر نے مناظرہ کے پہلے اجلاس کی ابتداء میں جو الفاظ کہے تھے کہ
"یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ مناظرہ کس وجہ سے منعقد ہو رہا ہے۔ یہ مولانا رحمت اللہ کی سعی و کوشش اور ان کی دلی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اس سے فائدہ کی کوئی صورت میرے نزدیک نظر نہیں آتی۔"

یہ اور اس قسم کے دوسرے کئی الفاظ اس کے اندرونی خوف اور نفسیاتی طور پر منفعل ہونے کی غمازی کر رہے تھے۔

پہلے روز مناظرہ کے آغاز میں ڈاکٹر فنڈر نے جو تقریر کی وہ اس کی مرعوبیت، انفعالی کیفیت اور ذہنی انتشار کی پوری طرح غماز ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ شروع ہی میں اپنے حریف اور دوسرے سامعین کو اپنے بلند بانگ دعوؤں اور تعلیوں کے ذریعہ مرعوب کر لے۔ پھر اس کے بعد اپنے کند ہتھیاروں سے اپنے حریف کو زیر کر لے۔ چنانچہ ابتداء ہی میں اُس نے سارے ہندوستان کے مسلمان علماء کو چیلنج کیا اور کہا کہ "اس مناظرہ کا نتیجہ پہلے سے معلوم ہے۔ اس مناظرہ کا کوئی حاصل نہیں ہے، کیونکہ کوئی مسلمان عالم ہمارے سامنے ٹک ہی نہیں سکتا۔ صرف مولانا رحمت اللہ صاحب کی خواہش پر مناظرہ میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی ہے تاکہ مناظرہ کرنے کی ان کی خواہش پوری ہو جائے۔"

پادری فنڈر کی ان باتوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ انتہائی درجہ مرعوب اور منفعل ہو چکا ہے اور ذہنی اور اعصابی تناؤ کا شکار ہے۔ چنانچہ مناظرہ کے دوران وہ معمولی معمولی باتوں پر خفگی کا اظہار کرتا اور اشتعال انگیز حرکتیں کرتا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح مولانا رحمت اللہ اشتعال میں آ جائیں اور اُسے اس بہانہ سے راہِ فرار اختیار کرنے کا موقع مل جائے۔

پادری فنڈر کے برعکس حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی گھن گرج اور رعب دار رویہ نے حاضرین و سامعین کو متاثر کیا، خصوصی طور پر جب کہ انہوں نے فرمایا:

"میں نے ہندوستان کے سب سے بڑے پادری جو علمائے

> مسیحین میں ممتاز حیثیت کے حامل اور میزان الحق کا مصنف ہے، اس سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے سامنے مجمع عام میں مناظرہ کرے تاکہ حق واضح ہو جائے، اور یہ معلوم ہو جائے کہ علمائے کرام نے ان رسائل کی تردید اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ عاجز تھے بلکہ وہ جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے۔"

مولانا مرحوم نے اپنی تقریر کا آغاز پرسکون علمی انداز میں کیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میدان کارزار میں قدم رکھنے سے قبل اچھی طرح تیاری کر لی ہے۔ ایک ماہر جنرل کی طرح پوری طرح واقف و آشنا ہیں کہ حریف کون کون سے حربے اختیار کرے گا اور اس کی کاٹ اور اس کا توڑ کیسے کیا جائے گا۔ انہوں نے نہ صرف اسلام کی حقانیت کے دلائل و شواہد پیش کیے بلکہ عیسائی مبلغین جن میں اس وقت سرفہرست پادری فنڈر تھا اور جس نے پوری تیاری کے ساتھ ترکی اور برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا بیڑہ اٹھایا تھا، اس کے اعتراضات کے جوابات اہل کتاب اور عیسائی مصنفین کی تحریروں سے پیش کر کے ان کو ششدر اور ہراساں کر دیا بلکہ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے علمی اور باوقار انداز نے ان کی کامیابی اور فتح مندی میں اہم رول ادا کیا۔

مولانا مرحوم کا انداز بیان نہایت رعب دار اور متاثر کن تھا۔ ان کے اندازِ گفتگو سے عیاں ہوتا تھا کہ وہ پادری فنڈر کو ایک طفل مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں دے رہے اگرچہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے ہاں چوٹی کا عالم تھا اور اس کی کتاب "میزان الحق" ان کے ہاں ایک لاجواب کتاب سمجھی جاتی تھی۔

دوسرے روز کے اجلاس میں تو پادری فنڈر کی نفسیاتی حالت پہلے روز سے زیادہ کمزور اور پتلی تھی۔ وہ کل سے زیادہ ذہنی انتشار اور انفعالی کیفیت کا شکار تھا۔ اس نے سامعین سے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپانے کی انتہائی کوشش کی اور دوسرے روز کی تقریر میں پھر ایسے الفاظ استعمال کیے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ فتح و نصرت کی بلندیوں کو چھو رہا ہے، لیکن اس کی باطنی اور ذہنی کیفیت یہ تھی گویا کہ وہ ایک گہرے سمندر میں ڈوبتا جا رہا

Marfat.com

ہے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت کیرانویؒ کی شخصیت دوسرے روز پہلے روز سے زیادہ متوازن تھی۔ ان کی زبان پر کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جس سے غرور ونخوت یا تعلّی کی بو آتی ہو اور نہ ہی ان کی باتوں سے مرعوبیت اور ذہنی انتشار کا اظہار ہوتا تھا۔ آپ فریق مخالف کی کتابوں ہی سے دلائل کے انبار لگا کر پادری فنڈر کے منہ سے اپنے ہر دعویٰ کو تسلیم کروا رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں پادری فنڈر کے مقابلہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی شخصیت ایک ناقابل تسخیر شخصیت تھی۔

Marfat.com

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ایک مناظر کی حیثیت سے

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ایک نابغہ، عبقری اور نادرۂ روزگار شخصیت تھے۔ وہ ایک بہترین عالم، پرجوش اور صاحب ولولہ داعی و مبلغ تھے۔ ایک بلند پایۂ مقرر اور بہترین مصنف تھے۔ اپنی ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک کامیاب مناظر بھی تھے۔ اگرچہ علم اور مناظرے کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر عالم مناظر بھی ہو۔ مناظرہ میں علم کے ساتھ حاضر جوابی کو بھی بہت بڑا دخل حاصل ہے، لیکن حاضر جوابی ایک وہبی چیز ہے جو ہر شخص کو عطا نہیں ہوتی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے اس صفت سے بھی نوازا تھا۔

جس زمانہ میں آپ علم سے فراغت حاصل کر کے کیرانہ واپس تشریف لائے، وہ انتہائی پرآشوب دور تھا۔ عیسائیت کو ہر جائز و ناجائز طریق سے لوگوں پر ٹھونسا جا رہا ہے۔ ہر شہر اور قریہ میں بلکہ شاہراہ اور گلی کوچہ میں عیسائی مبلغین دندناتے پھر رہے تھے اور انگریزی حکومت کی پوری پوری سرپرستی انہیں حاصل تھی بلکہ ان کی تنخواہیں حکومت کے خزانہ سے دی جاتی تھیں۔ اس پرفتن دور میں عیسائیت کی مخالفت حکومت کی بغاوت کے مترادف تھی۔ اس انتہائی نازک دور میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے دفاع اور ردّ عیسائیت کا محاذ آپ نے سنبھالا اور پھرپوری زندگی اس مشن کے لیے وقف کر دی۔ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا۔ خلاصہ یہ کہ بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ آپ نے اسلام کے دفاع کا فریضہ سرانجام دیا۔ پادری فنڈر کے ساتھ تاریخ ساز مناظرے نے انہیں شہرت دوام بخشی جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح مندی اور سرخروئی سے نوازا،

اور پادری فنڈر جیسے بین الاقوامی شہرت کے حامل شخص کو شکست اور ہزیمت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ ہزیمت اور پسپائی کے احساس کے زخم نے اُسے ہندوستان ہی سے رخت سفر باندھنے پر مجبور کر دیا۔ اس مناظرہ میں حضرت کیرانویؒ کی جو شخصیت نکھر کر سامنے آئی وہ حسب ذیل ہے:

قوت حافظہ اور ذہانت:

اس مناظرہ نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ کو عوام و خواص کے سامنے اجاگر کیا، اور حضرت مولانا جب عیسائی پادریوں کے سامنے ان کی اور اپنی کتابوں کے پے در پے حوالجات پیش کر رہے تھے تو نہ صرف مسلمان بلکہ عیسائی بھی آپ کی ذہانت اور قوت حافظہ کی داد دے رہے تھے۔

(ا) اس مشہور عالم اور تاریخ ساز مناظرہ میں آپؒ نے قدیم عیسائی علماء اور مصنفین اور خود پادری فنڈر کی تصنیفات سے بیس سے اوپر حوالے پیش کیے۔ مسلمان علماء اور مفسرین کی کتابوں اور تفاسیر سے بھی بہت سے شواہد آپ نے نقل کیے۔ یہ سارا کام آپ نے اپنی قوت حافظہ اور یادداشت سے کیا۔ کہیں کتاب کھولنے کی نوبت نہیں آئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کہیں بھی فریق مخالف کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں دیا کہ یہاں حوالہ دینے میں کمی یا بیشی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری عبارتیں نوک زبان ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ کا یہ مظہر دیکھ کر حریف اور حاضرین دونوں ششدر رہ گئے۔

اس کے برعکس پادری فنڈر اور اس کے شریک مناظرہ پادری فرنچ کو شواہد پیش کرنے کے لیے بار بار کتابوں کے اوراق الٹنے پلٹنے کی ضرورت پیش آئی۔ وہ اپنی قوت حافظہ اور یادداشت سے ایک حوالہ بھی پیش کرنے پر قادر نہ تھے۔ دیگر تصنیفات کے حوالے تو ایک طرف رہے پادری فنڈر خود اپنی کتابوں کی عبارات جن کو خود اس نے تصنیف و تالیف کیا تھا، اپنی یادداشت سے سنانے پر قادر نہ تھا۔ ان کتابوں سے جب بھی اُس نے کوئی حوالہ پیش کیا تو کتاب کھول کر پڑھ کر سنایا۔ حاضرین و سامعین کے لیے

تفریح طبع کا سامان اس وقت مہیا ہوتا جب پادری فنڈر اپنے دعویٰ کی دلیل میں کوئی حوالہ پیش کرنا چاہتا تھا، لیکن ناکام رہتا۔ بالآخر حضرت مولانا کیرانویؒ کو اس پر ترس آتا اور آپ فرماتے غالباً آپ جو حوالہ دینا چاہتے ہیں وہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر ہے۔ اس طرح آپ اپنی یادداشت اور حافظہ سے وہ پوری عبارت پڑھ کر سنا دیتے۔

(ب) مناظرہ کے مشمولات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جن مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں ان کے جملہ پہلوؤں سے آگاہ ہیں۔ موافقین اور مخالفین کے آراء و اعتراضات اور ان کے جوابات سے پوری طرح لیس ہیں۔ چنانچہ جب بھی کوئی مسئلہ زیر بحث آیا تو انہوں نے اس پر پوری تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کا بھی احاطہ کیا اور بتایا کہ فلاں فلاں عیسائی علماء اور مصنفین اس مسئلہ کی حمایت و تائید میں ہیں اور فلاں فلاں عیسائی علماء اور مصنفین اس کے مخالف ہیں۔ آپ ہر ایک کا نقطۂ نظر وضاحت اور تفصیل سے بیان فرماتے اور بتاتے کہ اس مسئلہ میں محققین کی رائے یہ ہے۔ یہ محض دعویٰ بلا دلیل نہ ہوتا بلکہ ہر ایک کے دلائل ان کی معتبر کتابوں سے پیش کرتے۔

(ج) شواہد پیش کرتے وقت آپ نے التزام کیا کہ کتاب کا نام، اس کے مصنف کا نام، جلد کا نمبر، کتاب کہاں طبع ہوئی، کس سن میں طبع ہوئی اور یہ کتاب کا کون سا ایڈیشن ہے، اور صفحہ نمبر ہر شی کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ اسی طرح عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید میں سے اگر حوالہ دینے کا معاملہ آیا تو اپ نے اس کو اپنی یادداشت سے پڑھ کر سنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سفر کا نام اور باب اور آیت کا نمبر بھی بتایا۔

مذکورہ مناظرہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید دونوں سے قریباً پندرہ شواہد پیش کیے، جن کی عبارتیں اپنی یادداشت سے پڑھ کر سنائیں، لیکن باب، آیت اور دیگر تمام چیزیں صحیح صحیح بتائیں، جب کہ پادری فنڈر اور اس کے معاون پادری فرنچ نے پہلے سے تحریر کردہ عبارات کتابیں کھول کر اور ان کے اوراق دیکھ کر پڑھیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پادری فنڈر نے اپنی ہی تصنیف کردہ کتاب ''میزان الحق'' سے قرآن حکیم کی زیر حوالہ آیات پڑھنی شروع کیں تو کئی جگہ غلطیاں کیں اور حاضرین نے اُٹھ کر اصلاح کی بلکہ یہاں تک کہا کہ عربی میں آیات

پڑھنا آپ کے بس کا روگ نہیں لہٰذا آپ صرف ان آیات کا ترجمہ پڑھ کر سنادیں۔

(د) نسخ اور تحریف جیسے اہم اور بنیادی قضیہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے دسیوں حوالے اور شواہد پیش کر کے اپنے دعوے کو ثابت کیا۔ جزوی مسائل مثلاً کسی خاص حکم کا نسخ، کسی جملہ یا آیت میں تحریف وتغییر کے اثبات کے لیے بھی دو دو تین تین شواہد پیش کر کے انہوں نے ثابت کر دیا کہ اپنے دعویٰ کے اثبات اور حریف کے دعویٰ کے ابطال کے لیے انہوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے تیاری کی ہے۔ فریق مخالف کی کتابوں سے ایسے حوالے اور دلائل پیش کیے جہاں دوسروں کا ذہن بھی نہ گیا تھا۔ ان کے اس عمل نے مخالفین کو حیران و ششدر کر دیا۔

(ھ) مناظرہ کے دوران میں حضرت مولانا کیرانویؒ کا یہ کمال بھی مشاہدہ میں آیا کہ شواہد کی فراہمی میں تنوع کا خاص خیال رکھا۔ ان کے یہاں تکرار نہیں تھی۔ ایک دلیل یا شاہد جب ایک مرتبہ آپ پیش فرمادیتے تو دوبارہ اس کا اعادہ نہ کرتے۔ ہر موقع پر انہوں نے نئی دلیل پیش کی اور نیا حوالہ دیا۔ معلوم ہوتا کہ دلائل وشواہد ان کے سامنے صف بستہ کھڑے اشارہ کے منتظر ہیں۔ دلائل و شواہد کے اس تنوع نے حاضرین پر نہایت خوشگوار اثر ڈالا۔ اور اکتاہٹ اور بوریت کا شکار نہ ہوئے۔ دوسری طرف اس کے حریف خاص ڈاکٹر فنڈر کو اپنی بے بضاعتی اور علمی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوا، کیونکہ وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر پامال اور گھسے پٹے حوالے ہی پیش کرنے پر مجبور تھے۔

مناظرہ کے دوران میں حضرت مولانا کیرانویؒ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ یا تو عقل و فلسفہ سے مؤید دلیل پیش کرتے یا عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید سے شواہد پیش کرتے جن کو فریق مخالف بھی تسلیم کرتا، یا پھر ایسے عیسائی علماء کے اقوال اور ان کی تحریریں پیش کرتے جو پادری کی نظر میں بھی ثقہ اور معتبر تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زیر بحث قضیہ میں اول مولانا کیرانویؒ نے اپنا دعویٰ پیش کیا۔ فریق مخالف نے اس کا انکار کیا۔ مولانا مرحوم نے اپنے دعویٰ کے اثبات میں توارت وانجیل کے حوالے پیش کیے۔ پادری فنڈر نے پھر بھی دعویٰ تسلیم کرنے سے انکار کیا تو حضرت مولانا کیرانویؒ نے عیسائی علماء کی تحریریں پیش کیں جن سے مولانا مرحوم کے دعویٰ کی تائید ہوتی تھی۔ اس طرح حضرت

Marfat.com

مولانا کیرانویؒ نے پادری فنڈر کے لیے فرار کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔ بارہا ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ ایک دلیل کے بعد دوسری دلیل اور دوسری کے بعد تیسری دلیل پیش کر دی تا کہ دعویٰ کے اثبات میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ یہ بھی ارشاد فرماتے کہ ہمارے پاس زیر بحث مسئلہ میں دلائل کی کمی نہیں، وہ اس بارے میں مزید شواہد پیش کر سکتے ہیں، لیکن تضیع اوقات سے بچنے کے لیے صرف دو چار شواہد پر اکتفا کیا ہے۔ یہ صورتحال پادری فنڈر کے لیے نہایت پریشان کن تھی۔ وہ حضرت مولانا مرحوم کے اس رویہ سے زچ ہو کر اعصابی تناؤ اور ذہنی پریشانی کا شکار ہو جاتا۔

بیدار مغزی اور حاضر جوابی:

(ا) اس مناظرہ نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی بیدار مغزی اور حاضر جوابی کی صفت کو بھی اجاگر کیا۔ متنازع فیہ مسائل میں حضرت مولانا کیرانویؒ کے دلائل وشواہد برمحل، قوی اور واضح تھے۔ ان میں کسی قسم کا کوئی ابہام تھا اور نہ کسی تاویل کی گنجائش تھی اور نہ ہی مقصود کو ثابت کرنے کے لیے طول وطویل بحث کی ضرورت تھی۔ اس کے نتائج ریاض کی طرح واضح اور متعین برآمد ہوتے تھے۔ چنانچہ پادری فنڈر اور اس کے شریک مناظرہ پادری فرنچ کے لیے حضرت مولاناؒ کے دعویٰ کو قبول کرنے یا پھر سکوت کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اس کے برعکس پادری فنڈر کے پیش کردہ دلائل نہ تو برمحل ہوتے اور نہ ہی واضح اور غیر مبہم تھے۔ اسے اپنا مقصد ثابت کرنے کے لیے طول طویل تقریر کرنا پڑتی۔ خاصے تکلف سے کام لینا پڑتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ پادری فنڈر زبردستی ایک مفہوم اخذ کر رہے ہیں۔ ایسے مواقع پر حضرت مولانا کیرانویؒ کی حاضر دماغی کے کرشمے دیدنی ہوتے۔ وہ اپنے حریف کو گرفت میں لانے کے لیے عہد نامہ قدیم اور عہد نامۂ جدید کے حوالوں کے درمیان موازنہ کر کے اپنا دعویٰ ثابت کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس دلیل کا جواب طویل عرصہ سے تیار کیے ہوئے ہیں۔

(ب) بارہا یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ حضرت مولانا کیرانویؒ نے عیسائی علماء کی تحریرات پیش کیں۔ پادری فنڈر نے انہیں تسلیم کرنے کے بجائے ان عیسائی علماء کو غیر معتبر ثابت

Marfat.com

کر کے راہِ فرار اختیار کی۔ فن حرب کے ماہر جرنیل کی طرح مولانا مرحوم نے کاٹ کی۔ حوالہ پیش کرنے سے قبل حضرت مولانا دریافت فرماتے کہ فلاں مصنف یا پادری کس درجے اور مرتبے کا حامل ہے۔ ثقہ ہے یا غیر ثقہ۔ معتبر ہے یا نا معتبر۔ جب پادری فنڈر اس مصنف کے مرتبہ اور مقام کا اعتراف کر لیتا تو آپ پھر اس کے کلام اور اس کی کتابوں سے اپنی بات ثابت کرتے۔ آپ نے ایک دوسرا طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ آپ پادری فنڈر سے فرماتے ''آپ نے فلاں عیسائی مصنف کی تحریریں اپنی کتابوں میں بطور حوالہ پیش کی ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ آپ کے نزدیک ثقہ اور قابل بھروسہ ہے۔ چنانچہ زیر بحث مسئلہ میں اس کی رائے یہ ہے۔''

چنانچہ حضرت مولانا اپنی بیداری مغزی سے شروع ہی میں پادری فنڈر کی ایسی پیش بندی کر دیتے کہ اس کے فرار کی ساری راہیں مسدود ہو کر رہ جاتیں۔ اگر کبھی پادری فنڈر نے کہا کہ فلاں عالم کی رائے اس قضیہ میں شاذ ہے۔ کوئی دوسرا اس کا ہم نوا نہیں ہے تو مولانا فوراً دوسرے عیسائی علماء کی فہرست شمار کر دیتے اور فرماتے کہ اس مسئلہ میں سب کی رائے متفق ہے۔ سب اس کے مؤید اور ہم خیال ہیں۔

حریف کے ساتھ ملاطفت:

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اس مناظرہ میں اسلامی ادب، اخلاق حسنہ اور علماء کے اخلاق کے پیکر مجسم تھے۔ مناظرہ میں ''وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ'' کے طریق کار پر عمل پیرا تھے۔ پادری فنڈر اور اس کے شریک مناظرہ پادری فرنچ کے ساتھ ان کا معاملہ نہایت لطف و نرمی کا تھا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ زچ ہو کر درمیان ہی میں فرار کا راستہ اختیار کر لے۔

(ا) دوران مناظرہ پادری فنڈر نے اپنی کتاب ''میزان الحق'' سے اور پادری فرنچ نے اپنے طومار سے طویل طویل عبارتیں پڑھیں، لیکن حضرت مولانا مرحوم نہایت صبر و تحمل سے ان عبارتوں کو سنتے رہے۔ ان کی تعلیوں اور بڑی بڑی باتوں کو بھی سنتے رہے۔ جب فریق مخالف نے اپنے ہی علماء کو نا قابل اعتبار قرار دے کر ان کی آراء کو تسلیم کرنے سے

Marfat.com

انکار کر دیا تو اس وقت بھی آپ نے کسی قسم کی خفگی اور ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔

(ب) پادری فنڈر ہی کی طرح اس کے معاون پادری فرنچ کو بھی آپ بولنے کا پورا موقع دیتے اور اس کی باتیں سنتے۔ اس کے برعکس فریق مخالف کا رویہ شروع سے قابل اعتراض رہا۔ اُس نے ڈاکٹر محمد وزیر خان مرحوم کو بولنے سے روک دیا جب کہ وہ حضرت مولانا کیرانویؒ کے معاون اور شریک مناظرہ تھے۔ اور ایک دفعہ ہی نہیں بلکہ کئی دفعہ روکا، یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم غصے میں آ کر فرمانے لگے کہ ''کیا میں شریک مناظرہ نہیں ہوں؟''

پادری فنڈر دورانِ مناظرہ میں بار بار خفا ہوتا بلکہ غضبناک ہوتا، چنانچہ جب قاضی القضاۃ آگرہ نے متن کے بارے میں سوال کیا اُس وقت بھی وہ غضبناک ہو گیا۔ اور جب یہ بات کہی گئی کہ کئی پاپائے روم ایسے تھے جنہوں نے انجیل کی قرأت سے لوگوں کو روکا تو وہ اس پر بھی غضبناک ہو گیا، حالانکہ ایک مناظر کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ متحمل مزاج ہو اور کسی مرحلہ پر بھی صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کسی موقع پر بھی آپے سے باہر نہیں ہوئے اور نہ اپنے ہوش کو جوش کے تابع کیا۔

(ج) آپ نے مفہوم کی تعیین میں بھی اپنے حریف کو پوری آزادی دی۔ جب اس نے ایک مفہوم متعین کر دیا تو اسی کی روشنی میں آپ نے اپنا دعویٰ ثابت کیا۔ چنانچہ تحریف کے مسئلہ میں جب پادری فنڈر نے تحریف کا مفہوم متعین کیا، پھر آپ نے کتب مقدسہ (عہد عتیق اور عہد جدید) سے مفہوم مختار کی تحریف کو ثابت کیا۔

جرأت وشجاعت:

مناظرہ کے دوران میں حضرت مولانا کیرانویؒ نے حق بات کہنے میں ایک مسلمان کی شجاعت اور ایک عالم دین کی جرأت کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔

(ا) جس وقت حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور پادری فنڈر کے مابین آگرہ میں مناظرہ ہوا، وہ مسلمانوں کے لیے نہایت تاریک اور پُر آشوب دور تھا۔ پادری فنڈر کی پشت پر پوری عیسائی دنیا تھی جو فاتح قوم تھی۔ برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے حدود سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ دوسری

Marfat.com

طرف حضرت مولانا کیرانویؒ کی حمایت میں ایک شکست خوردہ اور مغلوب قوم تھی، ذرائع اور وسائل سے فرومایہ، اس کے باوجود کسی موقع پر مولانا مرحوم کی آنکھ نہیں جھکی۔ حریف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی، اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی دلیری اور ایک عالم دین کی حق گوئی و بے باکی کا پورا مظاہرہ پیش کیا۔

(ب) انتہائی جرأت و بے باکی کے ساتھ انہوں نے عیسائیت اور اس کے عقائد کی کمزوریاں ظاہر کیں۔ دلائل کی روشنی میں ان کو بالکل ننگا کر دیا اور برملا اعلان کیا کہ ان کی کتابیں بے سند اور تحریف شدہ ہیں، اور ان میں تضادات کی بھرمار ہے۔

(ج) اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پادری فنڈر کے اقوال اور تحریروں میں تعارض و تضاد دکھانے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ اپنے چوتھے خط میں جو پادری فنڈر کے نام تحریر کیا گیا تھا۔ آپ نے نہایت صراحت سے اس کو ذمہ دار قرار دیا کہ آپ محض بہانہ بازی کر کے اور نامعقول شرائط پیش کر کے مناظرہ سے کترا رہے ہیں۔ جب پادری فنڈر نے اصرار کیا کہ مناظرہ صرف انجیل سے متعلق ہو سکتا ہے تو حضرت مولانا مرحوم نے سبب دریافت کیا کہ ایسا کیوں؟ ہمارے نزدیک تورات اور انجیل یکساں نوعیت کی حامل ہیں۔ نیز فرمایا کہ ''پادری صاحب! خود آپ نے اپنی کتاب ''میزان الحق'' میں گفتگو صرف انجیل تک محدود نہیں رکھی ہے، بلکہ دونوں کتابوں میں نسخ اور تحریف کی نفی کی ہے۔ اب ایسی کیا مجبوری پیش آ گئی کہ آپ تورات سے اظہار برأت کر رہے ہیں۔''

(د) مناظرہ کے پہلے روز کے اختتام پر مولانا مرحوم نے جرأت اور صفائی کے ساتھ پادری فنڈر سے فرمائش کی کہ یا تو وہ ہمارا تحریف کا دعویٰ تسلیم کریں یا اُن ساٹھ مقامات کی توجیہہ و تاویل پیش کریں جن کے محرف ہونے کا خود عیسائی علماء نے اعتراف کیا ہے۔ نیز کہا کہ جب تک وہ اپنی کتابوں کی سند نہ بیان کر دیں یا اُن کا بے سند ہونا نہ تسلیم کر لیں اس وقت تک تورات اور انجیل سے استدلال قابل قبول نہ ہوگا۔

(ہ) دوسرے روز جلسہ کے اختتام پر انہوں نے بآواز بلند اعلان کیا کہ اہل اسلام

Marfat.com

کے نزدیک تحریف کا جو مفہوم ہے، اس کے مطابق پادری فنڈر نے عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں کا محرف ہونا تسلیم کرلیا ہے۔اب نزاع صرف لفظی رہ گیا ہے۔اس کے جواب میں پادری فنڈر صرف یہی کہہ سکا کہ اس سے اصل متن کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ بالفاظ دیگر اس نے بائیبل کی تحریف کا دعویٰ تسلیم کرلیا۔

(ھ) دوسرے روز کے جلسہ کے اختتام پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے یہ اعلان فرمایا کہ وہ پادری صاحب سے دو ماہ تک مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بعد کی خط وکتابت میں بھی پوری قوت سے مناظرہ پر اپنی آمادگی ظاہر فرمائی، لیکن دوسری طرف آمادگی کی بجائے ہندوستان سے روانگی کی تیاری شروع ہوگئی۔

خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نہایت کامیاب مناظر تھے۔ایک کامیاب مناظر کے لیے ذہانت، حاضر دماغی، قوت حافظہ، وسعت مطالعہ اور منطقی واستدلالی انداز یہ وہ چیزیں ہیں جن سے کام لے کر وہ اپنے حریف کو زیر کرتا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ سارے ہی کمالات اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کیرانویؒ کو بدرجۂ اتم ودیعت فرمائے تھے جن کو چابک دستی اور نہایت مہارت کے ساتھ استعمال کر کے انہوں نے پادری فنڈر کو شکست فاش دی۔

اس مناظرہ نے برصغیر پاک و ہند میں عیسائیت کے سیلاب کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔ نیز مسلمانوں کے اندر اپنے دین کی حقانیت وابدیت کے بارے میں اعتماد بحال کیا۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان حضرت مولانا مرحوم کے اس احسان عظیم کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

مولانا کیرانویؒ اور جنگ آزادی

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ:

''جنگ پلاسی کے جیت لینے کے بعد سو سال تک انگریزی حکومت کے مسلسل تجربات ہندوستانیوں میں بے زاری کی آگ کو بھڑکاتے چلے جا رہے تھے۔ ایک اندرونی زخم تھا جو اندر ہی اندر شعوری و غیر شعوری طور پر پکتا چلا جا رہا تھا۔ تا اینکہ ٹھیک سو سال کے بعد 1857ء میں چربی ملے کارتوسوں کا قصہ منہ بن گیا۔ زخم پھٹ گیا۔ دبے ہوئے شعلے بھڑک اُٹھے۔ چونکہ کسی باضابطہ نظام کے تحت اقدام نہیں کیا گیا تھا، افراتفری پھیل گئی۔ ایک علاقے کی سن کر دوسرے علاقہ والوں میں تو چل میں چلکی کھلبلی مچ گئی۔ پھر جو کچھ ہونا تھا، ہوا، چاہے اسے نوشتۂ تقدیر کہیے یا زشتیِ اعمال کا قدرتی نتیجہ قرار دیجیے۔ ایک ہندو مؤرخ راجہ شیو پرشاد نے اپنی آنکھوں سے دلی میں جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اور کتابوں میں ''زشتیِ اعمال'' کی نادری صورت کا بھی مطالعہ کیا تھا، دونوں ہی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

''یہ سانحہ نادر شاہی سے بھی بڑھ کر ہو گیا۔'' (سوانح قاسمی: جلد دوم ص ۹۲)

اپنی اس بات کی مزید تشریح فرماتے ہوئے حضرت مولانا مناظر احسن گیلا[نی] نے لکھا ہے کہ

"واقعات و حالات سے بھی اسی کا پتہ چلتا ہے اور لکھنے والوں نے جو اس زمانہ میں موجود تھے، انہوں نے بھی لکھا ہے کہ کسی باضابطہ اسکیم یا لائحہ عمل کے تحت غدر کا یہ ہنگامہ پیش نہیں آیا تھا، اور نہ ہندوستان کی کسی خاص قوم یا کسی خاص طبقہ نے بغاوت کے لیے یا آزادی کی جدوجہد کا پروگرام بنایا تھا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ 1757ء میں پلاسی کی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد ہندوستان کی حکومت کا باضابطہ چارج لینے کا فیصلہ انگریزی قوم نے جب کرلیا اور سو سال کی طویل مدت میں ہندوستان کے باشندوں کو انگریزوں اور انگریزی حکومت کے طور وطریقہ، رنگ ڈھنگ کے تجربہ سے ان کے باطنی ارادوں کا پتہ جو کچھ بھی چلا، مجموعی طور پر سب سے ملک کے باشندوں میں بے زاری کے جذبات پرورش پاتے چلے جارہے تھے۔ اس عرصہ میں انگریزی حکومت کا دائرہ بھی وسعت کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ برما سے سرحد، کابل و قندھار، اور نیپال سے راس کماری تک کا کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہا جس پر بالواسطہ یا بلاواسطہ انگریز قابل و دخیل نہ ہوں۔ فتوحات کی اس عجیب وغریب وسعت میں بجائے گوروں کی پلٹن کے ہندوستان کی کالی پلٹن کے اخلاص و جان نثاری اور بہی خواہی کے ایسے حیرت انگیز تجربات انگریزوں کو ہوئے کہ گوری پلٹن کی گراں فوج کے مقابلہ میں کالی پلٹن کی ارزانی پر بھروسہ کر کے ہر فوج میں کالوں کو اکثریت حاصل ہوگئی۔ حق نمک جس سے گورے ناآشنا تھے، ہندوستانی فوج اسی نمک کی کان انگریزوں کو نظر آئی۔ دوسری طرف کالی پلٹن اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی کہ جنگ کے جدید حربی آلات کی جگہ یہ سمجھنے لگی کہ اپنی کثرت تعداد سے انگریزوں کو ہم لوگوں نے اتنے ممالک فتح کر کے حوالہ کر دیئے ہیں۔ اور تو کچھ

Marfat.com

نہیں، لیکن اس احساس نے کالی پلٹن کے نازنخروں کے سمند پر تازیانہ کا کام کیا۔ کالی پلٹن کا یہ بھی ایک نخرہ تھا کہ چربی ملے ہوئے کارتوس کو دانتوں سے نہیں کاٹیں گے۔ وہ تو خریداروں پر اپنا ناز دکھا رہے تھے، لیکن تقدیر نے اسی ناز کو نار بنا دیا۔ انگریز کچھ اڑ گئے۔ غرور تو کالوں کے دماغ میں بھر ہی گیا تھا، اٹھ کھڑے ہوئے اور وہی ہندوستانی فوج جو خود مارا یعنی پیچ پی کر اپنے گورے افسروں کو چاول کھلانے پر اصرار کرتی تھی، انگریزوں ہی کو نہیں، بلکہ ان کے بچوں اور اُن کے عورتوں کو اس طریقہ سے قتل کرنے لگی کہ گویا وہ انسان نہ تھے۔ فوج جب باغی ہوگئی تو ملک کے عام باشندے جو سو سال کے اس عرصہ میں انگریزی حکومت سے تنگ آ چکے تھے، ان کے سامنے بھی نجات کی ایک صورت آ گئی۔ مختلف علاقوں کے برباد اور تباہ ہونے والے خاندانوں میں بھی کچھ ابال آیا۔ کچھ غنڈوں شہدوں کو بھی لوٹا مار کا موقعہ مل گیا۔ یوں مل ملا کر وہ صورت پیش آئی جسے چاہے آپ غدر و بغاوت کہیے، چاہے اس کا نام آزادی کی جدوجہد رکھ دیجئے۔ اس میں ہندو مسلمان اور دونوں قوموں کے چھوٹے بڑے عوام و خواص سب ہی طرح کے لوگ شریک تھے، لیکن بایں ہمہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جیسے پہلے کوئی لائحہ عمل لوگوں کے سامنے نہ تھا، بعد کو بھی ضبط و نظم کے قائم کرنے کا عام طور پر نہ لوگوں کو خیال ہی ہوا، اور وقتی طور پر کہیں کچھ کیا بھی گیا تو حد سے زیادہ بے جان مضمحل، گستہ و شکستہ تھا۔"

(سوانح قاسمی: جلد۲ص ۸۶۔۸۷)

یہ اتنا طویل اقتباس صرف اس لیے نقل کیا گیا ہے تا کہ یہ پتہ چل سکے کہ 1857ء کا یہ ہنگامہ جو غدر یا جنگ آزادی جو کچھ بھی ہے، یہ کسی سوچے سمجھے منصوبے (Pre-Planned) کے تحت نہیں لڑا گیا تھا بلکہ انگریزوں کے ظلم وستم کی یہ سو سالہ نفرت

Marfat.com

تھی جو ہندوستان کے رہنے والوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں مختصر طور پر ہم نے گذشتہ اوراق میں بیان بھی کر دیا ہے لیکن یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فوج اور عوام کی بغاوت نے علماء اور صلحاء کے دلوں میں بغاوت کے جذبات کیسے پیدا کر دیئے اور وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حافظ محمد ضامن شہید، حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ اسرار ہم جیسے بزرگوں کو گوشۂ تنہائی سے نکال کر میدان کارزار میں لا کر کھڑا کر دیا۔

عوام تو اس وجہ سے گوروں کی حکومت کے خلاف اُٹھے کہ گوروں نے معاشی اور اقتصادی طور پر ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہوا تھا۔ لوگوں کا کاروبار یک قلم بند ہو گیا تھا اور ان کے لیے زندگی کے دن گزارنے نہایت مشکل ہو چکے تھے، چنانچہ سرسید احمد خان نے لکھا ہے کہ

> ''اہل حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیاء تجارت ولایت کے بالکل جاتا رہا تھا، یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ پارچہ بافوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا، اسی وجہ سے سب سے زیادہ اس ہنگامہ میں یہی لوگ گرم جوش تھے۔ (اسباب بغاوت ہند: ص ۳۶)

یہ تو صرف ایک سبب تھا لیکن کتابوں کی ورق گردانی سے جو پتہ چلتا ہے تو دو سبب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک دنیوی اور دوسرا اخروی یا ایک جسمانی اور دوسرا روحانی۔ یعنی انگریزوں نے نہ صرف اہل ہند کے جینے کے تمام دروازے بند کرنے چاہیے بلکہ ان کو اپنے مذہب میں بھی داخل کرنے کے پورے پورے منصوبے بنائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی پادری گلی کوچوں میں دندناتے پھر رہے تھے اور مسلمانوں کو دائرہ عیسائیت میں داخل کرنے کے لیے اپنے تمام ذرائع استعمال میں لا رہے تھے۔

برصغیر ہندو پاک میں رہنے والوں پر رزق کے دروازے کیوں بند کیے جا رہے تھے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ گوری چمڑی والے لوگ پرانی جاگیر شاہی ختم کر کے نئی جاگیر

شاہی اور اجارہ داری قائم کرنا چاہتے تھے جس میں زیادہ سے زیادہ فائدہ ان سامراج پرستوں اور اُن کے ہم وطنوں کا ہو جن کے عشرت کدوں میں دولت و ثروت کے انبار لگانے کے لیے یہ تمام کھیل کھیلا جارہا تھا اور غارت گری کی یہ مشق کی جارہی تھی۔

یورپ کے صنعتی انقلاب نے انہیں تاجرانہ ذہن سے ہر شے کو دیکھنے کا عادی بنا دیا تھا۔ ان میں مال کی حرص کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پھر ہندوستانیوں کو ایک حریف قوم سمجھتے ہوئے ان کے خلاف نفرت کا ایک خاص جذبہ اور اپنی قوم کے بارے میں متعصبانہ اور خیر خواہانہ جذبات نے ہندوستان کے رہنے والوں پر نہ صرف صنعت اور کاروبار کے دروازے بند کیے بلکہ ملازمتوں میں بھی انہیں بہت چھوٹی چھوٹی ملازمتیں بالکل معمولی اور قلیل تنخواہوں پر دی جاتیں۔ اس بارے میں مسلمانوں کی حالت ہندوؤں سے بھی بدتر تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ انگریزں نے مسلمانوں سے زمام اقتدار چھینی تھی۔ وہ سمجھتے تھے اور کافی حد تک ان کی یہ بات درست بھی تھی کہ ہندوؤں میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کے جراثیم ہی نہ تھے۔ دوسرے ایک محکوم و مغلوب قوم کو ایک حاکم کے حلقۂ غلامی سے نکل کر دوسرے کے حلقۂ غلامی میں آجانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق اس قوم کو پڑتا ہے جو قوت واقتدار کی انتہائی بلندیوں پر محو پرواز ہو کر یکا یک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دی جائے۔ اس وجہ سے انگریزں نے مسلمان قوم کو ذلت وادبار کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینکنے کے تمام حربے استعمال کیے۔

چنانچہ لکھا ہے کہ تحصیلداری اور ڈپٹی مجسٹریٹی سے آگے کوئی عہدہ کسی ہندوستانی کو نصیب نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر گوروں اور کالوں کی تنخواہوں میں تفاوت تھا وہ بھی ایک اور دس سے کم نہ تھا۔ یعنی جو عہدہ بھی ہندوستانیوں کو دیا جاسکتا تھا اس میں انگریزوں کی تنخواہ دس گنا زیادہ ہوتی تھی۔ گویا کہ ہندوستانی کو اگر ایک سو روپیہ دیئے جاتے تو اس کے مقابلہ میں اسی پوسٹ پر انگریز کی تنخواہ ایک ہزار تک ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے سرسید احمد خان نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”ضبطی معافیات وغیرہ سب اس لیے تھا کہ حکومت کا یہ غیر معمولی خرچ چلایا جاسکے، جو انگریز کے لیے ”گنج بخش“ تھا اور ہندوستانیوں کے لیے محض ”فاقہ شکن“۔

Marfat.com

انگریزوں کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو مفلس بنایا جائے تاکہ یہ بھکاری بن کر ہمارے خلاف بغاوت نہ کرسکیں۔ چنانچہ ہر وہ حربہ اختیار کیا گیا جس سے برصغیر پاک و ہند کے رہنے والے خصوصی طور پر مسلمانؒ اقتصادی طور پر زبوں حال رہیں۔ چنانچہ انگریزوں کے سب سے بڑے مداح سرسید نے بھی اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''ہندوستان کی رعایا روز بروز مفلس ہوتی جاتی تھی۔ ٹیکس کی زیادتی نے زمینداروں اور کاشتکاروں کو تباہ کر دیا تھا۔ بقایا وصول کرنے کے لیے زمینداریاں نیلام کرائی جاتی تھیں جو ہندوستان میں بالکل نیا دستور تھا۔ ولایتی مال کی آمد نے اہل حرفہ کو برباد کر دیا تھا۔ بایں ہمہ حکومت نے پرامیسری نوٹ جاری کر دیئے جس پر مالک سے سود وصول کیا جاتا تھا۔ اگلی عملداریوں میں شاہی انعام و اکرام آسودگی رعایا کا ایک مستقل ذریعہ تھا۔ جب شاہ جہان تخت پر بیٹھا تو صرف تخت نشینی کے دن چار لاکھ بیگہ زمین اور ایک سو بیس گاؤں اور لاکھوں روپے انعام دیئے تھے۔ اس عام افلاس کا نتیجہ تھا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا تو جیسے بھوکا آدمی قحط کے دنوں میں اناج پر گرتا ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جا گرے۔ بہت سے لوگ آنہ یومیہ پر نوکر ہوئے تھے اور بہت سے آدمی سیر ڈیڑھ سیر یومیہ اناج پاتے تھے۔'' (اسباب بغاوت ہند: ص ۳۵-۳۶)

اس سے چند سطور آگے سرسید نے لکھا ہے کہ:

''غرض کہ ملک ہر طرح سے مفلس ہو گیا تھا۔ اگلے خاندان جن کو ہزاروں کا مقدور تھا، معاش سے بھی تنگ آ گئے تھے، اور یہ اصلی سبب ناراضگی رعایا کا گورنمنٹ سے تھا۔''

''لوگوں کے دل جو تبدیلی عملداری کو چاہتے تھے اور نئی عملداری کے لیے راغب اور دل سے اس سے خوش تھے۔ میں سچ کہتا ہوں

Marfat.com

کہ اسی سبب سے تھے۔ ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں کہ جب افغانستان سرکار نے فتح کیا تو لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ کیا سبب تھا؟

''صرف یہ سبب تھا کہ اب مذہب پر علانیہ دست اندازی ہوگی۔ جب گوالیار فتح ہوا، پنجاب فتح ہوا، اودھ لیا گیا تو لوگوں کو کمال رنج ہوا۔ کیوں ہوا؟

اس لیے ہوا کہ ان کے پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی۔ نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں۔ ہر قسم کی ہندوستانی اشیاء کی تجارت بکثرت تھی۔ ان علمداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی جاتی تھی۔''

(اسباب بغاوت ہند: ص۳۶۔۳۷)

انگریزوں کے خلاف بغاوت کے اسباب صرف معاشی اور اقتصادی ہی نہ تھے بلکہ تہذیب اور مذہب کو بھی ان بدیشی حاکموں سے شدید خطرہ تھا۔ مذہب بسا اوقات ذاتی رجحانات کا نتیجہ ہوتا ہے جبکہ تہذیب کو انسان اپنا خاندانی اور آبائی ترکہ تصور کرتا ہے۔ جس طرح موروثی جائداد کی حفاظت کے لیے جان ہتھیلی پر لیے رہتا ہے، اسی طرح حفاظت تہذیب کے لیے بھی وہ ہمیشہ کفن بردوش رہتا ہے۔ اس ہنگامہ کے پس پردہ مذہبی اور تہذیبی تقاضے بھی اتنے شدید تھے کہ ہندستانی اگر 1857ء کی یہ قیامت برپا نہ کرتے تو فطرت انسانی کا فیصلہ اُن کے خلاف نہایت سخت ہوتا۔

سرسید اگرچہ بڑا وسیع المشرب تھا، لیکن آخر عمر میں ایشیائی تہذیب کی بجائے یورپین تہذیب کا داعی اور مناد بن گیا تھا، اس نے بھی بغاوت کے اسباب میں تہذیبی اور مذہبی خطرات کو بیان کیا ہے۔ ان کی شہادت سے زیادہ مستند شہادت اور کسی کی نہیں۔

''کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل، اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو کیا مسلمان عیسائی

مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر لا ڈالے، اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی (بغاوت) میں یہی ہے۔"

"ہر شخص دل سے جانتا تھا کہ ہماری گورنمنٹ کے احکام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں آتے ہیں اور جو کام کرنا ہوتا ہے رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں۔ اس واسطے دفعتاً اور جبراً دین بدلنے کو نہیں کہتے۔[1] مگر جتنا جتنا قابو پاتے جائیں گے اتنی اتنی مداخلت کرتے جائیں گے، اور جو باتیں رفتہ رفتہ ظہور میں آتی گئیں، جن کا بیان آگے آئے گا، ان کے اس غلط شبہ کو زیادہ تر مستحکم اور مضبوط کرتی گئیں۔ سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبر مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی بلکہ خفیہ تدبیریں کر کر مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت کے اور مفلس و محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کے جو ان کا مذہب ہے، اس کے مسائل سے ناواقف کر کر اور اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر، نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دے گی۔ 1837ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کیے گئے، وہ کام اضلاع مغربی و شمالی میں ارادۂ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح پر مفلس اور محتاج کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی، ہندوستان کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا اور یہ بھی میں سچ کہتا ہوں کہ منشا اس رنج کا اور کچھ نہیں ہوتا تھا بجز اس کے کہ لوگ جانتے تھے کہ جوں جوں اختیار ہماری گورنمنٹ کا زیادہ ہوتا جائے گا اور کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلہ میں فساد کا اندیشہ نہ رہے گا

۱۔ یہ بھی سرسید کی خوش فہمی ہے۔ پادریوں کی فوج جو انہوں نے ملک کے گلی کوچوں میں پھیلا رکھی تھی وہ دفعتاً تبدیلیٔ دین ہی کے لیے تو تھی۔

Marfat.com

دوں دوں ہمارے مذہب اور رسم و رواج میں زیادہ تر مداخلت کریں گے۔"

سرسید ہی نے اپنی گورنمنٹ یعنی حکومت برطانیہ کے بارے میں عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں یوں لکھا کہ:

"ہماری گورنمنٹ کی ابتدائی حکومت میں ہندوستان میں گفتگو مذہب کی بہت کم تھی۔ روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس زمانہ میں بدرجۂ کمال پہنچ گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو ان امور میں کچھ مداخلت نہیں تھا، مگر ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب معاملے بموجب حکم اور بموجب اشارے اور مرضی گورنمنٹ ہوتے ہیں۔ سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ سے پادری صاحب تنخواہ پاتے ہیں۔"

سرسید نے اس سے آگے اپنی گورنمنٹ کے حکام کا پادریوں کا معاون اور معتمد ہونا بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"گورنمنٹ اور حکام انگریزی جو ولایت سے آکر اس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں اور ہر طرح ان کی مددگار اور معاون ہیں۔ اکثر حکام معتمد اور افسران فوج نے اپنے تابعین سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی۔ بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آکر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرضیکہ اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ اس گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔"

جن پادریوں کا وعظ سننے کے لیے حکام حکومت لوگوں کو اپنی کوٹھیوں میں آنے کی دعوت دیتے تھے اور جبراً انہیں بلاتے تھے تاکہ پادری صاحب کا وعظ ان کے کان میں

Marfat.com

پڑ جائے اور اُسے مسیحی بھیڑوں میں بعد میں داخل کر لیا جائے، سر سید احمد خان نے ان پادریوں کے وعظ کے طریقوں کو یوں بیان کیا ہے:

''پادری صاحبوں کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی۔ تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال و جواب چھپنی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں۔ ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں کی نسبت الفاظ اور مضامین رنج دہ مندرج ہوتے۔ ہندوستان میں وعظ اور کتھا کا دستور یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو، وہاں جا کر سنے۔ پادری صاحبوں کا طریقہ اس کے برخلاف تھا۔ وہ خود غیر مذہب کے مجمع یا تیرتھ اور میلہ میں جا کر وعظ کہتے تھے۔ اور کوئی شخص حکام وغیرہ کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا۔ بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحب کے ساتھ تھانہ کا ایک چپراسی جانے لگا۔ پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس نظاموں کو بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے، جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا۔''

لوگوں کو ان کے اپنے مذہب سے دور اور عیسائی مذہب سے قریب تر لانے کے لیے ملک میں مشنری اسکولوں کا اجراء کیا گیا۔ چنانچہ سر سید نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

''مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور ان میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں۔ بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام معتہد ان اسکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی

ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں میں سے لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے، پوچھا جاتا کہ تمہارا خدا کون؟ تمہارا نجات دینے والا کون؟ اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے، اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔ ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔''

''یہاں ایک بہت بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے لڑکوں کو کیوں داخل کراتے تھے۔ اس بات کو عدم ناراضی پر خیال نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ ایک بڑی دلیل ہے ہندوستان کے بکمال خراب حال اور مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہو جانے پر۔ یہ صرف ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے ان اسکولوں میں داخل ہو کر ہماری اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہو گا۔ ایسی سخت بات کو جس سے بلاشبہ اُن کو دلی رنج اور روحانی غم تھا گوارا کرتے تھے نہ رضامندی سے۔''

یہ تو شہروں کا حال تھا۔ سر سید احمد خان نے دیہاتوں کا حال بھی بیان کیا ہے کہ وہاں کن کن طریقوں سے لوگوں کو ان مدارس اور مکاتب میں داخل کیا جاتا تھا۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سر سید لکھتے ہیں کہ:

''دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے سب لوگ بہ یقین سمجھے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر جو ہر گاؤں اور قصبہ میں لوگوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ اپنے لڑکوں کو مکتبوں میں داخل کرو۔ ہر ہر گاؤں میں ان کا نام ''کالا پادری'' تھا۔ عوام الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرشتان بنانے کو بٹھاتے ہیں۔ اور فہمیدہ آدمی اگرچہ یہ نہیں سمجھتے تھے مگر یوں جانتے تھے کہ ان مکاتب میں صرف اردو

Marfat.com

تعلیم ہوتی ہے۔ ہمارے لڑکے ان میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہو جائیں گے اور عیسائی بن جائیں گے۔ اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا ارادہ یہی ہے کہ ہندوستان کے مذہبی علوم کو معدوم کر دے تاکہ آئندہ کو عیسائی مذہب پھیل جائے۔ اکثر اضلاع مشرقی ہندوستان میں ان مکتبوں کا جاری ہونا اور لڑکوں کا داخل ہونا صاف تحکماً ہوا اور کہہ دیا کہ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ لڑکوں کو داخل کیا جائے۔''

لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں بھی سرسید نے لکھا ہے کہ:

''لڑکیوں کی تعلیم کا بہت چرچا ہندوستان میں تھا اور سب یقین جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکولوں میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں کہ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی۔ بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم سعی کر کر لڑکیوں کے مکتب قائم کر دیں گے تو ہماری بڑی نیک نامی گورنمنٹ میں ہو گی۔ اس سبب سے وہ ہر طرح پر بطریق جائز و ناجائز لوگوں کو واسطے قائم کرنے لڑکیوں کے مکتبوں کی فہمائش کرتے تھے۔ اور اس سبب سے زیادہ تر لوگوں کے دلوں کو ناراضی اور اپنے غلط خیالات کا اُن کو یقین ہوتا جاتا تھا۔

حکومت انگریز نے نوکری کے استحقاق کے بارے میں ایک اشتہار دیا اس اشتہار نے لوگوں کے دلوں میں اس حکومت اور اس کی پالیسیوں کے بارے میں بہت سے شکوک وشبہات کو پہنچنے کا موقع دیا۔ اس چیز کو سرسید نے یوں بیان کیا ہے:

''ادھر تو دیہاتی مکاتب اور کالجوں کا یہ حال تھا کہ اُن پر سب کو شبہ رواج دینے مذہب عیسائی کا ہو رہا تھا کہ دفعتاً پیشگاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ جو لوگ مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہو گا اور فلاں فلاں

علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہوگا وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سارٹیفکیٹ پر جن کو ابھی تک سب لوگ ''کالا پادری'' سمجھتے تھے، منحصر ہوگئیں۔ اوران غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دل پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا، اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہوگئی۔ لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے تاکہ مجبور ہو کر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر وتبدل ہو جائے۔''(۱)

ہندوستان میں ذات پات کا بہت چرچا تھا۔ کئی ذاتیں دوسری ذاتوں کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتی تھیں۔ لیکن جیل خانوں میں کھانے پینے کے اس اختلاط نے لوگوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات کو اور تیز کیا۔ چنانچہ سرسید نے لکھا ہے کہ:

''اسی زمانہ میں بعض اضلاع میں تجویز پیش ہوئی کہ قیدی جیل خانوں میں ایک شخص کے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں جس سے ہندوؤں کا مذہب بالکل جاتا رہتا تھا۔ مسلمانوں کے مذہب میں اگرچہ کچھ نقصان نہیں آتا تھا مگر اس کا رنج سب کے دل پر تھا کہ سرکار ہر ایک کا مذہب لینے پر آمادہ اور ہر طرح پر اس کی تدبیر میں ہے۔''

ان سب باتوں کے باوجود انگریزوں کی طرف سے کچھ مراسلے جاری کیے گئے جن میں عوام کو ترغیب وترہیب کے ذریعہ عیسائیت میں داخل ہونے کے لیے کہا گیا۔ اس کے اثرات بھی لوگوں کے دلوں میں بہت برے پڑے۔ چنانچہ سرسید ہی نے لکھا ہے کہ:

۱۔ لیفٹننٹ کرنل ویلر جو ایک رجمنٹ کمانڈر تھا، اس نے 1857ء میں بڑے فخر سے کہا تھا کہ بیس برس سے کچھ زیادہ دنوں سے میری یہ عادت رہی ہے کہ سب قسم کے آدمیوں کو بغیر کسی تمیز کے وعظ سناتا ہوں۔ مسیح کا سپاہی بن کر خدا کے احکام اور سرکار کمپنی کا سپاہی بن کر اُس کے احکام سناتا ہوں۔''
(تاریخ عروج عہد انگلیشیہ: ص ۳۰۱)

Marfat.com

''یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہی تھیں کہ دفعتہً 1857ء میں پادری اے۔ ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ ''اب تمام ہندوستان میں ایک علمداری ہو گئی۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہو گئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ'' میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے، وہ وقت اب آ گیا۔ اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول ان کو کرشتان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو۔ سب لوگ بے شک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیات گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔ آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کار ان سرکاری نوکروں سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پس بھی چھٹی آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بسبب لالچ نوکری کے کرشتان ہو گئے۔ ان چٹھیوں نے یہاں تک سرکاری اہل کاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی۔ لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آ جائے گی۔ کیا تم سرکاری نوکر نہیں ہو؟ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں، چنانچہ انہوں نے کر دیا اور اس نے مٹانے کو کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ کچھ عجب نہ تھا کہ اُسی زمانہ میں کچھ برہمی اور تھوڑا بہت فساد ملک میں شروع ہو جاتا۔ چنانچہ اس وقت کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے، مگر جناب معلّی القاب نواب

Marfat.com

لیفٹینٹ گورنر بہادر بنگال نے بہت جلد خبر لی اور ایک اشتہار جاری کیا جس سے فی الجملہ لوگوں کے دلوں میں تسلی ہوئی اور وہ اضطرار جو ہو گیا تھا وہ دھیما ہوا، مگر جیسا کہ چاہیے ویسا قلع اور قمع اس کا نہ ہوا۔ لوگ سمجھے کہ بالفعل یہ بات موقوف ہو گئی، پھر کبھی قابو کے وقت پر جاری ہو گی۔"

یہ جو کچھ بھی ہوا برصغیر پاک و ہند میں رہنے والے لوگوں کے ساتھ ہوا۔ اس میں دین و مذہب کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو مذہب اور تہذیب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن مسلمانوں کو اس بات کا زیادہ رنج اور غصہ تھا جو ان کے دین میں مداخلت کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ سرسید احمد خان ہی نے لکھا ہے کہ

"ان سب باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہنود کے زیادہ ناراض تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم و رواج کے ادا کرتے ہیں نہ بطور احکام مذہب کے۔ ان کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد اور وہ دلی اور اعتقادی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق ان کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں، اور نہ اُن کے برتاؤ میں ہیں۔ اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سست اور بجز ان رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کے پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصب نہیں ہیں۔ اُن کے سامنے ان کے اس عقیدے کے جس کا دل میں اعتقاد چاہیے، برخلاف باتیں ہوا کریں۔ اُن کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا، برخلاف مسلمانوں کے وہ اپنے مذہب کے عقائد بموجب جو باتیں کہ اُن کے مذہب سے نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں، بخوبی جانتے ہیں۔ اور اُن احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کرتے ہیں۔ اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصب ہیں۔ ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض تھے

Marfat.com

اور ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تر فساد میں اُن کا شریک ہونا قرین قیاس تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بلاشبہ جتنی گورنمنٹ کی مداخلت مذہب میں خلاف قواعد ملک داری ہے ایسا ہی کسی مذہب کی تعلیم کو روکنا علی الخصوص اس مذہب کی جس کو وہ حق سمجھتی ہے، برخلاف اور بے جا ہے، مگر ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ باوجودیکہ ہماری گورنمنٹ ایسی ہی ہے مگر کام اس طرح پر ہوئے کہ رعایا کا یہ غلط شبہ رفع نہ ہوا۔

(اسباب بغاوت ہند: ص ۱۷ تا ۲۳)

یہ تو مسلمانوں کا حال تھا لیکن ہندوؤں کی مخالفت بھی انگریزوں کے بارے میں مسلمانوں سے کم نہ تھی۔ انگریزوں نے ان کے مذہب میں بھی مداخلت کی اور ان کو عیسائیت کے حلقہ میں لانے کی کوشش کی، چنانچہ وہ بھی انگریزوں کے بدخواہ تھے۔ شمس العلماء ذکاء اللہ خان، مشنریوں اور انگریزی حکام کی ان کوششوں کو جو ہندوؤں کے مذہب اور اُن کے رسم ورواج کے خلاف تھیں، تفصیل سے بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''پنڈتوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں دنیاوی علوم کی ہر شاخ کو باقاعدہ نظام کے تحت داخل کر رکھا ہے۔ غرض اس دنیا میں اور اس سے باہر ہندوؤں پر پنڈتوں کو وہ اقتدار حاصل ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں۔ اب انگریزی عملداری میں اُن کے سارے اقتداروں اور اختیاروں میں خلل پڑا۔ مقدمات میں رجوع انگریزی عدالتوں کی طرف کیا جاتا اور اُن کی اپیل بھی اعلیٰ عدالتوں میں ہوتی۔ پنڈتوں کی پوچھ گچھ اُن میں کمتر ہوگئی۔ اس لیے یہ سارا فرقہ انگریزی عملداری کا بدخواہ ہوگیا۔'' (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ: ص ۱۹۷)

ایک انسان اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے ساتھ ساتھ اپنی عزت نفس کا بھی خاص خیال رکھتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے اس کا بھی تحفظ کرتا ہے۔ انگریز نے ہندوستانیوں کی عزت، شرافت، خودداری اور عزت نفس پر بھی ضرب کاری لگائی۔ ویسے ہندوستان کی عزت وعظمت پر ضرب کاری تو سو سال پہلے یعنی مئی 1757ء ہی میں لگ گئی

تھی جب انگریزوں نے عیاری اور مکاری سے میر جعفر جیسے سیاسی غدار پیدا کر کے سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس وقت ہندوستان کی مختلف طاقتیں آپس مین دست وگریبان تھیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ 1857ء میں جنگ پلاسی کی فتح کی صد سالہ یادگار منائی جارہی تھی۔ اس بات میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان کے باشندوں کو بے وقار بلکہ ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا تھا جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف جذبات موجزن رہتے تھے۔ چنانچہ سرسید ہی نے لکھا ہے کہ

> ''بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے اُن کو نہایت بے قدر اور بے وقار کر دیا ہے۔ ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے جیسی ایک چھوٹے یورپین کی ایک بہت بڑے ڈیوک کے سامنے، یوں تصور کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹلمین نہیں ہے۔'' (اسباب بغاوت ہند: ص ۴۲)

ایک اور جگہ پر سرسید لکھتے ہیں کہ:

> ''حال کے حکام متعہد سے (اُس وقت کے افسران متعلقہ کے مقابلہ میں) وہ پہلے لوگ (سابق زمانہ کے یورپین افسر) بہت عزت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کی ہر طرح سے خاطرداری کرتے تھے۔ اُن کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ دوستانہ اُن کے رنج و راحت کے شریک ہوتے تھے۔ باوجودیکہ وہ بہت بڑی سرداری اور حکومت ہندوستان میں رکھتے تھے اور تحشم اور رعب اور دبدبہ جو شایان حکومت ہے وہ بھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ پھر ایسی محبت اور عزت ہندوستانیوں کی کرتے تھے کہ ہر ایک شخص مل کر اُن کے اخلاق کا اور ان کی محبت کا فریفتہ ہو جاتا تھا۔ اور تعجب سے کہتا تھا کہ یہ کیسے اچھے لوگ ہیں کہ باوجود اس حشمت و شوکت اور

Marfat.com

حکومت کے بے غرور ہیں اور کس طرح اخلاق سے ملتے ہیں۔ ہندوستان میں جو لوگ بزرگ گنے جاتے تھے اُن سے اسی طرح پیش آتے تھے۔ بے شک ان لوگوں نے پطرس مقدس کی پیروی کی تھی اور برادرانہ محبت پر اُلفت بڑھائی تھی۔ حال میں جو حکام متعہد ہیں اُن میں سے اکثروں کی طبیعتیں اُن کے برعکس ہیں۔ کیا اُن کے غرور اور تکبر نے تمام ہندوستانیوں کو ان کی آنکھوں میں ناچیز نہیں کر دیا ہے؟ کیا اُن کی بدمزاجی اور بے پروائی نے ہندوستانیوں کے دل میں بے جا وحشت نہیں ڈالی ہے؟ کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھا؟ اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہل کار صاحب کے سامنے مسل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے اور صاحب کہ بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی۔ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔'' (اسباب بغاوت ہند: ص ۴۲۔۴۳)

کہنے والے کہتے ہیں کہ 1857ء کا ہنگامہ صرف مٹتی ہوئی جاگیرداری کی انگڑائی تھی، حالانکہ یہ ایک قوم کی بڑھتی ہوئی جاگیر شاہی کے مقابلہ میں دوسری قوم کی حرکت مذبوحانہ تھی۔ یہ ہنگامہ تقاضا تھا انسانی شرافت کا، عزت نفس اور ہندوستانیوں کی خودداری کا، ان کی حمیت وغیرت کا، احساس صحیح اور جذبۂ تعاون کا۔ یہ ہنگامہ اضطراب تھا دین و مذہب کے ماننے والوں، دھرم اور مذہب کے پابند، پاک نفوس اور پاک باطن خدا پرستوں کے پاک جذبات اور احساسات کا۔ یہ ہنگامہ شوروفغاں تھا تباہ شدہ دست کاروں کی فاقہ مستیوں کا، زیادہ ستانی کی مصیبت کے مارے ہوئے کسانوں اور کاشت کاروں کے رنج وغم کا۔ یہ ہنگامہ نتیجہ تھا کمپنی کی ڈیڑھ سو سالہ لوٹ مار کا جس نے جنگ پلاسی 1757ء کے بعد حکومت کا روپ دھار لیا تھا۔ پہلے اگر وہ ''گریۂ مسکین'' بن کر خون چوستی

Marfat.com

اور گوشت نوچتی تھی تو اب ''گرگ مردم خور'' بن کر نہ صرف دستکاری کے کارخانوں اور تجارت کی منڈیوں کو تباہ کر رہی تھی بلکہ بڑی بڑی حکومتوں کے پرخچے اڑا رہی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوستانیوں کے دلوں کی سرزمین میں قومی احساس کے ذرے چمک رہے تھے، اگر اُن کے سینوں میں وطنی جذبات زندہ تھے۔ اگر خودداری اور خود اعتمادی کی حرارت سرد نہیں پڑی تھی۔ اگر دور اندیشی اور انجام بینی کے چراغ گل نہیں ہوئے تھے تو وہ اتنے طویل عرصہ تک کیوں خاموش رہے، اور ان کے تن بدن میں حرکت کیوں نہیں پیدا ہوئی؟ یہ ایک نہایت معقول اور اہم سوال ہے۔ اگرچہ اس سوال کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا ہے کہ:

> ''انگریز جب یہاں پہنچے تو تاجروں کی حیثیت میں پہنچے تھے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں صرف تجارت سے دلچسپی ہے، ملک داری سے کوئی واسطہ نہیں اور انہوں نے جو لڑائیاں کیں وہ ملک گیری کے لیے نہ تھیں بلکہ ملکی حکمرانوں میں سے کسی ایک کی امداد کے لیے تھیں۔ یا اُن کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے یورپی تاجروں کا مقابلہ کر سکیں۔ پھر جب باقی یورپی قومیں مقابلہ کے میدان سے ہٹ گئیں تو انگریزوں نے یا تو ملکی حکمرانوں کی حمایت کو پردہ بنائے رکھا یا ایسی چالیں چلتے رہے کہ اُن کے حقیقی مقاصد سب پر آشکارا نہ ہو سکے۔''

اس جواب کی اصابت وصداقت ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔ کیونکہ یہ درست ہے کہ انگریزوں کے ابتدائی دور میں عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ انہیں صرف بیوپار سے دلچسپی ہے ملک داری اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں، اور یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ سراج الدولہ کو ختم کرنے کے لیے میر جعفر نے جو سازش کی اس کی بنیاد بھی یہی تصور تھا کہ روپیہ ان بیوپاریوں کا ہو گا اور سلطنت اور حکومت میری ہو گی، لیکن مقام غور ہے کہ جب تھوڑے ہی دنوں بعد میر جعفر کی گدی میر قاسم کو بخش کر کمپنی بہادر سودا فروش کی حیثیت سے نہیں بلکہ ''نواب گر'' اور ''بادشاہ گر'' کی شان میں جلوہ افروز ہوئی تو کیا اب بھی اس

Marfat.com

خیال کے لیے کوئی گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ ''انگریز کو صرف تجارت سے دلچسپی ہے۔''

اس قسم کے اور کئی اہم واقعات تاریخ کی کتابوں میں مرتسم ہیں۔ ان واقعات سے جو قوم انگریز کو نہیں پہچان سکی تھی، اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ کسی بھی وقت انگریز کو پہچان سکتی، کیونکہ بجلیوں کے کڑاکوں کو نہ سننا اور برق خرمن سوز کی چمک اور تڑپ کو نہ دیکھنا، غفلت کی دلیل نہیں بلکہ فقدان صلاحیت کی علامت ہے کہ یہاں سمع و بصر کی طاقت ہی موجود نہیں کہ گرج اور چمک کا احساس ہو۔ اسی صدی کے آخر میں سلطان فتح علی خان ٹیپو شہید کو ختم کر کے اس کے ملک کو حصے بخرے کرنا اور صرف سات سال بعد دہلی فتح کر کے شاہ عالم کو نظر بند کر دینا، انگریزی مقاصد کی سراسر عریانی تھی۔ اب کون سا پردہ تھا جو اس نیم برہنہ قوم کی کامل برہنگی میں حائل رہ گیا تھا۔

اتنی بات ہر کسی کے لیے قابل تسلیم ہے کہ یورپ کے سفید فام جو دلوں کی سیاہی اور اپنی جلاد طبیعت کو چٹی چمڑی اور بھولی بھالی صورتوں میں پنہاں کیے ہوئے تھے، اپنے کردار کی وحشت و بربریت پر بھی رنگ برنگ نقاب ڈالتے رہے، لیکن کیا ہندوستانی مدبر اور دانشور اتنے کوتاہ اندیش تھے کہ ان کی نگاہیں سیاسی چالبازیوں کے پس منظر تک نہ پہنچ سکیں، اور رنگ برنگ نقابوں کے نظر فریب نظاروں میں ایسے محو ہو گئے تھے کہ اندازہ قد و قامت کے بعد بھی پری اور دیو میں فرق نہ کر سکے؟

حقیقت یہ ہے کہ ارباب حل و عقد، فرمانروا اور علماء انگریز کو اسی وقت پہچان چکے تھے جب انہوں نے اور اُن کے پیش رو پرتگیزوں نے ہندوستان کے ساحلوں پر قزاقی شروع کی تھی اور حاجیوں کے جہازوں کو لوٹ کر اپنی بربریت اور دہشت کو تاریخ ہند کا ایک دل خراش باب بنا دیا تھا۔ ''واسکوڈی گاما'' مغل سلطنت کی بنیاد پڑنے سے بھی قریباً ربع صدی پہلے کالی کٹ پہنچ چکا تھا، اسی وقت سے سوداگروں کے لباس میں ان قزاقوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی اور اکبر کے زمانہ تک وہ متعدد بندرگاہوں پر قابض ہو چکے تھے۔ اکبر نے ایک مرتبہ اپنے دربار میں پرتگیزی وفد کا اعزاز و اکرام کر کے بلاشبہ اپنی بلند حوصلگی، سیر چشمی اور اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا، لیکن ساتھ ہی جب ان پرتگیزی قزاقوں کے بارے میں شکایات پہنچیں تو گجرات اور مالوہ کے گورنروں کے ذریعے اُن کی

گوشمالی بلکہ کافی حد تک پامالی بھی کرادی۔ اسی طرح جہانگیر کے عہد حکومت میں انگلستان کے نمائندے ہندوستان پہنچے۔ سرطامس رو کی سفارت باریاب ہوئی۔ شاہی اعزاز و اکرام سے اُن کا استقبال کیا گیا، لیکن شہزادہ خرم اُن کے چہرے بشرے سے ان کی نیتیں تاڑ رہا تھا۔ اس کی کوشش بھی یہی رہی کہ یہ سفارت ناکام ہو۔ پھر شہزادہ خرم جب شاہجہان ہوگیا تو اُس نے اور اُس کے بعد اُس کے بیٹے اورنگ زیب عالمگیر نے جس طرح اُن کو بار بار ہندوستان کی سرحدوں سے ہنکایا بلکہ دھتکارا، پیش قدمی کرنے والوں کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزائیں دیں، وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ بیدار مغز فرمانروا ان کے سبز قدموں کی نحوست سے غافل نہ تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد وہ دور آیا جو مغلیہ سلطنت کی جان کنی کا دور تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی عزت و عظمت بھی حالت نزع میں گرفتار ہونے لگی جس نے دو سو برس سے اپنی قسمت کے تار و پور مغل سلطنت کے دامنوں سے باندھ رکھے تھے۔ یہ وہ دور تھا جس میں مرکزیت فنا کے گھاٹ اتاری جارہی تھی اور طوائف الملوکی کے عفریت ہندوستان کے چپہ چپہ پر رینگ رہے تھے۔ اس دور کے متعلق یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ لوگوں نے انگریزوں کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا، البتہ یہ بات درست ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے غافل ہو گئے تھے، اور انہوں نے اپنے مستقبل کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انگریز کو پہچان لینے کے باوجود وہ نہیں کیا یا نہیں کر سکے جو کرنا چاہیے تھا۔ خود پرستی نے خود غرضی اور ذاتی مفاد کی ہوسناکی جو قومی عظمت و وقار اور حیات اجتماعی کے لیے سرطان اور پلیگ سے بھی زیادہ مہلک امراض ہیں اور جن کی بنا پر طوائف الملوکی عروج پاتی ہے، انہی امراض نے ارباب اقتدار کی چشم کو نابینا اور گوش حق نیوش کو اصم اور مدہوش بنا دیا تھا۔ یہ عجیب فلسفہ ہے کہ انسان جتنا زیادہ اپنی پرستش میں مشغول ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ خود فراموش ہو جاتا ہے۔ ذاتی مفاد اور خود پرستی کے شوالے جو دکن، بنگال اور اودھ میں تعمیر کیے گئے تھے، ان کی خصوصیت یہ تھی کہ اُن کے پجاری انگریزوں کو پہچاننے، سمجھنے اور بوجھنے کے باوجود اس پر مجبور تھے کہ سنی کو اَن سنی اور دیدہ کو نادیدہ بنا دیں کیونکہ وہ اغراض جن کے آب و گل سے یہ شوالے تعمیر ہوئے تھے اُن کا

Marfat.com

تقاضا ہی یہ تھا ورنہ یہ شوالے مسمار ہو رہے تھے۔

خلاصہ یہ کہ نو وارد فرنگیوں کے پہچاننے میں اگر ابتداء غلطی ہوئی بھی تھی تو وہ بہت جلد ختم ہوگئی۔ البتہ جن اغراض مشؤمہ نے جانے پہچانے پڑوسیوں سے انجان بنایا تھا وہی اغراض اب انگریزوں کے شناخت کرنے میں چشم بصیرت کے لیے باعث خیرگی بنی ہوئی تھیں۔ البتہ اسی اغراض پرستی اور طوائف الملوکی کے دور میں تحقیق و تفتیش کی ندرت آفرینی اور تلاش و جستجو کی عجائب نوازی ہمیں ایک جماعت سے روشناس کراتی ہے جس کے جذبات مقدس، مقاصد بلند اور جس کی جدوجہد ہر قسم کے شبہ سے پاک ہے۔ بادشاہوں، شہزادوں، نوابوں اور راجاؤں کے متعلق بجا طور پر جاگیر شاہی کی زریں تمناؤں کا شبہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اس جماعت کا دامن ایسے تمام داغوں سے پاک ہے۔ یہ جماعت نہ اقتدار کی خواہاں، نہ حکومت و سلطنت کی آرزومند، نہ اعزاز و اکرام اور اعلیٰ خطابات کی ہوس اس کے دامنوں سے الجھی ہوئی۔ اس کے سامنے صرف اور صرف دین و مذہب کی حفاظت تھی جس نے اس کے پاک نفوس میں یہ پاکیزہ جذبات پیدا کیے۔ اور وطن تھا، باشندگان وطن تھے ان کی حفاظت تھی اور اپنے وطن کی تعمیر و ترقی تھی۔

یہ جماعت علماء کی جماعت تھی۔ اس جماعت کے فکر سلیم اور جذبۂ صادق کا اگر اعتراف نہ کیا جائے، یہ نہ صرف اس با اخلاص اور ایثار پیشہ جماعت کے حق میں ناانصافی ہوگی بلکہ وطن عزیز کے حق میں خیانت اور ایثار و قربانی کی پوری تاریخ پر ایک بہت بڑا ظلم ہوگا۔ اس جماعت نے اٹھارویں صدی کے وسط سے رفتار زمانہ کو بھانپ کر جو تدبیریں سوچیں، جو نظریات قائم کیے اور جس طرح اُن پر عمل کیا، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

اس کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب ''علماء میدان سیاست میں''۔

علمائے کرام کے نظریات:

اٹھارہویں صدی کا قریباً وسط تھا۔ سلطنت مغلیہ کی کشتی ڈانواں ڈول اور انگریزی اقتدار کی گھٹائیں دن بدن گاڑھی ہو رہی تھیں۔ وطنی سیاست کے چاند تارے ان گھٹاؤں میں پردہ پوش ہو چکے تھے اور کچھ چھپتے جا رہے تھے۔ اس وقت دلی کا ایک نوجوان حجۃ

Marfat.com

الاسلام حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے خوش حال، ترقی پذیر متمدن اور فوجی لحاظ سے نہایت مضبوط وطن کے نقشہ کو نصب العین بنا کر کتاب اللہ اور سنت رسول کی روشنی میں اقتصادی اور سیاسی نظریات مرتب کیے۔ ان نظریات کو ذہنوں میں ڈالنے اور ان کے مطابق ذہنوں کی تربیت کے لیے انہوں نے ہندوستان میں چند مراکز قائم کیے۔ ان مراکز میں سب سے بڑا مرکز دہلی تھا۔ اس مرکز کے سربراہ پہلے وہ خود آپ تھے لیکن آپ کے انتقال پرملال کے بعد آپ کے صاحبزادے استاذ العلماء حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ کی زیرتربیت ہندوستان کے علمی حلقوں میں نئی زندگی پیدا کی اور حضرت مولانا سید احمد شہید بریلویؒ، حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ، شیخ الاسلام مولانا عبدالحیؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف پھلتی جیسے جرنیل، حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ، حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد صدرالدین صاحبؒ، حضرت مولانا رشید الدین صاحب، دہلویؒ، حضرت مولانا مرزا حسن علی محدث لکھنویؒ، حضرت مولانا اولاد حسین صاحب قنوجیؒ، حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا قطب الدین صاحب دہلویؒ اور حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادیؒ جیسے مفکر و مدبر پیدا کیے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے انتقال کے بعد اُن کے صحیح جانشین حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے سپرد اس مرکز کی صدارت ہوئی۔ شاہ صاحب کی وجہ سے یہ مرکز زندہ تھا، محفوظ تھا اور متحرک تھا، لیکن کچھ ایسا انقلاب آیا کہ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ اور اُن کے بھائی شاہ محمد یعقوب صاحب نے وطن عزیز سے رخت سفر باندھا اور مکہ معظمہ میں جا کر ڈیرے ڈال دیئے۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے لکھا ہے کہ

> ''مولانا محمد اسحاقؒ نے اولاً مکہ معظمہ پہنچ کر پوری آزادی سے اپنی ہندوستانی تحریک کی راہ نمائی کا کام شروع کر دیا۔ اس پر دولت عثمانیہ کی وزارتِ خارجہ کو اُن کے اخراج پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔''
>
> (حضرت شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک: ص ۱۸۴)

حضرت شاہ صاحب موصوف نے وہاں کا معاملہ شیخ الحرم کو درمیان میں ڈال

Marfat.com

کر ٹھیک کر لیا۔ چنانچہ انہیں وہاں رہنے کی اجازت مل گئی، لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل وعقد کے غیظ وغضب کو فرو کرنا نہ اُن کے امکان میں تھا اور نہ وہ عزائم اس کی اجازت دے سکتے تھے، جن کو وہ سینہ میں لے کر مکہ مکرمہ گئے تھے۔ چنانچہ یہاں اُن کی تمام املاک بحق سرکار ضبط کر لی گئیں جس کا مقابلہ انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے کیا۔ لکھا ہے کہ جب ضبطیٔ جائداد کی خبر ان بزرگوں کو پہنچی تو ان پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ آپس میں مبارک باد دے رہے تھے اور بڑی خوشی سے یہ خبر دوستوں کو سناتے تھے۔

فوج میں بغاوت:

1757ء کے بعد جو لاوا اندر ہی اندر ابل رہا تھا 10 مئی 1857ء کو وہ آتش فشاں پھٹ پڑا۔

الحاق، لاخراجی زمینوں کی ضبطی، جیل خانوں میں ایک کھانا، فوجی بھرتی میں سمندر پار جانے کی شرط، نکاح بیوگان، گھی میں چربی اور آٹے میں ہڈیوں کی راکھ کا پروپیگنڈہ، چپاتیوں کی تقسیم اور چربی لگے ہوئے کارتوس کے افسانے اور شاہ ایران اور شاہ روم سے غلط توقعات وغیرہ یہ وہ چیزیں تھیں جنہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور فوج باغی ہوگئی۔ چنانچہ لارڈ ڈلہوزی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''ہندوستان میں یورپین آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھے ہیں۔'' یہ آتش فشاں پھٹا اور پورا ہندوستان اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

اس بغاوت میں زیادہ دخل اس پروپیگنڈہ کا تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنا رہے ہیں۔ چنانچہ جب کسی صوبے کا الحاق کیا جاتا تو یہ کہا جاتا کہ اسے عیسائی بنانے میں آسانی ہوگی کہ بہت سے آدمی عیسائی ہو جائیں گے۔

دل آزار، تکلیف دہ اور ہندوستانیوں کے لیے توہین آمیز واقعات کا سلسلہ جو عرصہ سے چل رہا تھا وہ دن بدن زیادہ ہوتا رہا۔ حکومت کو بار بار آگاہ کیا گیا لیکن اس کے سول اور ملٹری حکام نے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر کان دھرنے سے انکار کر دیا۔ انہیں اسی وقت ہوش آیا جب طوفان نے درختوں کو اکھاڑنا شروع کر دیا۔

12 جنوری 1857ء کو ڈم ڈم (جو کلکتہ سے 12 میل دور ہے اور آج کلکتہ کا

Marfat.com

ہوائی اڈاہ بھی یہیں ہے) میں مقیم فوجیوں نے اپنے انگریز افسر سے شکایت کی کہ ان فیلڈ رائفلوں کے لیے جو کارتوس بنائے جاتے ہیں ان میں گائے اور سور کی چربی ہے۔ اس افسر نے حکومت ہند کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔ حکومت نے بعض چھاؤنیوں میں اپنے سپاہیوں کو یہ یقین دلا دیا کہ کارتوسوں میں گائے اور سؤر کی چربی استعمال نہیں کی جا رہی، لیکن یہ افواہ بارود کے ڈھیر میں چنگاری کا کام کر چکی تھی۔ چنانچہ 19 فروری 1857ء کو بہرام پور کی رجمنٹ نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ کرنل مچل (Mitchle) نے فوجیوں سے اس مظاہرے کا سبب دریافت کیا۔ فوجیوں نے جواب دیا:

"سرکار ہمارا دین بگاڑ رہی ہے۔"

اسی قسم کا سلسلہ مختلف جگہوں پر چل رہا تھا کہ ایک روز بارک پور کی چونتیسویں رجمنٹ کے ایک فوجی نے پریڈ کے وقت "دین دین" کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو فرنگیوں کے خلاف لڑنے کے لیے اکسایا۔ سارجنٹ میجر موقع پر پہنچ گیا۔ اس فوجی نے اس پر گولی چلا دی۔ وہ بال بال بچ گیا، لیکن بغاوت کے آثار پا کر جنرل ہری موقع پر پہنچ گیا اور حالات پر قابو پا لیا گیا۔

چند روز بعد چونتیسویں رجمنٹ کی سات کمپنیوں سے ہتھیار چھین کر انہیں الگ کر دیا گیا۔ حکومت مطمئن تھی کہ بغاوت ختم ہو چکی ہے، لیکن بغاوت تو ابھی ہونے والی تھی۔ حکومت نے ہر ممکن طریق سے سپاہیوں کو سمجھایا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی گئیں چنانچہ سپاہیوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ کارتوسوں کو استعمال کریں گے، لیکن ان کے لیے بڑی پریشانی کی بات یہ تھی کہ اگر فوجی مطمئن ہو کر ان کارتوسوں کو لے بھی لیتے تو فوج سے باہر ان کی بات ماننے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کی ذات برادری کے آدمی بھی اُن سے نفرت کرنے لگتے۔ چنانچہ وہ زار زار روتے کہ اگر ہم کارتوس لے لیتے ہیں تو ذات برادری سے خارج ہوتے ہیں، اپنے عزیزوں سے چھوٹتے ہیں، جینا برباد اور موت کے وقت ایمان اور دھرم کا خطرہ۔ اور اگر نہیں لیتے تو سرکار کے باغی ٹھہرتے ہیں۔

ادھر ہر سفید چمڑی والا اقتدار کے نشہ میں ایسا مدہوش تھا کہ غیر مشروط وفاداری کے سوا کسی بات کے ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دلوں کی بے چینی زبانوں

Marfat.com

تک اور زبانوں سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں تک پہنچ چکی ہے۔ چھاؤنیوں کی بیرکوں میں آگ لگنے کا سلسلہ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ آگ لگانے والوں کا پتہ کیسے چلتا، جب پتہ چلانے والے خود مجرم تھے اور کوئی گواہی دینے کو تیار نہ ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود فتوحات کے غرور نے گردنوں کو اتنا سخت کر دیا تھا کہ وہ کسی طرح خم ہونے کو تیار نہ تھیں۔

غرض یہ کہ 6 مئی 1857ء کو میرٹھ چھاؤنی میں پریڈ کرائی گئی۔ ہر ایک فوج سے پندرہ پندرہ آدمی منتخب کیے گئے۔ کل نوے آدمی پریڈ میں موجود تھے۔ کارتوسوں کی تقسیم کا حکم دیا گیا۔ پانچ کے سوا سب نے انکار کر دیا جن میں 49 مسلمان تھے اور 36 غیر مسلم تھے ان کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ 9 مئی کو فیصلہ سنانے کا دن تھا۔ پوری فوج کے سامنے ان کو دس دس سال قید بامشقت۔ پھر فوراً ہی فوجی نشان چھین لیے گئے۔ وردیاں پھاڑی گئیں۔ پھر لوہار بلائے گئے اور چند ہی لمحوں میں یہ بے داغ، وفادار سپاہی پابجولاں تھے۔ یہ نظارہ بہت ہی حسرت ناک اور اشتعال انگیز تھا۔ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا۔ یاس انگیز نگاہوں نے اشاروں ہی اشاروں میں انہیں بغاوت کا سبق پڑھا دیا، مگر گرداگرد تیار توپ خانہ کی موجودگی میں سرکشی کا تصور بھی خودکشی تھا۔

بعد ازیں ان 85 جوانوں کو پاپیادہ شہر کے جیل خانہ میں پہنچا دیا گیا۔ راستہ چلتے ہر شخص نے انہیں دیکھا۔ جدھر سے یہ سپاہی گزرتے اُن کے مایوس دلوں کی سوزش ہندوستانی غیرت وحمیت کی ٹوٹی جھونپڑیوں میں چنگاریاں چھوڑتی جاتی تھی۔ عورتیں بھی بیتاب ہو کر چیختی تھیں اور اپنے مردوں سے کہتی تھیں کہ اگر تم میں چھڑانے کی ہمت نہیں ہے تو چوڑیوں اور ہتھیاروں کا تبادلہ کر لو۔ چوڑیاں تم پہن لو اور تلوار ہمارے ہاتھ میں دے دو۔ ہم دکھا دیں گے کہ غیرت کس شی کا نام ہے اور حمایت کس طرح کی جاتی ہے۔ کیا آج کے آفتاب کے بعد بھی آفتاب طلوع ہوگا؟ آفتاب ضرور طلوع ہوگا مگر اب اس کی چلکتی ہوئی دھوپ اور نوکیلی کرنیں انگریزی اقتدار کی جڑیں اکھاڑنے کے لیے کام میں لائی جائیں گی۔ یہ تجویز دکھی دلوں کی پوری تائید کے ساتھ کسی کانفرنس کے بغیر پاس ہوگئی۔

آفتاب عالمتاب دن بھر کی بکھری ہوئی کرنوں کو ابھی سمیٹنے نہیں پایا تھا۔ گرجا میں

شام کا گھنٹہ بجنا شروع ہی ہوا تھا کہ بغاوت کا آتش فشاں انگارے اگلنے لگا۔ ایک دستہ نے بیرکوں کو آگ لگائی۔ دوسرا جیل خانہ کی طرف دوڑا کل جن کی مدد نہ کر سکے تھے آج ان کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں۔ جیل خانہ کو توڑ کر آٹھ سو اخلاقی قیدیوں کو بھی رہائی کا فیصلہ عملاً سنایا گیا۔

سپاہیوں کی بغاوت میں وہی کچھ ہوا جو ہوتا ہے۔ بارکیں پھونک دی گئیں، قیدی چھڑا لیے گئے۔ جو انگریز سامنے آیا اُسے گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اُن کو کچھ خدشات دکھائی دیتے تھے۔ ان خدشات سے بچنے کے لیے اُن باغیوں کے پاس ایک نعرہ تھا کہ ''دہلی چلو'' اور اتنا تیز چلو کہ انگریزوں کی تباہی سے پہلے ایک منزل طے کر لو۔ تاکہ انگریز یہاں تمہارے خلاف کچھ نہ کر سکے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہاں انگریزی فوج موجود ہے۔ ان کے پاس بہترین توپ خانہ ہے۔ وہ اس قابل ہیں کہ آناً فاناً توپ دم کر سکیں اور ان باغیوں کا خاتمہ کر سکیں۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے کو یہی کہتے کہ تیز چلو اور تیز چلو اور صبح کو جمنا کے پانی سے وضو کرو اور اشنان کر لو۔ مئی کا مہینہ، چاند کی سولہویں رات، دن گرم رات خوشگوار۔ جوش جنوں نے قدموں کی رفتار میں اضافہ کر دیا یا زمین کی طنابیں کھینچ دیں کہ باغی جو دن چھپنے کے بعد میرٹھ سے چلے تھے، آفتاب نے ابھی افق مشرقی سے جھانکا نہیں تھا کہ وہ دہلی پہنچ گئے نہ راستہ میں آرام کیا، نہ سانس لیا اور نہ کھانے کا کوئی لقمہ منہ میں ڈالا۔

بتایا جاتا ہے کہ میرٹھ میں انگریزی سپاہیوں کی پوری رجمنٹ اور پورے ہندستان کا بہترین توپ خانہ موجود تھا، لیکن میرٹھ کے افسران کے بارے تو کہا جاتا ہے کہ ایسے بدحواس ہو گئے کہ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ باغی کس طرف گئے ہیں۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ ہندوستانی رسالہ کا انگریز کمانڈر کرنل اسمتھ (Smith) بغاوت کی خبر سنتے ہی اپنی جان بچانے کی خاطر کہیں چھپ گیا اور جب توپ خانہ کے کمانڈر نے توپیں تیار کرائیں اس وقت ہندوستانی باغی فوج دہلی کے راستہ پر بہت دور نکل چکی تھی۔ انگریزی فوج کو بہانہ ہاتھ آ گیا وہ تعاقب کے بجائے چھاؤنی میں پڑ کر سو گئی۔

دہلی میں انگریز فوج کی اتنی بڑی جمعیت جو باغیوں پر دہلی کے دروازے بند کر سکتی تھی، لیکن ان کو بھی بدحواسی کی وجہ سے اس بغاوت اور باغیوں کے دہلی کی طرف کوچ کرنے کی بابت اطلاع نہ دی جا سکی۔ اور جب حواس ٹھکانے ہوئے تو احتیاط یا کسی یقین

Marfat.com

کی بنا پر دہلی تار دیا جو فوراً پہنچ گیا لیکن ریذیڈنٹ و کمشنر دہلی سائمن فریزر جن کے نام تار تھا، نیند یا نشہ میں ایسا بے خود اور مدہوش تھا کہ تار کو بغیر پڑھے جیب میں رکھ کر سو گیا۔

سورج نے ابھی اپنے رخ سے نقاب نہیں الٹی تھی کہ 16 رمضان المبارک 1274ھ مطابق 11 مئی 1857ء کو یہ باغی فوجی دریائے جمنا کے کنارے پہنچ کر بے چینی اور جوش وخروش کے ساتھ گزرگاہ تلاش کر رہے تھے۔ سورج کی کرنیں لال قلعہ کے سنہرے کلسوں اور سرخ وسپید برجیوں سے جب شوخیاں کرنے لگیں تو باغی فوج محکمہ تار کے انگریز افسر ٹاؤ، کلکٹر اور دیگر مزاحمت کرنے یا راستہ میں آنے والے لوگ کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے راج گھاٹ کی جانب سے شہر میں داخل ہوئی۔ داخل ہونے والی فوج کی داہنی جانب قلعہ تھا اور بائیں جانب کسی قدر فاصلہ سے دریا گنج جہاں کچھ انگریزوں کے بنگلے تھے۔ فوج قلعہ کی طرف بڑھی اور پھاٹک پر موجود سنتریوں کے ساتھ اشاروں ہی اشاروں میں ایسی باتیں ہوئیں کہ وہ بلا مزاحمت قلعہ میں داخل ہوگئی، اور بادشاہ کے حضور پہنچ گئی۔ اب بادشاہ سے کیا گفتگو ہوئی اس کو راقم الدولہ ظہیر دہلوی جو ہر روز بادشاہ سلامت کے حضور جایا کرتے تھے۔ ان کی زبانی سنیئے۔ ظہیر صاحب فرماتے ہیں کہ فوج کے نمائندوں نے بادشاہ سلامت سے عرض کیا:

> ''حضور جہاں پناہ سلامت! آپ دین ودنیا کے بادشاہ ہیں۔ تمام ہندوستان آپ کا محکوم اور فرمانبردار ہے۔ آج تک منادی میں پکارا جاتا ہے ''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی کا۔'' انگریز لوگ آپ کی طرف سے مالک ومختار ہیں۔ ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں۔ امیدوار انصاف ہیں۔ ہم لوگ ملازم انگریزی ہیں۔ ہمیں لوگوں نے اپنی جانیں بیچ کر اور سر کٹوا کر کلکتہ سے کابل تک چودہ سو کوس میں انگریزی عملداری قائم کرا دی اور ہمیں لوگوں کی استعانت وامداد سے تمام ہندوستان پر تسلط ہو گیا۔ یہ ولایت سے کوئی فوج ہمراہ لے کر نہیں آئے تھے۔ سب ہندوستانی فوج کی کارگزاری ہے۔ شہادت کے واسطے ہمارے پاس تمغے موجود ہیں۔

اب چونکہ تمام ہندوستان پر قبضہ اور تسلط انگریزوں کا ہو گیا اور کوئی سرکش باقی نہ رہا۔ اب سرکار کی نیت میں فتور واقع ہوا، اور ہمارے دین و مذہب کے درپے تخریب ہوئی اور چاہا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کر لیں اور ابتداء اس کی فرقۂ فوج ہونی چاہیے۔ چنانچہ باہم صلاح کر کے یہ تجویز قرار پائی کہ ایک قسم کی بندوق ایسی ایجاد کی گئی جس میں ٹوٹا یعنی کارتوس دانتوں سے کاٹ کر بندوق کے منہ میں دینا پڑے اور اس ٹوٹے کو جانوروں کی جھلی سے منڈھوایا گیا۔ اب نہ معلوم وہ جھلی کس جانور کی ہے۔ وہ بندوقیں ہم لوگوں کو دی گئیں کہ تم کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹ کر بندوقوں میں ڈالو۔ ہم لوگوں نے بالاتفاق ہندو اور مسلمان نے تعمیل حکم سے انکار کیا کہ ہم ہرگز ہرگز ایسا نہ کریں گے، خواہ سرکار نوکر رکھے یا نہ رکھے۔ فرقہ ہندو کو تو گائے کی جھلی کا اشتباہ ہوا اور اہل اسلام کو سوٗر کی جھلی کا۔"

اس کے بعد ظہیر صاحب کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ

"اب سرکار کو اپنی بات کی آن تھی اور ہمیں دھرم اور ایمان کی۔ چار ماہ سے زیادہ ہو گئے یہ نزاع درپیش ہے۔ حکام کی کمیٹیاں ہو رہی ہیں، اور ہم لوگوں میں بھی سواروں اور پیادوں کی چھاؤنیوں میں جگہ جگہ چٹھیاں دوڑ گئی ہیں کہ یک قلم کل فوج انکار کر دے اور زیادہ سختی برتی جائے تو ایک معین تاریخ پر تمام ہندوستان میں غدر مچا دیا جائے۔ پھر دیکھو انگریز کیا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مفسدہ کا ظہور اب آ کر ہوا اور اس وقت اس کی بنا اس طرح ہوئی کہ انگریز افسران کو خیال ہوا کہ میرٹھ میں انگریزی فوج بھی کافی ہے اور ہندوستانی فوج بھی وہ ہے جو پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ بھروسے کی اور بہت پرانی فوج مانی جاتی ہے، لہٰذا کارتوسوں کی مہم اگر یہاں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر پورے ہندوستان میں یہ مسئلہ حل ہو

Marfat.com

جائے گا۔ چنانچہ پریڈ کرائی گئی۔"

اس کے بعد ظہیر صاحب نے پریڈ، کارتوسوں کے پیش کیے جانے، فوجیوں کے انکار اور پھر انکار کرنے والوں کی سزا وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ ؂

بیک گردش چرخ نیلوفری
نہ نادر بجا ماند و نے نادری

"جب ہم داخل جیل خانہ ہوئے تو کیمپ میرٹھ میں تہلکہ عظیم برپا ہو گیا اور گھر گھر کھچڑی پکنے لگی اور باہم صلاح مشورے ہونے لگے خصوصاً فرقۂ مستورات میں کہ ہمیشہ سے ناقص العقل اور کوتاہ اندیش ہوتی آئی ہیں، ان کو ہرگز اپنے انجام پر نظر نہیں ہوتی۔ ان میں اکثر عورتیں تھیں جن کے ورثاء محبوس ہوئے تھے، انہوں نے زبان طعن و تشنیع سے پنکھا جھل جھل کر نائرۂ فتنہ و فساد کو بھڑکانا شروع کیا اور ان کی چرب زبانی آتش فساد پر روغن کا کام کر گئی۔ اس موقع پر "دیوانہ را ہوئے بس است" کا مضمون صادق آیا۔ ان عورتوں نے مردوں کو طعنے دینے شروع کیے کہ تم لوگ مرد ہو اور سپاہ گری کا دعویٰ کرتے ہو، مگر نہایت بزدل اور بے غیرت اور بے شرم ہو۔ تم سے تو ہم عورتیں اچھی۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ تمہارے سامنے تمہارے افسروں کی ہتھکڑیاں پڑ گئیں اور تم کھڑے کھڑے دیکھا کیے اور تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ لو یہ چوڑیاں تم پہن لو اور ہتھیار ہم کو دو ہم افسروں کو چھڑا لاتی ہیں۔ ان کلمات فتنہ انگیز نے اشتعال طبع پیدا کیا اور تمام فوج کے دلوں میں جوش و خروش مردمی اور مردانگی کی آگ بھڑک اٹھی، اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے اور باہم یہ صلاح قرار پائی کہ شب کو چل کر جیل خانہ توڑ کر افسرانِ فوج کو چھڑا لاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اس کے بعد انقلابی فوج کے افسروں نے کہا تیں کوس کی مسافت طے کر کے اس وقت ہم

یہاں پہنچے ہیں۔ بادشاہ سلامت ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں اور ہمارا انصاف فرمائیں۔ ہم دین بگڑ کر آئے ہیں۔

بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے ان لوگوں کی اس عرضداشت کو نہایت توجہ اور غور سے سنا۔ پھر باغی فوج کے ان نمائندگان کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضہ میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے آباء واجداد کے نوکر چاکر اپنے خداوندانِ نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضہ سے ملک نکل گیا۔ قوت لایموت کے محتاج ہو گئے۔''

اس کے بعد بادشاہ نے شاہ عالم کا ذکر کیا کہ کس طرح انگریزوں سے وظیفہ لینا قبول کیا۔ پھر فرمایا:

''لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں۔ اس کا انسداد اور انتظام انگریز لوگ خود کر لیں گے۔ میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مجھے ستانے کیوں آئے ہو۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمہیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کسی طرح کی توقع استعانت کی نہ رکھو۔ تم جانو یہ لوگ جانیں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے۔ البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمہارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمہاری صفائی کرا سکتا ہوں۔ تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو۔ میں نے صاحب ریڈیڈنٹ کو بلوایا ہے۔ وہ میرے پاس آنے والے ہیں۔ پہلے میں اُن سے دریافت کر لوں۔ ان کی زبانی مجھے حال فتنہ وفساد کا معلوم ہو جائے گا اور خدا

Marfat.com

چاہے تو میں اس فساد کو رفع دفع کرا دوں گا۔ غرض یہ گفتگو ہنوز ناتمام تھی کہ سائمن فریزر صاحب رزیڈنٹ بہمراہی قلعہ دار صاحب داخل دیوان خاص ہو گئے۔ خواجہ سرا نے جا کر آداب کورنش ادا کیا۔ اندر سے حکم آیا کہ دونوں صاحب محل میں حاضر ہوں۔ اس وقت صاحب رزیڈنٹ بہادر، قلعہ دار صاحب اور احسن اللہ خان اور محبوب علی کان ہر چہار اشخاص محل شاہی میں داخل ہوئے۔

حضور پرنور: کیوں بھئی، یہ کیا فتنہ و فساد برپا ہو گیا؟ یہ مذہب کا جھگڑا کیسا اُٹھ کھڑا ہوا؟ یہ مقدمہ دین آئین کا ہے۔ تعصب مذہبی بہت بری شی ہے۔ اس میں اکثر سلطنتیں معرض زوال میں آ گئی ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کا کشت و خون ہو گیا ہے۔ اس فتنہ کا جلد انسداد ہونا واجب ہے ؎

سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل
جو پُرشد نشاید گذشتن بہ پیل

مبادا فتنہ وفساد ہندوستان میں عالمگیر ہو جائے اوراور لاکھوں آدمیوں کا کشت وخون ظہور میں آئے اور نظام مالی وملکی میں فرق واقع ہو۔ جہاں تک ممکن ہو نرمی اور آشتی سے کام نکالنا چاہیے۔ یہ لوگ جاہل ہیں۔ فرقہ سپاہ جاہل ہوتا ہے۔ ان سے تھپک کر کام نکالنا چاہیے اور ان کو ہدایت کرو کہ یہ لوگ اس فتنہ وفساد سے باز آئیں۔ جائے تعجب ہے کہ تم کو اس معاملہ کی اب تک خبر نہیں۔

صاحب رزیڈنٹ بہادر: حضور! غلام کے پاس شب کے گیارہ بجے سوار نے چٹھی لا کر دی۔ مجھ کو چونکہ اس وقت نیند کا غلبہ تھا۔ میں سمجھا کوئی معمولی چٹھی ہے۔ اس وقت کچھ خیال نہ کیا۔ پاکٹ میں ڈال کر سو رہا۔ صبح کو جب حضوری سوار میری پاس پہنچے۔ اس وقت میں نے چٹھی پڑھی تو معلوم ہوا۔ حضور کچھ اندیشہ نہ فرمائیں۔ خاطر

Marfat.com

جمع رکھیں۔ بلوائی لوگ کیا کر سکتا ہے۔ حضور کے اقبال سے سب رفع دفع ہو جائیں گے۔ غلام ابھی جا کر اُن کو فہمائش کرتا ہے۔ خدا چاہے تو فساد بڑھنے نہ پائے گا۔"

اس کے بعد ظہیر صاحب نے، رزیڈنٹ صاحب کی تقریر نقل کی ہے۔ تقریر میں خوب سبز باغ دکھائے اور اطمینان دلانے کی کوشش کی، لیکن فوج کے نمائندوں کا جواب یہ تھا:

"آپ نے جن احسانات کا ذکر کیا ہے، مگر ہماری قربانیوں کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہم نے ہر موقع پر ہر حکم کی تعمیل کی یہاں تک کہ برما سے افغانستان تک پورا ملک فتح کر کے آپ کے حوالے کر دیا، مگر ہماری ان تمام قربانیوں کا بدلہ ہمیں یہ ملا کہ سرکار ہمارے دین کے درپے ہے۔ چربی لگے کارتوس دانتوں سے کٹوانے کا اصرار ہے تو "ہم لوگ اپنے دین آبائی کو چھوڑ کر کس طرح بے دین ہو جائیں۔ ہم کو مر جانا قبول ہے مگر دین سے بے دین نہ ہوں گے۔ اب سرکار جو چاہے ہمارا کرے ہم سب مرنے کو تیار ہیں اور ہم اپنے کو اسی وقت مردہ تصور کر چکے ہیں جب ہم نے جیل خانہ کو توڑ کر افسروں کو برآمد کیا تھا۔

رزیڈنٹ نے اس تقریر کا بھی جواب دیا اور یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک گولی فریزر کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزری۔ حکیم احسن اللہ خان نے جب دیکھا کہ حالات قابو سے باہر ہیں اور کسی وقت بھی کوئی ہنگامہ ہو سکتا ہے تو فریزر کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ فریزر یہاں سے روانہ ہوا تا کہ فوج کو باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کرے۔ بادشاہ نے فریزر سے کہا کہ شاہی باڈی گارڈ کے کچھ سپاہی اپنے ساتھ حفاظت کے لیے لے جائیے۔ فریزر نے بے پروائی سے مسکرا کر طنزیہ جواب دیا کہ

"دربار کی سوبھا کے آدمی ہیں۔ ڈیوڑھی کی حفاظت کو رہنے دیجیے۔ حضور کا اقبال کافی ہے۔ حضور خاطر جمع رکھیں۔"

Marfat.com

شہر کا رخ:

قلعہ سے نکل کر فوج نے اب شہر کا رخ کیا۔ ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف غیظ وغضب بھرا ہوا تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریز ہمیں بے دین کر کے عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دریا گنج میں (جہاں انگریزوں کے بنگلے تھے) انگریزوں کا قتل عام کر کے اپنی آتش غضب کو ٹھنڈا کیا۔ پھر چاندنی چوک کے قریب ایک سرکاری بینک پر یورش کر کے وہاں سے روپیہ لوٹا اور بینک منیجر اور اس کے خاندان کو ہمیشہ کی نیند سلایا۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ باغیوں کو نہ صرف انگریزوں سے بلکہ ان کی ہر ایک شی سے نفرت تھی۔ اب جوش انتقام میں وہ ان کی ہر شی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ دہلی گزٹ (انگریزوں کے اخبار) میں وہاں کے عیسائی کمپوزیٹرز کو ختم کیا۔ پھر گرجا گھر، اس کے گھنٹے، صلیب اور دیواروں پر بنی ہوئی تصویروں کو تباہ و برباد کیا۔

قلعہ کی شمالی دیوار سے کوئی تین فرلانگ کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا میگزین تھا باغیوں نے پہلے تو بادشاہ کی معرفت پھر خود اس پر قبضہ کرنا چاہا۔ انگریز افسروں کی قوت غیرت پوری طرح بیدار تھی۔ لیفٹیننٹ ولوبی (Willoughby) جو میگزین کا انچارج تھا اور اس کے انگریز ساتھیوں نے یہ طے کر لیا کہ مر جائیں گے مگر میگزین پر قبضہ نہیں ہونے دیں گے۔

چنانچہ انہوں نے میگزین کی چھت پر توپیں نصب کر دیں اور اس کے اردگرد بارودی سرنگیں بچھا دیں۔ انہوں نے ''دل ناتواں'' کی طرح باغیوں کا مقابلہ تو خوب کیا، لیکن کوئی بات نہ بنی۔ چنانچہ انہوں نے آخری اقدام کے طور پر اُسے بارودی سرنگوں سے تباہ کر دیا۔ میگزین کیا تباہ ہوا؟ بس ایک قیامت خیز دھماکہ ہوا اور میگزین میں موجود تمام سپاہیوں اور اردگرد کھڑے تمام باغیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ مرنے والوں کی تعداد سات سو بیان کی جاتی ہے۔ نو انگریز جنہوں نے جان پر کھیل کر یہ اقدام کیا تھا ان میں سے پانچ ختم ہو گئے لیکن چار نے بھاگ کر اپنی جان بچا لی۔ ولوبی بھی انہی بچنے والوں میں سے تھا۔ لیکن وہ غازی آباد میں مارا گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ میگزین پورا نہیں اڑا تھا۔ بہت سا اسلحہ بچ گیا جو انقلابی فوجوں کے کام آیا۔

میگزین کے قریب ایک لوہار خانہ تھا جہاں ہلکے ہتھیار بنتے تھے۔ اس کو لوٹ لیا گیا۔ یہاں ایک خزانہ بھی تھا اس کو بھی لوٹ کر بادشاہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ دہلی شہر اور چھاؤنی میں انگریزوں کو چن چن کر قتل کیا جانے لگا یہاں تک کہ ان کے بچوں کو بھی قتل کیا گیا۔ انتقام کا ایک جنون تھا جو ہر انقلابی کے سر پر سوار تھا۔

انقلابی فوجوں کا استقبال:

انقلابی فوج کے سپاہی جب دہلی شہر میں داخل ہوئے تو ان کی ایک ہی صدا تھی یعنی

"وہ دین دین پکارتے جاتے تھے۔ اس لیے اُن کے ساتھ مسلمانوں کی بھیڑ ہو جاتی۔ سارے شہر میں ہڑتال تھی۔ ایک سناٹے کا عالم تھا۔ اس سے ڈرتے تھے کہ دیکھئے شہر سے انگریز کیا معاوضہ لیں گے۔ باغی سپاہی شہر کے مالک ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ چھاؤنی میں جتنی پلٹنیں ہیں اُن میں سے ہر ایک سپاہی بھی ایسا نہیں ہے کہ انگریزوں کی حمایت کے لیے اپنی بندوق کا گھوڑا چڑھائے یا تلوار چلائے یا توپ کو پلیتہ لگائے۔"

(تاریخ عروج عہد انگلشیہ: ص ۶۶۱)

راقم الدولہ ظہیر صاحب کے بیان کے مطابق:

"دہلی میں قتل و غارت اس تاریخ کی صبح ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ تینوں ہندوستانی رجمنٹیں اور توپ خانہ جو دہلی کی چھاؤنی میں تھا وہ میرٹھ کے سواروں سے اُن کے پہنچنے سے پہلے مل گیا تھا۔ میگزین جس میں اسباب جنگ بہت موجود تھے، وہ بادشاہ کے اختیار میں آ گیا تھا اور شہر کے ڈیڑھ لاکھ باشندے فرنگیوں کے مرد و عورت بچوں کے قتل عام کرنے کے لیے اور اُن کے مال و اسباب کو لوٹنے کے واسطے مدد کرنے کو تیار تھے۔" (تاریخ عروج عہد انگلشیہ: ص ۴۰۵)

مسلمان انقلابی سپاہی تو ویسے ہی جذبۂ جہاد سے سرشار تھے اور علماء کرام نے

Marfat.com

بھی اپنے مسجدی وعظوں میں انہیں انگریزوں کے خلاف اکسایا ہوا تھا کیونکہ ایک تو وہ غاصب تھے۔دوسرے مسلمانوں کو عیسائی بنانے پر تلے ہوئے تھے۔لیکن ہندو بھی انگریزوں کی مخالفت میں کچھ کم نہ تھے۔ظہیر دہلوی صاحب ہی نے لکھا ہے کہ

''ہندوؤں کے پنڈت مسلمانوں کے مولویوں کی نسبت انگریزوں سے عداوت کرنے میں کچھ کم نہ تھے۔کئی دفعہ انہوں نے پتروں کو دیکھ بھال کر لڑنے کی شبھ مہورت نکال کر تلنگوں کو بتلائے اور اُن کو یقین دلایا کہ اُن میں اگر لڑنے جاؤ گے تو فتح پاؤ گے۔چنانچہ وہ ان مہورتوں میں جا کر خوب لڑے۔

پنڈتوں نے تلنگوں کو یقین دلایا تھا کہ انگریزی راج پھر نہیں ہوگا۔ان ہی کا راج ہوگا۔

ایک عجیب تماشا چاندنی چوک اور بازاروں میں یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ پنڈتوں کے ہاتھ میں پوتھیاں ہیں اور وہ ہندوؤں کو دھرم شاستر کا حکم سنا رہے ہیں کہ انگریزوں کو ملکشوں سے لڑنا چاہیے۔

جب لڑائیوں میں سے تلنگوں کی لاشیں چارپائیوں پر اُن کے سامنے آئیں تو وہ ہندوؤں کو اپدیش دیتے کہ ان سرگباشیوں کی طرح سرگ میں چلے جاؤ جن کے لیے نہ ارتھی کی ضرورت ہے نہ کریا کرم کی۔مگر ہندوؤں پر ان اپدیشوں کا ایسا اثر نہیں ہوتا تھا جیسا مسلمانوں پر جہاد کے وعظ کا ہوتا تھا۔'' (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ: ص ۶۷۶)

انقلابی فوجوں کا کردار:

فوجوں کی نقل وحرکت ہر زمانہ میں فتنہ وفساد کا موجب رہی ہے۔اس مہذب دنیا میں بھی جب فوج ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں خصوصاً زمانۂ جنگ میں منتقل ہوتی ہے تو بعض دفعہ لوگوں کو اپنی دوکانیں، اسٹال اور گھروں کے دروازے بند کرنے پڑتے ہیں۔جنگ عظیم اول (1914-1917ء) اور جنگ عظیم دوم (1939-1945ء) میں یہ بات بھی مشاہدے میں آئی کہ ایام جنگ میں

Marfat.com

امن پسند اور شریف شہری تو دہشت زدہ ہو کر اپنی جانوں کی فکر میں ہوتے تھے جبکہ آوارہ گرد اور اوباش لوگوں کی بہار آ جاتی تھی۔ وہ لوٹ مار سے لے کر عصمت دری تک من مانی کاروائیاں کرتے تھے۔

لیکن انقلابی فوجوں نے شہر میں داخل ہو کر انگریزوں کو بے شک قتل کیا۔ ان کے سامانوں کو بیشک تباہ و برباد کیا کیونکہ ان کی اس شورش اور یورش کا مقصد یہی تھا۔ اس سے افراتفری بھی کسی قدر ضروری اور لازمی تھی، لیکن وہ کچھ نہیں ہوا جس کی فوجیوں سے توقع کی جاتی ہے۔ کسی ہندوستانی کو نہیں مارا گیا اور نہ ہی اس کی دوکان لوٹی گئی۔ چنانچہ ہماری اس بات کی تائید ظہیر صاحب کے بیان سے بھی ہوتی ہے حالانکہ وہ انقلابیوں کے سخت مخالف تھے۔ وہ برملا بیان کرتے ہیں کہ

> "11 مئی کو جب میرٹھ کے فوجی آئے تو دو چار دستوں کو تو بادشاہی گھوڑوں کے دانہ کے چنے دے دیئے گئے۔ ان کے بعد جب مزید فوجی آئے جن کی تعداد کئی ہزار تھی تو بادشاہ کی طرف سے امن کا اعلان ہوا اور ہر جگہ چوکی پہرے بٹھا دیئے گئے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ حلوائیوں اور بقالوں کو بلوا کر دوکانیں کھلوائی گئیں۔ پھر حکیم احسن اللہ خان صاحب نے خود اور اُن کے ساتھ صوفی اشرف بیگ صاحب رسالدار کو بھیجا کہ جا کر دیکھیں کہ اعلان امن پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔ یہ لال قلعہ سے مسجد فتح پوری تک گئے۔ ہر جگہ امن پایا۔ فال فال دوکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ ہر دوکان پر پہرہ تھا کہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ (داستان غدر: ص ۷۱)

شہر میں انقلابی فوجیوں کو سامان رسد نہیں مل رہا تھا۔ دوسرے وہ شہر کے گلی کوچوں سے بھی واقف نہ تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ

> "تلنگے (انقلابی فوجی) ابھی شہر و گلی کوچوں سے نابلد تھے۔ چوڑے چوڑے بڑے بڑے بازاروں کو جانتے تھے۔ ان میں ان کی اپنی ضرورت کی چیزیں ملتی نہ تھیں۔ انہوں نے بادشاہ سے درخواست

Marfat.com

کی کہ حضور سوار ہو کر بازار کی دوکانیں کھلوا دیں۔ بادشاہ نے ان کی درخواست کے موافق سواری کا حکم دیا۔ بادشاہ عماری میں ہاتھی پر سوار تھا اس کے نقیب احکام سناتے جاتے تھے۔"

اب شہر کی حالت یک قلم بدل چکی تھی۔ لوگوں کے خیالات میں ایک خاص تبدیلی رونما ہوئی تھی۔

"غدر سے پہلے ڈھنڈورا اس طرح پیٹا جاتا تھا کہ نقارہ پر چوٹ لگا کر ڈھنڈورچی اول یہ کہتا کہ

"خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا حکم سرکار کمپنی بہادر کا۔ پھر آگے وہ بات کہتا تھا جس کا مشتہر کرنا منظور ہوتا تھا۔ 11 مئی کو ڈھنڈورے پر سے "حکم سرکار کمپنی بہادر کا" اڑ گیا اس کی جگہ بادشاہ کا حکم ہو گیا۔"

(تاریخ عروج عہد انگلیشیہ: ص ۶۶۲)

11 مئی کے اس اعلان کے بعد تو یہی ہوا کہ "ادھر کوئی دوکان کھلی اور ادھر بند ہوئی۔ لیکن دوسرے ہی روز یعنی 12 مئی کو کاروبار بدستور جاری ہو گیا بلکہ کچھ اضافہ ہی ہوا۔ چنانچہ شمس العلماء ذکاء اللہ خان کا بیان ہے کہ:

"جس تاریخ سپاہ آئی، دوسرے روز قلعہ میں اکابر شہر کی ایک مجلس مقرر ہوئی کہ شہر کا اور سپاہ کی رسد رسانی کا انتظام کیا جائے۔ اگر رسد کا بندوبست نہیں ہو گا تو وہ سارے شہر کو لوٹ کر کھا جائیں گے۔ اس کام کا اہتمام محبوب علی خان اور میر نواب پسر سید تفضل حسین وکیل کو سپرد ہوا۔"

"شہر میں انگریزوں کی طرف سے رسد آنے کا انسداد تو کسی جانب سے نہیں ہوا تھا۔ چاروں طرف سے صبح سے شام تک سب طرح کی اجناس ضرورت کے موافق آتی تھیں۔ بیلوں، گدھوں، ٹٹوؤں، خچروں، گاڑیوں، چھکڑوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ شہر میں جا بجا یہ اجناس بکتی تھیں۔ کسی کا مقدور نہیں تھا کہ اُن پر ہاتھ ڈال سکے۔

تلنگے رسد کے قواعد سے خوب واقف تھے۔ جنس کی قیمت نرخ کے موافق خوب دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہم قیمت کم دیں گے تو رسد بند ہو جائے گی۔ پھر ہم بھوکے مریں گے۔ غرض تلنگوں نے خود اپنی رسد کا انتظام ایسا رکھا کہ ان کو بادشاہی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی کوئی جنس کم ہو جاتی تھی تو وہ بادشاہ سے اس کو بہم پہنچانے کی درخواست کرتے۔ وہ ان کو منگا دیتا۔ ایک دفعہ افیون کا توڑا ہو گیا تو بادشاہ نے راؤ تلارام کو لکھا کہ دو من افیون بھیج دے۔ قیمت دے دی جائے گی۔ جب وہ میدان جنگ میں جاتے تو بادشاہ ہی اہل کار حلوائیوں سے مٹھائی وغیرہ بنوا کر چھکڑوں میں اُن کے پاس بھیجتے۔

''کہیں ایسا اتفاق دو تین ہی دفعہ ہوا ہوگا کہ شہر میں سپاہ کو یا اہل شہر کو ضروری چیزوں کے میسر ہونے میں تکلیف ہوئی ہو۔''

(تاریخ عروج عہد انگلیشیہ: ص ۶۷۹)

اندازہ فرمایئے کہ اتنی زیادہ فوج باہر سے آئی لیکن تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ شہر دہلی کے نظم ونسق میں کوئی بدامنی پیدا نہیں ہوئی۔ سارے کاروبار معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ دوکانیں کھلی تھیں۔ باہر سے ہر شئی مارکیٹ میں آ کر بکتی تھی بلکہ نفع اندوزی کے لیے اچھے مواقع مہیا ہو گئے یہاں تک کہ سونے کی قیمت دگنی ہو گئی۔

شہر کا نظم ونسق اب انگریزوں کے بجائے بادشاہ کے ہاتھوں میں تھا۔ مولوی فیض احمد آگرہ میں صدر بورڈ کا سرشتہ دار تھا اور باغی ہو کر دہلی میں آیا تھا، اس کو اور مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کو عدلیہ کا کام سپرد ہوا۔ بادشاہ دہلی بہادر شاہ ظفر نے یہ حکم جاری کیا کہ سلطنت اور عدالت کے کاموں میں شہزادے اور سپاہ مداخلت نہ کرے۔ عدالت کے سارے کام صرف مفتی اور صدر الصدور کیا کریں۔ نہ سپاہ نہ مال کے حکام اس عدالت میں دخل دیں۔ (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ: ص ۶۸۷،۶۸)

دہلی کے باہر مختلف شہروں میں جب میرٹھ کی اس بغاوت کا پتہ چلا اور یہ بات

Marfat.com

بھی ان کے علم میں آئی کہ اب بادشاہ دہلی بھی ان انقلابی فوجوں کے ساتھ ہے تو مختلف شہروں سے فوجیوں اور مختلف نوابوں اور راجاؤں نے بادشاہ کو اپنی امداد کی پیش کش کی۔ قدرت اللہ خان سو سواروں کو لے کر اودھ کی کل سپاہ کی عرضی لایا۔ بخت خان نے بادشاہ سے ملاقات کرائی۔ قدرت اللہ خان نے بادشاہ کی خدمت میں مندرجہ ذیل اشیاء نذر کیں۔

1- نئے سکہ کی اشرفیاں جن پر نقش تھا

بزد زر سکہ نصرت طراز

سراج الدین بہادر شاہ غازی

2- دو گھوڑے

3- دو ہاتھی

4- کلاہ جس میں بیش بہا موتی ٹکے ہوئے تھے

5- ایک جوڑی بازو بند الماس پیوند۔

منشی جیون لال کا بیان ہے کہ 4 ستمبر 1857ء کو جے پور، جودھ پور، بیکانیر اور الور کے راجگان کے نام بادشاہ کی دستخطی چٹھیاں بھیجی گئیں جن میں لکھا تھا کہ مجھے فوج کی ضرورت ہے اور یہ کہ میں انگریزوں کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہوں، لیکن چونکہ اس وقت میرے امور سلطنت کا انتظام کرنے کے لیے قابل اعتماد آدمی موجود نہیں ہیں، اس لیے میں رہاستوں کی ایک مجلس بنا دینا چاہتا ہوں۔ اور اگر وہ ریاستیں جن کے نام خط بھیجے جا رہے ہیں، اس غرض کے لیے مجلس بنا لیں گی تو میں نہایت خوشی سے اپنے شاہی اختیارات اُن کے ہاتھ میں دے دوں گا۔

اب وہ بادشاہ بھی انقلابی فوجوں کے ساتھ اس جہاد اور تحریک استخلاص وطن میں برابر کا شریک ہو گیا۔ اور اب اس کے نام سے مختلف علاقوں کی طرف خط جاری ہونے لگ گیا اور اُس نے ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت سے انقلابی فوجوں کی ہر وہ امداد کرنا شروع کر دی جو ایک بادشاہ اپنی اس فوج کی کرتا ہے جو میدانِ جنگ میں اس کی حمایت میں لڑ رہی ہو۔

Marfat.com

علماء کی اس جہاد میں شمولیت:

اب ملکی حالات پہلے سے بہت مختلف تھے، اس لیے علمائے کرام اور حریت نواز ارباب فکر نے بھی یہ ضروری سمجھا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر وطن عزیز کو ان اجنبی غاصبوں سے پاک کرلیا جائے، لیکن کچھ علماء ایسے بھی تھے جو ملوکیت سے انتہائی نفرت کی بنا پر یا اس وجہ سے کہ اُن کو کامیابی کی توقع نہ تھی یا اس وجہ سے کہ جہاد کے لیے ایک امیر کا ہونا ضروری ہے اور اس وقت وہاں کوئی امیر نہیں تھا، خاموشی کو بہتر جانتے تھے۔ چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ

> ''الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلویؒ کی نئی تنظیم پر پورے تیس برس نہیں گزرے تھے کہ دہلی کے آخری بادشاہ کی انگریزی کمپنی سے لڑائی ہوگئی۔

(الف) سلطان دہلی اگرچہ ایک وظیفہ خوار رئیس کی صورت میں نظر آتا تھا، مگر عام لوگوں کی نظروں میں وہ اب تک سارے ہندوستان کا موروثی سلطان مانا جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی چونکہ اسی کے نام سے عوام پر حکومت کرتی تھی، چنانچہ ڈھنڈورے میں کہا جاتا تھا ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا'' اس لیے عوام الناس کی رائے اسے ملک کا حقیقی مالک ماننے میں تأمل نہیں کرتی تھی۔

(ب) اس داہیہ کبریٰ میں مولانا محمد اسحاق کی نئی جماعت پھر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاقؒ) نے جس طائفہ کو نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے وہ طائفہ تو سلطان دہلی کا طرفدار ہوگیا اور سلطانی تحریک کی شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہنچ گیا، چنانچہ امیر امداد اللہ اور مولانا عبدالغنی، مولانا محمد یعقوب دہلویؒ کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر اپنی ہندوستانی تنظیمات کی راہ نمائی کرتے رہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے متبعین کی پہلی جماعت میں سے علماء اور صوفیہ کا کثیر حصہ سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانبدار بن گیا۔

اس کا حاصل یہ سمجھنا چاہیے کہ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاق) کی تنظیم کے بالمقابل اگر پٹنہ میں پارٹی قائم ہو چکی تھی تو اب خود الصدر الحمید کے اپنے فرقہ میں سے ایک مخالف جماعت دہلی میں بھی پیدا ہو گئی۔ مولانا سید نظیر حسین دہلوی اور مولانا شیخ محمد تھانوی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔"

(شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک: ص ۲۰۱)

دہلی کی اہمیت:

اردگرد سے جو فوجیں بھی آئیں وہ دہلی ہی میں جمع ہوئیں۔ گویا دہلی مرکز انقلاب تھا۔ شاہ جہان کا بسایا ہوا یہ شہر نازک اور خوبصورت بھی تھا، تہذیب و شائستگی، نفاست و نازو نعم کا گہوارہ بھی تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بربریت اور فوجی کرختگی کے کئی دور بھی اس پر گزرے۔ جہاں شعر و سخن کی بزم آرائی اور علمی موشگافیوں کی گرم بازاری ہوتی تھی وہاں فوجی رعب و داب کے بھی کئی دور اس پر گزرے۔ وہ کئی دفعہ اجڑی اور کئی دفعہ عروس البلاد بھی بنی۔ اور بقول حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ:

> "ان کے (حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ) کے زمانہ کی دہلی ایک ایسا مرکز تھی جس میں اقوام عالم کے سب نمونے ملتے تھے۔ دہلی میں یہ استعداد تھی کہ اُس کے توسط سے یہ تعلیم سارے ہند اور پھر ساری دنیا میں پھیل سکے۔"

مرہٹوں کی چیرہ دستیوں اور پھر انگریزوں کی خون آشامیوں کے بعد بھی بہادر شاہ ظفر کے عہد حکومت میں اس نازک، نفیس اور خوش مزاج شہر کی حالت یہ تھی کہ:

> "چیزیں سستی تھیں۔ روپے کی کمی نہ تھی۔ حرفت و صنعت فروغ پر تھی۔ لوگ خوش حال اور زندہ دل تھے۔ شہر فصیل کے اندر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف چہل قدمی نظر آتی تھی، خاص کر چاندنی چوک میں جس کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی، وہ رونق تھی کہ نظر لگتی تھی۔ ہندو مسلم بھائی بھائی کی طرح ایسی صلح و آشتی سے رہتے تھے کہ آج کل

Marfat.com

اُس کا یقین کرنا مشکل ہے۔ ایک دوسرے کی غمی شادی اور تہواروں میں بلا تکلف شریک ہوتے اور کسی قسم کی غیریت نہیں برتتے تھے۔ بادشاہ اگرچہ نام کے بادشاہ تھے، لیکن کیا ہندو کیا مسلمان سب اُن سے محبت کرتے اور اُن پر جان فدا کرتے تھے۔ بادشاہ کا برتاؤ بھی دونوں سے یکساں تھا، چنانچہ مسٹر ٹیلر (سابق) پرنسپل دہلی کالج اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ ''قلعہ معلیٰ میں عجیب ماجرا تھا۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ اگرچہ قدرتاً ہمدردی تھی، لیکن اس کے باوجود جتنے ملازمین شاہی تھے (ایسی خدمات پر جہاں فارسی اردو کی ضرورت رات دن پڑتی تھی) سب کے سب ہندو تھے۔ اگرچہ تعلیم آج کل کی طرح عام نہ تھی لیکن تہذیب اور ذوق جو تعلیم کی غایت ہے، عام طور پر پایا جاتا تھا یہاں تک کہ اَن پڑھ بھی اہل ذوق کی صحبت سے صاحب ذوق نظر آتے تھے۔ خوش اطواری اور سلیقہ دلی کا جوہر تھا۔ زبان کی تو ٹکسال ہی تھی جس نے ''دلی'' نہیں دیکھی یا جو ''دلی'' نہیں رہا وہ زبان دان ہی نہیں۔ گویا جامع مسجد کی سیڑھیاں ''ادبستان زبان'' تھیں۔ شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ خود بادشاہ شاعر تھے۔ شعر وسخن کے قدر دان تھے۔ قلعہ معلیٰ کی زبان فصاحت کی جان تھی۔'' (بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد: ص ۵۰۶)

بہادر شاہ ظفر اسی دہلی کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک آئینہ تھا جس میں دہلی کے مزاج کی عکاسی ہوتی تھی۔ مزاجوں کی اس ہم آہنگی کا یہ اثر تھا کہ تمام کمزوریوں اور بے چارگیوں کے باوجود بہادر شاہ ظفر دلی والوں کا محبوب تھا اور دلی والے بہادر شاہ کی آنکھ کے تارے تھے۔ اب اندازہ فرمائیں کہ اس انقلاب کے برپا کرنے پر دلی والوں کے کیسے جذبات ہوں گے۔

یہ طولانی تمہید صرف اس لیے بیان کی گئی ہے تا کہ یہ پتہ چل سکے کہ علماء نے اس جہاد میں کیوں عملی حصہ لیا، اور وہ اس حصہ لینے میں کہاں تک حق بجانب تھے۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ 1857ء کی بغاوت صرف فوجیوں کی بغاوت نہیں تھی بلکہ یہ زندگی کے ہر شعبہ کے لوگوں کی بغاوت تھی اور علماء نے بھی حالات کے تحت اس میں اپنی بے سروسامانی کے باوجود بھرپور حصہ لیا۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور پھر عملی طور پر جہاد کر کے لوگوں کو بتا دیا۔ اگرچہ اس جنگ میں ہندوستان کے باشندوں کے شکست ہوئی اور انگریز کامیاب ہوا لیکن اس ناکامی میں غداروں کا بہت بڑا ہاتھ تھا جیسے مرزا الٰہی بخش وغیرہ، لیکن علماء نے اس جنگ کے عواقب کو کلی طور پر فراموش کر کے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ علماء نے اس جہاد کے لیے باقاعدہ مشق کی اور ٹریننگ لی چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ، جنہوں نے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی طرح 57ء کی اس جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا، کے بارے میں لکھا ہے کہ

> ''جس زمانہ میں نانوتہ کے نوجوان چاند ماری کی مشق کر رہے تھے کہ ''ایک دن آپ (سیدنا الامام الکبیر'' مسجد سے آئے۔ ہم گولیاں لگا رہے تھے اور نشانہ کی جائے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا، اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا، قریب سے بندوق لگاتے تھے، گولیاں مٹی کی تھیں۔''

مولانا گیلانی مزید تحریر فرماتے ہیں

> ''مسجد سے نشان بازی کے اسی مقام پر پہنچ کر مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے فرمایا کہ بندوق کیونکر لگاتے ہیں۔ مجھے بھی دکھلاؤ۔''

مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں کہ آپ کو بتانے کے لیے کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانہ کا ذکر کیا۔ گویا کر کے بھی دکھایا اور نشانہ گولی مارنے جو طریقہ ہے اُسے بھی زبانی بتا دیا۔ بس ایک دفعہ دیکھے اور سن لینے کے بعد دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر نے

> ''تب بندوق ہاتھ میں لے کر فائر کی۔ لوگ نشانہ کی طرف دوڑے

وہی لکھتے ہیں کہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ صاف گولی نشانہ پر لگی۔''

(سوانح قاسمی: جلد ۲ ص ۱۰۸)

Marfat.com

یہ تو صرف مولانا کیرانویؒ کے ایک معاصر حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا واقعہ ہے۔ دوسرے علماء نے بھی جنہوں نے اس جنگ آزادی میں حصہ لیا، مورچوں میں بیٹھ کر باقاعدہ تیغ وتفنگ سے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ فوج کی بغاوت علماء کی بغاوت پر کیسے منتج ہوگئی۔ سؤر کی چربی اور گائے کی چربی کے کارتوسوں کا تعلق فوجیوں سے تھا جو انگریزوں کی فوج میں بھرتی تھے اور اپنے ہی ہم وطنوں کو انگریزوں کی حمایت میں اپنی گولیوں کا نشانہ بناتے تھے، لیکن اس سے علماء کو کیا ہوگیا کہ بالآخر انہوں نے بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی اور فوجیوں سے زیادہ ان کا مقابلہ کیا اور ناکامی کی صورت میں فوجیوں سے زیادہ سزا پائی۔ گویا باہر سے مسلط ہونے والے اس بیرونی اقتدار کے ساتھ تصادم اور مقابلہ کی صورت کہاں اور کیوں پیش آئی۔ یہ تو ہندوستان سے مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرکے ایک بدیشی اقتدار کے قیام کا مسئلہ تھا۔ ان حضرات کے سید الطائفہ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے تو خود مسلم اقتدار میں ہر مذہبی اور سیاسی باطل کے خلاف علم بغاوت اور علم جہاد بلند رکھا تو ان کے تربیت یافتہ حضرات کفر کی شوکت کے زمانہ میں اعلاء کلمۃ الحق کے مقصد سے کیسے دست بردار ہوسکتے تھے۔

دوسری بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں آکر ظلم و استبداد کا جو بازار گرم کیا اس سے ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم تنگ تھی، لیکن اس ظلم و وجور سے مسلمان کچھ زیادہ ہی متاثر تھے کیونکہ انگریزوں نے انہی سے حکومت کی باگ ڈور چھینی تھی، لہٰذا وہ ان کو جبر واستبداد کی چکی میں پیس کر ایک ایسی قوم بنادینا چاہتے تھے جو پھر کبھی ان کے سامنے سر نہ اٹھاسکے۔ چنانچہ علماء اسلام کے پیش نظر اعلاء کلمۃ اللہ کے ساتھ ساتھ عام ہندوستانی اقوام کی فلاح و بہبود کا مسئلہ بھی تھا جس کا حل اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ انگریزوں کے اقتدار کو اس ملک سے ہمیشہ کے لیے ختم کردیا جائے، چنانچہ علماء اسلام کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اس ملک کی فلاح و بہبود انگریزوں کی حکومت کے قیام اور راج میں نہیں ہے بلکہ ان کی حکومت کے مٹنے اور ختم ہونے میں ہے، لیکن اس جذبہ کے ساتھ جس طاقت کی ضرورت انگریزوں کی حکومت کو ختم کرنے اور مٹانے کے لیے تھی

Marfat.com

وہ ان کے پاس نہ تھی، کیونکہ اگر ان کے پاس وہ طاقت ہوتی تو سمندر پار کی یہ منحوس قوم یہاں اپنے پاؤں کیسے جما سکتی تھی۔ لیکن علماء کی یہ جماعت جو انگریزوں کو نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا بلکہ انسانوں کا دشمن تصور کرتی تھی، رات دن اسی فکر میں تھی کہ یہ بھاری پتھر اس ملک کے سر سے کیسے اٹھایا جائے۔

اتفاق سے 57ء کا ہنگامہ پیش آ گیا، لیکن اس ہنگامہ کا تعلق ان حضرات سے نہ تھا، اس کا تعلق فوجیوں سے تھا یا ہو سکتا ہے امیروں، وزیروں اور جاگیرداروں سے بھی اس کا تعلق ہو جن کو اس بدیشی حکومت کے قیام سے نقصان پہنچا، لیکن جب اس ہنگامہ نے طول کھینچا تو اس ملک کی تمام رعایا کو حکومت کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ یہ ہنگامہ مسلمان اور انگریز کا نہ تھا بلکہ ہندوستانی اور انگریز کا تھا چونکہ ہر قوم نے بغاوت کی تھی لہٰذا اس بات کے امکانات نظر آنے لگے کہ انگریزوں کا پنجۂ استبداد ڈھیلا پڑ جائے۔ اور اس اجتماعی بغاوت سے اس کے پاؤں اکھڑ جائیں، لہٰذا ان بزرگوں کا خیال تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس کے ذریعہ اپنے اصلی اور بنیادی نصب العین کو حاصل کیا جائے۔ علماء اس بارے میں خاموش تماشائی کا پارٹ نہیں ادا کر سکتے تھے، کیونکہ انگریزوں کے مظالم جو اس سلسلہ میں محرک اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے، لہٰذا وہ اس میدان جہاد میں کود پڑے۔

بہر حال بقول مولانا گیلانی جذبۂ اعلاء کلمۃ اللہ، مذہبی حمیت، ملکی غیرت اور برادران ملک کی مظلومیت و مقہوریت عامہ کے پیش نظر ان کے استخلاص کا جذبہ وغیرہ اصل بواعث تھے جنہوں نے ان بزرگوں کو خاک و خون کے تماشوں میں لا کھڑا کیا۔

انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ تو اسی روز سے علماء کے دلوں میں موجزن تھا جس روز سرزمین پاک و ہند پر انگریزوں کے منحوس قدم پڑے تھے لیکن کچھ ایسے ناگفتہ بہ حوادث بھی پیش آئے جنہوں نے ان بزرگوں کے عزائم کو تیز کرنے میں مہمیز کا کام دیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان حوادث کی بنا پر ان کے عزائم کو جلد متحرک ہو جانا بھی چاہیے تھا، جن میں سے مثلاً ایک یہ بھی ہے جس سے انگریزوں کی معاہدہ شکنی اور غداری کھلے طور پر واضح ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں تذکرۃ الرشید میں حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب مرحوم نے

Marfat.com

ایک واقعہ لکھا ہے، جس کو مولانا گیلانیؒ نے بھی سوانح قاسمی میں نقل فرمایا کہ تھانہ بھون کے قصبہ میں قاضیوں کا ایک رئیس خاندان کئی سالوں سے سکونت پذیر تھا۔ اچھا خاصا کھاتا پیتا یہ گھرانہ مغلیہ خاندان سے چلا آ رہا تھا اور حکومت مغلیہ نے اسے ایک بہت بڑی جاگیر بھی دی ہوئی تھی جس کی سالانہ آمدنی اچھی خاصی تھی جس کی وجہ سے یہ خاندان متمول سمجھا جاتا تھا اور حقیقت میں متمول تھا بھی۔ جس زمانہ میں 57ء کا ہنگامہ شروع ہوا، اس زمانہ میں اس خاندان کے رئیس قاضی عنایت علی خان تھے جو تھانہ بھون کے نہایت نیک دل اور سرکاری خیر خواہ زمیندار تھے۔ قاضی عنایت علی خان صاحب کے ایک چھوٹے بھائی قاضی عبدالرحیم تھے۔ قاضی صاحب انہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتے تھے اور قاضی صاحب کی عنایت خسروانہ سمجھ لیجیے کہ ان کے یہ چھوٹے بھائی نہایت امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جس زمانہ میں ملک ہنگامہ کی آگ میں جل رہا تھا اور ہر طرف معرکہ آرائی اور مار پیٹ کے گھرے بادل چھائے ہوئے تھے، نہ معلوم قاضی عبدالرحیم صاحب کو ہاتھی خریدنے کا سواد دماغ میں کیوں سمایا۔ چنانچہ وہ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے اپنے چند احباب کے ساتھ سہارنپور گئے اور سرائے میں کسی دوست کے ہاں ٹھہرے۔ ہاتھی اس زمانہ میں امارت و ریاست کا نشان سمجھا جاتا تھا جیسے آج کل بہترین کار امارت کا نشان سمجھی جاتی ہے۔

حکومت نے ایک انگریز مسٹر اسپنکی (Spanki) سہارنپور میں ضلع کا افسر اعلیٰ جس کو شاید اس زمانہ میں کلکٹر کہتے تھے، بنا کر بھیجا، اور اُسے کلی اختیارات دیئے یہاں تک کہ اُسے سزائے موت تک دینے کے اختیارات بھی دیئے، کیونکہ اس زمانہ میں حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی تھی اور اُسے فرو کرنے کے لیے حکومت انگریز نے اپنے افسروں کو سخت سے سخت سزائیں دینے کے اختیار تک دیئے ہوئے تھے۔ اتفاقاً وہاں اس سرائے میں ایک بنیا جو تھانہ بھون یا کسی اور علاقے سے تعلق رکھتا تھا، ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ کسی وجہ سے تھانہ بھون کے ان قاضیوں کا دشمن بن گیا ہوا تھا، اور ہر وقت اس بات کی ٹوہ میں رہتا تھا کہ ان کی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ آئے اور وہ انہیں جانی یا مالی نقصان دے کر دشمنی کی جو آگ اس کے سینے میں جل رہی تھی، اس کو ٹھنڈا کر سکے۔

ایسے فتنہ وفساد کے زمانہ میں قاضی رعایت علی خان المعروف بہ قاضی عبدالرحیم

Marfat.com

کا تھانہ بھون چھوڑ کر سہارنپور ہاتھی خریدنے کے لیے آنا انتقام کے لیے مغتنم بنیئے کو محسوس ہوا۔ وہ سیدھا حاکم ضلع اسپنکی صاحب کی کوٹھی پر گیا اور بڑھا چڑھا کر اور کچھ زیبائش و آرائش کے ساتھ وہ بات اس انگریز افسر کے کان میں پھونک دی۔ اس نے بات کو بگاڑ کر انگریز افسر کو یہ بتایا کہ قاضی عبدالرحیم تھانہ بھون سے دہلی کے باغیوں کو کمک اور مدد بھیجنے کے لیے ہاتھی خریدنے سہارنپور آیا ہوا ہے۔ بڑے لوگوں کے اور بھی کئی دشمن ہوتے ہیں، لہٰذا بنیئے کے علاوہ دوسرے دشمنوں نے بھی گلی کوچوں میں اس افواہ کو پھیلا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس افسر اعلیٰ مسٹر اسپنکی نے فوراً حکم دیا کہ قاضی عبدالرحیم اور ان کے تمام ساتھیوں کو بغاوت کے جرم میں جیل بھجوا دیا جائے۔

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ قاضی عنایت علی اور قاضی عبدالرحیم پسران قاضی سعادت علی خان پسر نجابت علی خان دونوں بہت سعید، پابند مذہب، شریف الطبع اور نیک طینت لوگ تھے۔ دونوں بھائیوں میں غیر معمولی محبت تھی اور بے حد اعتماد تھا۔ میرٹھ کے سپاہیوں کی بغاوت اور دہلی میں بخت خان اور دوسرے جرنیلوں کا انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونے نے ان دونوں بھائیوں پر بہت اثر کیا۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ قاضی عبدالرحیم مرحوم واقعی دہلی کے مجاہدین آزادی کو کمک پہنچانے کے لیے سہارنپور سے ہاتھی خریدنے گئے تھے۔ اور اس بنیئے نے ان پر جو الزام لگایا تھا وہ بالکل درست اور صحیح تھا۔ سہارنپور بھی اس وقت فوجی نقطہ نگاہ سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ شمالی ہند کی جنگ آزادی کو دبانے کے لیے پنجاب سے فوجیں لائی جا رہی تھیں۔ ان کے لیے سہارنپور ہی سب سے اہم ناکہ تھا۔

انگریز روزمرہ کے نئے حملوں کی خبروں سے بے حد پریشان اور حواس باختہ تھا اور اس کا دماغ بوکھلایا ہوا تھا۔ اور حد سے زیادہ اختیارات بھی بعض دفعہ آدمی کو بدمست بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اس حد سے زیادہ بااختیار انگریز افسر نے اصل واقعہ کی تحقیق و تفتیش کی کوئی زحمت گوارا نہ کی اور خبر ملتے ہی قاضی عبدالرحیم کی تلاش کرائی اور گرفتار کر کے بغیر تفتیش حال ان کو مع اُن کے چند ساتھیوں کے اس ناکردہ گناہ کے بدلہ میں پھانسی دے دیا جو کہ نہایت زیادتی تھی، کیونکہ تحقیق حال انصاف کا تقاضا ہے۔ اسپنکی صاحب کا یہ

Marfat.com

مجرمانہ اقدام اور قطعاً ظالمانہ فیصلہ حکومت کے آئین و دستور کی بے حرمتی اور رسوائی کی اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہوسکتی تھی؟

اسپنکی صاحب اور ان جیسے آمرانہ ذہنیت رکھنے والے افسروں کی ظالمانہ چیرہ دستیوں کو بھی آئندہ حوادث میں بہت بڑا دخل تھا۔ چنانچہ علمائے اسلام نے ان چیرہ دستیوں اور انگریز حکومت کے جبرواستبداد کے جواب میں اور اپنے ایمانی اقتضاء کی تکمیل و تعمیل کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا جس کو بعد میں جنگ آزادی یا غدر کا نام دیا گیا، چنانچہ ان ناکردہ گنہ گاروں کے اس خون ناحق کی خبر جو تھانہ بھون پہنچی تو سارے قصبے میں کہرام مچ گیا۔ اپنے بھائی قاضی عبدالرحیم کی سزائے موت کی خبر جب ان کے بڑے بھائی قاضی عنایت علی کو ملی تو صدمہ سے ان پر رنج وغم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ریاست تو ریاست زندگی بھی بھائی کے پھانسی پا جانے کے بعد ان پر دوبھر ہوگئی۔ ان پر گویا کہ ایک جنون کی سی حالت طاری ہوگئی۔ جوش حزن میں بھائی کے انتقام کا خیال ان کے ذہن میں پختہ ہوگیا۔ چنانچہ آغاز غدر کے چند مہینوں کے بعد قاضی عنایت علی انتقام کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ انہوں نے انتصار داد طلبی کے لیے تھانہ بھون کے اطراف و جوانب میں جو قصبات تھے، وہاں کے باشندوں کو پکارا۔ نانوتہ، گنگوہ اور کیرانہ وغیرہ کے نمائندے وہاں قاضی عنایت علی کے پاس پہنچے۔

نانوتہ، گنگوہ اور کیرانہ اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی وجہ سے دینی طور پر ایک اعلیٰ مقام کے حامل تھے۔ اول الذکر دونوں بزرگوں کے پیرومرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کا تو وطن اور مستقر ہی تھانہ بھون تھا۔ ان کے سوا حضرت حافظ محمد ضامن شہید اور حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی بھی تھانہ بھون میں موجود تھے۔

کمپنی کی طرف سے قاضی عنایت علی کو پیغام پہنچا کہ تم فساد سے باز آجاؤ اور اپنے بھائی کے بارے میں صبر سے کام لو۔ ہمارے افسر سے غلطی سے یہ حرکت سرزد ہوگئی ہے۔ اگر تم انتقام سے باز آگئے تو تمہیں تھانہ بھون کا نواب بنا دیا جائے گا، لیکن انگریزوں کا یہ پیغام کارگر ثابت نہ ہوا اور انتصار اور داد طلبی کے لیے جن لوگوں کو بلایا گیا

تھا وہ تھانہ بھون میں جمع ہو گئے۔

قاضی عنایت علی اگرچہ اس وقت جذبات سے مغلوب تھے، لیکن صاحب علم ہونے کے باعث انہوں نے ان بلائے ہوئے لوگوں سے مار دھاڑ اور اکھاڑ پچھاڑ کی اندھا دھند کاروائیوں کی بجائے "امرھم شوریٰ بینھم" کے تحت تھانہ بھون میں ایک مجلس شوریٰ قائم کی تا کہ ہر کام باہمی مشورہ سے سرانجام پائے۔ اس مجلس شوریٰ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے فقیہ اور دوسرے علماء وقت شریک ہوئے۔ علماء کی مجلس تھی لہٰذا اس بارے میں علمی گفتگو چھڑی۔ سوال یہ تھا کہ اپنے قانون کو توڑ کر حکومت اور حکومت کا نمائندہ غدر اور قانون شکنی کا مرتکب ہو چکا تھا، اس بغی کے مقابلہ میں انتصار کے فرض کو محسوس کرتے ہوئے، جہاد و قتال پر آمادہ ہونے کا وقت کیا آ گیا ہے؟ اس موقعہ پر تمام علماء جہاد و قتال کے خلاف تھے صرف حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ مدعیانہ طریقہ پر اس میں پیش پیش تھے۔ کچھ علماء نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے موقف کے خلاف جو دلائل پیش کیے، آپ نے ان کے مدلل اور مسکت جوابات دیئے۔ آخر میں حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی جو حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور عمر میں حضرت نانوتویؒ سے کئی سال بڑے تھے، آخر میں یہ عذر پیش کیا کہ اگر آپ کے دلائل اور آپ کی باتیں مان لی جائیں تو جہاد میں سب سے بڑی شرط نصب امام کی ہے، وہ امام کہاں ہے جس کی قیادت میں جہاد کیا جائے؟

مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی یہ بات عین شریعت کے مطابق تھی، کیونکہ دینی اور دنیوی معاملات میں کثرت جب تک وحدت کے نظام میں جکڑی نہیں جاتی، صحیح نتائج کی امید مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ حضرت مولانا نانوتویؒ نے شیخ محمد تھانویؒ کا یہ عذر سن کر فرمایا کہ نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے۔ حضرت مرشد برحق حاجی صاحب موجود ہیں ان ہی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کر لی جائے۔ حضرت حاجی صاحبؒ سے ان کی مراد حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ تھے۔ ساری مجلس اس پر متفق ہو گئی اور حضرت حاجی صاحبؒ کے دست مبارک پر لوگوں نے جہاد کی بیعت کر لی اور حضرت حاجی صاحب نے بھی ان کی اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اس طریقہ سے معاملہ کچھ یوں ہوا کہ

Marfat.com

''حضرت اقدس مولانا حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ مرکز بیعت جہاد تھے اور حضرت مولانا حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سب سے بڑے علم بردار جہاد تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ جامع مجاہدین تھے کہ وعظ و پند اور ترغیب و ترہیب سے مجاہدین کو مختلف مواقع پر قصبات و دیہات سے جمع کر کے میدان میں لائیں۔''

موجودہ عصری اصطلاحوں میں تنظیم کے ان عہدوں کی تعبیر کچھ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ امیر المؤمنین تھے۔ حضرت حافظ محمد ضامن شہید امیر جہاد گویا صدر مجلس جنگ تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ امیر الافواج یا چیف کمانڈر مولانا محمد منیر نانوتوی ان کے یاور حربی، فوجی سیکریٹری اور حضرت مولانا گنگوہی وزیر لام بندی تھے۔

یہ تھے وہ اسباب اور یہ تھیں وہ وجوہات جن کی وجہ سے علماء کو میدان جہاد میں کودنا پڑا اور چشم فلک نے یہ دیکھا کہ ان عالمانِ دین متین نے خاک وخون میں غلطاں ہو کر اپنے اس دینی فرض کو نبھایا۔ اور تحریک جہاد کی ناکامی کے بعد جو سزا بھی انہیں دی گئی، اسے بصد خوشی و مسرت قبول کیا۔

یہ تو صرف تھانہ بھون کے علماء کی کارگزاری کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کیرانہ، دہلی اور دوسرے علاقوں میں بھی علماء کا یہی موقف تھا اور وہ اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف اٹھنے کو لفظ جہاد سے تعبیر کرتے تھے، دہلی اس وقت مغلیہ حکومت کا دار الخلافہ تھا اور پورے ہندوستان کا علمی مرکز بھی تھا۔ شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبد العزیزؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ جیسے بزرگوں کا مسکن ہونے کا شرف بھی اسی دہلی کو حاصل تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مفتی اعظم حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ نے فرمایا تھا کہ

''اس اطراف میں اور یہاں سے لے کر کلکتہ تک نصاریٰ کا حکم جاری ہے، وہ بلا روک ٹوک جو کچھ چاہتے ہیں، کرتے ہیں۔ عبادت گاہوں تک کو مسمار کر ڈالتے ہیں۔ مذہب کا کوئی احترام اُن کی نظر میں نہیں ہے۔''

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کے فتویٰ کے بعد انگریزی ڈپلومیسی کا دارالافتاء بھی برابر کام کرتا رہا۔ اس دارالافتاء نے پہلے تو حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کو وہابی اور وہابیت زدہ بلکہ موٴ ہن رسالت قرار دیا۔ پھر مسئلہ کو الجھانے اور کھلی ہوئی حقیقت کے چہرہ پر نقاب ڈالنے کے لیے انوکھا پہلو یہ پیش کر دیا کہ

''انگریز حاکم وقت ہے۔ مسلمان اس کی پناہ میں ہیں (یعنی مستأمَن ہیں) پس ان کی اطاعت واجب ہے اور غدر حرام۔''

یہ موقف سرسید اور اُن جیسے کئی علماء کا تھا اور یہ حضرات انگریز کی وفاداری میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ اس کی حمایت میں اپنے ملک اور اپنی ملت کے کسی بھی بڑے آدمی کی کوئی وقعت ان کی نظر میں نہیں تھی۔ چنانچہ وہ اُن علماء کے بارے میں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا، کچھ ایسے بے قابو ہو جاتے ہیں کہ دہلی کی روایتی تہذیب کا دامن بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ ایسا انداز اختیار کرتے کہ حیاء بھی حیاء سے اپنا منہ چھپالیتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ تھانہ بھون کی طرح دہلی اور دوسرے اضلاع کے علماء نے بھی انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے دے کر لوگوں کو ان کے خلاف کھڑا کر دیا۔ دہلی کے فتویٰ پر جن علماء کے دستخط تھے ان میں مولانا احمد اللہ شاہ صاحبؒ، مولانا فیض احمد صاحبؒ، مولانا کفایت علی صاحبؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ، مولانا رشید احمد صاحبؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا عنایت احمد کاکوروی اور دیگر اکابر علماء کے نام درج تھے۔ اس فتویٰ جہاد سے سرسید اور اس کے ہم نوا علماء جو انگریز کے وظیفہ خوار بلکہ نمک خوار تھے، وہ اپنا حق نمک ادا کرنے کے لیے اس فتویٰ کی مخالفت میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان علماء کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت میں بیان دینے شروع کر دیئے۔ چنانچہ سرسید نے اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں لکھا ہے۔

''مسلمانوں کا بہت روز سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا اس ارادہ سے کہ ہم باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے لوگوں پر جہاد کریں

Marfat.com

اور ان کی حکومت سے آزاد ہو جائیں، نہایت بے بنیاد بات ہے
جب کہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے مستأمن تھے، کسی طرح
گورنمنٹ کی عملداری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے۔''

اس کے بعد سرسید کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے ہیں اور ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو ان جیسے شخص کے کسی طرح بھی شایان شان نہیں۔ آپ ان تمام بڑے بڑے جید اور ثقہ علماء کے لیے ''پاجی'' اور ''جاہل'' کے الفاظ استعمال کر کے انگریزوں سے اپنی وفاداری کے رابطہ کو استوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اور یہ جو ہر ضلع میں پاجی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا۔ اگر ہم اس کو جہاد ہی فرض کریں تو بھی اس کی سازش و اصلاح قبل دسویں مئی 1857ء مطلق نہ تھی۔ غور کرنا چاہیے کہ اس زمانہ میں جن لوگوں نے جھنڈا جہاد کا بلند کیا ایسے خراب اور بدرویہ اور بد اطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ و رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا۔ بھلا یہ کیونکر پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جا سکتے تھے۔ اس ہنگامے میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب جو امانت تھا، اس میں خیانت کرنا، ملازمین کو نمک حرامی کرنی، مذہب کی رو سے درست نہ تھی۔ صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں، بچوں اور بڈھوں کا، مذہب کے بموجب گناہ عظیم تھا۔ پھر کیونکر یہ ہنگامۂ غدر جہاد ہو سکتا تھا۔ ہاں البتہ چند بد ذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورے کرنے اور جاہلوں کے بہکانے کو اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام دے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرامزدگیوں میں سے ایک حرامزدگی تھی نہ واقع میں جہاد۔''

سرسید نے یہاں انگریزوں کی حمایت میں وہی زبان استعمال کی ہے جو ان

Marfat.com

کے معاصر مرزا غلام احمد قادیانی نے علماء کے متعلق کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات ایک ہی چشمہ سے سیراب اور ایک ہی آقا کے غلام تھے۔ پھر سید صاحب نے اس اقتباس میں بہت سے مغالطے دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے سرکاری خزانہ اور اسباب کو امانت لکھا ہے حالانکہ معاملہ ایسا نہیں تھا بلکہ مجاہدین انگریزوں کو اس ملک کا حاکم اور امیر نہیں تسلیم کرتے تھے بلکہ غاصب، بدعہد اور خائن سمجھتے تھے۔ سرکاری خزانہ اور اسباب امانت نہیں تھا بلکہ مال مغصوبہ تھا۔ اس خزانہ اور اسباب کے اصل مالک انگریز نہیں بلکہ یہاں کے باشندے تھے۔ انگریزوں نے جبر وقہر سے ہندوستانیوں کا مال چھینا بلکہ لوٹا تھا لہٰذا انہیں اپنا وہ مال لینے کا پورا پورا حق تھا۔ دوسرے انہوں نے ہندوستانی ملازمین کو نمک حرام کہا حالانکہ نمک حرام وہ نہیں تھے بلکہ انگریز تھے جنہوں نے شاہ عالم سے دیوانی حاصل کر کے اتنی بڑی نمک حرامی کی تھی کہ نمک حرامی کی پوری تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اس کے آگے سرسید نے مزید کھل کر لکھا کہ

> ''دہلی میں جو فتویٰ جہاد کا چھپا وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے، مگر میں نے تحقیق سے سنا ہے اور اس کے اثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دلی میں گئی تو کسی نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا۔ سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ اس پہلے فتویٰ کی میں نے نقل دیکھی ہے، مگر جب کہ وہ اصل فتویٰ معدوم ہے تو میں اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں تک لائق اعتماد کے ہے، مگر جب بریلی کی فوج دلی میں پہنچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے بلاشبہ اصلی نہیں۔ چھاپنے والے اس فتویٰ کے نے جو ایک مفسد اور نہایت قدیمی بدذات آدمی تھا، جاہلوں کے بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دی تھی بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی جو

Marfat.com

قبل غدر مر چکا تھا، مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اس کے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں۔''

(اسباب بغاوت ہند: ص ۸)

سرسید کے اس طویل اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں علماء نے انگریزوں کو نکالنے کے لیے فتویٰ جہاد دیا تھا، لیکن سرسید نے اس زمانہ کے آوارہ منش لوگوں کی حرکات کو اخلاص پیشہ اور شریف الطبع مجاہدین کے سر تھوپا جو کہ سرسید کی سراسر زیادتی ہے۔

سرسید کے ہم نوا شمس العلماء ذکاء اللہ خان نے بھی وہی لکھا اور انگریزوں کی حمایت میں وہی زبان استعمال کی ہے جو سرسید نے استعمال کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

''یہ کام لچے شہدے مسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے۔ مگر جب ''بخت خان'' جس کا نام اہل شہر نے ''کم بخت خان'' رکھا تھا۔ دلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھایا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لیے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہوگی تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ اُس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتوے پر دستخط و مہریں ان کی کرالیں اور مفتی صدارلدین نے بھی ان کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی، لیکن مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین نے فتویٰ پر مہریں نہیں کیں اور بے باکانہ کہہ دیا کہ شرائط جہاد موافق مذہب اہل اسلام موجود نہیں۔

''اس فتویٰ کا اثر یہ تھا کہ جاہل مسلمانوں کا جوش مذہبی زیادہ ہو گیا جن مولویوں نے فتویٰ پر مہریں کی تھیں۔ وہ کبھی پہاڑی پر انگریزوں سے لڑنے نہیں گئے۔ مولانا نظیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا اور پیشوا تھے، ان کے گھر میں ایک میم چھپی بیٹھی تھی۔ اس فتویٰ پر کچھ مہریں اصلی اور کچھ جعلی تھیں۔'' (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ: ص ۶۷۵)

سرسید اور ذکاء اللہ خان دونوں نے ان لوگوں کو جو جہاد کا داعیہ لے کر اٹھے تھے

Marfat.com

پاجی، شہدے اور اس قسم کے رذیل الفاظ استعمال کیے ہیں۔ دوسری بات یہ لکھی کہ اس فتوے پر کچھ مہریں اور دستخط فرضی تھے اور ان علماء نے مجبور و مقہور ہو کر دستخط کیے تھے۔ معلوم نہیں انہیں مجبور کرنے والے کون تھے اور وہ علماء جنہوں نے دستخط نہ کیے ان کو کون سا نقصان پہنچا۔ جیسے مولانا نذیر حسین دہلوی اہل حدیث اور شیخ محمد تھانوی۔ (ان دونوں بزرگوں کا موقف یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد تو ضرور ہونا چاہیے لیکن اس وقت جہاد کی شرطیں موجود نہیں ہیں جیسے یہ کہ اس وقت ہم میں مقابلہ کی پوری قوت وغیرہ موجود نہیں)۔

سرسید اور ذکاء اللہ خان کے بیانات صرف انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہیں وگرنہ حالت یہ ہے کہ علمائے دہلی نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اور قرآن و سنت کی روشنی میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ فتویٰ کی عبارت سے معلوم ہو جائے گا کہ ان ارباب فتویٰ اور اہل علم حضرات کے پیش نظر نہ یہ تصور تھا کہ انگریز حاکم ہے اور ہم اس کی مستأمن رعایا، جیسا کہ سرسید احمد خان نے لکھا ہے اور مستأمن ہونے کے ناطے انگریزوں کی اطاعت فرض ہے۔ اس وقت ہر عالم کے نزدیک انگریزوں کے خلاف جہاد ضروری تھا۔ سوال اس وقت صرف ایک تھا کہ آیا ہم میں اس وقت انگریزوں کے خلاف مقابلہ کی طاقت ہے یا نہیں؟ چنانچہ فتویٰ کا سوال اور پھر اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں، اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟ اور لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں؟ بیان کرو اللہ تعالیٰ تم کو جزائے خیر دے۔

اس استفتاء کا جواب علماء کی طرف سے جو دیا گیا وہ حسب ذیل ہے:

درصورت مرقومہ فرض عین ہے۔ اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے۔ تو فرض عین

Marfat.com

ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف و احوال کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض ہو جائے گا۔ اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہو گا۔ اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل و غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض عین ہو جائے گا بشرط ان کی طاقت کے۔

العبد المجیب احقر نور جمال عفی عنہ

اس جواب کے نیچے مندرجہ ذیل علماء کے دستخط اور ان کی مہریں بھی ہیں۔ ان میں نہ تو کوئی دستخط جبر سے کیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی مہر مجبوراً لگائی گئی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا عالم ہے جو دستخط کرنے سے قبل اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو رحلت کر گیا تھا۔ ان علماء کے نام حسب ذیل ہیں:[1]

(1) سید محمد نذیر حسین (2) رحمت اللہ (3) مفتی محمد صدر الدین (4) اکرام الدین معروف سید رحمت علی (5) محمد ضیاء الدین (6) عبدالقادر (7) فقیر احمد سعید احمدی (8) محمد میر خان (9) محمد عبدالکریم (10) فقیر سکندر علی (11) محمد کریم اللہ (12) مولوی عبدالغنی (13) خادم العلماء محمد عبدالغنی (14) فرید الدین (15) محمد سرفراز علی (16) سید محبوب علی جعفری (17) ابواحمد محمد حامی الدین (18) سید احمد علی (19) الٰہی بخش (20) محمد مصطفےٰ خان ولد حیدر شاہ نقشبندی (21) محمد انصار علی (22) مولوی سعید الدین (23) حفیظ اللہ خان (24) محمد نور الحق عفی عنہ (25) سراج العلماء ضیاء الفقہاء مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی خان (26) واللہ الغنی وانتم الفقراء (27) حیدر علی (28) سیف الرحمٰن (29) سید عبدالحمید عفی اللہ عنہ (30) محمد ہاشم (31) یا حافظ (32) محمد امداد عفی عنہ (33) خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضاۃ محمد علی حسین۔

۱۔ اگرچہ اس فتویٰ پر دستخط کرنے والے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نہیں بلکہ دلی کے مولانا رحمت اللہ تھے لیکن اس فتویٰ کے مرتب کرنے والوں میں مولانا رحمت اللہ شامل تھے۔

نیچے تحریر ہے۔ حسب فرمان واجب الاذعان شاہی در جمیع المطابع دہلی سید جمیل الدین خان مہتمم طبع نمود۔

اس فتویٰ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صدرالدین صاحب کے متعلق جو یہ روایت مشہور ہے کہ انہوں نے بالجبر دستخط کیے تھے وہ غلط ثابت ہو جاتی ہے، کیونکہ اس فتویٰ میں دستخطوں کے ساتھ "شهدت بالجبر" کے کوئی الفاظ منقول نہیں ہیں۔

شمس العلماء ذکاء اللہ خان نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے بارے میں جو لکھا ہے کہ اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ وہ ایک ہنگامہ اور فساد تھا۔ شمس العلماء کا یہ خیال بھی بالکل غلط ہے۔ حضرت مولانا تو انگریز کے خلاف جہاد میں پیش پیش تھے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کئی سالوں سے انگریزی حکومت کی ملک دشمن اور دین دشمن کاروائیوں کو بنظر غائر دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ آپ نے ردّ عیسائیت کے بارے کتابیں لکھ کر جہاد بالقلم کیا۔ پھر اکبر آباد میں 1854ء میں پادری فنڈر سے مناظرہ کر کے جہاد باللسان کا فریضہ ادا کیا۔ یہ جذبہ جہاد آپ کے قلب میں موجزن تھا کہ 1857ء میں جہاد بالسیف کا مرحلہ بھی آپ کے سامنے آ گیا۔ اور اس فریضہ سے بھی آپ بخوبی سبکدوش ہوئے۔

ردعیسائیت پر مولانا کیرانویؒ کی کتابیں اور پھر آگرہ کے مناظرے نے مولانا کی شہرت کو پورے ہندوستان میں پر لگا دئے۔ خیبر سے آسام تک اور ہمالیہ سے راس کماری تک علمی حلقوں میں آپ کا نام گونجنے لگا۔ دہلی اس وقت دارالسلطنت ہونے کے ناطے بھی اور علمی مرکز ہونے کے ناتے بھی بڑے بڑے جید علماء کی آماجگاہ تھا۔ چنانچہ علمی حلقے میں بھی مولانا کیرانویؒ کا ایک خاص مقام تھا۔ علماء کے علاوہ لال قلعہ کے شہزادگان پر بھی مولانا مرحوم کی علمی قابلیت اور رد نصاریٰ میں آپ کی وسیع معلومات کا اثر تھا۔ جس طرح ہر ہندوستانی عیسائی پادریوں کی تبلیغی حرکتوں کو ملک وقوم کے لیے خطرناک سمجھتا تھا اہل قلعہ بھی اور خصوصی طور پر شہزادگان بھی ان سے پریشان تھے۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کا ولی عہد مرزا فخرو کو جب معلوم ہوا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ رد نصاریٰ میں ایک کتاب "ازالة

Marfat.com

الشکوک" تالیف فرمارہے ہیں تو انہوں نے دہلی کے عیسائی پادریوں کے چھ سوالات ان کی خدمت میں روانہ کیے اور عرض کی کہ آپ ان چھ سوالوں کا جواب بھی اس کتاب میں شائع فرمادیں۔ چنانچہ اس کی درخواست پر مولانا مرحوم نے اپنی اس کتاب میں اُن چھ سوالوں کے جوابات بھی شائع فرمائے۔ بعدازیں مرزا فخرو ہی کے حکم سے اکبرآباد کے مناظرہ کی روئیداد البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف کے نام سے زیور طباعت سے مزین ہوئی۔ اور انہی کے حکم سے ہندوستان کے اطراف واکناف میں اس کی اشاعت اور تشہیر ہوئی۔

مولانا کیرانویؒ کے علاوہ ایک اور شخصیت ایسی تھی جن کی علمیت سے تو نہیں البتہ روحانیت سے شہزادگانِ قلعہ بہت متاثر تھے۔ اور وہ شخصیت تھی حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی۔ چنانچہ کئی شہزادے ان کے مرید تھے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے

"اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) جب بھی دہلی تشریف لاتے تو حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے پاس قیام فرماتے۔ اور استاذ الکل مولانا مملوک علی کے شاگرد سیدنا امام الکبیر مولانا محمد قاسم بھی زیارت سے بہرہ یاب ہوتے۔ خلاصہ یہ کہ دہلی سے نانوتہ اور نانوتہ سے دہلی جاتے ہوئے بھی حضرت حاجی صاحب، قبلہ کی خدمت میں حاضری کے مسلسل مواقع آپ کو ملتے رہتے۔ اور یوں بھی جب کبھی حاجی صاحب دہلی تشریف لاتے تو قدرتی تائید ہی کی اس کی ایک شکل سمجھنا چاہیے کہ دہلی جہاں عرض کر چکا ہوں شاہی خانوادے کے بھی بعض ارکان حاجی صاحب کی بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ اسی دلی میں بجائے کسی اور جگہ فروکش ہونے کے اسی گھر کو قیام گاہ بنانے کا شرف بخشا جاتا تھا، جہاں سیدنا امام الکبیر کو حاجی صاحب کے ساتھ تعلقات کے تروتازہ کرنے کے مواقع بہ آسانی مل جاتے تھے۔" (سوانح قاسمی: جلد ۱ص ۳۸۵)

جب میرٹھ کے مجاہدین نے دہلی میں جنگ آزادی کا بگل بجایا، چونکہ مولانا

Marfat.com

رحمت اللہ کیرانوی کا دہلی کے علمی طبقے اور لال قلعہ کے شہزادوں پر اثر تھا اور ان سے تعلقات بھی تھے۔ اس وقت بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مولانا کیرانویؒ نے بھی جنگ آزادی کا نقشہ بنانے میں حصہ لیا اور جنگ میں عملی طور پر شمولیت فرمائی۔ مولانا کیرانویؒ اور ان کے ساتھیوں نے جنگ آزادی میں جو انقلابی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ حاجی امداد اللہ صاحب، ڈاکٹر محمد وزیر خان اور مولانا فیض احمد بدایونیؒ کے باہمی مشوروں اور پروگرام کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی وہ دور اندیش ہستی تھی جنھوں نے اپنی دور بینی سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ جب تک انگریزی حکومت قائم رہے گی، ہندوستانیوں خصوصی طور پر مسلمانوں کے مذہب، تمدن اور معاشرت کو ختم کرتی رہے گی اور اپنی تہذیب وتمدن مسلمانوں پر مسلط کر کے اپنے عیسائی مذہب کو پھیلاتی رہے گی۔ اس لیے اس حکومت کا زور قلم، زبان اور بندوق وتلوار سے توڑنا چاہیے۔ ایسے حساس آدمی اور باشعور ہستی کے بارے یہ توقع رکھنا کہ وہ جنگ آزادی کو ایک تماشا اور بازیچۂ اطفال سمجھے گا اور اس میں شمولیت نہیں کرے گا انتہائی غلط ہے۔

حضرت مولاناؒ نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا کیونکہ ملک میں عام بغاوت ہو چکی تھی جس کے اسباب ہم نے گذشتہ صفحات میں لکھے ہیں۔ وہ سب سے پہلے کیرانہ سے دہلی تشریف لائے تاکہ ٹوہ لگائیں کہ جہاد کی کیا صورت ہے۔

مولانا ذکاء اللہ نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ پر یہ بہتان لگایا ہے کہ ان کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی لہٰذا وہ واپس اپنے وطن کیرانہ چلے گئے۔

(ملاحظہ ہو تاریخ عروج سلطنت انگلیشیہ: جلد ۳ ص ۶۷۵)

کیا کوئی انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ جب میرٹھ کے مجاہدین نے دہلی پر حملہ کیا تھا اور وہ انگریزوں کا قلع قمع کر رہے تھے اس وقت جہاد کے حالات نہیں تھے۔ جہاد کے حالات تھے اور یقیناً تھے اسی وجہ حضرت مولانا مرحوم نے اس جہاد میں عملی طور پر حصہ لیا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور دیگر اکابرین امت کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت

Marfat.com

کے خلاف صف آرا ہوئے۔ چنانچہ روزنامچہ عبداللطیف میں مرقوم ہے:

''30 جون کم تر از روز برآمدہ بود کہ آویزش دل نشین سپاہ نصیرآباد آمد۔ آئین سپاہ گری بجا آورد ویکوبچہ ملاقی شد۔ و لے ہزیمت خورد وہم امروز کہ بیشتر از روز رفتہ بود کہ مردم نجیب آباد کہ بشمار دو صد میر سیدند باقتدائے مولوی رحمت اللہ کیرانہ نژاد بمنازعت برآمدند و بمراجعت درآمدند۔ (ص:۷۸)

30 جون کچھ دن چڑھے نصیرآباد کے لشکر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سپہ گری کا حق ادا کر دیا لیکن شکست کھائی۔ اور آج ہی دن ڈھلے دو سو نجیب آباد کے باشندے مولوی رحمت اللہ کیرانوی کی قیادت میں پہنچے اور آمادہ پیکار ہوئے لیکن پھر واپسی اختیار کی۔''

اس عبارت اور دوسرے واقعاتی قرائن سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ حضرت مولانا کیرانویؒ 1857ء کی جنگ آزادی میں برابر شریک رہے اور آپ نے کبھی بھی اسے جہاد سے کم درجہ نہیں دیا۔ چنانچہ اس جنگ آزادی سے قبل اور اس کے دوران جس قدر فتاویٰ بابت جہاد شائع ہوئے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے اس پر ہمیشہ دستخط ہوتے تھے۔

مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی نے اس الزام کی تردید میں کہ جنگ آزادی کے بانی مبانی علمائے اہل حدیث تھے، اپنے رسالہ اشاعت السنہ میں ایک مضمون لکھا جس کا نام تھا ''غدر اور علمائے اہل حدیث'' اس میں انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ جنگ آزادی کے دوران انقلابی فتویٰ جو دہلی میں تقسیم ہوا تھا اور اس کی حسب ذیل نقل 19 جولائی 1857ء کے صادق الاخبار دہلی میں شائع ہوئی تھی، اس پر دستخط مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے نہیں تھے بلکہ دلی کے مولانا رحمت اللہ صاحب کے تھے، مولانا محمد حسین بٹالوی کا یہ مضمون بڑا معلوماتی ہے لہٰذا غور وفکر سے پڑھنے کے قابل ہے:

''واضح ہو کہ مفسدہ 1857ء میں اس گروہ کے کسی ایک (لائق شمار و اعتبار) کی شراکت وسازش بغاوت کرنے یا اس کی ترغیب دلانے

میں پائی نہیں گئی، کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ اس کا ثبوت دے سکتا ہے کہ کوئی مولوی یا مقتدی یا رئیس اس گروہ کا اس مفسدہ میں شریک تھا۔ اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں فلاں شخص (بہادر شاہ یا فیروز شاہ یا بخت خان وغیرہ) جو اس بغاوت کے بانی مبانی یا اس کے معاون تھے، اہل حدیث یا وہابی تھا۔ اس موقع پر علماء دہلی کا، جن میں اس وقت کے اکابر اہل حدیث بھی داخل ہیں فتویٰ جہاد پر دستخط یا مواہیر کرنا اور بعض مولویوں کا جیسے مولوی عبدالقادر لدھیانوی اور ان کے بیٹے سیف الرحمٰن وغیرہ اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور مولوی سرفراز علی گورکھپوری اور مولوی فضل حق خیر آبادی وغیرہ کا اس ہنگامہ میں شریک ہونا کچھ کچھ شکوک وظن پیدا کرتا ہے اور مخالف کو بات کہنے کا موقع دیتا ہے، لہٰذا ان باتوں کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

بے شک علماء دہلی نے فتویٰ جہاد پر مواہیر کی ہیں مگر بخوف گولی و شمشیر کے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب باغی فوج دہلی میں آ کر جمع ہوئی اور بخت خان بریلی سے آیا اور مولوی سرفراز علی اور مولوی رحمت اللہ اور مولوی عبدالقادر معہ اپنے فرزندوں کے بخت خان کے ساتھ شامل ہوئے تو بخت خان نے ان لوگوں سے جہاد کا فتویٰ لکھوایا پھر اس پر علماء دہلی کے دستخط و مواہیر ثبت کروانا چاہا۔ ایک روز بخت خان معہ افسران باغی فوج جامع مسجد دہلی میں آیا اور سپاہیوں کی معرفت شاہ احمد سعید، شاہ عبدالعزیز خانقاہی اور مفتی صدرالدین آزردہ اور نواب قطب الدین خان صاحب اور مولوی کریم اللہ اور مولوی فریدالدین اور مولوی ضیاءالدین اور مولوی نوازش علی اور مولوی رحمت اللہ دہلوی (پہلے مولوی رحمت اللہ کیرانوی ہیں) اور مولوی حفیظ اللہ اور مولوی سید نذیر حسین صاحب کو بلایا۔ پھر مولوی سرفراز علی نے بحکم بخت خان وہ فتویٰ پڑھ کر سنایا۔ جب وہ فتویٰ تمام ہوا تو بخت خان

وغیرہ باغی افسروں نے علماء کو حکم دیا کہ اس فتویٰ پر اپنے اپنے دستخط کر دیں ورنہ سب قتل کیے جائیں گے۔ پس سب نے بخوف خان کرہاً و جبراً دستخط کر دیئے۔ اور اگر وہ دستخط نہ کرتے تو اسی وقت سب تلوار سے قتل کیے جاتے یا توپ سے اڑائے جاتے۔ ہمارے خیال میں اگر وہ انگریز (جو اہل حدیث پر مجبوراً شرکت کے سبب حرف گیری کر رہے ہیں) اس موقع پر ہوتے اور اس فتویٰ کی موافقت پر مجبور کیے جاتے تو تلواروں کو دیکھ کر اظہار موافقت کرتے اور اس فتویٰ پر دستخط کرتے۔ ہمارے اس دعوے پر کہ انہوں نے جبراً دستخط کیے ہیں، دلی ارادہ سے نہیں کیے ایک بڑی روشن دلیل یہ ہے کہ وہ لوگ دستخط کر کے پھر گھر سے باہر نہ نکلے اور اس جہاد میں شریک نہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب گورنمنٹ انگلیشیہ کا دہلی پر دوبارہ تسلط ہوا تو گورنمنٹ نے ان دستخط کرنے والے مولویوں کو بری الذمہ قرار دیا۔ نہ کسی کو پھانسی دی نہ کسی کا گھر لوٹا باوجودیکہ باغیوں کے مددگاروں کو پھانسی دینا اس وقت کا عام رول تھا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ انہیں مجبور ہو کر دستخط کرنے والے مولویوں سے مولوی حفیظ اللہ خان اور مولوی نذیر حسین اور ان کے بیٹے مولوی شریف حسین اور ان کے شاگردان مولوی محمد صدیق پشاوری اور مولوی عبداللہ مرحوم غزنوی (جن کی اولاد و قبائل اب امرتسر میں آباد ہیں اور اس سلطنت کو امن و آزادی کی نظر سے اپنے قدیم وطن غزنی و کابل سے بہتر سمجھ کر پھر وہاں جانا نہیں چاہتے) نے ایک میم کو زخمی پا کر امن دیا اور اپنے گھر میں لے جا کر اس کے زخموں کا علاج کر کے جب موقع پایا سرکاری کیمپ میں پہنچا دیا جس پر ان کو سرکار کی طرف سے انعام و اکرام بھی ہوا۔ اور اگر ان کا اس فتویٰ پر مہر لگانا دلی ارادہ سے ہوتا تو یہ خیرخواہانہ کام ان سے

کیوں ہوتا۔ ان کو انگریزوں کی ایسی حالت ضعیف میں انگریزوں سے کیا ڈر تھا اور کیا طمع و توقع۔

اس بیان کی تصدیق کے لیے ہم دو چٹھیاں انگریزی معہ ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ ان چٹھیوں کی نقل جو ہمارے پاس دہلی سے پہنچی ہیں، ان میں بعض الفاظ مشتبہ ہیں۔ ان کو ہم نے بدلنا مناسب نہیں سمجھا۔

نقل چٹھی ڈبلیو۔ جی، واٹر فیلڈ صاحب بہادر قائم مقام کمشنر سابق دہلی 27ء ستمبر 1877ء۔

''مولوی نذیر حسین اور ان کے پسر مولوی شریف حسین نے معہ دیگر مردم خاندان کے مسز لیسن کی میم کی غدر میں جان بچائی تھی۔ اس وقت یہ اس کو اپنے گھر لے گئے تھے جس وقت میں وہ زخمی پڑی تھی۔ سو اپنے مکان میں ساڑھے تین مہینے تک رکھا۔ آخر کار سرکاری کیمپ میں پہنچا دیا۔ ان کے یہاں سے ظاہر ہوا کہ سرکاری انگریزی چٹھیاں اس آگ سے جل گئیں جو ان کے مکان میں لگی تھی۔ میں خیال کرتا ہوں یہ امر صحیح ہے۔ ان کے پاس چٹھیاں نولی چیمر لین صاحب اور جنرل بڑن صاحب اور کرنل ٹیٹلر صاحب وغیرہ کی تھیں۔ اور مسز لیسن کی میم کے آنے کی کل حقیقت مجھ کو یاد ہے۔ ان کو دو سو روپیہ ایک مرتبہ اور چار سو ایک مرتبہ انعام ملا۔ اور سات سو روپیہ بعوض گر جانے مکانات کے ملا۔ پس یہ خاندان قابل لحاظ اور مہربانی کے ہے۔''

نقل چٹھی میجر جی۔ ای ینگ صاحب بہادر کمشنر

میں نے بچشم خود دیکھا کہ میم صاحبہ سے بھی سنا۔ فی الحقیقت یہ سرٹیفکیٹ درست ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ مولوی نذیر حسین اور شریف حسین نے ان کی جان دشمنوں سے بچائی۔

16 ستمبر 1881ء

Marfat.com

یہ اس فتویٰ جہاد پر علماء دہلی کے مہر و دستخط کرنے کا جواب ہے۔
اب رہا بعض علماء پنجاب و ہندوستان کا اس مفسدہ 1857ء میں شریک ہونا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ منجملہ ان علماء کے جو اس مفسدہ میں شریک تھے، اہل حدیث ایک بھی نہ تھا بلکہ اکثر ان میں سے ایسے تھے جو اہل حدیث سے مخالفت کے مدعی تھے اور ان کی ذریات واتباع اب تک اس گروہ سے عداوت کا دم مارتے ہیں۔
ان میں سب سے بڑے مولوی فضل حق خیر آبادی ہیں۔ ان کی عداوت ومخالفت اس گروہ سے شہرۂ آفاق ہے۔ وہ مولوی اسماعیل کے (جو اس گروہ کے پیشوا تھے) مدت العمر مخالف رہے، اور امکان نظیر پیغمبر کے مسئلہ میں ان کی تکفیر کرتے رہے۔ وہ فوت ہوئے تو ان کے بیٹے عبدالحق بحکم ''میراث پدر خواہی علم پدر آموز'' اس کام میں لگے اور اب تک اس خاندان کی زیارت واتباع اس گروہ کی مخالفت کے مدعی موجود ہیں۔''
مولوی عبدالقادر لودہانہ والے بھی اس گروہ کی چال پر نہ تھے۔ وہ تو فوت ہو گئے ہیں۔ ان کے خیالات کا کوئی تجربہ ومشاہدہ چاہیے تو ان کے فرزندوں کو جو اب لودہانہ میں ہیں آ کر دیکھ لے۔ کیسے منبروں پر بیٹھ کر اہل حدیث کی تکفیر کرتے ہیں۔ اس گروہ سے اپنی اور اپنے باپ کی مخالفت ظاہر کر رہے ہیں۔ اس باب میں انہوں نے چند رسائل بھی لکھے ہیں۔ ازاں جملہ ایک رسالہ انتصار الاسلام ہے جس میں اس گروہ کے مسائل مذہبی کا بہت تحقیر وتوہین کے ساتھ ردّ ہے۔ ایک رسالہ ''انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد'' ہے۔ جس میں اس گروہ کو اپنی مسجدوں سے نکال دینے اور اُن کو کافر ومرتد سمجھنے کی وصیت وتاکید فرمائی ہے۔ صوبہ بہار میں اس رسالہ پر عمل بھی ہو چکا ہے جس کا ذکر ہم نے ضمیمہ اشاعت

Marfat.com

السنۃ نمبر 10 جلد 3 میں کیا ہے۔ جس کو اس بیان میں شک ہے وہ ان رسائل کا مطالعہ کرے۔ ایسا ہی مولوی رحمت اللہ اور مولوی سرفراز علی کا حال ہے.......... حاصل مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں میں ایک شخص بھی اہل حدیث کے عمل وعقیدہ پر نہ تھا۔ پھر ان لوگوں کا اس مفسدہ میں شریک ہو جانا اہل حدیث پر الزام قائم ہونے کا باعث کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس بات سے ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ جس مذہب پر وہ لوگ ہیں اس مذہب یا مذہب اہل حدیث کے سوائے اور بھی اسلامی مذاہب کی رو سے مخالفت گورنمنٹ جائز ہے۔ حاشا وکلا ہم کسی مذہب کو اس مخالفت کی تہمت نہیں لگاتے بلکہ مقصود ہمارا اس بات سے صرف اسی قدر ہے کہ ان لوگوں کا فعل (خواہ کسی نیت و سبب سے ہوا ہو) اہل حدیث کا فعل نہیں ہو سکتا۔ رہا یہ امر کہ انہوں نے یہ کام (غدر میں شریک ہونا) کیوں کیا۔ آیا یہ ان کو مذہب کی ہدایت تھی یا کوئی اور وجہ ہوئی۔ اس میں ہم تو یہی کہیں گے (گو ہم ان کے مذہب پر نہیں ہیں) کہ اس فعل میں ان کے مذہب کا دخل نہیں ہے۔ ان کو مذہب نے غدر فساد کی ہدایت نہیں کی بلکہ طمع دنیوی اور بدنیتی نے ان کو یہ جرأت دلائی۔ (چنانچہ مولوی فضل حق کا بہادر شاہ سے ان ایام میں خیر آباد کی سند لکھوالینا) اس دنیا طلبی پر دلیل ہے یا یہ کہ انہوں نے اپنی رائے میں غلطی کی۔ یا کوئی اور وجہ ان کے دماغ میں پیدا ہوئی۔ الغرض ان کو جو ہدایت ہوئی خیال سے ہوئی مذہب سے نہیں ہوئی۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ جو ان دنوں ایک شخص مکلین نامی نے ملکہ معظمہ قیصرہ ہند پر باوجود عیسائی ہونے کے گولی چلائی تھی، اس فعل کو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ مذہب کی ہدایت تھی۔ اس قسم کی وجہ ان لوگوں کے فعل کی پیدا ہو سکتی ہے۔ مفسدہ 1857ء میں شمولیت کا جواب بھی ادا ہوا۔'' (اشاعت السنۃ لاہور: جلد ۵ نمبر ۱)

Marfat.com

یہ اتنا طویل اقتباس ہم نے اس لیے نقل کیا تا کہ معلوم ہو کہ اس زمانہ میں بھی کچھ علماء ایسے تھے جو اپنی ذاتی اغراض یا حکومت سے ڈر کر انگریزوں کی حمایت کر رہے تھے جنہوں نے پہلے تو فتویٰ پر دستخط کر دیئے لیکن جنگ آزادی ناکام ہوگئی تو یہ تاویلیں کرنی شروع کر دیں کہ ہم سے تلوار کی نوک پر دستخط کروائے گئے تھے۔ لیکن کچھ مجاہد علماء ایسے تھے جنہوں نے ببانگ دہل نہ صرف اس انقلابی فتویٰ پر دستخط کیے بلکہ خود بھی میدان جنگ میں کود کر عملی طور پر اس جہاد میں حصہ لیا۔

ان مجاہد علماء میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا حافظ محمد ضامن شہیدؒ کا نام سرفہرست ہے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ان حضرات نے فتویٰ اور اپنے عمل سے معذرت نہیں کی بلکہ اس کی پاداش میں ہر قسم کی صعوبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کیا یہاں تک کہ ملک سے ہجرت کی اور بعض حضرات نے تو مکہ معظّمہ جو دارالامان ہے وہاں جا کر پناہ لی۔ جن میں سرفہرست حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہیں۔

جنگ شاملی:

شاملی جو آج کل سہارنپور سے دہلی شاہدرہ جانے والی چھوٹی لائن کا ایک اسٹیشن ہے اور مردم خیز قصبہ کاندھلہ کے قریب ہے۔ اس قصبہ میں ایک چھوٹی سی گڑھی بھی تھی جو شاید کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہو۔ تھانہ بھون کے مجاہدین نے اس گڑھی پر حملہ کیا۔ یہ علاقہ دہلی سے قریباً چالیس میل کے فاصلہ سے شروع ہونے والا علاقہ ہے۔ یہ علاقہ اب جمنا سے سیراب ہوتا ہے اور کہیں اس کی سرسبز و شاداب وادیاں آب رود گنگا کی فیاضیوں سے ہم کنار ہوتی ہیں۔ اس علاقہ میں آج کل ضلع مظفر نگر اور ضلع سہارنپور کے اضلاع شامل ہیں۔ یہ علاقہ مردم خیز بھی ہے اور انقلاب انگیز بھی۔ اس علاقہ میں کیرانہ، کاندھلہ، شاملی، پھلت، بڈھانہ، دیوبند، جھنجھانہ، نانوتہ، گنگوہ، انبیٹھہ اور کھاتولی وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔ اس علاقہ میں مسلمان تعداد میں کبھی بھی زیادہ نہیں ہوئے، لیکن گذشتہ اڑھائی سو سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ اخلاق و کردار اور ذہنی صلاحیتوں

Marfat.com

کے لحاظ سے ان کا درجہ بلند اور ممتاز رہا ہے۔

10 مئی 1957ء کو میرٹھ کی مسلح افواج نے اپنے فرائض کا احساس کر کے جنگ آزادی کی بسم اللہ شروع کی۔ میرٹھ اور اس کے مضافات کے رہنے والے عوام کی جملہ امکانی امداد نے اُن آزادی پسند افواج کے حوصلے اور بھی بلند کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف ضلع میرٹھ بلکہ ضلع مظفر نگر اور ضلع سہارنپور تحریک آزادی کے مرکز بن گئے۔ سردھنہ خاص میں علماء کرام کا ایک گروہ جو کہ وہابی تحریک میں پیش پیش تھا، مقامی باشندوں کو لے کر جنگ آزادی کے لیے برسر پیکار تھا۔ ایسے ہی کچھ حالات تھانہ بھون، کیرانہ اور دوسرے علاقوں میں تھے۔ تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ ان واقعات میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ شمس العلماء ذکا اللہ خان نے لکھا ہے

> ”سب سے اول مولوی رحمت اللہ کیرانویؒ، کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے؟ وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے ردّ میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلا گیا۔“ (تاریخ عروج سلطنت انگلیشیہ: جلد۳ص ۶۷۵)

شمس العلماء صاحب نے معلوم نہیں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے بارے میں کہاں سے یہ لکھ دیا کہ ان کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی لہٰذا وہ واپس دہلی چلے گئے۔ پھر منشی ذکاء اللہ نے ان کے بارے میں دانشمند کا لفظ بھی لکھ دیا۔ گویا بتانا یہ مقصود ہے کہ جن علماء کرام نے انگریز کے خلاف جہاد کیا وہ دانشمند نہ تھے صرف وہ علماء دانشمند تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد نہ کیا۔ لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ اس لحاظ سے غیر دانشمند ہی تھے کیونکہ حضرت مولانا رحمت اللہؒ مجاہدین جنگ آزادی کی ایک جلیل القدر جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے حالات کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لائے تھے۔ شمس العلماء نے اس جماعت کا نام لینا یا اس کی طرف اشارہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ جماعت علمائے دیوبند کی جماعت تھی اور حاجی امداد اللہؒ کے

Marfat.com

مریدانِ باصفا اور حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے شاگردانِ بے ریا کی جماعت تھی جن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے لوگ شامل تھے۔

ہوسکتا ہے کہ دہلی کے واقعات کو دیکھ کر کچھ عرصہ کے لیے حضرت مولانا کیرانویؒ اس جہاد سے کنارہ کش رہے ہوں، لیکن وہ زیادہ دیر اس جہاد سے کنارہ کش نہ رہ سکے۔ چنانچہ دہلی کے جہاد کے فتویٰ میں بھی آپ کے دستخط موجود ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب جنرل بخت خان اور امیر جماعت مولانا سرفراز علی صاحب نے دہلی پہنچ کر تحریک کو منظم کیا اور انقلابی کاروائیوں میں باضابطہ جہاد کی شکل پیدا ہوگئی۔ اس وقت حضرت مولانا کیرانویؒ نے باقاعدہ مجاہدین کی صف میں داخل ہوکر جہاد کیا۔ اور تحریک جہاد کی ناکامی کے بعد مکہ المکرمہ کی جانب ہجرت فرمائی اور پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے۔

جنگ شاملی کا سبب تاریخ کے رپورٹر کچھ اس طرح بتاتے ہیں کہ انگریزی فوج کے چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جارہے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تھانہ بھون میں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو جہاد کا امیر مقرر کردیا گیا تھا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کے تمام مدارج اور منصوبے طے ہو چکے تھے۔ اب سوال اسلحہ کی فراہمی کا تھا۔ کچھ تو اسلحہ دوسرے شہروں سے منگوایا گیا اس میں قاضی عنایت علی صاحب کا بھی کافی عمل دخل تھا کیونکہ تھانہ بھون کا رئیس ہونے کے ناطے اسلحہ کی خریداری کے لیے مال دولت کی فراوانی بھی ان کے پاس تھی اور اثر و رسوخ بھی۔ کارتوسوں کی پیٹیاں اور وہ بھی دشمنوں کی، مجاہدین نے انہیں مغتنم خیال کر کے قاضی عنایت علی رئیس تھانہ بھون کی سرکردگی میں مجاہدین کی چھوٹی سی جماعت کو لے کر شیر علی کے باغ کی سمت کی سڑک پر جاپڑے اور جس وقت وہ سوار سامنے سے گزرے اُن کا وہ تمام مال و اسباب جس میں کارتوسوں کی وہ پیٹیاں بھی تھیں، حملہ کر کے لوٹ لیا۔ انگریزوں کے تمام سپاہی اس معرکہ میں کام آئے، ایک سوار زخمی ہوکر سمت مشرق جنگل کو بھاگا، مگر تھوڑے فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مرگیا۔

یہ تھانہ بھون کے مجاہدین کی سب سے پہلی حربی کامیابی تھی۔ قاضی عنایت علی صاحب کے ساتھ اس معرکہ میں کون کون حضرات شامل تھے، ان کے نام کہیں نہیں ملتے۔

Marfat.com

لیکن حالات کے تیوروں سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں کچھ بزرگوں کی شمولیت بھی ضرور ہوگی۔
یہ گویا تمہید تھی اس جنگ شاملی کی جس میں حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ اور ان کے مریدان باصفا کی شمولیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس باغ شیر علی کی سڑک والے واقعہ کی خبر فوری طور پر مظفر نگر پہنچی تو حاکم ضلع کی جانب سے کسی تاخیر کے بغیر فوج کشی کا حکم ہوا۔ شاملی کی جانب انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر پا کر تھانہ بھون میں نقارہ بجا دیا گیا اور جتھے کا جتھا شاملی پر چڑھ دوڑا۔
یہ بات کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ تھانہ بھون اور کیرانہ کے مجاہدین نے جن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ وغیرہ حضرات شامل تھے، شاملی کے محاذ پر انگریزوں کے خلاف جنگ کی۔

اگرچہ گڑھی شاملی پر حملہ کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور تاریخ کے رپورٹروں نے اسی کو اصلی وجہ قرار دیا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تلمیذ خاص نواب محی الدین خان مراد آبادی کے والد ماجد نواب شیر علی خان حضرت نانوتویؒ کے معتقد اور بادشاہ دہلی بہادر شاہ ظفر کے مصاحب خاص اور معتمد علیہ تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے نواب صاحب کی معرفت بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کو جہاد اور استخلاص وطن و ملت کی جنگ پر آمادہ فرمایا۔ غرض یہ تھی کہ بادشاہ دہلی انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت استعمال کر کے دہلی کو انگریزوں سے پاک کرنے کی کوشش کریں۔ اور ہم تھانہ بھون، کیرانہ ،شاملی اور دوسرے نواحی علاقوں سے جہاد کر کے دہلی کی طرف بڑھیں گے۔ اگر صحیح اصول پر دوطرف سے یہ حملہ اور دفاع عمل میں لے آیا گیا تو دہلی کا آزاد ہو جانا عین ممکن ہے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ بھون، کیرانہ اور دوسرے علاقوں کی طرف سے شاملی پر حملہ نہ صرف شاملی پر حملہ تھا بلکہ یہ اقدام درحقیقت پایۂ تخت دہلی تک پہنچنے کے لیے کیا گیا تھا۔
چنانچہ سرفروشان دین سروں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر ایک منظم اور مضبوط طاقت سے ٹکرانے کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون اور کیرانہ سے شاملی کی گڑھی کی طرف مارچ شروع کیا جن کا نصب العین اور اصل مقصد دہلی تھا۔

Marfat.com

تھانہ بھون اور کیرانہ کا فاصلہ شاملی سے کوئی زیادہ نہیں۔ ان دونوں جگہوں سے مجاہدین کے جتھے بآسانی گڑھی شاملی پہنچ گئے۔ ان جتھوں میں جہاں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ (۱) اور چوہدری عظیم الدین تھے وہاں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ اور ان کے ساتھی حافظ محمد ضامن شہیدؒ اور حاجی صاحب کے شاگردان عظام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد منیر نانوتویؒ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت رحمت اللہ کیرانویؒ نے کیرانہ کے مورچہ پر انگریزوں کا مقابلہ کیا، لیکن حضرت مولانا محمد سلیم کیرانویؒ مہتمم مدرسہ صولتیہ، مکۃ المکرمہ کا بیان ہے کہ

> ''پرگنہ کیرانہ وشاملی میں زمیندارہ شیوخ اور مسلمان گوجروں کے ہاتھ میں تھا جن میں دینداری کے ساتھ جوش بھی موجود تھا۔ تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا۔ پرگنہ کے چاروں طرف اس مجاہدانہ

۱۔ نانوتہ، کیرانہ، کاندھلہ اور ضلع مظفر نگر کے دوسرے قصبوں کے لوگوں کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں بلکہ اب بھی ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے مابین بھی عزیز داری اور رشتہ داری کے تعلقات قائم تھے۔ چنانچہ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی نے لکھا ہے کہ

''اس خاندان کے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ سے روحانی اور ایمانی تعلق کے علاوہ رشتہ داری کا تعلق بھی قائم تھا۔ حضرت مفتی الٰہی بخش کی صاحبزادی کی نواسی حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی اہلیہ تھیں اور حضرت حافظ صاحب کی بھتیجی حضرت مولانا مظفر حسین کی اہلیہ تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی نسلی رشتے ان بزرگوں سے قائم تھے اور قصبہ تھانہ بھون کے جن مجاہدین نے نمایاں طور پر 1857ء کی جنگ آزادی میں، سرفروشی کی، سب کے ساتھ رشتہ داری تھی، قرابت و یگانگت تھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ مہاجر مکی (جنہوں نے کیرانہ سے علم جہاد بلند کیا) سے بھی رشتہ اور قرابت کے تعلقات وابستہ تھے اور وہ اتحاد و یگانگت تھی جس کی بنا پر ایک ہی خاندان شمار ہوتا تھا۔'' (حالات مشائخ کاندھلہ:۱۶۱)

اس قرابت داری کی وجہ سے بھی ان بزرگوں نے کیرانہ اور شاملی کے محاذوں پر مل کر جنگ لڑی۔

تحریک کا اثر عام ہو چکا تھا۔ تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور مولوی عبدالحکیم صاحب تھانوی مع رفقاء اور نواح کیرانہ میں حضرت مولانا مرحوم گورہ فوج کا مقابلہ کر رہے تھے۔ مجاہدین کیرانہ میں چونکہ مسلمان گوجر زیادہ تھے اس لیے ان کی قیادت چوہدری عظیم الدین حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ کر رہے تھے۔ (انقلاب کے بعد چودھری عظیم الدین مکہ معظّمہ حضرت مولانا مرحوم کے پاس آ گئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا)۔ اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم و تربیت کے لیے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا اور اعلان ہوتا تھا

''ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا۔''

اس جملہ کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا تھا وہ عوام کو سنایا جاتا۔ اس پرانی آواز کو سننے والوں میں سے اب کوئی نہیں رہا، مگر جنہوں نے اپنے بزرگوں سے اس کی صدائے بازگشت سنی ہے وہ اب تک موجود ہیں۔''

حضرت مولانا محمد سلیم کیرانویؒ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کیرانہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ قدس سرہ کا اچھا خاصا اثر تھا۔ اتنا اثر تھا جتنا اثر دہلی میں بادشاہ دہلی بہادر شاہ ظفر کا تھا، کیونکہ اس قسم کا اعلان اس کا دہلی میں ہوتا تھا۔ اس بات کو کچھ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح تھانہ بھون میں حضرت حاجی صاحبؒ کو امیر المؤمنین بنایا گیا تھا اور تھانہ کے بزرگان دین نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، کچھ اسی طرح کی حیثیت کیرانہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کی تھی۔

حضرت مولانا کے اس عمل اور اس مجاہدانہ جذبہ سے ان کا ایثار اور استخلاص وطن کے لیے ان کے جذبۂ جہاد کا پتہ چلتا ہے اور اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا کوئی بکاؤ مال نہ تھے کہ غیر ملکی حکومت انہیں خرید سکتی۔ انہوں نے دین کی خاطر اپنا سب کچھ تج دیا لیکن سرزمین پاک و ہند کے ان غاصبوں کی حکومت کو برداشت نہ کیا۔

دوسرے تمام علماء کے مقابلہ میں میرے خیال کے مطابق حضرت مولانا رحمت

Marfat.com

اللہ کیرانویؒ انگریز کی خباثتوں کو زیادہ جانتے تھے۔ کیونکہ جنگ آزادی سے تین چار سال قبل وہ پادری فنڈر اور دوسرے انگریز پادریوں سے عظیم الشان مناظرہ بھی کر چکے تھے۔ اس مناظرہ کے علاوہ ایسے بھی انگریز پادریوں سے آپ کو واسطہ پڑتا رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ انگریزوں کی اندرونی خباثتوں سے واقف و آشنا تھے، لہٰذا انہوں نے نہایت شدید جذبۂ حریت کے ساتھ اس عملی جہاد میں حصہ لیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ کیرانہ اور تھانہ بھون کا محاذ ایک ہی تھا اور دونوں جگہ پر ایک ہی جیسے بزرگ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے۔ اگر ایک طرف حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تھے تو دوسری طرف حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (1) جو بعد

ا۔ حضرت حاجی صاحبؒ کا اصل نام "امداد حسین" تھا جب آپ 1260ھ میں جب کہ آپ کی عمر قریباً 20 سال تھی، حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت مولانا شاہ محمد اسحاقؒ نے آپ کا نام امداد حسین سے "امداد اللہ" رکھ دیا۔ آپ نسبتاً فاروقی تھے اور وطناً تھانوی۔ اس وجہ سے مؤرخین آپ کو فاروقی تھانوی لکھتے ہیں۔ آپ 1233ھ بمطابق 1818ء میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے قصبہ نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ جہاں آپ کی ننہال تھی۔ آپ کی فطری صلاحیتوں کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا بیان ہے کہ "آپ کی طبیعت عالمانہ رنگ کی نہ تھی۔ آپ حضرت سید احمد شہیدؒ سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ سید صاحبؒ کا نمونہ تھے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے آبائی وطن میں پائی۔ پھر آپ دہلی تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے مولانا شیخ محمد قلندرؒ اور مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کو آپ کے اساتذہ میں سے لکھا ہے۔ دہلی کے بہت سے مکتبوں اور مدرسوں میں حضرت مولانا نصیرالدین صاحب دہلویؒ کی بھی ایک درس گاہ تھی جہاں ظاہری علم کے ساتھ ساتھ عشق و معرفت کا درس بھی دیا جاتا تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور بعض دیگر حضرات کے بیان کے مطابق نوجوان "امداد اللہ" نے جس طرح مولانا نصیرالدین کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ سی پارۂ دل کے اوراق بھی اسی استاذ کے سامنے کھول دیئے چنانچہ مولانا تھانویؒ کے مطابق "حضرت حاجی صاحبؒ" نے فرمایا کہ ظاہر میں اول بیعت میری طریقہ نقشبندیہ میں حضرت نصیرالدین صاحب دہلویؒ خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق صاحبؒ سے ہوئی اور باطن میں بلاواسطہ خود رسول اللہ ﷺ سے اس طرح ہوئی کہ

Marfat.com

میں بھی مکہ مکرمہ میں مولانا رحمت اللہ کے ساتھ رہے اور اللہ کی شان کہ دونوں کی قبریں

﴿حاشیہ صفحہ گذشتہ﴾ میں نے دیکھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں اور حضرت سید احمد شہید کا ہاتھ آپ کے دست مبارک میں ہے اور میں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب کے دور کھڑا ہوں۔ حضرت سید صاحبؒ نے میرا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں دے دیا۔

حضرت مولانا امداد اللہؒ ابھی درجہ وسطی کی کتابیں پڑھ رہے تھے کہ حضرت مولانا نصیر الدین صاحب کے جہادی قافلے نے 3 ذی الحجہ 1250ھ بمطابق 2 اپریل 1838ء کو اپنا کوچ شروع کر دیا۔ حضرت الاستاد کے اس سفر نے دل و دماغ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ کتابوں کی ورق گردانی بار خاطر معلوم ہونے لگی۔ پانچ سال کے بعد کے بعد حضرت مولانا نصیر الدین صاحبؒ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کے خسر اور تحریک کے راہ نما حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلویؒ نے ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ کو تحریک کا مرکز بنایا۔ لیکن ہندوستان کے سیاسی مرکز یعنی دار السلطنت میں ایک نظام رکھنے اور ترقی دینے کی پھر بھی ضرورت تھی جس کے لیے ایک بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس بورڈ کا صدر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی کو بنایا گیا۔ اس بورڈ کے خصوصی ارکان مولانا قطب الدین دہلوی، حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ اور حضرت مولانا عبدالغنی تھے۔ لکھا ہے کہ جب 1261ء میں حضرت حاجی صاحبؒ پہلی بار حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت مولانا شاہ محمد اسحاقؒ نے حضرت حاجیؒ صاحب کو اسی کام کے لیے مقرر فرما دیا، اور ایک جمع کبیر اور جماعت کثیر آپ کے گرد جمع ہو گئی۔ اس جماعت کثیر اور جمع کبیر میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، علامہ فیض الحسن سہارنپوریؒ، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حضرت مولانا محمد منیر نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد مظہرؒ جیسے اکابر شامل تھے۔

1857ء کا ہنگامہ جس طرح انگریزوں کے حق میں اچانک تھا اسی طرح انقلابی جماعتوں کے حق میں بھی وہ دفعتاً تھا۔ جو لوگ کسی جماعت سے منسلک نہیں تھے ان کے لیے یہ آسان تھا کیونکہ وہ بغیر کسی سوچ و بچار کے اس جنگ آزادی میں شرکت یا علیحدگی کا فیصلہ کر سکتے تھے لیکن جو لوگ اپنی زندگی کسی نظام سے وابستہ کیے ہوئے تھے ان کے لیے جلد بازی درست نہیں تھی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جماعت کہلانے والے لوگوں کے پاس جب رمضان المبارک کے آخر میں انقلاب دہلی کی خبر پہنچی

بھی ایک ہی احاطہ میں ہیں۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو حضرت حاجی

﴿بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ﴾ تو غور وخوض کا ایک اہم موضوع ان کے سامنے آیا جس کے لیے ہنگامی اجلاس ضروری تھا۔ چنانچہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو نانوتہ سے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو گنگوہ سے، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ان دنوں سہارنپور تھے لہٰذا ان کو وہاں سے طلب کیا گیا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو کیرانہ سے بلایا اور آپ کو تحریک کی حقیقت ونوعیت معلوم کرنے کے لیے دہلی بھیجا گیا، چنانچہ مئی کے آخر یا جون کے شروع میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ دہلی پہنچے۔ اس وقت تک تحریک بوڑھے بادشاہ اور ناز پروردہ شہزادوں کی ناتجربہ کاریوں کے حوالے تھی۔ انقلابی سپاہیوں نے بے شک زمام قیادت انہیں کے حوالہ کی تھی، لیکن کسی سنجیدہ یا اصولی جماعت کے لیے ان پر اعتماد کرنا بہت مشکل تھا۔ اس وقت جو بدنظمی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی، اس کو دیکھ کر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو وہی فیصلہ کرنا چاہیے تھا جس کا ذکر ہم نے گذشتہ صفحات میں منشی ذکاء اللہ خان کے حوالہ سے کیا ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے قریباً ڈیڑھ سال انبالہ، تنگری اور پنجلاسہ وغیرہ ضلع مظفر نگر، ضلع سہارنپور اور ضلع انبالہ کے دیہات میں گذارا۔ 1276ھ میں ہجرت مکۃ المکرمہ کی نیت سے روانہ ہوئے۔ سندھ کے راستہ سے کراچی پہنچے اور وہاں سے بحری جہاز کے ذریعہ مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس سفر کے بہت عجیب وغریب واقعات تاریخ کے رپورٹروں نے بتائے ہیں، اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے۔ غیبی امداد اور خداوندی تحفظات کے زیر سایہ آپ مکہ مکرمہ پہنچے۔ وہاں آپ نے زہد وتقویٰ، ریاضت ومجاہدہ اور توکل علی اللہ کی وہ مثال قائم کی کہ نہ صرف عجم، بلکہ عرب نے بھی آپ کے سامنے گردن عقیدت خم کردی کہ آج دنیائے اسلام کا ہر ذی علم شخص آپ کو شیخ العرب والعجم کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔

آپ خلقت کے لحاظ سے ضعیف ونحیف اور دبلے پتلے تھے لیکن روحانی قوت میں ایک پہاڑ سے بھی زیادہ ثابت قدم۔ آخر 12 جمادی الآخرہ 1317ھ بمطابق 19 اکتوبر 1899ء بروز بدھ بوقت صبح اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرمایا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ اور مکہ مکرمہ کے قبرستان جنت المعلی میں دفن ہوئے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بھی اسی احاطہ میں دفن ہیں۔

امداد اللہ صاحب نے دہلی بھیجا تھا۔[1] ہوا یوں کہ رمضان المبارک کے اواخر میں جب تھانہ بھون اور اس کے نواحی علاقوں میں انقلاب دہلی کی خبر پہنچی اور پتہ چلا کہ میرٹھ کی باغی فوجیں یہاں شہر پر قبضہ کرنے کے لیے آئی ہیں، تو حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے اس اہم موضوع پر غور وخوض کرنے کے لیے علماء کا ایک ہنگامی اجلاس بلایا۔ علماء کو ان کے نواحی قصبوں سے اس اجلاس میں شرکت کے لیے بلایا گیا، چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نانوتہ سے اور حضرت مولانا مولانا رشید احمد گنگوہی کو گنگوہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کو سہارنپور سے تشریف لائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو بھی کیرانہ سے بلایا گیا ہوگا۔ کیونکہ کیرانہ تھانہ بھون سے کوئی دور نہیں تھا۔ دوسرے حضرت مولانا کیرانویؒ کوئی معمولی شخصیت نہ تھے۔ عذر سے تین چار سال قبل کے مناظرہ نے جو انہوں نے پادری فنڈر کے ساتھ کیا تھا، آپ کی شہرت کو بال و پر لگا دیئے تھے اور دو تین سالوں میں پورے ہندوستان میں آپ کا طوطی بولنے لگا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس قدر با اثر عالم دین کو حضرت حاجی صاحبؒ اپنے اس اہم اجلاس میں شرکت کے لیے نہ بلائیں۔ تاریخ کے رپورٹر یہ تو بتاتے ہیں کہ حضرت مولانا کیرانویؒ کو تحریک آزادی کی حقیقت ونوعیت معلوم کرنے کے لیے دہلی بھیجا گیا۔ مئی کے آخر یا جون کے شروع میں حضرت مولانا کیرانویؒ دہلی پہنچے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ جس وقت دہلی پہنچے اس وقت دہلی کی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ ایک افراتفری کا عالم تھا۔ تحریک بوڑھے بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور ناز پروردہ شہزادوں کی نا تجربہ کاریوں کے حوالہ تھی۔ انقلابی سپاہیوں نے دہلی میں داخل ہوکر اپنے کو بے یارومددگار پایا۔ خود ان میں اتنی اہلیت نہیں تھی کہ وہ تحریک منظم کرسکیں اور انہیں کوئی دوسرا شخص نہ ملا جو اس تحریک تشکیل و

ا۔ یہ عین ممکن بھی ہے کیونکہ دہلی کے علمی طبقے اور خصوصاً لال قلعہ کے شہزادوں پر مولانا رحمت اللہؒ کی علمی قابلیت اور ردنصاریٰ میں وسیع معلومات اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی روحانیت کا اثر تھا اور یہ لوگ ان دونوں حضرات کے معتقد اور مرید تھے۔ چنانچہ ولی عہد مرزا فخرو کے حکم سے آگرہ کے مناظرہ کی روئیداد ''البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف'' طبع ہوئی تھی اور اسی کے حکم سے ہندوستان کے اطراف واکناف میں اس کی اشاعت ہوئی۔

Marfat.com

تنظیم کر سکے۔ لہٰذا بامر مجبوری بوڑھے بادشاہ کو یہ تکلیف دی گئی، لیکن کسی سنجیدہ یا اصولی جماعت کے لیے ان پر اعتماد بہت مشکل تھا۔ اس بد نظمی اور افراتفری کی حالت کو دیکھ کر حضرت مولانا رحمت اللہ کو وہی فیصلہ کرنا چاہیے تھا جو منشی ذکاء اللہ خان نے لکھا ہے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی اس رپورٹ اور اس فیصلے سے علمائے ابرار اور مردان احرار جن کے دلوں میں اس اجنبی اور جابر حکومت سے نجات اور حریت کاملہ کی آرزوئیں سالہا سال سے انگڑائیاں لے رہی تھیں، نہایت دکھ ہوا۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کو دہلی بھیجتے وقت ان کے دماغوں نے خدا جانے کتنے نقشے بنائے اور بگاڑے۔ مستقبل کے کیا کیا خوشگوار منصوبے ان کے کوزۂ ذہن میں تراشے گئے، لیکن حضرت مولانا کیرانویؒ کے فیصلے نے ان کے سارے منصوبوں اور ان کی ساری امیدوں پر گویا پانی پھیر دیا۔ ان کے دل بجھ گئے، آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ ان کے لیے یہ فیصلہ افسوس ناک بھی تھا اور تکلیف دہ بھی کہ ایسے وقت جب کہ فضا اس قدر ہموار اور ماحول اتنا سازگار ہو، پورا ملک سربکف اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے رہیں، اور موسم کی خوشگوار تبدیلی سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں، لیکن جس شریعت غرا اور جس پاک تعلیم کی روشنی میں وہ آگے قدم بڑھا سکتے تھے اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ جو قدم بھی بڑھایا جائے وہ نظم وضبط، سنجیدگی اور قانون کی پوری پابندی کے ساتھ آگے بڑھے۔

بہرحال اس فوری اور پہلے اجلاس میں یہ تو طے ہو گیا کہ معاملہ بڑے نظم وضبط کا متقاضی ہے۔ حالات بڑے سازگار ہیں لیکن مرکز کی افراتفری پریشان کن تھی، لہٰذا وہ جماعتی نظم جو اب تک ایک اصلاحی یا سیاسی پارٹی کی حیثیت رکھتا تھا، اب اس نظام کو حکومت کی شکل دے دی جائے گی۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ امیر اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حافظ محمد ضامن شہیدؒ اور مولانا محمد منیر نانوتویؒ جیسے زعماء اور اکابر کو فوج، حفاظت، فصل خصومات اور عدل و قانون وغیرہ کے شعبے سپرد کیے گئے اور اس موقع پر یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ خود بادشاہ کو بھی ضبط ونظم قائم کرنے اور اس جیسے نظام میں داخل ہونے کا مشورہ دیا جائے۔ چنانچہ نواب شیر علی خان کو جو بادشاہ کے منہ چڑھے اور بے تکلف مصاحب تھے، اسی مقصد کے لیے دہلی بھیجا گیا۔

Marfat.com

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے دہلی سے واپس آ کر تحریک کی جو صورت حال بیان کی تھی اس کے پیش نظر خیر خواہی ملک وملت کے بلند جذبات کا بھی یہی تقاضا تھا کہ جس طرح ممکن ہو بادشاہ کو نیک مشورے دیئے جائیں اور ایسی باتوں کی فہمائش کی جائے جو غلبہ وکامیابی ورنہ کم از کم اخروی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن سکیں۔

چنانچہ حالات کے دھارے میں بڑی جلدی تبدیلی آئی۔ 2 جولائی 57ء کو جنرل بخت خان اپنی منظم اور باضابطہ فوج لے کر دہلی پہنچ گئے۔ مولانا سرفراز علی صاحب امیر جماعت کی حیثیت سے اُن کے ساتھ تھے بلکہ جنرل مذکور کی سرپرستی اور راہ نمائی فرما رہے تھے۔

جنرل بخت خان (1) نے صرف فوجوں کو ہی منظم نہیں کیا بلکہ نظم وضبط کو اس

ا۔ جنرل بخت خان جس کا اس تحریک میں اچھا خاصا کردار ہے اور جو دہلی کے محاذ پر شہاب ثاقب بن کر چمکا اور ایسا چمکا کہ اس کی داستان سرفروشی میں دلچسپ و دلگیر ہے تو صرف اسی کی کارگزاری اور معرکہ آرائی۔ اس کی زندگی کا آغاز اور انجام دونوں پردۂ اخفا میں ہیں۔ خود بخت خان نے بادشاہ دہلی کو اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا، چنانچہ منشی جیون لال نے لکھا ہے کہ

"بادشاہ نے جنرل کو بنج میں باریابی دی۔ جنرل نے کہا میں بھی آپ کے خانوادہ سے ہوں۔ اطمینان کی غرض سے آپ تحقیق فرما سکتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا: تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ اس وقت جنرل سے اور کوئی بڑا بہادر موجود نہیں ہے۔ جنرل نے جواب میں عرض کیا "میں بہادر کے خطاب کا مستحق ہو جاؤں گا اگر میں دہلی اور میرٹھ سے انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔" (روئیداد منشی جیون لال مورخہ ۲ جولائی)

اسی منشی جیون لال نے ۱۱ جولائی ۱۸۵۷ء کے روزنامچہ کی روئیداد میں لکھا ہے کہ:

"بخت خان نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں سلطان پور علاقہ لکھنؤ کا باشندہ ہوں اور اودھ کے شاہی خاندان سے میری رشتہ داری ہے۔ میری درخواست ہے کہ اس بیان کی تصدیق فرمائی جائے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ تصدیق کی ضرورت نہیں۔ آپ یقیناً شریف ونجیب خاندان سے ہیں۔ جنرل نے پھر عرض کیا میں تصدیق پر اس وجہ سے زور دے رہا ہوں کہ جب انگریزوں کو دہلی، آگرہ اور میرٹھ سے نکال دیا جائے گا تو میں اعزاز کے امتیازی نشان کے لیے استدعا کروں گا۔"

Marfat.com

معیار پر لانے کی کوشش کی جو اسلامی تعلیم کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اور ایسے مواقع پر جو شرعی مطالبات ہو سکتے تھے ان کو پورا کرنے کے لیے جامع مسجد دہلی میں علمائے کرام کا اجتماع کیا گیا۔ تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ ضلع مظفر نگر، ضلع سہارنپور یعنی علاقہ تھانہ بھون کے علمائے کرام 57ء کی تحریک کے سلسلہ میں دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں جامع مسجد دہلی میں بادشاہ سے ملاقات کی اور اس سے عہد و معاہدے کیے۔ پھر ایک فتویٰ مرتب کیا گیا جس میں لوگوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کی ترغیب دی گئی۔ اس فتویٰ کا متن گذشتہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔ اس فتویٰ پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے بھی دستخط تھے جو پہلے تو صرف تحقیق حال کے لیے تشریف لائے تھے، لیکن اب اپنی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے اس اجتماع میں شرکت کے لیے تشریف

﴿بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ﴾ ان دونوں اقتباسات میں نہ ولدیت کا ذکر ہے اور نہ خاندان کا تذکرہ اور نہ رشتہ داری کی تفصیل۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل سیدہ رئیس فاطمہ بریلوی نے مفتی انتظام اللہ شہابی کے حوالہ سے یوں نقل کی ہے:

''اس سلسلہ میں سب سے بڑی اہم شہادت نواب دوندے خان کی پڑپوتی چندا بیگم کی ہے۔ ان سے معلوم ہوا کہ غلام قادر روہیلہ شہید سے ان کی قرابت قریبہ تھی، اور خاندان روہیلہ سے تھے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ خان تھا۔ والی رُوہیل کھنڈ حافظ الملک رحمت خان کا خاندان جب انگریزوں اور شجاع الدولہ کے مظالم کا شکار ہو کر برباد ہوا تو غلام قادر خان کا خاندان بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس انتشار میں جس کا جدھر منہ اٹھا چلا گیا۔ چنانچہ بخت خان کے والد مع اہل خاندان اودھ کے موضع سلطان پور میں بس گئے۔ نواب عبداللہ خان روہیلہ جو خوبصورتی اور بہادری میں منفرد زمانہ تھے، شجاع الدولہ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہ کا مرکز بن گئے، اور اس معتوب روہیلہ سردار کی نوابان اودھ سے قرابت داری ہو گئی۔''

(۱۸۵۷ء کے ہیرو: ص ۵۶،۶۶)

اس بیان سے بخت خان کے بارے میں کچھ معلومات فراہم ہوتی ہیں لیکن پھر بھی کچھ سوالات تشنۂ جوابات رہ جاتے ہیں۔

تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ خود بخت خان انگریزی فوج میں بھرتی ہو گئے اور جنگ افغانستان میں شریک ہوئے۔ افغانستان سے واپسی پر آپ فوج کی ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔

Marfat.com

لائے تھے اور وہاں علماء کی بحث وتمحیص اور غور وفکر کے بعد اس فتوے پر دستخط کیے تھے۔
دہلی کے حالات درست ہونے کے بعد اب پھر تھانہ بھون میں علماء کا اجتماع ہوا

﴿بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ﴾ پھر حضرت مولانا سرفراز علی صاحب کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ اور جس طرح مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے مرشد طریقت نے بیعت کے وقت انگریزوں سے جہاد کرنے کا عہد لیا تھا، یہ مولانا سرفراز علی صاحبؒ بھی بیعت جہاد ہی لیا کرتے تھے۔ اس بیعت جہاد کی آزمائش کا وقت بھی جلد ہی آ گیا، چنانچہ جیسے ہی بریلی میں نواب بہادر خان نے علم آزادی بلند کیا تو بخت خان اس کے دست وباز و تھے۔ دہلی چونکہ مرکز تھا اور مرکز ہر طرح سے امداد کا محتاج تھا، لہٰذا بریلی کی بغاوت کے بعد ایک لشکر جرار لے کر بخت خان دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ منشی جیون لال کی رپورٹ کے مطابق

''یکم جولائی ۱۸۵۷ء محل (لال قلعہ) میں خبر آئی کہ بریلی کی فوج جمنا کے کنارے آ پہنچی ہے۔ چونکہ پل خراب ہو چکا تھا اور اُس پر سے گزرنے کی صورت نہ تھی، لہٰذا بادشاہ نے چار سوقلیوں اور سفر مینا کی دو کمپنیوں کو میر فتح علی کی سرگردگی میں پل کی درستی کے لیے بھیج دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ صبح تک فوج پل پر سے گزر سکے گی۔ بادشاہ نے احمد قلی خان (زینت محل کے باپ) کو اس فوج کے استقبال کا حکم دیا۔

۲ جولائی کو احمد قلی خان استقبال کے لیے گئے۔ حکیم احسن اللہ خان۔ جرنیل عبدالصمد خان، ابراہیم علی خان، غلام علی خان اور دوسرے اصحاب بھی ساتھ تھے۔ احمد علی خان اور بخت خان نے بارگاہِ شاہی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جہاں ارشاد ہو فوج متعین کر دی جائے۔

بخت خان نے سپہ سالار کی حیثیت سے اپنی خدمات بادشاہ کو پیش کیں جو قبول کر لی گئیں۔ چنانچہ سب صوبیداروں نے بخت خان کے ہاتھ پر اطاعت کے حلف اٹھائے۔ پھر بادشاہ سلامت نے عبدالرحمٰن خان والی ججر کو حکم ہوا کہ کالا محل بخت خان کی فوج کے لیے خالی کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی پھر بخت خان نے شہزادہ مرزا مغل سے ملاقات کی۔

پھر بخت خان کو ایک ڈھال اور ایک تلوار کے علاوہ جنرل کا خطاب دیا گیا اور اُسے تمام افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا گیا۔ منادی کرادی گئی کہ تمام رجمنٹوں کے افسر محمد بخت خان سے ہدایات حاصل کریں۔ مرزا مغل کو ایڈجوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا۔ جنرل بخت خان نے عرض کیا کہ اگر شہزادوں نے لوٹ مار کی کوشش کی تو میں اُن کے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔ فرمایا تمہیں پورا اختیار ہے۔ جس کام میں بہتری نظر آئے وہی کرو۔ اس فرمان کے مطابق شہر کے کوتوال کو اطلاع دے دی گئی کہ اب اگر لوٹ مار ہوئی تو لوٹنے والوں کو پھانسی دے دی جائے گی۔ (روزنامچہ منشی جیون لال ۲ جولائی کی روئیداد)

Marfat.com

تا کہ حالات کی تبدیلی کے پیش نظر انگریزوں کے خلاف جہاد کے مسئلہ پر غور وخوض کیا جائے۔اب اجلاس شوریٰ میں تمام حاضر ارکان نے راست اقدام کا فیصلہ کیا اور دہلی والے فتویٰ کی تصدیق وتوثیق کی جس پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے بھی دستخط تھے۔

تھانہ بھون کے اس دوسرے اجلاس میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی

﴿حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ﴾ بدرالدین خان دہلی میں بہت اچھی مہریں بناتا تھا۔ ۷ اگست کو اس کے نام بادشاہ کا فرمان جاری ہوا کہ ''ایک بہترین وضع کی مہر تیار کر کے پیش کرو۔ اس پر بخت خان کے تمام خطابات کندہ ہوں یعنی معزالدولہ مابدولت کا بندۂ خاص، محمد بخت خان، لارڈ گورنر بہادر، ناظم جملہ امور فوجی و دیوانی۔'' اور دستور کے مطابق اس پر سن جلوس اکیس درج ہو۔'' (بہادر شاہ کا مقدمہ انگریزی: ص ۳۱، ۶۸)

جنرل صاحب کو جب دہلی میں ناکامی ہوئی تو وہ ۱۹ ستمبر کو دہلی سے نکلے اور اپنی فوج کے ساتھ لکھنؤ کا رخ کیا۔ جہاں پہنچتے پہنچتے اُن کے ہمراہ صرف پانچ ہزار فوج، ۳۳ عورتیں نیز دلی فرخ آباد کے کچھ لوگ باقی رہ گئے۔ لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو بخت خان مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے ہمراہ شاہجہانپور چلے گئے۔ اس کے بعد بخت خان کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔

بخت خان کے بارے میں مفتی انتظام اللہ شہابی کا بیان ہے:

''سید احمد بریلویؒ کے مریدین میں سے رئیس المجاہدین مولوی سرفراز علی گورکھ کے اضلاع میں انگریزوں کے خلاف ایک عرصہ سے خفیہ طور پر بیعت جہاد لے رہے تھے۔ وہ دورہ خود بھی کرتے اور اپنے خلفاء کو بھی دیہاتوں میں بھیجتے تھے۔ چنانچہ جب سلطان پور پہنچے تو ایک صوبیدار بخت خان نواب دوندے خان کے خاندان سے تھا جس کے والد نے نواب شجاع الدولہ (لکھنؤ) کے خاندان میں شادی کر لی تھی۔ وہ مولوی سرفراز علی کا مرید ہوا اور اُس نے بیعت جہاد کی۔'' (ابوظفر بہادر شاہ: ص ۴۱)

بخت خان نہایت سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ لباس بھی سادہ تھا اور مزاج بھی سادہ چنانچہ سید ظہیر دہلوی نے لکھا ہے:

''سر پر انگوچھا لپٹا ہوا۔ کرچ گلے میں پڑی ہوئی۔ پیچھے حال کھلا۔ بریلی والا جرنیل وہی تھا۔ ظاہر تو اس کا لباس گھس کھدوں کا تھا۔ میں تو سمجھا جیسے اور پوربی سپاہی ہیں یہ بھی سپاہی ہوگا ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شرکت کا پتہ نہیں چلتا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ اس میں شریک نہ ہوئے ہوں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جس فتویٰ کی اس اجتماع میں توثیق کی گئی اس کی تصدیق اس سے قبل حضرت مولانا کیرانویؒ دہلی میں کر چکے تھے۔

اس دوسرے اجتماع کے کچھ حالات گذشتہ صفحات میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ حکومت کی تنظیم و تشکیل کے بعد جس میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کو امیر بنایا گیا تھا، سب سے پہلا سوال یہ اٹھایا گیا کہ اقدام کس طرف ہو۔ ظاہر ہے کہ دہلی کا مرکز ہی قبلہ نما بن سکتا تھا، چنانچہ سرفروشان دین و وطن سر ہتھیلی پر رکھ کر ایک منظم غیر ملکی طاقت سے ٹکرانے کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے شاملی کی طرف مارچ شروع کر دیا جس کا نصب العین دہلی تھا۔

شاملی کی طرف اقدام کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ مہار سنگھ رئیس شاملی نے جو علم آزادی بلند کیا تھا اس کو کمک کی شدید ضرورت تھی۔ اس مہار سنگھ نے خط و کتابت کے ذریعہ اور آدمی بھیج کر بھی دربار دہلی سے تعلقات قائم کر لیے تھے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ تھانہ بھون کے جن حضرات پر مشتمل تشکیل حکومت کی گئی ان حضرات سے لوگ بہت متاثر تھے۔ ان کی خدا ترسی اور دین داری کی وجہ سے لوگوں کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ ان حضرات کے تلامذہ اور مریدین کے علاوہ عوام الناس بھی ان کے بہت معتقد تھے، لہٰذا نہایت قلیل عرصہ میں جوق در جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ اس وقت تک چونکہ ہتھیاروں پر پابندی نہیں تھی اس لیے عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار تھے جن کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن یہ ہتھیار پرانی قسم کے تھے۔ بندوقیں توڑے دار تھیں۔ کارتوسی رائفلیں نہ تھیں۔ اس قسم کی رائفلیں صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور تھانہ بھون، کیرانہ اور اطراف میں حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے۔ اسی حکومت کی طرف سے جامع مسجد کیرانہ کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا اور اعلان ہوتا تھا

"ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا"

انگریزوں کے پاس چونکہ جدید اسلحہ تھا اور یہی اسلحہ ان کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ تھی، لہٰذا مجاہدین یہ اسلحہ کسی نہ کسی طریقے سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اسی سوچ میں تھے کہ خبر آئی کہ سہارنپور سے شاملی کو توپ خانہ بھیجا گیا ہے۔ مخبروں نے بتایا کہ وہ توپ خانہ ایک پلٹن لا رہی ہے۔ رات کو یہاں سے گزرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی، کیونکہ جو ہتھیار ان مجاہدین کے پاس تھے وہ تلواریں، توڑے دار بندوقیں اور برچھے وغیرہ تھے مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی، لہٰذا فکر ہوئی کہ توپ خانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔ مجاہدین کو فکر مند دیکھ کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فرمایا ''فکر مت کرو۔''

سڑک ایک باغ کے کنارے گزرتی تھی۔ منصوبہ بنایا گیا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی امداد اللہؒ نے افسر مقرر کر دیا۔ آپ اپنے ماتحتوں کو لے کے باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم دیا کہ پہلے سے تیار رہو۔ جب میں حکم کروں سب ایک دم فائر کرنا۔ چنانچہ جب پلٹن معہ توپ خانہ باغ کے سامنے پہنچی تو سب نے یکدم فائر کھول دیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپ خانہ چھوڑ کر پوری پلٹن بھاگ گئی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی مسجد کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اس سے لوگوں میں ان حضرات کی فراست، ذکاوت، فنون حربیہ کی مہارت، معاملہ فہمی اور ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا اور لوگوں کو پتہ چل گیا کہ یہ حضرات صرف محراب و منبر کی ہی زینت نہیں بلکہ میدان جنگ کے بھی شاہ سوار ہیں۔

اب ایک جدید قسم کا توپ خانہ مجاہدین کے ہاتھ میں تھا۔ شاملی اس زمانہ میں ایک مرکزی مقام تھا۔ ضلع سہارنپور سے اس کا تعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی۔ کچھ فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا کہ اس پر حملہ کیا جائے۔ اس حملہ کے دو فائدے تھے۔ ایک یہ کہ مزید جدید اسلحہ حاصل ہو جائے گا۔ دوسرے اگر اس مرکزی مقام کو فتح کر لیا تو مجاہدین کے حوصلے بلند اور دشمنوں کے پست ہو جائیں گے۔ چنانچہ چڑھائی ہوئی لیکن انگریزی فوج جو شاملی میں موجود تھی، مجاہدین کے ہجوم کو دیکھ کر تحصیل کی چار دیواری میں

Marfat.com

محصور ہوگئی اور اندر سے فائر شروع کر دیئے۔ مجاہدین کا ہجوم باہر میدان میں تھا جہاں کوئی آڑ نہیں اور نہ ہی کوئی مورچہ بندی۔ اس وجہ سے مجاہدین کا کافی جانی نقصان ہوا۔ اتفاق سے تحصیل کے قریب ایک چھپر تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی نظر اس چھپر پر پڑی۔ چھپر اٹھا کر تحصیل کے صدر دروازے پر ڈالا گیا اور اس میں آگ لگا دی گئی جس سے پھاٹک جل گیا اور اندر داخل ہونے کا راستہ کھل گیا۔ اب فوج میں مجاہدین کے مقابلے کی طاقت نہیں تھی۔ اس کے کچھ سپاہی بھاگنے میں کامیاب ہوئے اور کچھ کام آگئے اور باقی مجاہدین کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے اور شاملی پر مجاہدین کا قبضہ ہوگیا۔

حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ نے اس معرکہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ حضرت حافظ صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان کی شہادت سے پہلے روزانہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں مقام انگریزوں سے چھین لیا گیا۔ آج فلاں مقام پر ہندوستانیوں کا قبضہ ہوگیا، مگر حافظ صاحب کی شہادت کے بعد پہلے پہل خبر آئی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور یہی حال ہر جگہ کی خبروں کا تھا۔ اس سے پہلے گورے فوجی چھپتے پھرتے تھے۔ ایک ایک مجاہد گوروں کی جماعتوں کو بھگائے پھرتا تھا مگر بعد میں معاملہ برعکس ہوگیا۔

حضرت شیخ مولانا محمود الحسن قدس سرہ فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام معاملہ جوش وخروش اور جنگ وجدال کا حضرت حافظ محمد ضامنؒ کی شہادت کے لیے کیا گیا تھا۔ بہرحال حضرت حافظ صاحب اور دہلی کے سقوط کی خبر سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہوگئیں۔ اور سب اپنے اپنے وطنوں کو واپس آگئے۔

ادھر ہندوستان کے مرکز دہلی میں بھی تحریک بالکل ختم ہوگئی۔ کچھ تو غداروں کی وجہ سے اور کچھ بدانتظامی کے باعث بخت خان اور اس کے ساتھیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ 19 ستمبر 57ء کو بہادر شاہ گرفتار ہوئے۔ مجاہدین کی فوج تتر بتر ہوگئی اور دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوگا۔ پھر فتح مند فوجوں نے اطراف دہلی پر بھی قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ چند روز بعد ہی تھانہ بھون اور کیرانہ کا نمبر آگیا۔ ایک رات تاریکی میں انگریزی فوج کی آمد کی خبر نے پورے علاقے میں سنسنی پھیلا دی۔ اب شکست یقینی نظر آرہی تھی مگر

Marfat.com

بہادری یہ ہے کہ اس یقین کے باوجود مقابلہ کی ہمت کی گئی۔ سب مجاہدین کے حوصلے بلند تھے۔ جنگ کی ترکیب یہ کی گئی کہ قصبہ کے گرد فصیل تھی۔ اس کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اور وہی توپ جو آغاز جنگ میں حضرت مولانا گنگوہیؒ نے انگریزوں سے چھینی تھی، اس کو ایک بلند مقام پر نصب کر دیا گیا۔ اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس توپ کا پہلا فائر ایسا کامیاب رہا کہ اس کا گولہ ٹھیک غنیم کی توپ کے دہانہ پر جا کر پڑا۔ انگریزی فوج کی یہ توپ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ پھر یہاں تو ایک توپ تھی اور غنیم کے پاس بہت سی تھیں۔ یہاں توڑے دار بندوقیں تھیں اور وہ بھی بہت کم اور دوسری طرف جدید اسلحہ کی بہتات اور فراوانی تھی۔ دو گھنٹے سے زیادہ مقابلہ جاری نہ رہ سکا۔ صبح صادق کے وقت مشرق کی جانب سے تھانہ بھون پر گولہ باری شروع ہوئی تھی۔ قریباً یہی حال کیرانہ کا تھا۔ وہاں کے محاذ پر تو ایک بھی توپ نہ تھی، لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے مجاہدین سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔

تھانہ بھون اور کیرانہ انگریزی فوجوں کے اس حملہ کی تاب نہ لا سکے۔ چند ہی گھنٹوں کے بعد ہزیمت کا اعتراف کر لیا۔ اب یہاں کے رہنے والے لوگوں کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو ایک فاتح قوم مفتوح قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ تیل ڈال کر مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ جو ملا اس کو تہ تیغ کیا گیا۔ قیمتی مال و متاع سے فوج نے اپنی جیبیں بھر لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھانہ بھون اور کیرانہ اور اس کے اردگرد کے علاقے اجڑ دیار بن گئے اور لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے جائے پناہ ڈھونڈنے لگے۔

کیرانہ اور تھانہ بھون کے یہ راہ نما حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور ان کے متعلقین و مریدین جنہوں نے انگریزوں کی زبان میں بغاوت اور غدر میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا، فاتح قوم نے ہر جرم اُن کے سر تھوپ دیا اور عبور دریائے شور سے لے کر توپ دم کیے جانے یا ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا ڈالنے تک کی کون سی سزا تھی کہ اس دور کے آئین میں یہ اس کے مستحق نہ تھے۔ لیکن ان تمام حرکتوں اور کاروائیوں کے باوجود ہر قسم کی سزا سے بچ جانا، ہماری زبان میں کرشمۂ قدرت کے علاوہ اور کوئی لفظ اس کے لیے موزوں نہیں ہے۔

Marfat.com

19 ستمبر 1857ء کو سقوط دہلی ہوا۔ ایک دو روز کے بعد یہ خبر تھانہ بھون پہنچی کہ علی الصبح انگریزی فوج تھانہ بھون پہنچ جائے گی۔ یہ خبر سن کر لوگ سخت پریشان ہوئے اور قصبہ کو چھوڑنے لگے۔ قاضی عنایت علی خان بھی تھانہ بھون کو خیر باد کہہ کر نجیب آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ اس کے بعد ان کا پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں گے اور کب اور کہاں فوت ہوئے۔

صبح ہوئی تو سرکاری فوج نے تھانہ بھون کو گھیر لیا اور مشرقی جانب سے قصبہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہوگئی اور وہ لوٹ مار مچائی جس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے۔ اس ظلم کے بعد قصبہ میں گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ تھانہ بھون کے فساد کے اصل بانی یہی اشخاص تھے اور شاملی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔ اور انہی ملانوں نے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر سرکاری خزانہ کو لوٹا۔ (تذکرۃ الرشید: جلد ا ص ۷۶)

حاجی امداد اللہ صاحب تھانہ بھون سے گنگوہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے ملاقات کرتے ہوئے پنجلاسہ ضلع انبالہ پہنچے اور راؤ عبداللہ خان جو وہاں کے بڑے زمیندار اور سرکار کے بااعتماد لوگوں میں سے تھے، آپ کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید تھے، ان کے ہاں کچھ روز قیام کر کے اور تگری اور دیگر مواضعات و قصبات میں پوشیدہ رہ کر 1274ھ میں براستہ کراچی ہجرت کر کے مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو بھی بہت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار ہوئے اور چھ ماہ مظفر نگر کی جیل میں رکھ کر تفتیش کی اور پھر کہیں جا کر رہائی ملی۔

کیرانہ کے لوگوں نے بھی شاملی کی تحصیل لٹوانے میں برابر کا حصہ لیا تھا اور کیرانہ میں بھی انگریزی فوج سے ان لوگوں نے سخت مقابلہ کیا جس میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے ساتھ چودھری عظیم الدین اور مولانا کیرانوی کے بھائی حکیم اکبر علی صاحب، حکیم محمد امین الدین انصاری، شیخ فریدالدین عرف پیر جی فدو اور شیخ حمید اللہ

Marfat.com

عرف پیر جی مدد وغیرہ نے حصہ لیا۔ چونکہ یہاں مسلمان گوجروں کی کثرت تھی اس لیے ان کی قیادت چودھری عظیم الدین نے مولانا رحمت اللہ کے ہمراہ کی۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ 19 ستمبر 1857ء کو ہوا۔ کم از کم ساڑھے تیرہ ماہ نہ صرف کیرانہ، تھانہ بھون، دہلی اور اس کے گردونواح بلکہ پورے ہندوستان میں بقول بہادر شاہ ظفر حکومت کی عام پالیسی یہ رہی کہ ؏

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے

آخر یکم نومبر 1858ء کو ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ سقوط دہلی اور اعلان معافی کے درمیانی عرصہ میں لاکھوں لوگ تہ تیغ اور توپ دم کیے جا چکے تھے۔ اعلان معافی کے بعد بھی مندرجہ ذیل قسم کے لوگوں کو معافی سے مستثنیٰ رکھا گیا۔

1- جو لوگ باغیوں کے سردار تھے
2- جنہوں نے لوگوں کو کسی طریقے سے بغاوت کی ترغیب دی
3- جو انگریزی رعایا کے قتل میں بذات خود شریک تھے
4- جنہوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو اطلاع دی۔

ان لوگوں کے بارے میں ملکہ وکٹوریہ نے کہا تھا کہ

”ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہو گی، لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے وہ اپنی اطاعت سے پھر گئے، پورا غور کیا جائے گا۔“

لیکن ظالم حاکم قوم کے وعدوں کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اس نمائشی معافی نامہ کے بعد بھی عرصۂ دراز تک دارو گیر کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو قریباً سات ماہ بعد یعنی جولائی 1859ء میں گرفتار کیا گیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ کیرانہ اور اس کے نواح کے محاذ پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی حکومت تھی اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہر روز نقارہ بجا کر یہ آواز لگائی جاتی کہ ”ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا۔“ کیرانہ کا یہ محاذ جو کہ اگرچہ تھانہ

Marfat.com

بھون سے ملحق تھا، لیکن کئی لحاظ سے تھانہ بھون کے محاذ سے زیادہ مضبوط تھا، لہٰذا یہاں بظاہر شکست کا امکان نہ تھا، لیکن ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں بلکہ غداروں کی سازش نے حالات کا رخ بدل دیا۔ ویسے 57ء کی جنگ آزادی کی ناکامی میں جہاں اور عوامل کا دخل ہے وہاں سب سے بڑا عامل غدارانِ ملک وملت کی ریشہ دوانیاں بھی ہیں۔ اس محاذ پر بھی غداروں نے حالات کا رخ پلٹنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔

کیرانہ میں گورا فوج اور توپ خانہ ان غداروں کی وجہ سے داخل ہوا۔ محلّہ دربار کے دروازے کے سامنے توپ خانہ نصب کیا گیا۔ توپوں کے فائر کر کے علاقہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ مجاہدین نے شکست کا اعتراف کرتے ہوئے محاذ جنگ سے بھاگ کر اپنی جانوں کو بچانا شروع کر دیا۔ حضرت مولانا اس وقت اس محاذ پر تھے۔ آپ بھی روپوش ہو گئے اور اس وقت جنگی حکمت عملی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ گورا فوج نے مولانا کیرانویؒ کو تلاش کرنے کی غرض سے محلّہ دربار کا محاصرہ کر کے ایک دار و گیر کا سماں پیدا کر دیا۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی۔ عورتوں، بچوں اور رہنے والے ہر شخص کو فرداً فرداً محلّہ دربار سے باہر نکالا گیا، کیونکہ مخبر نے اطلاع دی تھی کہ مولانا کیرانوی محلّہ دربار میں روپوش ہیں۔ کیرانہ کے قریب ”پنجیٹھ“ مسلمان گوجروں کا ایک گاؤں ہے۔ حضرت مولانا فوری طور پر اپنے باقی ماندہ مجاہدین کے ساتھ اس گاؤں میں پہنچ گئے۔ خود ”پنجیٹھ“ کے لوگ بھی مجاہدین کے لشکر میں شریک تھے۔ انگریزوں کو پتہ چلا کہ مولانا ”پنجیٹھ“ بھاگ گئے ہیں۔ اس اطلاع پر گورا فوج کے ایک گھوڑ سوار دستہ نے پنجیٹھ کا رخ کیا۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کو کیرانہ اور تمام قرب و جوار کے حالات کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ چنانچہ پنجیٹھ کے مکھیا کو جب فوج کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اس نے فوراً ان تمام مجاہدین کو منتشر کر دیا جو مولاناؒ کے ساتھ تھے۔ اور حضرت مولاناؒ سے خواہش کی کہ ”کھرپا“ لے کر کھیتوں میں گھاس کاٹنے چلے جائیں۔ چنانچہ حضرت مولانا کیرانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ گورا فوج اس کھیت کی پگڈنڈی سے گزری جہاں میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں فوج کو اپنے پاس سے گزرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ فوج نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ گھر گھر کی تلاشی لی لیکن مولاناؒ کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ گاؤں کے مکھیا کو گرفتار کر لیا گیا

Marfat.com

لیکن اس نے بھی حضرت مولانا کیرانویؒ کی نشان دہی نہ کی۔ مجبوراً فوجی دستہ کیرانہ واپس چلا گیا۔[1] حالات پر قابو پالیا گیا۔ وارنٹ جاری ہوا اور حضرت مولاناؒ کے خلاف فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ مفرور باغی قرار دیا گیا اور گرفتاری کے لیے ایک ہزار روپیہ انعام رکھا گیا۔ مولانا پر یہ الزام تھا کہ انہوںؒ نے شاملی کو لٹوانے میں حصہ لیا۔

انہی دنوں مولانا کیرانویؒ نے چودھری عظیم الدین سے فرمایا: ''اب میں ہندوستان میں نہیں رہوں گا۔ تمہارا مجھ پر ہی نہیں بلکہ تمام قوم پر احسان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دو کنوئیں تمہارے نام کر دوں۔'' چودھری صاحب نے کہا ''حضرت مجھے اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ اگر میں آپ سے اپنے نام دو کنوئیں کرالوں گا تو اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا کہ قوم و وطن کی آزادی کے لیے بھی لالچ میں پھنس گیا۔''

ایک روایت کے مطابق چودھری عظیم الدین نے مولانا کیرانویؒ کو چھ ماہ تک اپنے گاؤں میں چھپائے رکھا۔ اس گاؤں کے قریب بہت سے جنگل تھے۔ دن میں مولانا

۱۔ بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ گرفتار نہ ہو سکے تو انگریزی فوج نے گاؤں کے چودہ آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کو جب ان کی گرفتاری کا علم ہوا تو آپ نے اپنے دوست اور ساتھی چوہدری عظیم الدین صاحب سے فرمایا کہ ''ان چودہ حضرات کو میری وجہ سے گرفتار کر لیا گیا ہے اور میری وجہ سے ان کو اور ان کے رشتہ داروں کو پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے، لہٰذا میں اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں، تاکہ یہ چودہ آدمی رہا ہو جائیں۔'' چوہدری عظیم الدین صاحب نے جواب میں کہا ''مولوی صاحب! یہ تو صرف چودہ آدمی ہیں، اگر پورا گاؤں بھی گرفتار ہو جائے اور ان کو تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے، پھر بھی آپ کو فوج کے حوالے نہیں ہونے دیا جائے گا۔'' بعد میں یہ چودہ آدمی بھی رہا ہو گئے۔

اُن چودہ اشخاص کے نام یہ ہیں:

الٰہی داد، شہداد، علی بخش، نعمت، نہار، بہار، کرم علی، بھوپ، چترو، کریم الدین، شہید الدین عرف سہی، دہدارہ، صندل اور محمد تقی۔

ان چودہ آدمیوں کے بارے میں مولانا رحمت اللہ صاحب پیش گوئی فرما چکے تھے کہ چھ ماہ کے بعد یہ لوگ فلاں تاریخ کو رہا ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہ لوگ چھ ماہ گزرنے کے بعد اسی تاریخ کو رہا ہوئے۔

Marfat.com

اکثر جنگل میں چلے جاتے تھے اور رات کو گاؤں میں رہتے۔ آخر ایک روز مولانا نے مکہ مکرمہ جانے کے لیے گاؤں چھوڑ دیا۔ لیکن چودھری عظیم الدین آپ کے ساتھ رہے اور اس وقت تک آپ سے علیحدہ نہیں ہوئے جب تک کہ آپ جہاز میں سوار ہو گئے۔

آخر ایک روز حضرت مولاناؒ نے اپنا نام بدل دیا اور مصلح الدین نام رکھ کر پیدل دہلی روانہ ہوئے۔ یہ وقت سخت مشکل اور آزمائش کا تھا۔ ایمانی عزم و ہمت اور صبر و استقلال کے ساتھ جے پور اور جودھپور کے مہیب اور ہولناک جنگلوں کو پا پیادہ عبور کرتے ہوئے سورت کی بندرگاہ پہنچے۔ اس زمانہ میں سورت کی بندرگاہ سے بھی جہاز کا سفر آسان نہ تھا۔ بادبانی جہاز سال بھر میں صرف ایک مرتبہ ہوا کی موافقت کے زمانہ میں سورت سے روانہ ہوتا اور اسی طرح جدہ سے آتا تھا، اور ایک خط کا محصول چار روپے تھا۔ جو لوگ ہجرت کے ارادے سے ترک وطن کرتے وہ ساتھ ہی دنیوی تعلقات اور باہمی علائق کو زندگی ہی میں ختم کر دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا کیرانویؒ تو مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ آپ کی غیر حاضری میں آپ پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس فوجداری مقدمہ کے بعد آپ کی اور آپ کے خاندان کی جائداد ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ خاص طور پر پانی پت میں، جو کہ حضرت مولاناؒ کے سابق وطن اور ان کے جد امجد حضرت مخدوم الاولیاء جلال الدین کی جائے مزار ہے، مخبر کمال الدین کی شناخت پر جو جائداد قرق کر کے نیلام کی گئی اس کی تفصیل یوں ہے۔ جائداد کے نیلام کا فیصلہ ڈپٹی کمشنر کرنال نے 30 جنوری 1864ء میں کیا۔

1- سرائے کھجور۔ اس کی قیمت سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کے کاغذات میں پانچ سو روپیہ ہے۔

2- سرائے چوڑھے۔ اس کی قیمت // // // // // //

3- سراء شیخ فضل الٰہی۔ // // // // // // //

4- سرائے قصابان۔ // // // // // // // //

5- سرائے لوہ آباد۔ // // // // // // // //

6- سرائے مایاں۔ // // // // // // // //

Marfat.com

یہ سب سرائیں اور وسیع قطعات زمین اور مکانات صرف ایک ہزار چار سو بیس روپیہ میں نیلام ہوئے جن کی قیمت لاکھوں روپے تھی۔ مزروعہ علاقے اور سکنائی جائداد اور زرعی زمینیں اس کے علاوہ ہیں جو بحق سرکار ضبط ہوئیں۔ مذکورہ بالا سرائیں جس قیمت پر نیلام ہوئیں وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

-1	سرائے کھجور	42 روپے میں
-2	سرائے لوہ آباد	15 روپے میں
-3	سرائے چوڑھے	56 روپے میں
-4	سرائے قصاباں	14 روپے میں

کاغذات جائداد نیلام شدہ میں انڈکس مشمولہ کا یہ عنوان ہے

''انڈکس مشمولہ مثل فوجداری مقدمہ عرضی کمال الدین ساکن کیرانہ حال پانی پت مولوی رحمت اللہ باغی۔''

سورت کی بندرگاہ سے جہاز پر سوار ہو کر طویل سفر کے آلام ومصائب برداشت کرتے ہوئے حضرت مولانا کیرانویؒ مکہ مکرمہ پہنچے۔ دوران سفر راستہ میں کتنی صعوبتیں اٹھائیں، کتنے مصائب برداشت کیے، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس زمانہ میں نہ تو آج کل کی طرح کے اسٹیمر تھے جن میں ہر طرح کی سہولت اور آرام میسر ہوتا ہے بلکہ بادبانی جہاز ہوتے تھے جو سمندر میں بھی ہوا کے رحم وکرم پر چلتے تھے۔ بعض دفعہ ہوا نہ ہوتی یا باد مخالف ہوتی اور جہاز کو کئی کئی دن سمندر میں لنگر انداز رہنا پڑتا تھا۔ یہ ساری صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد حضرت مولانا کیرانویؒ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، وہاں بھی حضرت مولاناؒ اپنے اس دینی مشن سے غافل نہ رہے۔ وہاں کس طرح اس مجاہد حق نے دینی اور علمی کارنامے انجام دیئے اور کس طرح مختلف جگہوں پر عیسائی جماعتوں سے فاتحانہ مقابلہ کیا۔ پھر مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ قائم کر کے ایک غیر فانی کارنامہ سرانجام دیا وہ تا قیامت آپ کے نام کو زندہ رکھے گا۔ سلطان عبدالحمید خان خلیفۃ المسلمین سے شرف باریابی حاصل کیا اور اپنے حقیقی برادر زادہ یعنی مولانا بدرالاسلام کو وہیں تعلیم و تربیت دے کر سلطان مذکورہ کا معتمد خاص بنوادیا۔

Marfat.com

مولانا کیرانویؒ مکہ معظّمہ میں:

طویل سفر کے آلام و مصائب کو برداشت کرتا ہوا یہ سربکف مجاہد جس کی ٹھوکر سے صحرا و دریا بھی دو نیم ہو جاتے ہیں، مرکز اسلام مكة المكرّمہ پہنچا تاکہ بیت اللہ کے زیر سایہ رب البیت کے دین کی کوئی خدمت کر سکے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا کیرانویؒ سے قبل ہی ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ پہنچ گئے تھے اور رباط داؤد یہ جو باب العمرہ سے متصل ہے، کے ایک حجرہ میں مقیم تھے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ صبح صادق کے قریب مکہ مکرمہ پہنچے۔ مطاف میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ طواف قدوم اور سعی صفا مروہ میں حضرت حاجی صاحبؒ ساتھ رہے۔ اس کے بعد دونوں حضرات رباط داؤد میں آ گئے۔

یہاں ایک سوال ذہنوں میں کھٹکتا ہے کہ یہ حضرات ہندوستان سے بھاگ کر مکہ مکرمہ کیوں آئے؟ ہندوستان کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد تحریک کے اکثر راہ نما جو انگریزوں کی دار و گیر سے بچ گئے وہ مكة المكرّمہ چلے آئے۔ یہ حضرات یہاں کیوں آئے کسی اور ملک میں کیوں نہ چلے گئے؟ ایک کی دو وجوہات ہماری سمجھ میں آتی ہیں۔

1- الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلویؒ کی نئی تنظیم پر پورے تیس برس نہیں گزرے تھے کہ دہلی کے آخری بادشاہ کی انگریزی کمپنی سے لڑائی ہو گئی۔

(ا) سلطان دہلی اگرچہ بظاہر ایک وظیفہ خوار رئیس کی صورت میں نظر آتا تھا، مگر عام لوگوں کی نظروں میں وہ اب تک سارے ہندوستان کا موروثی سلطان مانا جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی چونکہ اسی کے نام سے عوام پر حکومت کرتی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورے میں کہا جاتا تھا ”خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔“ اس لیے عوام الناس کی رائے اسے ملک کا حقیقی مالک ماننے میں تامل نہیں کرتی تھی۔

(ب) اس داہیۂ کبریٰ میں مولانا محمد اسحاقؒ کی نئی جماعت پھر دو حصوں میں تقسیم ہو

Marfat.com

گئی۔ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاقؒ) نے جس طائفہ کو نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے، وہ طائفہ تو سلطان دہلی کا طرفدار ہو گیا۔ اور سلطانی تحریک کی شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہنچ گیا۔ چنانچہ امیر امداد اللہ اور مولانا عبدالغنی مولانا محمد یعقوب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر اپنی ہندوستانی تنظیمات کی راہ نمائی کرتے رہے۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسحاقؒ نے اپنی تحریک کا مرکز مکہ مکرمہ کو بنایا جہاں ترکوں اور ان کے حلیفوں سے مدد لے کر ہندوستان کی تحریک حریت کو کامیاب بنایا جا سکتا تھا، لیکن ہندوستان کے سیاسی مرکز یعنی دارالسلطنت میں ایک نظام کے قائم رکھنے اور ترقی دینے کی پھر بھی ضرورت تھی جس کے لیے پہلے مولانا مملوک علی صاحب (1) کی زیر صدارت ایک بورڈ بنایا گیا جس کے خصوصی ارکان مولانا نواب قطب الدین صاحب دہلوی، حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی صاحب دہلویؒ تھے۔ اور جب حاجی امداد اللہ صاحب پہلی بار حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ نے حاجی امداد اللہ کو اسی کام کے لیے مقرر فرما دیا۔ چنانچہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں:

"امیر جماعت حضرت حاجی امداد اللہ جو 1261ھ میں مکہ مکرمہ پہنچے۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کی خدمت میں حاضر

ا۔ حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی قدس سرہ اپنے زمانے کے بہت بڑے صاحب علم حضرات میں سے تھے۔ سرسید احمد خان نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"آپ کو علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو ان کے لوح حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔"

(آثار الصنادید)

آپ کا وطن اصلی نانوتہ ضلع سہارنپور تھا اور نسب کے لحاظ سے صدیقی تھے۔ آپ سے چار پشت اوپر آپ کے مورث حضرت شیخ ہاشمؒ نانوتہ شریف لائے تھے۔ سلطان عالمگیر کی طرف سے آپ کو یہاں ایک بہت بڑی جاگیر بھی دے دی گئی تھی۔

Marfat.com

ہوئے اور ان سے تحریک کا لائحہ عمل اور پروگرام معلوم کیا۔ پھر 1262ھ میں ہندوستان واپس ہوئے۔ وہ لوگ جو اس سلسلہ سے وابستہ تھے، انہوں نے حضرت محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور ان کے علاوہ علماء ہند کی ایک بہت بڑی جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی۔"

(شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک: ص ۱۸۳ حاشیہ)

﴿بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ﴾

آپ کے اساتذہ میں سے حضرت مولانا رشید الدین صاحب جو حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے، کا اسم گرامی خاص طور پر تذکرہ کا مستحق ہے۔ عرصۂ دراز تک دہلی کی عربی یونیورسٹی میں جو اس وقت مدرسۂ شاہجہان آباد یا مدرسہ غازی الدین کہلاتا تھا، عربی علوم وفنون کا درس دیتے رہے۔ پھر یہاں شعبۂ عربی کے صدر بنا دیئے گئے۔ اس دور کے بلند پایہ فضلاء اور علماء زیادہ تر آپ ہی کے شاگرد تھے۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، امام ربانی فقیہ عصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، سر سید احمد خان بانی علیگڑھ یونیورسٹی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی مترجم قرآن حکیم، شمس العلماء منشی ذکاء اللہ خان اور آپ کے فرزند رشید حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس بنائے گئے اور جو اپنے والد محترم کی طرح بقول حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ علوم عقلیہ ونقلیہ کے بہترین فاضل اور جامع ترین شخصیت تھے۔ تقویٰ وطہارت اور تزکیہ باطن میں بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا، یہ سب آپ کے شاگرد ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔

حضرت مولانا مملوک علی کا چونکہ مستقل قیام دہلی میں رہتا تھا، اس لیے آپ نے کوچۂ چیلاں میں ایک مکان بھی خرید لیا تھا۔ سرکاری درسگاہ میں سالہا سال ملازم رہنے کے باوجود انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ریذیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے تو آپ کے علم اور رتبے کے خیال سے آپ سے ہاتھ ملایا، لیکن جب تک صاحب بہادر وہاں رہے مولانا نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس شی کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی کئی مرتبہ ہاتھ کو دھویا۔ (دہلی کی آخری شمع، فرحت اللہ بیگ) آپ نے ۱۲۶۷ھ بمطابق ۱۸۵۰ء میں دہلی ہی میں انتقال فرمایا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

ان حوالجات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا ایک مرکز محمد اسحاق صاحبؒ نے مکہ مکرمہ میں بھی بنایا تھا۔ یہ حضرات وہاں جا کر سرزمین پاک و ہند کی تحریک کو کنٹرول کرنا چاہتے تھے حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر وزیر خان مرحوم اور دوسرے کئی ایک حضرات ممکن ہے کہ اسی مقصد کے لیے مکہ مکرمہ گئے ہوں۔

دوسری وجہ جو ان حضرات کے مکہ مکرمہ جانے کی سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات قائد کی حیثیت رکھتے تھے اور ایک قائد کو قوم کی زمام قیادت سنبھالنے کے لیے اپنے کو یوں ہی ایک ظالم و جابر قوم کے ہاتھ میں نہیں دے دینا چاہیے، بلکہ اگر کوئی تحریک فیل یا ناکام ہو جائے تو قائد اور رہنما کو اپنے آپ کو محفوظ کر کے ایسے وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے پھر قوم کی قیادت کر سکے۔

تحریک کی ناکامی کے بعد انگریز کے ظلم و ستم کی داستانِ خونچکاں بڑی طویل ہے۔ چشم فلک نے انگریز کی درندگی کے خونین نظارے بہت سے دیکھے۔ وہ نہایت منتقم مزاج تھا۔ اس نے ہر گنہ گار اور بے گناہ آدمی کو دار و رسن کی تعزیریں سنائیں۔ اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ ہر برے سے بُرا کام اس سے لیا گیا۔ چنانچہ ایک پادری کی بیوہ نہایت فاتحہ انداز میں لکھتی ہے کہ

> ”جب بہت سے باغی گرفتار کر لیے گئے تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ گرجے کے فرش کو صاف کریں، مگر باوجودیکہ یہ لوگ اپنے مذہبی معتقدات کی بنا پر اس قسم کا کام خلاف اسلام سمجھتے تھے پھر بھی سنگین کی نوک سے انہیں اس حقیر کام کے لیے مجبور کیا گیا۔ ان میں سے بعض نے نہایت پھرتی کے ساتھ اس کام کو سرانجام دیا، محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی کی سزا سے بچ جائیں، لیکن بے سود کیونکہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔“ (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۴۰)

لکھا ہے کہ الٰہ آباد سے کانپور آتے ہوئے دو دن کے اندر بیالیس آدمیوں کو سڑک کے کنارے پھانسی دی گئی۔ اور بارہ آدمیوں کو صرف اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ

Marfat.com

جب فوج مارچ کرتی ہوئی اُن کے سامنے سے گزری تو ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔

یہ پھانسی کی سزا صرف ان لوگوں ہی کو نہیں دی گئی جنہوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی بلکہ آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہندوستان کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی تختۂ دار پر لٹکایا گیا۔ (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۵۹)

درختوں سے لٹکا کر پھانسی دی گئی۔ چو گوشہ سولیاں مختلف شہروں میں نصب کی گئیں۔ جلتی ہوئی سلاخوں سے داغ کر مارا گیا۔ مارنے سے پہلے مرنے والوں کے ساتھ کیا کچھ کیا گیا، ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین نے لکھا ہے کہ ''زندہ مسلمانوں کو سؤر کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں، ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں جن کا کفارہ ہمیں بھی ایک دن ادا کرنا پڑے گا۔''

بعض لوگوں کو توپ سے باندھ کر اڑایا گیا۔ چنانچہ لارڈ رابرٹس اپنی والدہ کو ایک چھٹی میں لکھتا ہے

> ''ہم پشاور سے جہلم تک پا پیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے آئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھیننا اور اُن کو پھانسیوں پر لٹکانا۔ چنانچہ توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے اکثر استعمال کیا ہے اس کا لوگوں پر خاص اثر ہوا یعنی ہماری ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ یہ طریقہ نہایت دل خراش تھا۔''

(تصویر کا دوسرا رخ: ص ۴۴)

مسٹر رسل نے اپنی ایک طویل تحریر میں لکھا ہے کہ

''دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد انگریز فاتحین نے

باشندوں کا قتل عام کیا اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیئے گئے حالانکہ ان کو بغاوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔'' (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۷۵)

''کانپور کے حادثہ سے بہت عرصہ پیشتر ایک طرف تو فوجی قانون کے نفاذ کا اعلان کیا گیا اور دوسری طرف مجلس وضع قانون نے مئی اور جون میں نہایت خوفناک قوانین پاس کیے جن پر پوری سرگرمی سے عمل کیا گیا اور فوجیوں اور سول افسروں نے خونی عدالتیں قائم کر کے ہندوستانیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ بلکہ بعض حالات میں تو بغیر کسی نام نہاد عدالت کے حکم کے پھانسیاں دی گئیں جن میں مرد عورت کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ بایں ہمہ خونریزی کی آگ دن بدن اور بھڑکتی گئی۔ چنانچہ آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا۔ نہ صرف سولی پر ہی اکتفاء کیا گیا بلکہ دیہات میں اُن کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ اور شاذ و نادر ہی کسی ایک کو گولی سے مارنے کی تکلیف گوارا کی گئی۔ انگریزوں نے بڑے فخر سے یہ لکھا ہے کہ ہم نے حتیٰ الامکان کسی ذی روح کی آبادی کو زندہ نہیں رہنے دیا۔'' (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۶۴)

یہی حال شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب اور ہندوستان کے مختلف شہروں مثلاً لکھنؤ وغیرہ میں کیا گیا۔ دہلی جو ہندوستان کا پایۂ تخت ہونے کے ناطے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، اس کی حالت سب سے بری تھی۔ چنانچہ مسٹر رسل ہی کا بیان ہے کہ

''دہلی میں ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو چلتے پھرتے نظر آئے وہ سنگینوں سے وہیں ختم کر دیئے گئے۔ ایسے

Marfat.com

بدقسمت انسانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آپ اس ایک واقعہ سے کافی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزین ہو گئے جو اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے اور ہمارے عفو وکرم پر تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ جن کے متعلق میں خوشی سے ظاہر کرتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیونکہ ہم نے اسی جگہ اُن کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا۔"

(ایضاً: ص ۶۸)

"بے گناہ شہریوں کو درآنحالیکہ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کرتے رہے تھے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا، بلکہ عمر رسیدہ لوگوں کو حالانکہ ان کے جسم رعشہ سے کانپ رہے تھے کاٹ کر رکھ دیا گیا۔"

(ایضاً: ص ۶۸)

ٹائمنر کے نامہ نگار نے لکھا تھا:

"میں نے دہلی کے بازاروں میں سیر کرنا مطلق چھوڑ دیا ہے کیونکہ کل ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی جب ایک افسر کچھ سپاہی لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی اُن کے ہمراہ ہو لیا اور راستہ میں ہم نے چودہ عورتوں کی لاشوں کو شالوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا جن کے سر دھڑوں سے اُن کے خاوندوں نے خود جدا کیے تھے، چنانچہ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دردناک حادثہ اس لیے ظہور پذیر ہوا کہ اُن کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ اگر یہ انگریز سپاہیوں کے قابو میں آ گئیں تو وہ اُن کی عصمت دری کریں گے، لہٰذا تحفظ ناموس کا یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا جس کے بعد خاوندوں نے بھی خودکشی کر لی۔ چنانچہ ان کی لاشوں کو خود ہم نے دیکھا۔" (ایضاً: ص ۶۸)

Marfat.com

ایڈورڈ ٹامسن لکھتا ہے کہ:

''فوجی شرابوں کی دکانیں لوٹتے اور شراب پی کر بازاروں میں گشت کرتے۔ بے دریغ قتل وغارت کرتے۔ کبھی کبھی کوئی منچلا ان میں سے کسی کو ختم کر دیتا۔ لطف یہ ہے کہ اس قاتل کو مذہبی دیوانہ کہا جاتا یعنی عقل کا تقاضا یہ تھا کہ نہایت خاموشی سے ان شرابیوں کے سامنے ذبح کے لیے گردن کیوں نہیں جھکا دی۔'' (ایضاً: ص ۷۰)

اسپیئر وال پول لکھتا ہے کہ

''وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہیں مچائی تھی۔ جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ یا چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی۔'' وال پول کا بیان ہے کہ ''تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی جن میں سے انتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کیے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔ (افسانۂ غم: ص ۲۸)

یہ تو صرف چند اقتباسات نقل کیے گئے ہیں ورنہ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب Our Side of The Middle میں اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہوا ہے اور مسٹر ٹامسن کی اس کتاب کا ترجمہ شیخ حسام الدین بی۔اے نے کیا ہے۔ اور اس کتاب کا نام ''تصویر کا دوسرا رخ'' رکھا ہے۔ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں جتنے واقعات لکھے گئے ہیں ان میں سے ایک بھی کسی ہندوستانی قلم یا زبان سے نکلا ہوا نہیں ہے نیز یہ کہ ان بہت سے واقعات کو چھوڑ دیا ہے جن سے ان سے زیادہ سنگدلی اور درندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۷۸)

گذشتہ صفحات میں صرف عوام پر انگریزوں کے ظلم وستم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ علماء پر کیا کچھ ظلم وستم روا رکھے گئے ان کا مفصل بیان تو یہاں نہیں کیا جائے گا۔ صرف ایک عالم دین حضرت مولانا علامہ فضل حق خیر آبادی کا تذکرہ کیا جاتا ہے اسی سے

Marfat.com

پتہ چل جائے گا کہ علماء کے بارے میں انگریزوں کی خونین درندگی بھی کچھ کم نہیں ہے۔

19 ستمبر 58ء کو دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوا۔ مولانا اور اُن کے اہل و عیال پانچ روز تک کسی مکان میں بھوکے پیاسے بند رہے۔ پھر رات کی تاریکی میں اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکلے اور پا پیادہ سفر کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے بھیکن پور ضلع علیگڑھ پہنچے۔ یہاں اٹھارہ روز چھپے رہے۔ پھر نواب عبدالشکور خان رئیس بھیکن پور نے شہر سے آٹھ میل دور دریا کے پار اتار دیا۔ پھر آپ کچھ مدت چھپے رہے۔ پھر آپ مخبری پر گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی اور تمام مال و اسباب حتیٰ کہ کتابیں تک بھی بحق سرکار ضبط کر لی گئیں۔ پھر حسب ضابطہ کچھ عرصہ ہندوستان کی مختلف جیل خانوں میں رہے۔ مولانا خود فرماتے ہیں کہ

> ''مجھے ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ میں ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم ہوں اور میرا اشمار علماء اعلام میں ہوتا تھا۔''
>
> (الثورۃ الہندیہ: ص ۴۱۷)

جیل کی اذیتوں کے بارے میں مولانا فضل حقؒ فرماتے ہیں:

> ''مکر و تلبیس سے جب نصاریٰ نے مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم بستر چھین کر خراب سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا اس پر کانٹے بچھا دیئے گئے یا دھکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا پیالہ اور کوئی برتن نہیں چھوڑا۔ بخل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ کوئی گرم جوش دوست تو کیا ملتا، گرم جوش پانی دیا گیا۔ اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہر وقت اور ہر آن ذلت و توہین سے کام لیا گیا۔''
>
> ''پھر مجھے دریائے شور کے کنارے ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا گیا

Marfat.com

جس کی آب و ہوا ناموافق، جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا ہے۔ اس کی گھاٹیاں دشوار گزار پیچ در پیچ جنہیں دریا شور کی موجیں ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس کی نسیم صبح بھی سموم سے زیادہ گرم۔ غذا حنظل سے زیادہ کڑوی اور زہر ہلاہل سے زیادہ مضر۔ اس کا پانی سانپوں کے زہر سے زیادہ ضرر رساں۔ ہر کوٹھڑی پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح اس کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں اور ان سے بدبو مہکتی رہتی تھی۔ امراض کی کثرت۔ بیماری عام دوا ناپید اور مشکل۔ خارش اور قوبا کا رواج عام۔ بیمار کے علاج، تندرست کے بقا صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام۔ مرض سرسام اور برسام ہلاکت کی علت تام اور کتنی ہی بیماریاں ایسی ہیں کہ طب کی کتابوں میں اُن کا نام و نشان نہیں۔ ڈاکٹروں کی یہ حالت کہ مرض کچھ اور دوا کچھ۔ مرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کہ مردہ خاکروب کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جو اس کے کپڑے اتار کر ٹانگ پکڑ کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ غسل نہ کفن نہ دفن نہ نماز جنازہ۔ اگر میت کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا تو یہاں کی مصیبتوں کے مقابلہ میں مر جانا سب سے بڑی آرزو ہوتی۔ اور اگر مذہباً خودکشی ممنوع نہ ہوتی تو قید و بند کی ان مصیبتوں سے نجات پالینا بہت آسان تھا۔

"میں نہیں جانتا کہ ان مصیبتوں سے کس طرح چھٹکارا ہو سکے گا۔ خارش اور قوبا میں مبتلا ہو جانا مصیبت بالائے مصیبت۔ صبح و شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں

اضافہ ہوتا رہتا ہے۔" (الثورۃ الہندیہ: ص ۴۲۱۔۴۲۴)

یہ سارے حالات اور واقعات خونچکاں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان ظلم وستم کی داستانوں سے بچنے کے لیے بعض قائدانہ صلاحیت رکھنے والے علماء کرام سرزمین پاک وہند کو خیر باد کہہ کر مکہ مکرمہ چلے گئے، ان علماء میں سے ایک حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بھی تھے جو کیرانہ سے بھاگ کر اور سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے مکہ مکرمہ تسریف لے گئے۔ مولانا عبدالغنی محدث دہلویؒ اور حاجی امداد اللہ صاحبؒ بھی ایسے ہی حضرات تھے جو مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر آخر تک ہندوستانی تحریک کی قیادت کرتے رہے۔ مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ کا قیام اور ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند، جامعہ قاسمیہ مراد آباد اور مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے۔ مدارس کے ان حلقوں نے اگرچہ سیاسیات سے علیحدگی کا اعلان کیا مگر دین و مذہب جس کی تعلیم کو نصب العین بنایا تھا، اس کی ہمہ گیر تفسیر میں حضرت مولانا کیرانویؒ اور دیگر بزرگوں کے عقیدہ کے مطابق وطنی سیاست اور جدوجہد آزادی ایک فرض کی حیثیت رکھتی تھی۔

غرض کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت مولانا کیرانویؒ کی مطاف میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے ملاقات ہوئی جو حضرت مولانا کیرانویؒ سے کچھ عرصہ قبل ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ پہنچے تھے۔ اس زمانہ میں سلطان عبدالعزیز خانہ خلیفۃ المسلمین تھے اور ان کی طرف سے شریف عبداللہ بن عون بن محمد گورنر مکہ تھے۔ مکہ مکرمہ کے شیخ العلماء سید احمد دحلانؒ تھے امیر مکہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ چند دنوں میں حضرت مولاناؒ نے حالات کا جائزہ لیا اور علمائے حرم سے اپنے تعلقات استوار کیے۔

سید احمد دحلانؒ شیخ العلماء اس زمانہ میں حرم میں درس دیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ بھی اکثر وبیشتر ان کے حلقۂ درس میں بیٹھ جاتے اور شیخ کا درس اور طریقۂ استدلال سنتے رہتے۔ شیخ موصوف شافعی المذہب تھے جبکہ حضرت مولانا کیرانویؒ حنفی المذہب۔ ایک دن شیخ العلماء نے دوران تقریر کسی مسئلہ کی بحث کرتے ہوئے اپنے مذہب کی ترجیح کے ساتھ احناف کے دلائل کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مولانا مرحوم مناظرانہ

Marfat.com

طبیعت کے مالک تھے اور علم میں بھی جید، لہٰذا درس ختم ہونے کے بعد آپ نے سید احمد دحلانؒ سے ملاقات کر کے اس مسئلہ کے بارے میں طالب علم کی حیثیت سے اپنی تشفی چاہی۔ تھوڑی دیر کے سوال و جواب اور علمی گفتگو سے سید احمد دحلان کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص طالب علم نہیں بلکہ ایک جید عالم دین ہے جو مسئلہ کے مالہ وما علیہ سے پورا پورا واقف ہے۔ شیخ نے حضرت مولاناؒ سے ان کا تعارف چاہا۔ حضرت مولانا مرحوم نے اختصار کے ساتھ اپنے حالات، وجۂ ہجرت اور ہندوستان میں انگریزوں کی دار و رسن کی داستان بیان کی۔ یہ حضرت شیخ سے آپ کی پہلی ملاقات تھی۔ شیخ حضرت مولاناؒ کی باتوں سے بڑے محظوظ اور آپ کے علم سے بڑے متاثر ہوئے، لہٰذا دوسرے روز اپنے گھر میں دعوت کے لیے حضرت مولانا کیرانویؒ سے فرمایا۔ حضرت مولانا مرحوم نے اس دعوت کو قبول فرما لیا۔ چنانچہ آپ اپنے رفیق عزیز حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ہمراہ حضرت سید صاحبؒ کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے۔ اس مجلس میں حضرت مولانا کیرانویؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے 1857ء کی جنگ آزادی اور شاملی، دیوبند، کیرانہ اور دیگر جگہوں کے محاذوں کے حالات حضرت شیخ سے بیان کیے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے خاص طور پر عیسائیت کی مذہبی کوششوں اور رد نصاریٰ میں مسلمانوں کی عظیم الشان کامیابی کی تفصیل بیان کی۔ حضرت شیخ نے بے حد مسرت کا اظہار فرمایا اور پادری فنڈر کے فرار سے تو بہت ہی زیادہ خوش ہوئے۔ اسی خوشی میں حضرت مولانا کے ساتھ دیر تک بغل گیر ہوئے۔ حضرت مولاناؒ کے علم سے متاثر ہو کر شیخ نے اسی مجلس میں آپ کو مسجد حرم میں درس کی باقاعدہ اجازت دی اور مسجد حرم کے علماء کے دفتر میں آپ کے نام کا اندراج کروا دیا۔ جس طرح شیخ دحلان حضرت مولانا کے علم و فضل سے متاثر تھے اسی طرح مولانا مرحوم بھی شیخ دحلانؒ سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ حضرت مولاناؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب اظہار الحق کے مقدمہ میں شیخ کا ذکر نہایت عقیدت و محبت کے ساتھ کیا ہے۔

مولانا رحمت اللہؒ قسطنطنیہ میں:

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد پادری فنڈر جرمنی، سوئٹزر لینڈ، انگلستان اور

Marfat.com

دوسرے کئی ایک ممالک میں رہا اور وہاں عیسائیت کی تبلیغ اور عیسائی مشنریوں کی ٹریننگ کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ بعد میں چرچ مشنری سوسائٹی لنڈن نے اس کو خلافت اسلامیہ کے پایۂ تخت قسطنطنیہ موجودہ استنبول بھیجا تا کہ وہاں اسلام کے خلاف وہ کام کرے۔ پادری فنڈر اپنی شرانگیز اور شرپسند طبیعت سے مجبور تھا۔ دولت عثمانیہ اور خصوصی طور پر استنبول میں فنڈر اور اس کے حواریوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ ہندوستان میں عیسائیت فتح مند اور اسلام میرے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے۔ آگرہ میں مسلمان علماء سے میرا جو مناظرہ ہوا تھا اس میں علماء لاجواب ہو چکے تھے اس وجہ سے ہندوستان میں اب مسلمان بڑی تیزی سے عیسائیت قبول کر رہے ہیں ا۔ اس خبر سے خلیفۃ المسلمین کو بہت تشویش ہوئی۔ انہوں نے امیر مکہ شریف عبداللہ پاشا کو لکھا کہ حج کے زمانے میں ہندوستان سے جو علماء اور باخبر حضرات تشریف لائیں ان سے پادری فنڈر کے مناظرہ اور 1857ء کی جنگ آزادی کے خصوصی حالات و واقعات معلوم کر کے باب خلافت کو مطلع کیا جائے۔ امیر مکہ نے شیخ العلماء سید احمد دحلانؒ سے اس فرمان کا تذکرہ کیا حضرت شیخ نے فرمایا کہ ''جس عالم سے یہ مناظرہ ہوا ہے وہ خود یہاں موجود ہیں۔'' ان سے آپ کو تمام حالات کا پتہ چل جائے گا۔'' امیر مکہ نے حضرت مولانا کیرانویؒ کو اپنے ہاں بلایا، چنانچہ دوسرے دن حضرت مولانا کیرانویؒ شیخ العلماء کے ہمراہ امیر مکہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امیر مکہ نے حضرت مولاناؒ سے اس مناظرہ کے تمام حالات سن کر ان سے سلطان کو مطلع کیا اور قسطنطنیہ سے خلیفۃ المسلمین کی طلبی اور حکم پر امیر مکہ شریف عبداللہ پاشا نے حضرت مولانا کیرانویؒ کو 1280ھ مطابق 1864ء میں شاہی مہمان کی حیثیت سے دربار خلافت روانہ کیا۔

حضرت مولانا مرحوم بڑے اعزاز و احترام کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچے۔ پادری فنڈر کو جونہی حضرت مولاناؒ کی قسطنطنیہ پہنچنے کی اطلاع ملی وہ وہاں سے فوری طور پر بھاگ گیا تا کہ اس کے جھوٹ کا پول نہ کھل سکے۔ خلیفۃ المسلمین نے حضرت مولاناؒ کی قسطنطنیہ آمد کے بعد ایک مجلس علماء منعقد کی جس میں وزرائے سلطنت کے علاوہ اہل علم و فضل حضرات کو بھی مدعو کیا گیا اور حضرت مولانا مرحوم سے آگرہ میں پادری فنڈر کے ساتھ مناظرہ اور

Marfat.com

عیسائیت کی شکست کی مکمل روداد اور 1857ء کی جنگ آزادی کے حالات و واقعات تفصیل سے سنے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے سلطان المسلمین کو عیسائیوں کی شرانگیزیوں سے بھی مطلع کیا۔ سلطان نے دولت عثمانیہ میں اس فتنہ وفساد کو روکنے کے لیے مسیحی مبلغین کو قید کیا ،ان کی کتابوں پر پابندیاں لگائیں اور ان کے بارے میں سخت احکامات جاری فرمائے۔

نماز عشاء کے بعد اکثر سلطان بکمال التفات شاہانہ حضرت مولانا مرحوم کو شرف باریابی عطا فرماتے تھے۔ اس وقت خیرالدین پاشا تونسی صدر اعظم اور شیخ الاسلام وغیرہ بھی شریک مجلس ہوتے۔ سلطان عبدالعزیز خان مرحوم نے مولانا کی جلیل القدر دینی مجاہدانہ خدمات کی قدر افزائی فرمائی۔ زریں خلعت کے ساتھ تمغۂ مجیدی، درجہ دوم اور گراں قدر وظیفۂ ماہانہ سے سرفراز فرمایا۔

مولانا رحمت اللہ کی ملاقات کے بعد سلطان عبدالعزیز خان نے عیسائی مشنریوں کے فتنہ وفساد کو روکنے کے لیے سخت اقدام اٹھائے جس کا ذکر پادری برکت اللہ نے اپنی کتاب ''صلیب کے علمبردار'' میں کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

> ''ترکی گورنمنٹ اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ اسلام پر کسی طرح کا حملہ برسر بازار یا نج کے طور پر کیا جائے۔ وہ مشنریوں کو یا ان کے کارندوں کو اسلام کے خلاف منادی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اور اس طرح ہر کوشش ترکی حکومت کی نظر میں قومی مذہب پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ وہ کسی مباحثہ کی کتاب کو برسر بازار یا نج کے طور پر تقسیم کرنے یا فروخت کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ برطانوی سفیر نے ان ذلت آمیز احکام پر رضامندی ظاہر کردی گو بعد میں بصد مشکل دوکانیں کھلوالی گئیں۔'' (صفحہ:۲۲)

اسی کتاب ''صلیب کے علمبردار'' سے پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا قسطنطنیہ میں مباحثہ کرانے کی تیاری کی تصدیق ہوتی ہے۔ پادری برکت اللہ لکھتا ہے:

> ''قسطنطنیہ میں اس کی (پادری فنڈر) کی بیوی کی حالت نہایت خراب ہوگئی اور وہ 1865ء میں اپنے بیوی بچوں کو انگلستان

Marfat.com

چھوڑنے چلا گیا۔" 1870ء میں جب فرنچ ملتان گیا تو وہاں کے
ایک مولوی نے جو مولوی رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خان کا دوست
تھا۔ اس کو بتایا کہ جب قسطنطنیہ میں ڈاکٹر فنڈر کے وعظ کی منادی اور
کتابوں کا شہرہ ہوا تو سلطان نے مولوی رحمت اللہ کو بلوا بھیجا تا کہ
ڈاکٹر فنڈر سے مباحثہ کرے لیکن مولوی رحمت اللہ کے دارالخلافہ میں
پہنچنے سے پہلے ڈاکٹر فنڈر وفات پا چکا تھا۔ (صفحہ:۲۲)

پادری برکت کا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ مولانا رحمت اللہ 1864ء میں قسطنطنیہ پہنچے ہیں جبکہ بقول پادری برکت اللہ پادری فنڈر نے 1865ء میں قسطنطنیہ چھوڑا اور یکم دسمبر 1865ء کو اس کا انتقال ہوا۔ گویا پورے ایک سال کا فرق ہے۔

سلطان اور دیگر علمائے کرام نے حضرت مولانا کیرانویؒ سے وہ سارے دلائل و براہین سنے جو انہوں نے آگرہ کے مناظرہ میں پادری فنڈر کے سامنے پیش کیے تھے۔ انہیں یہ بھی پتہ چلا کہ ان دلائل کا جواب پوری عیسائی دنیا کے پاس نہیں ہے، لیکن ان دلائل سے عام علماء واقف نہ تھے کیونکہ انہوں نے عیسائی مذہب کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں، لہٰذا سلطان مرحوم اور خیرالدین پاشا نے حضرت مولانا کیرانویؒ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان دلائل پر مشتمل ایک کتاب لکھی جائے تا کہ دوسرے علماء بھی اس سے اس قدر مستفید ہوں کہ ہر عالم اپنی جگہ پر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ثابت ہو اور کسی پادری فنڈر کو کسی عالم کو للکارنے کی جرأت نہ ہو۔ چنانچہ سلطان کی خواہش اور صدر اعظم جناب خیرالدین پاشا کی تحریک پر ماہ رجب 1280ھ میں حضرت مولانا کیرانویؒ نے "اظہار الحق" تحریر شروع کی اور آخر ذی الحجہ 1280ھ میں یعنی چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں اس مدلل اور عالمانہ کتاب کو مکمل کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کتاب کیا۔ مسودہ صدر اعظم جناب خیرالدین پاشا نے بھی پڑھا۔ مقدمہ میں حضرت مولانا کیرانویؒ نے لکھا تھا کہ

"پھر مجھے مکہ مکرمہ کی حاضری کا اتفاق ہوا، اور میں حضرت الاستاذ
علامہ سیدی وسندی ومولائی سید احمد بن زینی وحلان اوام اللہ فیضہ،

Marfat.com

کی چوکھٹ پر حاضر ہوا۔ موصوف نے حکم دیا کہ میں ان پانچوں
مباحث کا ان کتابوں سے جو اس سلسلہ میں میں نے تالیف کی
ہیں، عربی زبان میں ترجمہ کروں۔"

خیرالدین پاشا نے جب یہ پڑھا تو حضرت مولانا کیرانویؒ سے فرمایا کہ آپ نے تو یہ کتاب امیر المؤمنین سلطان عبدالعزیز خان کی خواہش پر لکھی ہے۔ اس لیے اس پر سید احمد دحلانؒ کے بجائے امیر المؤمنین کا ذکر ہونا چاہیے تھے، لیکن آپ نے بجائے اس کے مکہ مکرمہ کے شیخ العلماء کا ذکر فرمایا ہے؟ حضرت مولانا کیرانویؒ نے صدر اعظم کے جواب میں فرمایا:

"خالص مذہبی خدمت میں کبھی دنیوی غرض اور مقصد کا کوئی شبہ نہ
آنا چاہیے۔ اس کے علاوہ مکہ مکرمہ میں خود شیخ العلماء سید احمد
دحلانؒ مجھ سے ان حالات کے قلم بند کرنے کی خواہش کا اظہار کر
چکے تھے، اور ابتدائی مواد کی ترتیب کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا اصل سبب شیخ العلماء
ہیں۔ اگر وہ مجھے امیر مکہ تک نہ پہنچاتے تو میری رسائی یہاں تک نہ
ہوتی اور مجھے اس خدمت کا موقع نہ ملتا۔"

حضرت مولانا کیرانویؒ کے اس جواب سے امیر المؤمنینؒ اور صدر اعظمؒ دونوں خوش ہو گئے۔

حضرت مولانا مرحوم قسطنطنیہ کے قیام کے زمانہ میں اکثر علماء اور مختلف مذاق اور خیال کے اہل علم وغیرہ اصحاب شاہی مہمان خانے میں آتے تھے۔ مختلف مذہبی مسائل پر تبصرہ اور تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ یورپ کی تعلیم اور نئی روشنی کا اثر یہاں تک پہنچ چکا تھا۔ لوگوں کے ذہن یورپی نظریات سے متاثر ہوتے نظر آرہے تھے، اس لیے حضرت مولانا مرحوم نے ضرورت کا احساس کرتے ہوئے بعثت و نبوت، حشر و نشر اور نزول وحی وغیرہ امور کو عقلی دلائل سے ثابت کیا، کیونکہ مغربی اقوام کی تقلید میں یورپی تعلیم و تہذیب کے گرویدہ مسلمان بھی عقل کے بچاری ہوتے جارہے تھے۔ اس کتاب کا نام آپ نے

''تنبیہات'' رکھا۔ آپ اس کتاب کی تالیف سے جمادی الآخرہ 1281ھ میں فارغ ہوئے۔ یہ رسالہ صدر اعظم خیرالدین پاشا تونسی کے حکم سے طبع ہوا۔ مصر میں اظہار الحق کے بعض مطبوعہ نسخوں کے حاشیہ پر یہ رسالہ چھپا ہوا ہے۔

مدرسہ صولتیہ کا قیام:

قسطنطنیہ سے واپسی کے بعد مسجد حرام میں آپ نے پھر درس و تدریس کا سلسلہ جاری فرما دیا۔ سب سے پہلے حضرت مولاناؒ نے معقول سے طلبہ کو روشناس کرایا اور خاص طور پر ریاضی میں علم ہیئت کی تدریس شروع کی جو حجاز مقدس میں تعلیمی حیثیت سے غیر معروف تھا۔ یہ طریقہ تعلیم خالص ہندوستانی تھا۔ عرب ممالک میں معقولات کی تعلیم پر اتنا زور نہیں دیا جاتا۔ اس زمانے میں جبکہ لوگ عقل پرست ہو گئے ہیں معقول سے طلبہ کو روشناس کرانا نہایت ضروری ہے۔ علاوہ ازیں علم صرف مستقل طور پر داخل درس نہ تھا بلکہ نحو کے ساتھ علم صرف کی ابتدائی معلومات پڑھائی جاتی تھیں۔ حضرت مولاناؒ نے صرف کی تعلیم کو نحو سے الگ کیا۔ اسی کے ساتھ یہاں کے طریقۂ درس و تدریس اور مقامی اہم ضرورتوں پر کافی غور کے بعد یہ رائے قائم کی کہ یہاں ایک ایسے دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا جائے جو اپنے اندر مرکزیت کی شان رکھتا ہو۔ دنیا کی مختلف زبانیں جاننے والے علماء مدرس ہوں اور ایسا نصاب تعلیم رائج کیا جائے جو دینی اور دنیوی ضروریات کا متکفل ہو۔ اگرچہ سلطنت عثمانیہ ان علمائے حرم اور باکمال افراد کی حوصلہ افزائی میں لاکھوں روپیہ بے دریغ صرف کر رہی تھی جو مسجد حرم میں درس و تدریس میں مشغول تھے مگر اس میں جو نقائص پائے جاتے تھے وہ حسب ذیل ہیں:

1- وہ علماء جو اپنے درس و تدریس کو کسی نظام اور کام کو ضابطہ کی ماتحتی میں انجام نہیں دے رہے تھے۔

2- کوئی مخصوص نصاب تعلیم رائج اور مقرر نہ تھا اور جو کچھ پڑھایا جاتا تھا وہ طلبہ میں کسی قسم کی قابلیت واستعداد پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

3- طریقۂ تعلیم کی حالت نہایت ابتر تھی اور سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ کتاب کی

Marfat.com

عبارت کو خود استاد بڑھتا اور خود ہی مطلب بیان کرتا۔ شاگرد اُسے استاد کا ایک وعظ سمجھتے اور اپنے دماغ پر زور ڈالنے کے عادی نہ تھے۔ استاد سے سوال کرنا یا نفس مسئلہ پر اعتراض پیدا کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ سمجھنے یا توضیح کے لیے استفسار بے ادبی میں داخل تھا۔

-4 مدارس میں جو علوم پڑھائے جاتے تھے ان میں نحو، فقہ، تفسیر اور حدیث پر تمام عمر ختم ہونے کے باوجود تکمیل یا اعلیٰ قابلیت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ تفسیر جلالین جو عالم طور پر ہندوستان میں سال بھر میں پڑھائی جاتی تھیں، اس وقت سات سال میں ختم ہوا کرتی تھی۔ باقی علوم کے پڑھنے اور فنون کے حاصل کرنے کا نہ رجحان و شوق تھا اور نہ تبحر و استعداد کے ساتھ پڑھانے کی ہمت تھی۔

-5 ان مہاجرین کی اولاد کے لیے جو مختلف اسلامی ممالک سے ہجرت کر کے آتے تھے کسی قسم کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ان کی اولاد غیر تربیت یافتہ اور جہالت و بداخلاقی کا شکار تھی۔ نہ وہ دنیا کے کسی کام کی تھی اور نہ دین کے لیے مفید۔

-6 مکہ مکرمہ کو سرچشمۂ دین اور مرکز اسلام خیال کر کے ہر سال اسلامی دنیا کے دور دراز مقامات سے بڑی تعداد میں متلاشیان علوم دینیہ اس شوق میں آتے تھے کہ اس چشمہ سے سیراب ہوں، مگر اس زمانہ میں یہاں ان طلبہ کی تعلیم کا کوئی انتظام تھا اور نہ قیام و طعام اور دیگر ضروریات تعلیم کی کوئی صورت تھی۔

ان تمام حالات اور گرد و پیش کی ضرورتوں پر کافی غور کرنے کے بعد حضرت مولانا کیرانویؒ پہلے شخص تھے جنہوں نے اہل حرم اور شائقین علوم دینیہ کی ضرورت کا احساس کیا اور اپنے حکیمانہ دماغ سے یہ بات پیدا کی کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مٹی ہوئی درسگاہ کا زمین حرم پر احیاء کیا جائے۔ مہاجرین کی اولاد اور اہل عرب کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے انتظام کے ساتھ صنعت اور دستکاری سکھانے کے لیے ایک باقاعدہ صنعتی اسکول بھی اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیا جائے تاکہ اہل حجاز اور ان مہاجرین کی اولاد ضروری اور ابتدائی تعلیم کے بعد گداگری اور افلاس کا شکار ہو کر اسلام کے لیے باعث ننگ و عار نہ بنیں۔

حضرت مولانا کیرانویؒ مکہ مکرمہ کے ہندوستانی مہاجرین اور اہل خیر اصحاب کو اس اہم ضرورت کی طرف متوجہ فرماتے رہے۔ اس سلسلہ میں متعدد اجتماعات ہوئے۔ کئی لوگوں کو دعوت دی گئی، لیکن کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی، لیکن دین اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اپنے دین کا وہ خود محافظ ہے اور اس کے لیے اسباب بھی وہ خود مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا کیرانویؒ کی کوشش کی وجہ سے جب مدرسہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو آخر میں یہ طے پایا کہ نواب فیض احمد خان صاحب مرحوم رئیس ضلع علیگڑھ جو اس زمانہ کے طبقۂ مہاجرین میں دنیوی وجاہت کے لحاظ سے ممتاز حیثیت کے حامل تھے، ان کے ذاتی مسکونہ مکان کے ایک حصہ میں اللہ کا نام لے کر مدرسہ کی ابتداء کر دی جائے تاکہ ممتاز ہندوستانی مہاجرین کی ہمدردی اور عملی شرکت اس کار خیر کو حاصل رہے۔ مکہ مکرمہ کے اس سب سے پہلے مدرسہ کی سب سے پہلی تاریخی اور بنیادی اپیل جو کی گئی وہ درج ذیل ہے:

> ''حمد ونعت کے بعد عرض یہ ہے کہ اکثر ہندی اہل توفیق کی ہمت سے حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً میں بعضے بعضے خیر کے کام جیسے رباطیں اور سبیلیں تیار ہوگئی ہیں، پر اب تک کوئی مدرسہ ان کی طرف سے یہاں نہیں ہے حالانکہ اور کاموں سے یہ کام بھی بڑا خیر کا کام ہے، اس لیے یہ عرض ہے کہ جو اس امر میں شریک ہوں وہ اپنا نام مع اس رقم کے جو انہیں ماہانہ دینا منظور ہو لکھ دیں اور تھوڑے بہت کا خیال نہ کریں کہ تھوڑا تھوڑا اکٹھا ہو کے بہت ہو جاتا ہے۔ اور اس مدرسہ کے تدریس کے اور خرچ کے قواعد ان لوگوں کی رائے سے مقرر ہوں گے جو اس امر کے لیے بمشورہ مقرر کیے جائیں گے۔ فقط
>
> المرقوم ماہ رمضان المبارک 1290 ہجری قدسی

جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لیے اٹھتا ہے تو بے سروسامان لوگوں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ اسباب مہیا فرما دیتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ خدمت دین کے لیے اٹھے۔ اپنی طرف سے دینی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم

Marfat.com

کرنے کا عزم کیا۔ کوشش کی کہ تمام اسباب مہیا ہوں۔ جب نہ ہوئے تو توکلاً علی اللہ ایک شخص کے چھوٹے سے مکان میں اس کار خیر کو شروع کر دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک نیک دل خاتون کے ذریعہ ان کی ایسی مدد فرمائی کہ اس نہال خیر کا ثمر آج تک قائم ہے۔

موسم حج 1290ھ میں کلکتہ کی ایک اولوالعزم، نیک سیرت، نیک طینت اور مخیّر خاتون محترمہ صولت النساء بیگم صاحبہ اپنی لڑکی اور داماد حکیم نوازش حسین صاحب کے ساتھ حج کے لیے تشریف لائیں۔ ہر نیک دل اور صاحب استطاعت مسلمان کی یہ دلی خواہش اور قلبی اُمنگ ہوتی ہے کہ وہ مکہ مکرمہ اور دیار رسولؐ میں کوئی ایسا صدقہ جاریہ اور نیک کام کر جائے جو اس کے لیے ذخیرہ آخرت ثابت ہوئے۔ محترمہ صولت النساء بیگم صاحبہ بھی اپنے حج کے دوران کوئی صدقۂ جاریہ قائم کرنا چاہتی تھیں۔ آج دولت کی بہتات اور فراوانی نے لوگوں کے دلوں میں بخل پیدا کر دیا ہے۔ لوگ اپنی ذاتی شان، ذاتی وجاہت اور اپنی دولت کی نمائش اور ریا کے لیے تو لاکھوں کروڑوں صرف کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور خرچ کرتے بھی ہیں، لیکن دین کے لیے خرچ کرنے میں ہماری مٹھیاں بھینچ جاتی ہیں۔ اس زمانے کے دولت مند حضرات دیندار بھی ہوتے تھے اور دین کے لیے اپنی دولت صرف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ صولت النساء بیگم صاحبہ دولت مند بھی تھیں اور دیندار بھی۔ دیندار ذہن میں حرمین شریفین کی سرزمین کے اثرات کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ وہ وہاں یہی چاہتا ہے کہ اللہ کے رستہ میں اپنی ساری دولت خرچ کر کے اپنے لیے ذخیرۂ آخرت بنا لے۔ صولت النساء بیگم نے مکہ مکرمہ میں حجاج کرام کے قیام کے لیے ایک رباط (مسافر خانہ) بنانے کا ارادہ فرمایا۔ اس سے قبل بھی مختلف مخیّر حضرات نے مکہ مکرمہ میں حاجیوں کے لیے کئی رباط قیام تعمیر کیے جن سے حاجی حضرات فائدہ اٹھا رہے تھے۔ حاجی اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوتے ہیں۔ ان کی خدمت کرنا اور ان کو کسی قسم کی سہولت فراہم کرنا اللہ کے ہاں اجر عظیم کا باعث ہوتا ہے۔ اس اجر عظیم کے حصول کے لیے صولت النساء بیگم صاحبہ بھی ایک رباط بنوانا چاہتی تھیں۔ جذبہ بڑا نیک تھا۔ موصوفہ کے داماد اکثر مسجد حرام میں حضرت مولانا کیرانویؒ کے حلقۂ درس میں ہندوستانی ہونے کے ناطے شریک ہوتے تھے۔ ایک دن حضرت مولانا مرحوم کے درس

Marfat.com

سے فراغت کے بعد انہوں نے آپ سے اپنی خوشدامن صاحبہ کے مبارک ارادہ کا ذکر کیا اور آپ سے اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔ حضرت مولانا مرحوم نے فرمایا کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں رباطوں اور مسافر خانوں کی کوئی کمی نہیں۔ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ایک ایسے مدرسہ کی ہے جس میں غیر ممالک خصوصی طور پر ہندو پاک کے مہاجرین کے بچے تعلیم حاصل کر سکیں۔'' اس نے محترمہ صولت النساء بیگم صاحب سے حضرت مولانا کی اس خواہش کو بیان کیا۔ دوسرے روز بیگم صاحبہؒ حضرت مولانا کیرانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ کی اس رائے کو انتہائی مسرت کے ساتھ پسند فرماتے ہوئے مدرسہ کے لیے زمین کی خرید وغیرہ کے لیے گفتگو کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بلند ہمت اور مخیّر خاتون سے یہ عظیم الشان کارِ خیر لینا تھا۔ چنانچہ محلّہ خندریسہ میں جگہ خریدی گئی اور فی الفور مدرسہ کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ اکثر صولت النساء بیگم صاحبہ خود تعمیر کا کام دیکھنے کے لیے تشریف لاتیں اور اپنی خوش قسمتی اور کارِ خیر کی توفیق پر اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتیں۔ مدرسہ کے سب سے پہلے رجسٹر کی ابتدائی عبارت جو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مبارک قلم کی ہے، ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

> ''حمد اور نعت کے بعد یہ ہے کہ اگرچہ مدرسہ ہندیہ حضرات اہل ہند کی ہمت اور توجہ سے مکہ معظمہ ادام اللہ شرفہا میں سنہ بارہ سو نوے رمضان کے مہینے میں قائم ہوا تھا۔ پر اسباب چند در چند سے جو اس سنہ کے چار مہینوں میں کئی طرح کے ہرج پیش آئے۔ سو اس لحاظ سے ہم ان چار مہینوں کو نظر سے گرا کر اس مدرسہ کے قیام کو محرم الحرام بارہ سو اکانوے (1291ھ) گنتے ہیں اور سب امور متعلقہ اس مدرسہ کو اسی سال سے لیتے ہیں۔ اللہ خیر سے ان امور کو انجام دیجو۔ بمنہ وکرمہ۔
> 12 شعبان 1291ھ روز چہار شنبہ میں مدرسہ صولتیہ جدیدہ میں سب مدرسوں اور طالب علموں کو لایا گیا۔ یکم شعبان 1292ھ سے نواب محمود علی خان بہادر والی چھتاری نے سو روپیہ ماہوار اس مدرسہ کے مقرر کر دیئے۔''

Marfat.com

ازل سے علم الٰہی میں یہ سعادت اور فخر اس بیوہ خاتون کے حصہ میں تھا، اس لیے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے ان کے اس ایثار کی بہتر یادگار کے طور پر مرکز اسلام کے اس اولین علمی عمارت کا نام ''مدرسہ صولتیہ'' رکھا جو قیامت تک اس کے نام کو عزت اور سچی ناموری کے ساتھ زندہ رکھے گا۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا کیرانویؒ جب سرزمین پاک و ہند سے ہجرت فرما کر نہایت بے سروسامانی کے ساتھ مکہ مکرمہ پہنچے۔ یہاں پہنچنے کے بعد حضرت مولانا نے اپنی تعمیری و اصلاحی ذہن وفکر سے بہت جلد یہ حقیقت مشاہدہ فرمالی کہ مکہ مکرمہ میں باقاعدہ تعلیم کا نہ کوئی معیار ہے اور نہ کوئی مرکز۔ جس کا دل چاہے پڑھے نہ دل چاہے نہ پڑھے۔ علماء کرام کے حلقہ ہائے درس سے کما حقہ وہ نتائج نہیں پیدا ہورہے تھے جو اس مقام کے شایانِ شان تھے۔ چنانچہ چند روز بعد اس اجنبی ماحول میں رب العالمین کی طرف سے حالات سازگار ہوتے ہی آپ نے سب سے پہلے مسجد حرام میں بیت اللہ کے سامنے مقام حنفی سے متصل ماہ ربیع الاول 1285ھ میں مدرسہ ہندیہ کے نام سے ایک دینی مدرسہ کا آغاز فرمایا اور اس کو اس نظم وضبط اور اصولوں کے تحت چلانا شروع کیا جو آپ کے کوزۂ ذہن میں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل حرم نے جب یہ منظم تعلیم دیکھی اور نیا طریقۂ تدریس ملاحظہ کیا۔ سلیبس نیا اور کتابیں نئی دیکھیں تو پروانہ وار اپنی اولاد اور بچوں کو حضرت مولاناؒ کے اس نئے مدرسہ میں تعلیم دلانے کے لیے لانے لگے۔ وہ لوگ اس طریقۂ تعلیم اور انداز تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے، لیکن مسجد حرام کا ماحول تعلیم کی سازگاری اور انضباط کے لیے نامناسب تھا۔ کسی مقصد کی بنیاد خلوص وللّٰہیت پر ہو تو قدرت خود کارساز ہوتی ہے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کا مقصد صحیح اور نیت میں خلوص تھا اس لیے حق تعالیٰ شانہ نے خاص مدد فرمائی اور مہاجرین حرم کے طبقۂ خواص مین دتاؤلی ضلع علیگڑھ کے نواب فیض احمد صاحب حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی قربانیوں، خلوص اور ان کے مقام سے بخوبی واقف وآشنا تھے اور روزانہ آپ کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے، اس وجہ سے آپ کے علم سے بھی بہت متاثر تھے۔ چنانچہ جب مدرسہ کے لیے جگہ کا مسئلہ پیدا ہوا اور کسی جگہ کا حصول ناممکن نظر آنے لگا تو نواب صاحب مرحوم نے

Marfat.com

اپنے عالیشان مکان کی پہلی منزل مدرسہ کے لیے پیش کر دی۔ نواب صاحب مرحوم کے مکان کی جگہ چونکہ تھوڑی تھی لہٰذا مسجد حرم کے مدرسہ کے صرف اُن طلبہ کو اس مکان میں منتقل کیا گیا جو ابتدائی اسباق اور قرآن حکیم کے طلبہ تھے اور بڑی کتابیں پڑھنے والے طلبہ مسجد حرام میں مصروف رہے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کے ذہن میں طلبہ کی ان دو جگہوں پر تقسیم عارضی تھی۔ آپ ان دونوں قسم کے طلبہ کو اس مستقل مدرسہ میں رکھنا چاہتے تھے جس کا منصوبہ آپ کے ذہن میں تھا۔ اسباب فراہم کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک بندہ اس کی بارگاہ میں دعا ہی کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا کیرانویؒ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ہر وقت دست بدعا رہتے تا کہ کسی طرح مدرسہ کی مستقل و منظم تعمیری صورت پیدا ہو جائے۔ حق تعالیٰ شانہ نے حضرت مولانا کیرانویؒ کی دعاؤں کو شرف قبولیت سے نوازا اور 1289ھ میں محترمہ صولت النساء بیگم صاحبہ حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ تشریف لائیں۔ ان کے ساتھ ان کی صاحبزادی اور ان کے داماد حکیم نوازش حسین صاحب مرحوم بھی تھے۔ اس نیک دل خاتون نے حضرت مولانا کیرانویؒ کے اس ذہنی منصوبے کو علمی شکل دی اور محلّہ خندریسہ میں وہ مدرسہ جاری کیا جس کو "مدرسہ صولتیہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

صولت النساء بیگم صاحبہؒ:

صولت النساء بیگم صاحبہ کون تھیں؟ کہاں کی رہنے والی تھیں؟ ان کا نسبی حدود اربعہ کیا تھا؟ یہ جاننا بھی ضروری ہے۔ اس بارے میں مدرسہ صولتیہ کے مرحوم مہتمم حضرت مولانا محمد مسعود شمیم کیرانویؒ، جنہوں نے اس کتاب کی تالیف پر احقر کو آمادہ کیا، کی تحقیق یہاں نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا شمیم صاحبؒ نے مرحومہ کے بارے میں بڑی تحقیق کی ہے۔ حضرت مولانا شمیم صاحبؒ فرماتے ہیں۔

کسے معلوم تھا کہ بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ کے ایک غیر معروف اور نامانوس گاؤں بھسیلہ سے ایک ایسی ہستی پیدا ہو گی جس کا فیض روئے زمین کے مقدس ترین خطہ سے اطراف عالم میں جاری و ساری ہو گا اور ہزاروں تشنگانِ علم اس سے معارف اسلامیہ

Marfat.com

اور علوم محمدیہ کی دولت لے کر اطراف عالم کو سیراب کریں گے۔ اس کا نام سورج کی روشنی اور چاند کی ٹھنڈک کا مصداق ہوگا، مگر قدرت کے کام نرالے ہیں۔ وہ جس کو چاہے نواز دے اور جس کو چاہے محروم کردے۔ قدرت کا یہ دستور انسانی فکر وفہم سے بالاتر ہے۔

کلکتہ سے جنوبی مشرقی سمت تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلہ پر بھسیلہ نامی گاؤں یا آبادی ہے جس کے متعلق وہاں کے لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ کسی زمانہ میں حضرت شاہ وسیلۃ اللہؒ نامی کوئی بزرگ وہاں آباد ہوئے اور چونکہ اس جگہ کا کوئی نام نہیں تھا اس لیے ان کے زہد وتقدس اور صلاح وتقویٰ سے متاثر ہوکر ان کے نام نامی پر اس آبادی کا نام پڑ گیا جو امتداد زمانہ اور تلفظ بگڑنے کی بنا پر وسیلۃ اللہ سے بھسیلہ ہوگیا۔ انگریزوں کے زمانے میں سرکاری کاغذات میں اس کو Bhaselah لکھا جاتا تھا جو اب تک رائج ہے۔

اُسی آبادی میں حضرت شاہ وسیلۃ اللہؒ کی نسل اور اولاد میں ایک صدیقی خاندان کے عابد و زاہد اور نیک نام اور نیک سیرت مولوی اجابت حسین صاحبؒ تھے۔ قدرت نے دنیوی اسباب و وسائل سے بھی خوب نوازا تھا۔ مولوی اجابت حسین کے ہاں سب سے پہلے ایک فرزند عبدالصمد نامی تولد ہوئے اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے چھ لڑکیوں کی پیدائش ہوئی اور جب ساتویں بیٹی کی ولادت ہوئی تو وہ بے حد غمزدہ اور کبیدہ خاطر ہوئے اور اس عطیہ ربانی کو ایک نظر دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوئے۔ ساتویں روز عقیقہ کے دن اعزا و اقارب کے اصرار پر ساتویں بیٹی کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے اور بے اختیار سینے سے لگالیا کہ اپنی سب بہنوں میں بے حد حسین وجمیل اور معصوم صورت تھی۔ سات دن کی بچی کے چہرے پر جلال و جمال کا معصوم امتزاج سب کو متحیر کیے ہوئے تھا۔ باپ نے بے اختیار دو رکعت نماز پڑھ کر سجدۂ شکر ادا کیا اور شاید اس وقت راضی برضا ہونے کی یہ ادا قدرت کو پسند آگئی اور باپ کی دعا اور سجدۂ شکر نے اس معصوم بچی کے لیے دنیوی اور اخروی سعادتوں کے فیصلے کروالیے۔

اس باسعادت دختر کی ولادت 1832ء میں ہوئی اور باپ کی زبان سے الہامی نام ''صولت النساء بیگم'' تجویز ہوا۔ اس وقت کے مروجہ طریقوں کے ساتھ اس کو قرآن پاک اور علوم دینیہ سے وافر حصہ پڑھایا۔ اس کی چھ بہنوں کی شادیاں متوسط

گھرانوں میں ہوئیں لیکن صولت النساء بیگم کی شادی منشی لطافت حسین سے ہوئی، جو کلکتہ، بلیا گھاٹ اور چوبیس پرگنہ کے بڑے زمیندار اور صاحب حیثیت اور صاحب خیر تھے۔ شادی کے بعد منشی لطافت حسین صاحب کی قسمت اور چمکی۔ جاہ وثروت میں دن بدن ترقی ہونے لگی۔ ان کے شوہر نے جب صولت النساء بیگم کے محبت وخلوص، انتظامی قابلیت اور امور خیر سے دلچسپی کے مظاہرے دیکھے تو 1882ء میں اپنی پوری جائداد ان کے نام منتقل کر دی اور اس کے ایک ہی سال بعد 1883ء میں وہ انتقال فرما گئے، جس کے بعد صولت النساء بیگم نے اپنے بڑے بھائی مولوی عبدالصمد صاحب عرف مانک میاں اور اپنی دو بہنوں کے صاحبزادوں منشی منتظر حسین اور منشی مبارک حسین کے ذمہ جائداد کی دیکھ بھال کا کام سپرد کیا اور خاوند کی یادگار میں ایک سڑک ''منشی لطافت حسین روڈ'' تعمیر کروائی جو آج تک اسی نام سے کلکتہ میں موجود ہے۔

اپنے قابل فخر اور محبوب شوہر کی وفات کے بعد محترمہ صولت النساء بیگم صاحب کی توجہ امور خیر کی طرف اور زیادہ بڑھ گئی، اور اسی جذبہ کے تحت انہوں نے 1289ھ میں اپنے داماد حکیم نوازش حسین صاحب مرحوم اور دیگر اعزا کے ساتھ حج کا ارادہ کیا اور یہ نیک عزم اور پاک ارادہ لے کر چلیں کہ اب مکہ معظّمہ میں بھی کوئی مسافر خانہ تعمیر کریں گی یا ٹھنڈے پانی کی سبیلیں جاری کرائیں گی، لیکن قدرتِ خداوندی ان کے حصہ میں ایسا کار خیر لکھ چکی تھی جو ان کے بلند عزائم اور پرخلوص ارادوں سے کہیں زیادہ پاک ومقدس اور مقبول بارگاہ الٰہی تھا۔

ہندوستان میں انقلاب 1857ء کے حالات ایسے نہیں تھے کہ جن سے کوئی قومی وملی درد اور تعلق رکھنے والا بے خبر رہا ہو۔ خود بنگال کا علاقہ بھی بہت پہلے سے انگریزی سیاست کی زد میں آکر فرنگی اقتدار کا مرکز بن چکا تھا بلکہ ابتدا وہیں سے ہوئی تھی جس کی بڑی دردناک اور سنگین قربانی نواب سراج الدولہ مرحوم دے چکے تھے۔ خاص طور پر عیسائی مشنریوں اور مسیحی طاقتوں کے ساتھ حضرت مولانا رحمت اللہ مرحوم کے مناظروں نے تمام ہندوستان میں ہمہ گیر شہرت اختیار کر لی تھی جن سے صولت النساء بیگم بھی پوری طرح واقف وباخبر تھی۔ چنانچہ مکہ معظّمہ پہنچنے کے بعد پہلی فرصت میں انہوں نے اپنے

Marfat.com

داماد حکیم نوازش حسین صاحب مرحوم کے ساتھ حرم پاک میں حضرت مولاناؒ کے درس بخاری کے بعد ملاقات کی اور مکہ معظّمہ میں مسافر خانہ یا ٹھنڈے پانی کی سبیل کی تعمیر کے متعلق ارادے کا اظہار فرمایا۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا کہ ''الحمد للہ مکہ معظّمہ میں یہ دونوں کارِ خیر بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں مگر مدرسہ کوئی نہیں ہے جہاں اہل حرم کی اولاد اور مہاجرین کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا نظم ہو۔''

کعبہ مکہ کے دروازہ پر طویل دعاؤں کا زیر اثر حضرت مولانا کیرانویؒ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ چند الفاظ اس پاک طینت خاتون کے دل میں اتر گئے اور یہ ابدی سعادت رحمت کے فرشتوں نے اس خاتون کے نام لکھ دی اور دوسرے دن پھر حرم پاک کے مبارک ماحول میں درس بخاری شریف کے بعد صولت النساء بیگم صاحبہ نے مدرسہ کے لیے زمین کی خرید اور تعمیر وغیرہ کے لیے وہ رقم لا کر پیش کر دی جس کو ہندوستان سے کسی کارِ خیر کے لیے ساتھ لائی تھی اور مدرسہ کے سب سے پہلے رجسٹر میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کے قلم مبارک سے لکھی ہوئی تحریر کے مطابق 12 شعبان المعظم 1290ھ بروز چہار شنبہ تمام طلبہ و مدرسین کو نئی عمارت میں لایا گیا اور یہی دن مدرسہ کی تاسیس کا مقرر ہوا، اور حضرت بانیؒ کی ایک دوسری تحریر اس مضمون کی بھی درج رجسٹر ہے کہ تمام اسباق کی تنظیم اور باقاعدہ آغاز یکم رمضان المبارک 1291ھ کو ہوا۔ مکہ مکرمہ کی تاریخ میں چہار شنبہ 12 شعبان المعظم 1290ھ کا یہ دن آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ اس سے پہلے سرزمین پاک پر کوئی مدرسہ نہیں تھا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے مدرسہ کے افتتاح کے لیے حرم محترم کے تمام علماء و مدرسین اور صلحاء اور اتقیاء مکہ کو مدعو فرمایا۔ چنانچہ مسجد حرام میں صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد سب حضرات مدرسہ میں آنے شروع ہو گئے۔ جو بھی آتا سب سے پہلے چار رکعت نماز اشراق ادا کر کے قرآن پاک اور سورۂ یٰسین کی تلاوت میں مشغول ہو جاتا۔ سب اکابر کی تشریف آوری کے بعد مدرسہ کے قاری جناب شیخ ابراہیم سعد مصری نے طلبہ کو قرآن کریم شروع کرایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے بخاری شریف شروع فرمائی۔ جس کے بعد شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے مثنوی شریف کے درس سے اس یوم افتتاح کی برکتوں

میں اضافہ فرمایا جس کے بعد طویل دعا ہوئی اور دعا کے بعد تمام مہمانوں، شرکائے مجلس اور طلبہ کو ناشتہ کرایا گیا۔

ذرا آنکھ بند کر کے عالم تصور میں اب سے ایک سوتیس سال قبل اپنے مدرسہ صولتیہ کے یوم افتتاح و آغاز کی اس نورانی مجلس کا تصور کیجئے کہ مکہ مکرمہ کے صلحاء اور اتقیاء کی موجودگی میں حضرت اقدس مجاہد اسلام مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ اور قطب الاقطاب حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ کی سرپرستی میں قرآن کریم، بخاری شریف اور مثنوی کے اسباق سے آغاز ہوا۔ کیسے کیسے اہل اللہ، صاحب دل اور مسجد حرم کے ائمہ و خطباء اور اس دور رحمت کے فرشتہ سیرت، پاک طینت بزرگانِ دین اس مجلس میں جمع ہو گئے، جن کی روحانی برکتوں اور دعاؤں کے زیر سایہ باری تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ سلسلہ فیض و رحمت زمانہ کے گرم و سرد جھیلتا ہوا الحمدللہ سرگرم سفر ہے۔

ابھی سطور بالا میں قاری ابراہیم سعد صاحبؒ کا نام گزرا ہے۔ یہی وہ صاحب فیض ہستی ہیں جن کے دست مبارک پر مدرسہ کے عہد اول میں شیخ القراء حضرت قاری عبداللہ صاحب مکی اور اُن کے بھائی حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب الہ آبادی جیسی عظیم ہستیوں نے قرآن و تجوید کی دولت حاصل کر کے اس کو مشرق و مغرب میں پھیلایا۔ قاری ابراہیم سعد مصر کے رہنے والے تھے۔ نہایت عابد، زاہد اور قرآن پاک کے عاشق تھے۔ کعبہ کے زیر سایہ خدمت قرآن کے پاک جذبہ کے ماتحت اپنے وطن سے ہجرت کر کے مکہ معظّمہ آ گئے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے درس بخاری میں آ کر بیٹھنے لگے تو پھر حضرتؒ ہی کے ہو کر رہ گئے اور اُن کے مدرسہ میں بچوں کو قرآن پڑھانے پر مامور کیے گئے اور آخر دم تک مدرسہ سے وابستہ رہے۔

بارگاہ رب العزت میں صولت النساء بیگم کے خلوص کی قبولیت اور سچے تعلق کے ثبوت کے لیے یہ ایمان پرور روحانی قصہ بھی سنتے چلئے کہ مدرسہ کے لیے خرید زمین اور تکمیل عمارت میں جس قدر رقم صولت النساء بیگم کے پاس تھی وہ صرف ہو چکی مگر عمارت میں پانی کے اسٹور یا مخزن کی تعمیر نہیں ہوئی تھی اور مکہ معظمہ میں اس وقت ہر محلّہ یا علاقہ میں نہر زبیدہ کا پانی ہر گھر تک نہیں پہنچا تھا بلکہ محلوں میں قدیم طرز کے سقایہ تھے جن کو

Marfat.com

ترکی زبان میں بازان کہا جاتا تھا جن سے سقے اور اہل محلّہ مشکوں اور کنستروں کے ذریعے گھر گھر پانی پہنچاتے تھے، اس لیے ہر گھر میں پانی کے لیے زمین دوز مخزن بنائے جاتے تھے جن میں بارش کا پانی محفوظ کرنے کا انتظام اس طرح کیا جاتا کہ چھتوں کو پختہ بنوا کر دیواروں میں ہضمی نالیاں زمین دوز مخزن تک پہنچائی جاتی تھی تاکہ بارش کا پانی از خود چھتوں سے جمع ہو کر آتا رہے۔ پانی کا مخزن دراصل مدرسہ میں تیار نہیں ہوا تھا اور یہی کام باقی تھا کہ سابقہ رقم ختم ہوگئی۔ دوسرے روز صولت النساء بیگم نے خواب میں دیکھا کہ ان کو جنت الفردوس میں ایک نہایت عالی شان محل عطا ہوا ہے جس کو دیکھ کر وہ بے انتہاء مسرور ہو رہی ہیں مگر اسی کے ساتھ خود شدید پیاس محسوس کر کے پانی تلاش کر رہی ہیں، مگر اس میں کوئی سقایہ یا حمام وغیرہ کا نظم پانی کے لیے نہیں ہے۔ اور نہ ہی پانی کہیں نظر آتا ہے۔ شدت پیاس سے ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ صبح کی نماز کے بعد صولت النساء بیگم صاحبہ بعجلت تمام اپنے داماد حکیم نوازش حسین صاحب کے ساتھ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور خواب بیان کر کے جو روپیہ واپسی سفر کے اخراجات کے لیے ساتھ تھا وہ سب دے کر التجا کی کہ بہت جلد مدرسہ میں طلبہ و مدرسین کے لیے وضو خانہ اور پانی کے مخزن کی تعمیر کرائی جائے۔ چنانچہ اس سے وہ بے حد خوش تھیں اور بار بار کہتی تھیں کہ انشاء اللہ یہ قبولیت کی علامت ہے۔ جب تک حیات رہیں ماہانہ پچاس روپیہ مدرسہ کو مزید اس تاکید کے ساتھ دیتی رہیں کہ اہل مدرسہ کو پانی کی تکلیف نہ ہو۔

ایمانی احساس و شعور رکھنے والے دل اور خدمت دین کے جذبہ اور سوز و درد سے معمور قلوب اس تذکرہ میں یقیناً ایک روحانی سوز و گداز پائیں گے۔ خلوص نیت اور زہد و تقویٰ کا یہ بلند مقام بھی جبین عقیدت کو خم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ نے اس کو کوئی اور نام دینے یا اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اصل محسنہ کے نام سے موسوم کیا۔ یہ ہے آپ کے مدرسہ صولتیہ کی وجہ تسمیہ اور اولین تاریخ کے چند نقوش۔

محترمہ صولت النساء بیگم صاحبہ مرحومہ نے حج سے واپسی کے بعد اپنے وطن بھسیلہ ضلع چوبیس پرگنہ بنگال میں بھی ایک مدرسہ ''صولتیہ'' کے نام سے قائم کیا اور اُس

Marfat.com

کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ ان دونوں امور خیر کے اخراجات کے لیے معقول جائداد وقف کی اور اپنے بڑے بھائی الحاج مولوی منشی عبدالصمد صاحب کو ان دونوں کا متولی مقرر کیا، مگر مولوی عبدالصمد صاحب کی وفات کے بعد ان کے فرزند منشی محمد عبداللہ صاحب نے اس مدرسہ کو مڈل انگلش سرکاری اسکول بنا دیا جو کچھ عرصہ کے بعد سرکاری نگرانی میں جونیر ہائی اسکول ہو گیا اور اب تک مغربی بنگال کی حکومت کے زیر نگرانی سرکاری اسکولوں کی طرز پر باقی ہے۔ مختلف زمانوں میں اس مدرسہ کے صدر اور سرپرست جناب مولوی کفیل الدین صاحب اور مولانا عبدالرزاق صاحب وغیرہ ہوئے جو اس علاقہ کی مشہور شخصیت گزرے ہیں۔ جناب مولوی برکت علی صاحب، صوفی قاری محمد مستقیم صاحب جیسے مشہور اساتذہ اس سے وابستہ رہے، اور بنگال کی مشہور علمی ہستی جناب مولانا مسرت حسین صاحب نے بھی اس میں 45 سال درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ مولانا مسرت حسین صاحب کے پوتے پروفیسر ڈاکٹر محمد شہید اللہ صاحب ایم۔ اے، بی۔ ایل، ڈی لٹ، پیرس صاحب علم و فضل اور متعدد اعلیٰ ڈگریوں کے حامل ہیں اور دنیا کے ممتاز ماہرین السنہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دنیا کی اکیس زبانوں کے ماہر ہیں۔ 1955ء میں بغرض حج مکہ معظمہ تشریف لائے تو بہت اہتمام سے اکثر و بیشتر مدرسہ صولتیہ میں تشریف لاتے تھے اور کئی زبانوں میں گفتگو فرماتے تھے۔

اپنے وطن میں متعدد امور خیر کے علاوہ صولت النساء بیگم صاحبہ نے کلکتہ میں اپنے عالی شان سکونتی مکان کے قریب ایک شاندار مسجد کے علاوہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے غریب طلبہ کے لیے ایک ہوسٹل بھی تعمیر کرایا اور اس ہوسٹل میں رہائش پذیر تمام طالب علموں کے اخراجات مقرر کیے۔ اسی طرح بنگال میں مسلمانوں میں دینی تعلیم اور عربی زبان کے رواج اور قرآن کریم کی تدریس و اشاعت کے لیے کئی کام کیے۔ علماء و طلبہ کی بے حد قدر افزائی اور سرپرستی کی جس کے اثرات اب تک جاری و ساری ہیں۔ مذکورہ بالا مسجد کے قریب انہوں نے باہر سے آنے والے مسافروں کے لیے ایک مفت مسافر خانہ تعمیر کرایا۔ رفاہ عام کے ان تمام کاموں کے لیے اپنی جائیداد وقف کی جس کے سب سے پہلے متولی صولت النساء بیگم صاحبہ کے لائق اور پاکباز فرزند الحاج مولوی محمد محسن صاحب

Marfat.com

تھے، جن کے بعد 1930ء تک یہ تمام ادارے مرحوم کے پوتے جناب مولوی منشی محمد عیسیٰ صاحب کی زیرِ نگرانی عمدگی کے ساتھ چل رہے تھے۔

صولت النساء بیگم کو فیاض ازل نے سراپا خیر و برکت پیدا فرمایا تھا۔ بچپن ہی سے علماء، مشائخ اور بزرگان دین اور اہل قرآن سے عقیدت و تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا گھرانہ بزرگ ہستیوں کا گویا مستقل مرکز تھا۔ اس زمانہ کے مشہور صوفی بزرگ اور اہل اللہ حضرت شاہ محمد بہاء الدین شامی کی شہرت سن کر نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ کلکتہ بلا کر اُن کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور اُن سے بیعت ہوئیں۔ یہ بزرگ ترکی خلیفہ سلطان عبدالحمید مرحوم کے بھی مرشد تھے۔ صولت النساء بیگم کے امور خیر سے غرباء، فقراء، بیوگان اور محتاج لوگوں وغیرہ کی جو امداد اور پرورش ہوتی تھی اس کے سچے قصے اب تک زبان زد خواص و عام ہیں۔ بہت سے عزیزوں کو انہوں نے اپنے خرچ سے حج کرایا۔ دوسرے یا تیسرے حج سے واپسی کے بعد جب بمبئی میں صولت النساء بیگم صاحبہ کے سب سے چھوٹے فرزند کا انتقال ہوا تو چالیسویں دن ایصال ثواب کے لیے بمبئی کے تمام ہی علماء اور بزرگوں اور کئی ہزار غرباء و مساکین کو مدعو کیا۔ حفاظ قرآن اور بزرگانِ دین کو ایک ایک جلد قرآن کریم کے ساتھ نذرانہ کی معقول رقم ہدیہ دی۔ حج بیت اللہ کے لیے جب تشریف لے جاتیں تو حرمین شریفین میں جود و سخا اور امداد کی انتہاء نہ رہتی۔ بہت سے حجاج کے اخراجات کا تکفل کرتیں۔ جنگ بلقان کے موقعہ پر صولت النساء بیگم صاحبہ نے ترکی کی حکومت کو پندرہ ہزار روپیہ کی تھیلی پیش کی۔

صولت النساء بیگم کا خاندان علماء اور مشائخ کا خاندان ہے جو پورے بنگال میں پھیلا ہوا ہے۔ خرخرہ شریف ضلع ہوگلی کا مشہور و معروف علمی اور روحانی خانوادہ صولت النساء بیگم کے بہت قریبی عزیز ہیں۔ اور اس مبارک سلسلہ کے سابقہ بزرگ حضرت مولانا شاہ محمد عبدالحیٔ صاحبؒ کی صولت النساء بیگم حقیقی پھوپھی ہوتی تھیں۔ خرخرہ شریف ضلع ہوگلی میں حضرت مولانا الحاج شاہ ابوبکر صاحب صدیقی کا روحانی فیض پورے بنگال، آسام اور بنگلہ دیش پر محیط ہے اور آپ "مجدد وقت" کہلاتے ہیں۔ ان صوبوں میں آپ کے مریدین و معتقدین کی کوئی انتہا نہیں۔ آپ حضرت شاہ سید صوفی فتح محمد صاحب اویسی

Marfat.com

رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق خیر سے بھرپور زندگی کے 76 سال پورے کرنے کے بعد ماہ فروری 1910ء میں جمعہ کے مبارک دن صولت النساء بیگم صاحبہ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور بلیا گھاٹ کلکتہ میں اپنی تعمیر کردہ مسجد کے احاطہ میں اپنے عزیز شوہر منشی لطاف حسین مرحوم کے برابر ابدی نیند سو رہی ہیں۔ صولت النساء بیگم صاحبہ مرحومہ کی تعمیر کردہ تمام مسجدیں اور عمارتیں الحمد للہ بدستور موجود ہیں، البتہ بلیا گھاٹ کلکتہ والی مسجد میں جہاں وہ خود مدفون ہیں، وہاں تقسیم ملک کے بعد مسلمان آبادی بتدریج کم ہونی شروع ہوئی تو مقامی ہندو اور بعد میں بنگلہ دیش سے آئے ہوئے شرنارتھی چاروں طرف آباد اور قابض ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک اس مسجد میں گنیش کی مورتی بھی رکھی رہی اور اس کی باقاعدہ پوجا ہوتی تھی۔ مگر اب مورتی ہٹا کر مسجد مقفل کر دی گئی ہے۔ اسی طرح صولت النساء بیگم کی خود سکنہ عالی شان کوٹھی میں بھی ہندو آباد ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مسجد اور قبریں اب تک تو محفوظ ہیں۔

مدرسہ صولتیہ کے جائے وقوع اور عمارتوں کے متعلق ناظم اعلیٰ حضرت مولانا محمد سعید صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اقتباس پر اس تاریخی تذکرہ کو ختم کرتا ہوں جو انہوں نے 1357ھ میں مدرسہ کی ایک تعارفی رپورٹ ''ندائے عام'' میں اپنے قلم سے شائع فرمایا۔

> ''مدرسہ صولتیہ کی عمارتیں جس جگہ واقع ہیں اس کا عہد جاہلیت سے قدیم تاریخی نام ''خندریسہ'' ہے اور عربی میں پرانی تند و تیز شراب کا نام خندریس ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہاں شراب کی بھٹیاں تھیں۔ میخانے آباد تھے اور جھومتے جھامتے مخموروں سے اس آبادی کی رونق تھی، لیکن اب الحمد للہ یہاں علوم نبویہ اور معارف الٰہیہ کی دو آتشہ وسہ آتشہ شراب حقیقت تشنگانِ علم کو پلائی جا رہی ہے۔ اور اب ہاتھوں میں بجائے ساغر و مینا کے کتاب معرفت اور دفتر حقیقت ہے۔ جہاں بدمست نظر آتے تھے اب

Marfat.com

وہاں مہاجرین حرم کے معصوم بچے اور دنیائے اسلام کے شائقین علم درس قرآن و حدیث میں منہمک نظر آتے ہیں۔ مدرسہ کی چاروں عمارتیں مکہ معظّمہ میں اسلام کی ان تاریخی یادگاروں کے درمیان واقع ہیں۔ جن سے ایک طرف جبل کعبہ وہ مقدس پہاڑ ہے جس کے پتھروں سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے کعبہ کی تعمیر فرمائی۔ دوسری طرف جبل عمروہ پہاڑ ہے جس پر اسلام کے عظیم المرتبت خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے بعد سب سے پہلے وحدہٗ لاشرک لہ، کے نام کی آواز بلند کی اور اپنے اسلام لانے کا اعلان فرمایا۔ کفرستانِ عالم میں خدائے ذوالجلال کے لیے یہ پہلی آواز حق مکہ کے پہاڑوں میں گونجی تو کفار مکہ کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا۔ مدرسہ کی تیسری عمارت بورڈنگ (دارالطلبہ) سے متصل وہ قطعۂ زمین ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے روپیہ سے خرید کر مسلمانوں کے لیے اُن کی آخری آرام گاہ قبرستان کے لیے وقف فرمایا تھا۔ جب عہد اول میں کفار قریش نے اسلام کے ان سابقین اولین کو اپنے قبرستان میں دفن ہونے سے روک دیا تھا۔ ''مقبرہ شبیکہ'' کے نام سے یہ بابرکت قطعۂ زمین اب تک موجود ہے۔ 1310ھ تک اس میں تدفین جاری تھی، اور ایک صدی قبل کے اکثر و بیشتر صلحاء واتقیاء اور اہل مکہ اس قطعۂ زمین میں اپنا مدفن ہونے کے لیے عہد اول کے ان نفوس قدسیہ کے قرب و پڑوس کے لیے متمنی رہتے تھے جو اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے اس میں مدفون ہیں۔ آپ کے مدرسہ صولتیہ کی عمارتیں اسلام کے ان پرانوار یادگاروں کے قریب ہیں جن کو بصارت سے نہیں بصیرت کی آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

Marfat.com

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارنیہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

اس ایمان افروز اور روحانی سوز و گداز سے لبریز تذکرۂ علم و عرفان کو پڑھ کر کیا یہ کہنا برمحل نہ ہوگا کہ سرزمین پاک مکہ معظّمہ میں اہل حرم کے لیے اب سے ایک ہزار ایک سو سال قبل عظیم المرتبت خلیفۂ ہارون الرشید کی بیگم زبیدہ خاتون نے پانی کی شکل میں نہر زبیدہ جاری کر کے تشنگان حرم کو سیراب کیا، بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے علمی پیاس بجھانے اور قلبی و روحانی سیرابی کے لیے دوسری زبیدۂ وقت صولت النساء بیگم کا انتخاب فرمایا جن کے مالی عطیہ اور مجاہد اعظم شیخ وقت حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مسلسل قربانیوں اور جاں فشانی کے نتیجہ میں مدرسہ صولتیہ کا فیض الحمداللہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ میں پورے عالم اسلام پر محیط ہے۔ 22 رمضان المبارک 1308ھ بروز جمعہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کے اس عالم فانی سے رحلت فرمانے کے بعد حضرت مولانا مرحوم کے پوتے اور داماد مولانا محمد سعید صاحب کیرانویؒ حضرت کے جانشین، مدرسہ کے ناظم و مہتمم اور شرعی متولی مقرر کیے گئے، اور حق تو یہ ہے کہ اس مرد مجاہد نے اپنے 48 سالہ دور سعادت میں خدمت کا حق ادا کر دیا۔ آپ کے دور نظامت کا سب سے بڑا کارنامہ مدرسہ کی جدید عالی شان سہ منزلہ عمارت ہے جس میں الحمدللہ تقریباً پون صدی سے تمام علمی و تعلیمی اغراض و مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ 1357ھ میں ان کی وفات کے بعد حرم محترم کی اس علمی و دینی خدمت کی سعادت حضرت مولانا محمد سلیم صاحبؒ کے حصہ میں آئی اور اپنے اسلاف اور عظیم المرتبت اہل حق بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر آپ نے رب العالمین کی توفیق و تائید سے مدرسہ کے لیے جو بین الاقوامی مقام پیدا کیا وہ آج سب کے سامنے ہے۔ پورے 51 سال اس تاریخی امانت کی خدمت کے بعد اس جانشین اکابر نے بھی 2 شعبان المعظم 1397ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ (افسوس کہ حضرت مولانا محمد مسعود شمیم بھی 1412ھ میں انتقال فرما گئے اور اب زمام اہتمام ان کے صاحبزادے حضرت مولانا ماجد سعید حفظہ اللہ کے ہاتھ میں ہے) یہ بابرکت تاریخی معلومات بھی قابل ذکر ہیں کہ 1308ھ میں حضرت بانی مدرسہؒ کی رحلت

Marfat.com

کے بعد اور ان کی ہدایت و وصیت کے مطابق شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ صولتیہ کے سرپرست مقرر فرمائے گئے

گزر جائیں گے اہلِ درد رہ جائے گی یاد اُن کی
وفا کا درس جب ہو گا تو ان کے ذکر پر ہو گا

یہ تھا وہ مضمون جو حضرت مولانا محمد مسعود شمیم کیرانوی قدس سرہ نے مدرسہ صولتیہ اور محترم صولت النساء بیگم صاحبہؒ کے بارے میں لکھا تھا۔ ہم نے برکت کے لیے اس کو یہاں نقل کر دیا ہے اس میں محترمہ صولت النساء بیگم صاحبہؒ کے بارے میں کافی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

مدرسہ کے قیام میں مشکلات:

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو مدرسہ صولتیہ کی ابتداء میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مشکلات ہر کام کرنے والے کو ابتداء میں پیش آتی ہی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مشکلات ہی سے ہر کام اپنی ارتقائی منازل تک پہنچتا ہے۔ بادِ مخالف کی تندی عقاب کی اڑان کو اونچا کرنے کے لیے ہوتی ہے، لیکن عام ابتدائی مشکلات کے علاوہ حضرت مولانا کیرانویؒ کو دو نئے امور سدّ راہ ہوئے جو حضرت مولاناؒ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھے۔

1- پہلی مشکل انگریزی کونسل متعینہ جدہ کی رکاوٹ تھی۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ہم نے بیان کیا ہے کہ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے مکہ مکرمہ ہجرت فرمانے کے بعد ہندوستان کی تحریک آزادی کا مرکز مکہ مکرمہ بن گیا تھا، اسی لیے حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ اور دوسرے کئی ایک حضرات مکہ مکرمہ ہجرت کر کے آ گئے تھے، لیکن یہاں ترکی حکومت بھی انگریزوں کے زیر اثر تھی۔ چنانچہ حضرت مولانا کیرانویؒ کے مکہ مکرمہ تشریف لانے کے وقت سے لے کر عمومی طور پر اور مدرسہ صولتیہ کے قیام کے بعد خصوصی طور پر انگریزی کونسل متعینہ جدہ کو یہ خیال اور وہم پریشان کرتا رہا کہ حضرت مولانا مرحوم اس درسگاہ کے پس پردہ

Marfat.com

انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈہ اور کوئی باغیانہ سازش نہ کرتے ہوں، اس لیے کہ حضرت مولانا مرحوم پر 1857ء کے انقلاب میں غیر وفاداری کا الزام لگایا گیا تھا، اس وجہ سے انگریزی کونسل نے مدرسہ کے قیام میں ہر ممکن رکاوٹ پیدا کی اور جب وہ بن گیا تو اس کو بند کرانے کے لیے سارے جتن کیے۔

2- دوسری مشکل یہ تھی کہ حجاز کے مقامی ترک حکام کو یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ زمین حرم پر اس مدرسہ کی ابتداء ہندوستان کے مسلمانوں کی کوشش سے ہو رہی ہے۔ یہ حضرات چونکہ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کو ختم کر کے اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ درسگاہ آئندہ بیرونی اقتدار اور اغیار کی مداخلت کا کسی وقت میں ذریعہ بن جائے۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ترکوں کی یہ بدگمانی ایک حد تک درست بھی تھی، کیونکہ وہ اپنے ملک میں عیسائی مشنوں اور پادریوں کے خیراتی اور رفاہِ عام کے کاموں کا تلخ تجربہ اٹھا چکے تھے۔ پھر ہندوستان میں بھی تو انگریز تجارت کے لبادہ میں حکمران بن گیا، اس وجہ سے مقامی ترک حاکم بھی اس مدرسہ کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھے اور وہ اسے چلنے نہیں دینا چاہتے تھے، ان تمام مشکلات اور زبردست مخالفت، اور وہ بھی اندرونی اور بیرونی حکام کی طرف سے، کے باوجود حضرت مولانا کیرانویؒ نے ہمت و پامردی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور ان تمام مشکلات پر غلبہ حاصل کیا۔ کچھ زمانے کے بعد حقیقت حال اور اصلیت کی روشنی میں تمام شکوک وشبہات کے گہرے بادل چھٹ گئے اور مولانا مرحوم نے اپنے خلوص وللٰہیت اور استقلال وصبر کی بدولت آئندہ کے لیے راستہ صاف کر لیا۔

مدرسۂ صولتیہ کا نصاب تعلیم:

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت مولانا کیرانویؒ جب ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو اس وقت وہاں کے مدارس میں اور خصوصی طور پر مسجد حرم کے مدرسہ میں ایک عجیب قسم کا تعلیمی نصاب تھا جس سے نہ تو طالب علم کی

Marfat.com

اندرونی علمی پیاس بجھتی تھی اور نہ ہی اس کے ذہن میں وہ علمی وسعت پیدا ہوتی تھی جو ایک عالم دین کے ذہن میں ہونی چاہیے، علاوہ ازیں درس وتدریس کی رفتار محدود بھی تھی اور سست بھی۔ حضرت مولانا کیرانویؒ اس نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں ایک انقلاب لانا چاہتے تھے۔ حضرت مولانا مرحوم نے اپنی خداداد دور اندیشی اور حساس دل دماغ سے مدرسہ کے قیام کے بعد جو لائحہ عمل مرتب فرمایا، اس میں حضرت مولانا محمد سلیم کیرانویؒ سابق مہتمم مدرسہ صولتیہ کے بیان کے مطابق تین اہم اغراض کو مقصد اولین بنایا۔

حضرت مولانا تھانویؒ نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے بارے میں فرمایا ہے کہ مولانا کیرانویؒ نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران دیکھا کہ عرب لوگ ہندی لوگوں کی تلاوت وغیرہ پر ہنستے ہیں۔ چنانچہ آپ نے مدرسہ صولتیہ جب قائم فرمایا تو ایک مصری قاری جن کو سلطان عبدالحمید خان کی آمد کے وقت پانچ سو قاریوں میں سے انتخاب کیا گیا تھا، ان کو قرأت وتجوید کے لیے مدرس رکھا، اور چند ہندی طلبہ اُن کے سپرد کیے جن کو وہ تجوید اور قرأت سکھلائیں۔ ان طلبہ میں جو اپنی جگہ قائم رہے اور کامیاب رہے۔ ان میں قاری عبداللہ صاحب ممتاز تھے۔ ان کی محنت اور سعادت مندی دیکھ کر مصری قاری نے بڑی توجہ کے ساتھ ان کو پورا فن سکھلایا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے ان کے استاذ مصری سے پوچھا کہ قاری عبداللہ تمام ہندیوں میں بہتر ہیں تو فرمایا نہیں بلکہ تمام عرب میں بہتر ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ میں جب مکہ مکرمہ دوسری مرتبہ حاضر ہوا تو خیال ہوا کہ اب کچھ عرصہ یہاں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں قیام رہے گا۔ اس وقت تجوید قرآن کی مشق کسی سے کرلوں۔ اتفاقاً ایک روز حضرت حاجی صاحب نے بہت سے علماء اور قراء کی دعوت کی اور دعوت میں سب قراء نے قرآن مجید بھی سنایا۔ مجھے ان سب میں قاری عبداللہ صاحب کی قرأت زیادہ پسند آئی، کیونکہ اس میں تصنع نہ تھا۔ میں نے ان سے مشق کرنے کی درخواست کی اور کام شروع کر دیا۔ اور بحمد اللہ اس میں ایسی صورت ہوگئی کہ بالا خانہ پر جب میں قاری صاحب سے مشق کرتا تھا تو نیچے سننے والوں کو یہ امتیاز مشکل ہوتا تھا کہ میں پڑھ رہا ہوں یا قاری صاحب۔ لیکن قاری صاحب فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی

Marfat.com

آب و ہوا کا یہ اثر ہے، مگر یہ کیفیت وہاں پہنچنے کے بعد باقی نہ رہے گی۔ البتہ اگر پاؤ پارہ روزانہ علیحدہ بیٹھ کر اسی طرح تلاوت کرنے کا معمول بنالو تو یہ کیفیت باقی رہ سکے گی۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ مجھ سے اس کا التزام نہ ہوسکا۔ (مجالس حکیم الامت:ص ۲۵۱)

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا بھی ایک لحاظ سے مدرسہ صولتیہ سے رشتۂ تلمذ تھا۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا کیرانویؒ تجوید کی طرف خاص توجہ فرماتے تھے بلکہ مدرسہ کے قیام سے ایک مقصد ان کا ہندی طالب علموں کے لیے تجوید کو ترقی دینا بھی تھا۔

ردّ نصاریٰ کی تعلیم:

حضرت مولانا کیرانویؒ نے علوم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس سے زیادہ ردّ نصاریٰ پر توجہ دی تھی کیونکہ یہ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا، لیکن یہ سلسلہ آپ کا آخر عمر تک جاری رہا۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کے قیام کے زمانہ میں بھی آپ نے اپنے اس مشن کو جاری رکھا جس کا ذکر مولانا شرف الحق صاحب صدیقی نے اپنے سفر نامۂ حج میں کیا ہے۔ یہ سفر حج انہوں نے 1305ھ میں کیا تھا۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:

> ”حاجی امداد اللہ صاحب نے حافظ عبداللہ سے فرمایا کہ مولوی شرف الحق کو مولوی رحمت اللہ کے پاس پہنچا دو۔ ان کے ہمراہ مولوی صاحب کے مدرسہ میں پہنچا۔ مولانا ایک چھوٹے سے تہ خانہ میں بیٹھے تھے۔ پہلے سلام کیا خط دیا۔ مولانا نے پڑھوایا۔ بہت مہربانی اور شفقت سے پیش آئے اور خط سن کر فرمایا کہ تم اپنا اسباب یہاں لے آؤ۔ میں نے عرض کیا کہ میرے ہمراہ اور لوگ ہیں۔ غرض کھانا اس روز مولانا صاحب کے ہمراہ کھایا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کے ہاں بھی لوگ حافظ عبداللہ صاحب کی معرفت امانتیں رکھتے ہیں۔ مولانا کی بصارت جاچکی ہے۔ اس وجہ سے یہ کام سے معذور ہیں۔ کتب ردّ نصاریٰ ہندوستان سے بڑی

Marfat.com

تعداد میں ان کے پاس پہنچتی ہیں۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ کی دو کتابیں میرے سامنے آپ کے پاس آئی تھیں۔ مولانا رحمت اللہ مغفور کتب ردنصاریٰ کے بہت شائق تھے۔ مجھ سے ان کتب کے بعض مقامات مولانا نے سنے تھے۔ مولوی دین خان صاحب اور حاجی احسان اللہ نے ازالۃ الاوہام شروع کر رکھی تھی۔ وہ تہ خانہ میں پڑھائی جاتی تھی۔ اظہار الحق بھی مولانا کے ہاں ہوتی تھی، اکثر واقعہ آگرہ کے مناظرہ کو خوب وضاحت اور تفصیل سے فرماتے تھے۔ اور مولانا صاحب اپنے پوتے کو بھی سبق دیتے تھے۔ ان صاحبزادے کا نام سعید تھا۔ نام کا بھی سعید ہے بلکہ افعال سے بھی سعید ہے۔ اپنے ماں باپ کا ایک لڑکا ہے۔ مشن کے مدرسہ انبالہ میں پڑھتا تھا۔ کتب اظہار الحق اور ازالۃ الاوہام کا سبق مولانا کے ہاں صبح وشام ہوتا تھا۔ علمی گفتگو ہوتی تھی۔ ان کے کلام سے مستفید ہوتا تھا۔ مولانا صاحب اب بھی کتب رد نصاریٰ کے مشتاق ہیں۔ اگر ان کی بصارت پھر آجائے وہ اب بھی ایک کتاب جامع لکھنے کو تیار ہیں۔''

1- پہلا مقصد یہ کہ اسلامی دنیا سے مکہ مکرمہ میں ہر سال شائقین علوم دینیہ کی ایک جماعت اس جذبہ اور ولولہ کے ساتھ آتی ہے کہ اسلام کے اس دینی مرکز میں تعلیم حاصل کرے اور اسلامی تہذیب ومعاشرت کا گہرا مطالعہ کرنے کا قریب سے موقع ملے۔ ان آفاقی طلبہ کی تعلیم اور قیام وطعام کا اہتمام اور حتی الامکان ان کی ضروریات کا لحاظ رکھنا مدرسہ کا اہم فرض ہے۔

2- مہاجرین حرم کی اولاد کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا تاکہ آوارہ گردی، جہالت اور بداخلاقی کے شکار نہ ہوں، اور تعلیم وتربیت کے ساتھ ان کو شریف پیشے سکھائے جائیں، تاکہ گداگری اور فقر وتنگدستی کی مصیبت سے ان کو نجات ملے اور خدا کے گھر میں دوسروں کے دست نگر نہ ہوں۔

3- ہندوستان (قدیم) میں قرآن حکیم کی صحیح قرأت کی اشاعت اور اس اعتراض

Marfat.com

کو اٹھانا کہ ہندوستانی حفاظ کلام اللہ کو غلط پڑھتے ہیں۔ مصر وحجاز وغیرہ ممالک اسلامیہ کے قراء اور حفاظ کی ہندوستانیوں پر یہ نکتہ چینی بے جا نہیں، اس کے ازالہ کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا۔

ان اغراض و مقاصد کے ساتھ ساتھ بانی مدرسہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اپنی ایمانی فراست اور گردوپیش کے تمام حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس عرفانی مرکز کے لیے کچھ ضروری اور اہم ہدایات مرتب فرمائیں۔ آپ کے ہدایات مرتب فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے بانیان مدرسہ صرف مدرسہ کا اجراء ہی نہیں کرتے تھے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے اس کو چلانے کے لیے کچھ اصول اور قوانین مرتب کر کے جاتے تھے۔ سرزمین پاک و ہند میں جب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی تو حضرت نانوتویؒ نے بھی مدرسہ کا مسلک اور اس کو چلانے کے لیے اصول وقوانین مرتب فرمائے۔ اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے بھی مدرسہ کو چلانے کے اصول وقوانین مرتب فرمائے جس سے مدرسہ کے مسلک کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان اصول اور ہدایات میں حضرت مولاناؒ نے ان تین امور پر زیادہ اصرار کے ساتھ پابندی کی تاکید فرمائی۔

1- ہر کارکن، مدرس اور طالب علم کو جو اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتا ہے، سیاسی دلچسپیوں اور سیاسیات سے قطعی طور پر بے تعلق رہنا چاہیے، کیونکہ مدرسہ تعلیم کے لیے ہے، سیاست کے لیے نہیں ہے۔

2- اختلافی امور اور وہ مسائل جو مختلف ائمہ کے نزدیک مختلف فیہ ہیں، سے کلی طور پر اجتناب واحتراز کرنا چاہیے۔

3- تفریق اور گروہ بندی امت کے لیے سخت نقصان کا باعث ہیں۔ اس سے دلوں میں دراڑیں پڑتیں ہیں اور امت تشتت وافتراق کے قعر مذلت میں گرتی ہے، لہٰذا اس سے کلی طور پر بچنا چاہیے۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے جس حکمت اور بالغ نظری کے ساتھ ان امور کی پابندی کو لازمی قرار دیا اور ان کو مدرسہ کا مستقل مسلک معین فرمایا۔ زمانہ کی کروٹوں نے یہ

Marfat.com

ثابت کر دیا کہ بانی مدرسہ حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ کو یقیناً خداداد بصیرت حاصل تھی۔ پچاس سال پہلے حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء نے مدرسہ صولتیہ مکۃ المکرمۃ کی اس خصوصیت کے بارے میں تحریر فرمایا تھا:

''مدرسہ کی خوش نصیبی اور مولانا مرحوم کی نیک نیتی کا ایک عمدہ ثمر یہ ہے کہ اس کے تمام مدرسین اور طلبہ اس وقت کی آفتوں سے علیحدہ ہیں۔ ان کے خیالات میں نہ افراط وتفرط ہے اور نہ جدال ونزاع کا انہیں شوق ہے اور نہ کسی کی تکفیر وتفسیق کا انہیں خیال ہے۔ الحمدللہ اس نازک اور پرفتنہ وقت میں اس بلا سے بچنا ہی خدا کا بڑا فضل ہے وہ اس مدرسہ پر ہے۔''

مولانا کیرانویؒ کا دوسرا سفر قسطنطنیہ:

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ مکہ مکرمہ کی حکومت اس زمانہ میں خلافت عثمانیہ کے تحت تھی، خلافت عثمانیہ کا پایۂ تخت اس زمانہ میں قسطنطنیہ تھا جہاں خلیفۃ المسلمین قیام پذیر ہوتے تھے۔ 1299ھ میں خلیفۃ المسلمین نے گورنر حجاز کو تبدیل کر کے ان کی جگہ عثمان نوری پاشا کو دولت عثمانیہ کی طرف سے حجاز کا گورنر مقرر فرمایا جب کہ اس سے قبل شریف عبداللہ پاشا گورنر حجاز تھا۔ عثمان نوری پاشا فوجی قسم کے آدمی تھے۔ ان میں سیاسی بصیرت وہ نہ تھی جو سابقہ گورنر میں تھی، حکمت عملی اور دوراندیشی بھی ان میں وہ نہ تھی جو شریف عبداللہ پاشا میں تھی۔ ان کی ان صفات کی کمی سے بعض خودغرض اور فتنہ انگیز لوگوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ مدرسہ صولتیہ کے اجراء کے ساتھ ہی بعض لوگ خاص وجوہات کی بنا پر مدرسہ کے خلاف ہو گئے تھے۔ انہوں نے گورنر حجاز کو مدرسہ سے بدظن کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور وہ کافی حد تک بدظن ہو بھی گئے۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ مدرسہ اجنبی ملک ہندوستان کی تحریک کا ایک مرکز ہے۔ چونکہ مکہ مکرمہ کو ایک زمانہ میں تحریک آزادی کا مرکز بنانے کی کوشش بھی کی گئی تھی، اس وجہ سے گورنر حجاز ایسا سمجھنے میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ چنانچہ مدرسہ صولتیہ کو اجنبی ملک

Marfat.com

کی تحریک سمجھتے ہوئے انہوں نے اس کی مخالفت کرنی شروع کر دی۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے گورنر موصوف کو یہ بات باور کرانے کی پوری پوری کوشش کی کہ مدرسہ ان تمام باتوں سے بالاتر ہے۔ یہ کسی تحریک کا مرکز نہیں اور نہ اس کا سیاست سے کوئی تعلق ہے بلکہ اس کا مسلک ہی ہر قسم کی سیاست سے علیحدگی ہے، لیکن گورنر موصوف کے ذہن میں یہ بات نہ آتی تھی اور وہ یہ باور کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہ تھا۔ ان حالات نے گورنر حجاز اور حضرت مولانا کیرانویؒ کے درمیان شدید قسم کی کشیدگی کو جنم دیا۔ جب حالات اور تعلقات کچھ زیادہ کشیدہ ہو گئے تو گورنر صاحب نے معاملہ پایۂ تخت خلافت قسطنطنیہ تک پہنچا دیا۔ اس زمانہ سلطان عبدالحمید خان کی خلافت قائم تھی۔ سلطان نے حضرت مولانا کو قسطنطنیہ بلا لیا۔ یہ حضرت مولانا مرحوم کے دوسرے سفر قسطنطنیہ کی قدرتی تمہید تھی۔ پایۂ تخت خلافت سے جب حضرت مولانا کی طلبی کا پیغام پہنچا تو عثمان نوری پاشا کو بڑا تعجب ہوا اور مولانا مرحوم کے مقام کا علم ہوا۔ حضرت مولانا مرحوم شاہی مہمان کی حیثیت سے دارالخلافہ تشریف لے گئے۔ یہ حضرت مولانا مرحوم کا قسطنطنیہ کا دوسرا سفر تھا۔ اس سفر میں حضرت مولانا مرحوم کے بھتیجے مولانا بدرالاسلامؒ بھی آپ کے ساتھ تھے۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے اپنے اس سفر کی روداد خود اس طرح بیان فرمائی ہے:

”20 ربیع الاول 1301ھ ہفتہ کے دن مغرب کے وقت مکہ معظمہ سے جدہ کو روانہ ہوئے۔ آٹھویں کے آگبوٹ میں چلنے کی تجویز موقوف رہی۔ پھر بابور (جہاز) مصری میں 15 ربیع الثانی 1301ھ بروز بدھ کو سوار ہوئے، اور اس نے جمعرات کے روز صبح کے وقت لنگر اٹھایا۔ پیر کی رات کو پانچ بجے سویز پہنچے، اور صبح کو جو پیر کا دن اور 20 ربیع الثانی کی تھی۔ بابور سے اترے۔ وہاں سے منگل کے دن 21 تاریخ اسکندریہ کو ریل پر گئے۔ تین بجے اسکندریہ پہنچے۔ سعد اللہ بے کے مکان پر اُترے۔ پھر آٹھویں دن بابور مصری پر سوار ہو کر جمادی الاولیٰ کی پانچویں تاریخ پیر کے دن استنبول میں پہنچے۔ ادھر جہاز نے لنگر ڈالا۔ اسی وقت فی الفور

Marfat.com

مصطفیٰ وہبی بے یاور (اے۔ ڈی۔ سی) اور بین باشی حضرت سلطان کے جہاز پر چڑھے، اور مل کے کہا کہ حضرت سلطان نے بہت بہت سلام فرمایا۔ اور کشتیٔ خاص اپنی بھیجی ہے، چلیئے، وہاں سے چل کر سرائے (محل) قصر شاہی سلطانی تک جو بنائے سلطان مرحوم عبدالمجید خان غازی کی ہے، آئے۔ وہاں کشتی سے اتر کر دو گھوڑوں کی بگی میں سوار ہو کر محل سرائے سلطانی میں آئے اور محل سرائے کے ایک کمرے میں اُترے۔ اس روز ملاقات کو جناب کمال پاشا اور جناب عثمان بے اور جناب علی بے اور جناب نسیم بے تینوں قرناء (مشیر) حضرت سلطان کے ہیں۔ اور جناب سید احمد اسعد مدنی جو مصاحب حضرت سلطان ہیں، دن کو اور رات کو نصرت پاشا آئے، اور اگلے دن منگل کو جناب پاشا غازی اور بدھ کو ساتویں تاریخ جناب شیخ حمزہ ظافر اور جناب سید احمد اسعد مدنی اور جناب کمال پاشا آئے۔ اور رات کو جناب علی بے قرناء درجہ دوم نے حضرت سلطان کی طرف سے مزاج پرسی کر کے کلمات عواطف شاہانہ پہنچائے۔ آٹھویں تاریخ جمعرات کے روز شیخ محمد صفوت پاشا اور جناب اسماعیل حقی اور جناب سید فضل پاشا آئے اور اسی دن مغرب کے وقت خلعت سلطانی میرے اور بدرالاسلام اور مولوی حضرت نور (صدر مدرس مدرسہ صولتیہ) کے لیے آیا۔ 17 تاریخ ہفتہ کے دن وہبی بے نے حضرت سلطان کی طرف سے حکم پہنچایا کہ مرضی سلطان یہ ہے کہ تم اپنے اہل و عیال کو بلوا لو۔ موسم ربیع آ پہنچا۔ اب عرصہ تک آب و ہوائے استنبول بہت اچھی رہے گی۔ نرمی سے اس میں عذر کیا گیا۔ منگل کے دن کیسۂ مفتاح کعبہ اور ایک تسبیح عقیق البحر کی، ایک تسبیح سنگ مقصود کی بھجوائی گئی اور فرمایا کہ اس شکریہ میں میں نے تم کو رتبہ "پایۂ حرمین شریفین" کا

Marfat.com

عطا کیا، اس کا لباس بھی پہنچے گا۔ اور چھٹی تاریخ رجب کی جمعرات کے دن کو عصر کے بعد سرائے سلطانی (محل) کو جانا ہوا۔ مغرب کے بعد ملاقات ہوئی۔ غایت عنایت شاہانہ سے پیش آئے۔ مسند سے اُٹھ کر ایک دو قدم بڑھا کر ہاتھ میرا قوت سے اپنے ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا کہ "کثرت شغل کے سبب اب تک میں نے ملاقات نہیں کی تھی۔ اور تاخیر کا سبب اس کے سوا کوئی دوسرا امر نہیں......" میں نے بھی دعا اور کلمات شکریہ مناسبہ کہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کہا جاتا ہے کہ "عدو شرے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد" حضرت مولانا کیرانوی کے ساتھ استنبول میں یہی کچھ ہوا۔ دربار خلافت میں آپ کے بارے میں گورنر حجاز نے یہ غلط بات بتائی کہ آپ کا مدرسہ اجنبی ملک کی تحریک کا مرکز ہے، لیکن حضرت مولانا جب وہاں سلطانی پیغام پر پہنچے تو آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی شاہانہ پذیرائی ہوئی۔ خطابات سے نوازا گیا۔ مختلف عہدہ دارانِ حکومت اور اساطین خلافت نے ملاقاتیں کیں۔ خلعت سلطانی عطا ہوئی، اور جو کچھ ایک بڑے سے بڑے آدمی کے لیے کیا جا سکتا ہے وہ سب کچھ حضرت مولانا کیرانویؒ کے لیے کیا گیا۔

قسطنطنیہ کے قیام کے دوران حضرت خلیفۃ المسلمین نے حضرت مولانا کیرانویؒ کو کئی بار شرف باریابی بخشا۔ مختلف مسائل اور متعدد معاملات پر گفتگو ہوئی۔ آخر میں جس مدرسہ صولتیہ کو گورنر حجاز خطرناک اور تحریک کا مرکز سمجھتے ہوئے بند کرنا چاہتے تھے، سلطان وقت نے اس کو جاری رکھنے کے لیے مدرسہ صولتیہ کے لیے ایک معقول ماہانہ امداد مقرر کرنے کے متعلق خیال ظاہر فرمایا جس کے جواب میں شکریہ اور دعا کے بعد حضرت مولانا کیرانویؒ نے سلطان کی خدمت میں عرض کیا کہ:

"حرمین شریفین میں امیر المومنین کے بہت سے جاری کردہ امور خیر ہیں اور بہت سے نیک کام تشنۂ تکمیل۔ مدرسہ صولتیہ چونکہ ہندوستان (ہند اور پاکستان) کے دین دار اور نیک خیال مسلمانوں کی امداد سے چل رہا ہے اور قائم ہے۔ ان کو اس کار خیر میں شرکت و

سرپرستی کی سعادت سے محروم نہ فرمایا جائے جو یقیناً امیر المومنین کے الطاف شاہانہ سے بعید نہیں۔"

سلطان سے مولانا کیرانویؒ کی ایک ملاقات میں مولانا بدرالاسلام صاحب جو حضرت مولاناؒ کے بھتیجے تھے اور اس تاریخی سفر میں آپ کے ہمراہ تھے، بھی ساتھ تھے۔ ان کے بارے میں سلطان نے فرمایا کہ یہ میرے پاس رہیں گے اور کتب خانہ حمیدیہ یعنی سلطان عبدالحمید خان کا شاہی دارالکتب جو دنیا کے خاص کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا اور جس میں سلاطین آل عثمان کی تمام کتابوں کو جمع کیا گیا تھا، قصر یلدز کا ان کو مہتمم بناتا ہوں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اس قدر افزائی پر سلطان کا شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ حضرت مولانا بدرالاسلام صاحب اس خاص علمی خدمت پر مامور ہوئے۔ آخر وقت تک سلطان کے معتمد علیہ رہے۔ محاصرۂ قصریلدز اور سلطان عبدالحمید کی معزولی کے پرخطر وقت میں صرف تین اشخاص سلطان کی خدمت میں باقی رہے جن میں ایک مولانا بدرالاسلام بھی تھے۔

حضرت مولانا کیرانویؒ کچھ دنوں تک قسطنطنیہ میں مقیم رہے۔ واپسی پر سلطان سے الوداعی ملاقات کے بعد دوسرے دن مصطفیٰ وہبی بے یاور اور خیر الدین پاشا اور نسیم بے اور سید احمد اسعد مدنی یہ چاروں اصحاب تشریف لائے اور سلطان کی طرف سے ذاتی ہدیہ ایک مرصع تلوار حضرت مولانا مرحوم کو دی اور سلطان کے یہ الفاظ نقل کیے کہ:

"ہتھیار ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی زینت ہے۔"

مدرسہ صولتیہ کا انتظام و انصرام:

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے مدرسہ صولتیہ کے قیام کے بعد اس کے انتظامات کو چلانے کے لیے مہاجرین حرم میں سے بااثر اور صاحب علم حضرات پر مشتمل ایک مجلس منتظمہ قائم فرمائی۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کو جو تعلق مدرسہ سے تھا وہ اراکین مجلس منتظمہ کو نہیں تھا کیونکہ حضرت مولانا کی شبانہ روز کوششوں اور بارگاہ الٰہی میں نالہ ہائے نیم شب کے ثمرہ میں حق تعالیٰ نے اس مدرسہ کو قائم فرمایا اور بنگال سے ایک

Marfat.com

پاکیزہ صفت اور حور شمائل عورت صولت النساء بیگم کو اس کی تعمیر کے لیے مکہ مکرمہ بھیجا، لیکن اراکین مجلس تو صرف حضرت مولانا کیرانویؒ کے انتخاب کی وجہ سے رکن بنے تھے۔ ان کا عملی حصہ اس مدرسہ کے قیام میں کوئی نہیں تھا، چنانچہ مدرسہ کے قیام کی ابتداء میں جب حضرت مولاناؒ نے مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں یہ تجویز رکھی کہ معزز اراکین مدرسہ کے کام کو چلانے کے لیے قرض کے حصول میں تعاون فرمائیں تو ان لوگوں نے بجائے تعاون اور امداد کرنے کے مدرسہ کو ایک دردسری سمجھتے ہوئے مجلس کی رکنیت سے تحریری استعفٰی دے دیا۔

اس موقع پر ان حضرات کی علیحدگی حضرت مولاناؒ اور مدرسہ کے لیے ایک پریشان کن معاملہ تھا لیکن مولانا کیرانویؒ نے ان کے استعفوں کو پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہ دی۔ اور مدرسہ کی تمام ذمہ داری کے بار گراں کو تنہا اپنے کندھوں اٹھالیا اور پھر تمام زندگی اس بار گراں سے سبکدوش نہ ہوئے۔ گویا کہ آپ نے مجلس مشاورت سے بے نیاز ہر کر پھر باقی ماندہ زندگی مدرسہ کا نہایت احسن طریقہ سے انتظام فرمایا۔

حضرت مولانا کیرانویؒ کے ایک خط سے بھی مدرسہ کے قیام اور اس کی ابتدائی کیفیات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ خط آپ نے ڈپٹی امداد علی خان صاحب کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ خط طویل ہے لیکن اس سے مدرسہ کے حالات پر چونکہ کافی روشنی پڑتی ہے، پھر یہ ہے بھی حضرت مولانا کیرانویؒ کے اپنے قلم کا لکھا ہوا، اس لیے مدرسہ کے بارے میں اس سے صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کا یہ طویل خط کچھ تبرکاً بھی نقل کیا جاتا ہے

> ”جناب ناصر الحق ڈپٹی صاحب مکرم مجمع مکارم اخلاق سلمہ اللہ تعالیٰ سلام مسنون کے بعد گذارش ہے کہ آپ کا عنایت نامہ پہنچا اور دو دفعہ کے اخبار بھی پہنچے۔ مدرسہ کے لیے جو دو بار آپ نے ایک سو پینسٹھ روپے روانہ کیے وہ منشی ظفر اللہ کی معرفت پہنچے۔ مدرسہ کا حال جو استفسار فرمایا۔ مکرم میرے مدت سے ارادہ تھا کہ آپ کو اس کے حال سے اطلاع دوں، پر کئی وجوہ کے لحاظ سے منجملہ اس کے یہ بھی ہے کہ لوگوں نے اکثر ایسی چیزیں کمائی کے حیلے بنا

Marfat.com

رکھے ہیں اور ان حیلوں سے جمع کر کے کھا جاتے ہیں، متامل تھا۔
اب جو آپ نے استفسار فرمایا، گذارش ہے کہ مجھے مدت سے
خیال تھا کہ آپ کے یہاں ہندیوں کی طرف سے اگر ایک مدرسہ
جاری ہو تو بہت اچھا ہے۔ پر اول اول اپنی بے مقدوری اور ہم
جنسوں کی کم رغبتی سے متامل تھا۔ 1290ھ کے شعبان کے آخر
میں میرا ارادہ پکا ہوا اور اسی رمضان کے مہینہ کی پہلی سے ایک
مدرسہ قائم کیا۔ ابتداء میں گو مجھے بہت رنج رہا۔ مدرسہ کے لیے
مکان نہ تھا۔ چار مہینے میں مدرسہ کے لیے تین مکان بدلے گئے۔
پر اسی سال میں بی بی صولت النساء اور ان کے داماد شاہ نوازش
حسین صاحب کلکتہ محلّہ سونڈے کے رہنے والے حج کے لیے
آئے تھے۔ انہوں نے یہ حال سن کر بڑی مدد کی اور بیس ریال
قبالہ خرید کے لیے اور قبالہ بابت وقف محکمہ قاضی میں دیئے۔ اور
ایک ہزار پانچ سو کیانویں ریال اس کی بنا پر لگائے۔ سو ان کے
اس پر دو ہزار دو سو اکہتر ریال صرف ہوئے تھے کہ بنگالے کے قحط
سے جو ان کے مواضع زمینداری میں ہوا، ان کی قلت آمدنی کا
سبب ہوا۔ انہیں اتمام بنا سے روکا، پھر میں نے ان کی رضا اور
اجازت س چار سو ریال حاصل کر کے اس پر لگائے۔ ان دو ہزار
چھ سو اکہتر ریال میں تین مجلسیں جن میں دو بڑی بڑی اور ایک
متوسط ہے اور دو دیوان معہ ان کے آگے سائبانوں کے اور دو
ٹانکی جسے ''صہریج'' کہتے ہیں، ہر ایک جس میں گیارہ گیارہ سو
وقریہ (یہاں کی بڑی مشک) اور ایک مخزن اور چھ پاخانہ تیار
کرائے، اور ان سب میں استحکام بنا کا لحاظ رہا۔ پھر بسبب نہ
ہونے پیسے کے بنا رک گئی۔ اب ضروری حاجت بنا میں اتنی ہے
کہ ایک دروازہ کلاں مسجد کی بنا میں جس پر ایک اور مجلس بنائی

Marfat.com

جائے گی۔ دو سو ریال تخمیناً لگیں گے اور دونوں ٹانکیوں کے آگے جو کیچڑ کے خوف سے گچ کرائی جائے گی، اس میں بیس ریال صرف ہوں گے۔ اور جو مخزن مدرسہ کے اسباب میں رکا ہے اور تینوں مجلسیں اور دونوں دیوان مدرسوں کے پڑھانے میں رکے ہوئے ہیں سو طالب علموں کے لیے جدا جدا حجروں کی بڑی حاجت ہے۔ مدرسہ کے قریب ایک جگہ ہے اُسے مول لے کر اگر حجرے بنائے جائیں تو اس زمین کی قیمت اور حجروں کے بنانے میں بارہ سو ریال سے کم خرچ نہ پڑے گا۔ پھر بنانے سے تو فراغت ہو جائے گی اور اس کی ایسی جائداد کا فکر رہے گا جس کی آمدنی سے مدرسہ کا کام چلتا رہے، اور اس کی بھی یہاں ہم سے لوگوں کے حق میں اس کے سوا اور کوئی تجویز اچھی بن نہیں پڑتی کہ اس شہر میں مکانات اور دکانیں مول لے کے اس پر وقف ہوں کہ ان کی آمدنی سے مدرسہ کا کام چلتا رہے۔ پر یہ امر تو بالفعل میری حیثیت کے لحاظ سے ایک مستبعد معلوم ہوتا ہے اور اللہ کے نزدیک آسان ہے۔ کیا عجب ہے کہ کسی آپ جیسے نیک نیت کے دل میں اللہ ڈال دے گا اور وہ اس امر میں للہ کمر باندھ کر کھڑا ہو جائے گا اور اس کی سعی سے یہ امر انجام کو پہنچے۔ یہ حال تو متعلق بنا تھا۔ اب اس کی تعلیم کا حال سنیئے اور اس میں میرے سوا اور چار مدرس ہیں۔ دو قاری، دو معلم قرآن مجید کے اور دو مدرس علوم عقلیہ اور نقلیہ کے اور ایک محرر، ان مدرسوں اور محرر کے سوا پچھتر طالب علم ہیں۔ اور میں صبح سے دو پہر تک اسی مدرسہ میں پڑھاتا ہوں اور ظہر سے عصر تک حرم شریف میں۔ اور قلت آمدنی کے سبب اس مدرسہ کی ترقی نہیں ہوئی، اس لیے کہ چالیس روپے سے کچھ تو چندہ کے طور پر ماہواری جمع ہوتا ہے، اور چالیس روپے ماہوار بی

Marfat.com

بی صولت النساء اور شاہ نوازش حسین صاحب، جن کا ذکر اوپر گذرا، دیتے ہیں۔ اور اس کے سواچ کے دنوں میں اللہ کے اور بندے بھی کچھ دے جاتے ہیں اور گذران ہوئی چلی جاتی ہے، پر تنگی اور دقت کے ساتھ۔ ان چار مدرسوں اور ایک محرر کی تنخواہ اور ستر طالب علموں کی خوراک جو اس مدرسہ سے مقرر ہے، اس میں سے دی جاتی ہے، اور اب معلوم ہوا کہ جناب محمود علی خان صاحب والیٔ چھتاری نے اس سال کے شعبان کے مہینے سے سو روپیہ ہر ماہ اس مدرسہ کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ نواب صاحب نیک نیت ہیں اور ان کی توجہ ایسے امور کی طرف ہے وہ جاری رکھیں گے۔ اور اگر یہ جاری رہا تو البتہ مدرسہ کے لیے ایک بڑی مدد ہے۔ منشی ظفر اللہ صاحب کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ چھ ماہی ان کی سرکار سے منشی ممتاز علی خان صاحب کو مل گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو خان صاحب کی معرفت میرے پاس پہنچ جائے گی۔

ہمارے اوضاع اور اطوار اہل بلدہ کے اوضاع اور اطوار کے مخالف ہیں اور ہمارا طریقہ تعلیم و تعلم کا ان کے طریقہ تعلیم و تعلم سے نہیں ملتا اور ان پچھتر طالب علموں میں سب ایسے ہیں کہ ابتداء سے ان کی تعلیم اسی مدرسہ میں ہوئی ہے اور بفضل اللہ قرآن پڑھنے والے بچے تو ایسی تجوید سے قرآن پڑھتے ہیں کہ سب عرب، مصری اور ترک تعریف کرتے ہیں۔ حضرت شیخ العلماء جو دوبار امتحان میں تشریف لائے، بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ واللہ! ہمارے بچے ایسا نہیں پڑھتے۔ تعجب ہے کہ ہندی بچے اتنی مدت قلیل میں ان سے سبقت لے گئے۔ انشاء اللہ رمضان آئندہ میں چودہ لڑکے حافظ مسجد حرام میں قرآن سنائیں گے۔ اور علوم پڑھنے والوں پر بھی میری اور دونوں مدرسوں کی اتنی محنت ہے کہ

Marfat.com

ان کی استعداد شکر کے قابل ہے اور اس دو برس کی مدت میں جن طالب علموں نے اس مدرسہ میں آکے میزان شروع کی تھی سو انہوں نے اس مدت میں میزان منشعب، صرف میر، پنج گنج، دستور المبتدی زرادی، مراح الارواح، فصول اکبری، شافیہ، صرف میں، اور خلاصہ جمل، تتمہ نحو میر، شرح مایۃ عامل عربی، اور شرح مأیۃ عامل فارسی، عبدالرسول، ہدایت النحو، قطر اللہ اور کافیہ نحو میں، اور قدوری تمام اور نصف کنز فقہ میں، اور سراجی فرائض میں پڑھتے ہیں۔ اور اوپر کی جماعت جوان طالب علموں کے سوا ہیں وہ دو جماعتیں ہیں، جو میرے پاس مطول اور قطبی اور میر قطبی پڑھتے ہیں، ان دنوں مدرسہ کا سب خرچ ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہے، مگر گذارش یہ ہے کہ جو اول میں میں نے لکھا ہے وہ اپنی حیثیت کے لحاظ سے لکھا ہے۔ اب آپ کی حیثیت کے لحاظ سے لکھتا ہوں اور اس کو میں نے اول میں اس لیے نہیں لکھا کہ شاید آپ مصلحتاً ہوں اور اس کو میں نے اول میں اس لیے نہیں لکھا کہ شاید آپ مصلحتاً اول درجہ میں چھپوا دیں اور یہ متمول اسی درجہ میں ہو تو ناظر میری حیثیت کے لحاظ سے اس مضمون کو شیخ چلی کا خیال سمجھے گا۔ گو آپ کی حیثیت کے لحاظ سے وہ اپنی جگہ پر ہے اور وہ یہ ہے کہ میری آرزو دلی یہی ہے کہ یہ ہندی مدرسہ حرم کے قریب ہو۔ حرم کے قریب میں اگر کہیں جگہ ہاتھ آتی تو اب تک جتنا اس مدرسہ پر خرچ ہوا ہے اتنا سب اس زمین پر ہی خرچ ہوتا، اور وہ زمین تب بھی پیمائش میں اس مدرسہ کی زمین سے کم ہوتی۔ اس لیے حرم سے دور محلہ خندریسہ میں زمین کو مول لیا............ امید ہے کہ اگر آپ نے کوشش کی تو مدرسہ اسلامی جو مکہ معظمہ میں ہوگا، اعلیٰ درجہ کو پہنچے گا اور ہر سال اس بلدہ معظمہ میں جو مجمع مردم ہفت

Marfat.com

اقلیم کا ہے، لاکھوں کی نظر میں ہدیوں کی عزت اور آپ کی سعی مشکور رہے گی۔ اس لیے گذارش کرتا ہوں کہ آپ اس امر کے لیے کمر باندھیں اور اس مدرسہ کی بنا کا کام اہتمام کر کے ایک اور زمین وسیع حرم کے قریب لی جائے اور اس میں ایک بڑا مدرسہ بنایا جائے۔ اور وہ زمین ایسی جگہ پر ہو کہ اگر چاروں طرف اس کے دوکانیں نہ نکل سکیں تو دو تین طرف تو نکل سکیں۔ اور انشاء اللہ اگر تجویز ہوگئی تو بنظر ثواب اخروی اس کے بنوانے کی کوشش کروں گا کہ تھوڑے دنوں میں مدرسہ نیک نام ہو جائے گا۔ اور اس مدرسہ موجودہ کو فقط قرآن مجید کی تعلیم کے لیے رکھا جائے گا۔ اور یہ مدرسہ موجودہ اس دوسرے بڑے مدرسہ کی شاخ ہو جائے گا اور انشاء اللہ اس کے فیض میں فرق نہ آئے گا۔

اگر خدا آپ کی سعی میں زیادہ برکت بخشے تو اس پر صلاح یہ ہے کہ حرم کے پاس سلطان جنت مکان عبدالمجید خان غازی انار اللہ برہانہ نے ایک مدرسہ کی بنا ڈالی تھی۔ سو اس سلطان جنت مکان کی وفات کے سبب سے وہ بنا بیچ میں رہ گئی، اور حضرت سلطان کو بسبب بعض امور ملکی کے اس کی طرف التفات نہیں ہوئی۔ وہ ویسے ہی پڑی ہے۔ اگر کوئی اس کی بنا اور آبادی کے خیال کرے تو اور صرف زر کثیر سے امید ہے کہ حضرت سلطان خلد اللہ کی طرف سے وہ اسے مل جائے گی۔ پر یہ امر صرف کثیر کا محتاج ہے۔ بہر حال گذارش یہ ہے کہ جو آپ کی صلاح میں آئے ویسا کیجیے۔ جو ہماری سمجھ میں آیا اُسے گزارش کر دیا۔

16 ذی الحجہ 1292ھ بدست مولوی اللہ یار خان

مکہ معظمہ، مدرسہ واقعہ محلّہ خندریسہ، المکلف رحمت اللہ عفی عنہ

اس خط سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

Marfat.com

1- محترمہ صولت النساء بیگم صاحبہ کے مکہ مکرمہ تشریف لانے سے قبل ہی حضرت مولانا کیرانویؒ ہندی طالب علموں کے لیے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھ چکے تھے اس مدرسہ کی ابتداء یکم رمضان المبارک 1290ھ کو ہوئی۔ مدرسہ کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اسی وجہ سے چار مہینے میں تین مکان بدلے گئے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کے اخلاص اور علوم نبوت کی تشہیر کے جذبہ کو دیکھ کر رحمت خداوندی جوش میں آئی اور اسی سال ہندوستان کے ایک دور دراز علاقے بنگال سے ایک نیک دل، نیک طینت اور پاکیزہ صفت بی بی محترمہ صولت النساء بیگم صاحبہ کو اپنے داماد سید نوازش حسین صاحب کے ساتھ مکہ مکرمہ بھیج دیا اور ان کے وسیلہ سے محلّہ خندریسہ میں ایک مدرسہ ''مدرسہ صولتیہ'' کے نام سے باقاعدہ کام کرنے لگا۔

2- مدرسہ کی ابتداء میں حضرت مولانا کیرانویؒ کو بے شمار تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ان میں زیادہ تر تکالیف مالی تھیں لیکن مولانا مرحوم نے صبر و تحمل سے کام لیا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص نے ان ساری مشکلات کو دور فرما دیا۔

3- محترمہ صولت النساء بیگم صاحبہ کے علاوہ وہ حاجی حضرات جو ہر سال حج بیت اللہ کے لیے آیا کرتے تھے وہ بھی مدرسہ کی اچھی خاصی امداد کرتے تھے۔

4- بعد میں نواب محمود علی خان صاحب، نواب آف چھتاری نے بھی ہر ماہ سو روپیہ اس مدرسہ کے لیے دینا شروع کر دیا۔ اس سے بھی مدرسہ کی مالی حالت بہتر ہوگئی۔

5- حضرت مولانا کیرانویؒ کی یہ خواہش تھی کہ مدرسہ حرم سے قریب تر ہوتا کہ اس کے اردگرد دوکانیں بنا کر مدرسہ کو خودکفیل بنا دیا جائے لیکن حضرت مولانا کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ شاید حق تعالیٰ نے اس وجہ سے آپ کی اس خواہش کی تکمیل نہ فرمائی کہ مستقبل میں حرم کی توسیع ہونا تھی تو شاید وہ مدرسہ مسمار کرنا پڑتا۔ اب تو موجودہ مدرسہ بھی حرم سے قریب ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے آپ کی خواہش کی تکمیل ہوگئی کہ آپ کا مدرسہ حرم سے قریب ہو گیا۔

6- حضرت کیرانویؒ کے اس خط سے طلبہ کے لیے دارالاقامۃ (ہوسٹل) کی

Marfat.com

خواہش کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کی یہ خواہش بھی پوری فرما دی۔ اور 1293ھ میں صوبہ بہار کے ایک مخیّر رئیس میر واجد حسین آف پٹنہ نے پچاس طلبہ کے لیے دارالاقامۃ تعمیر کروا دیا۔ جس میں طلبہ کی رہائش کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔

عثمان نوری پاشا کو حضرت مولانا کیرانویؒ کی پایۂ تخت خلافت میں شاہانہ پذیرائی کا علم ہو گیا اور اس کو مولانا مرحوم کے بلند مقام کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ جب حضرت مولانا مرحوم قسطنطنیہ سے واپس مکہ مکرمہ پہنچے تو مدرسہ صولتیہ اور حکومت وقت کی جانب سے آپ کا عظیم الشان بلکہ فقید المثال استقبال کیا گیا۔ استقبال کرنے والوں میں اور افسران حکومت کے علاوہ خود گورنر حجاز جناب عثمان نوری پاشا جن کی شکایت پر آپ کو قسطنطنیہ بلایا گیا تھا، بھی موجود تھے۔ وہ سب سے پہلے حضرت مولاناؒ سے بغل گیر ہوئے اور اپنی غلط فہمی کی معافی چاہی۔

مدرسہ صولتیہ کے اراکین اور طلبہ کے لیے وہ بڑا خوشی و مسرت اور فخر و مباہات کا دن تھا۔ عثمان نوری پاشا کی غلط فہمی دور ہو جانے کی وجہ سے حضرت مولانا کے لیے مدرسہ صولتیہ کی ترقی کی راہیں کھل گئیں اور وہ اب بے خوف و خطر مدرسہ کے لیے دن رات کام کرنے لگے۔

مکہ مکرمہ میں مولانا کیرانویؒ کی اصلاحات:

1- ملکۂ بغداد امیر المومنین ہارون الرشید کی نیک دل اور پاکیزہ صفت بیوی زبیدہ کا دائمی صدقہ جاریہ ''نہر زبیدہ'' آج تک مکہ مکرمہ کے گلی کوچوں میں رہنے والے اور موسم حج میں حجاج کرام کو سیراب کر رہی ہے۔ یہ نہر امتداد زمانہ سے بہت زیادہ قابل مرمت و اصلاح تھی۔ جس کی وجہ سے وہاں کے باشندوں کو پانی کی بہت زیادہ تکلیف اور زحمت پیش آتی تھی۔ حجاز مقدس کی حکومت اس زمانہ میں اتنی مالدار نہ تھی کیونکہ ابھی تیل کے ذخائر نہیں نکلے تھے، لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ کچھ لوگ مل کر اس نہر کی مرمت کریں اور ساکنانِ حرم کی پانی کی تکلیف کا ازالہ کریں۔

اس زمانہ میں ہندوستان کے ایک سیٹھ، سیٹھ عبدالواحد عرف ''واحدنا سیٹھ'' مکہ مکرمہ آئے ہوئے تھے۔ ان کو حضرت مولاناؒ نے اس بارے میں احساس دلایا۔ چنانچہ اس بارے میں حضرت مولانا کیرانویؒ کی تحریک پر مدرسہ صولتیہ میں ایک مشاورتی اجتماع منعقد ہوا جس کی صدارت حضرت مولانا مرحوم نے فرمائی۔ سیٹھ عبدالواحد ایک نہایت متمول، باتوفیق اور صاحب ہمت آدمی تھے۔ مشاورتی اجتماع میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ حضرت مولانا مرحوم نہر زبیدہ از سر نو مرمت کا بیڑا اٹھائیں اور ہم سب حضرات اس بارے میں ان کی معاونت کریں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حکومت سے اجازت لی گئی۔ پھر ایک مستقل مجلس قائم کی گئی جس میں مہاجرین مکہ کے ہر طبقہ میں سے ہر قوم کے ممتاز افراد اس مجلس کے رکن بنائے گئے۔ اس مجلس کی صدارت کے لیے حضرت مولانا مرحوم کو منتخب کیا گیا، مگر آپ نے بعض وجوہات کی بنا پر اپنے شاگرد رشید شیخ العلماء مکہ مکرمہ، فضیلت مآب حضرت مولانا شیخ عبدالرحمٰن سراجؒ، مفتی احناف کو اپنی جگہ انہیں اس منصب صدارت پر فائز کیا، اور خود نائب صدر کی حیثیت سے اس عظیم الشان اور عظیم النفع منصوبے کی ذمہ داری اٹھائی۔ جناب سیٹھ عبدالواحد اس مجلس کے خازن اور تحویل دار مقرر ہوئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم اور ان بزرگوں کی ہمت و کوشش سے یہ صدقۂ جاریہ دوبارہ زندہ ہوا، اور ساکنانِ حرم اور حجاج کرام کی پانی کی دقت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ یہ حضرت مولانا کیرانویؒ کا ایک بہت بڑا کارنامہ بھی ہے اور مدرسہ صولتیہ کی طرح ایک صدقۂ جاریہ بھی۔

2- حضرت مولانا کیرانویؒ جب ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ پہنچے تو وہاں کی ڈاک کا انتظام نہایت ناقص تھا۔ کوئی ڈاک تقسیم کرنے والا نہیں تھا۔ نہ کوئی ڈاک خانہ تھا اور نہ کوئی ناظم ڈاک خانہ۔ اس زمانہ میں اندرون ملک یا بیرون ملک سے جو ڈاک آتی تھی اس کو حرم کعبہ کے دروازے پر رکھ دیا جاتا تھا۔ جس کا خط ہوتا وہ تلاش کر کے لے جاتا۔ اس سے نہ تو کسی کو وقت پر خط لکھتا اور نہ اُسے وقت پر ملنے کی توقع ہوتی بلکہ اکثر خطوط گم ہو جاتے جن میں بعض بہت ضروری ہوتے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے ڈاک کے اس ناقص انتظام کو درست کرنے کی کوشش فرمائی، لیکن مکہ مکرمہ کی انتظامیہ نے آپ

Marfat.com

سے تعاون نہ کیا، چنانچہ آپ ڈاک کی اس درستگی کی حسرت لے کر اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے جانشین حضرت مولانا محمد سعید صاحب کیرانویؒ نے آپ کی اس خواہش کو بروئے کار لانے کے لیے اس جدوجہد کو جاری رکھا اور سطان عبدالحمید خان خلیفۃ المسلمین کو خط لکھ کر اس کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ مہتمم مدرسہ صولتیہ کے توجہ دلانے پر باب الوداع پر ڈاک خانہ تعمیر کرایا گیا۔

3- حضرت مولانا کیرانوی قدس سرہ سے قبل مکہ مکرمہ بلکہ تمام حجاز میں تعلیم کا ایک خاص منہاج اور نظام رائج تھا جس سے طالب علم میں وہ شعور پیدا نہیں ہوتا تھا جو وقت کا تقاضا تھا۔ حضرت مولانا بھی اس نصاب تعلیم سے خوش نہ تھے۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ تعلیم کے اس منہاج اور نظام کو تبدیل کیا جائے۔ چنانچہ مسجد حرم میں آپ نے جو مدرسہ قائم کیا وہ بڑا کامیاب رہا اور طالبعلم بھی بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ مدرسہ صولتیہ کی بنیاد بھی آپ نے اسی منہاج اور نظام تعلیم پر رکھی۔

4- مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا کیرانویؒ کی ہجرت سے قبل وہاں بچوں کے لیے کوئی صنعتی اسکول نہیں تھا جس میں وہ کوئی ہنر سیکھ سکیں۔ حضرت مولانا کیرانویؒ نے مکہ مکرمہ میں ایک صنعتی اسکول قائم فرمایا جس میں مہاجرین اور مقامی باشندوں کے بچے ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد ہنر مند بن کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی سرپرستی

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صابؒ اور اس انقلابی جماعت کے دوسرے کئی ایک افراد حضرت مولانا کیرانویؒ سے پہلے مکہ مکرمہ پہنچ چکے تھے۔ اور مولانا کیرانویؒ جس صبح مکہ پہنچے اس روز طواف کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحبؒ سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ پھر سعی میں بھی حضرت حاجی صاحبؒ آپ کے شریک رہے۔ حاجی صاحبؒ اس زمانہ میں رباط داؤدیہ میں جو باب العمرہ کے متصل ہے، رہائش پذیر تھے۔ عمرہ سے فراغت کے بعد یہ دونوں حضرات یہاں تشریف لائے۔ ہندوستان میں ان دونوں حضرات کا تعلق تو تھا ہی مکہ مکرمہ میں بھی اس روز سے لے کر

Marfat.com

آخر تک ان دونوں کا نہایت قریبی تعلق رہا۔ اور حضرت حاجی صاحبؒ مولانا کیرانویؒ کے ہر اہم اور غیر اہم کام میں شریک رہے۔ یہ دونوں حضرات مکہ میں یک جان دو قالب کی طرح رہتے تھے۔ اور رہتے بھی کیوں نہ کیونکہ ہندوستان میں بھی ان دونوں کی عزیز داری تھی۔ قصبے (تھانہ بھون اور کیرانہ) بھی قریب قریب تھے۔ مقصد زندگی بھی ایک تھا۔ دونوں ہی 57ء کی جنگ آزادی کے مجاہد اور ہیرو تھے اور دونوں ہی انگریزوں کے مفرور۔ چنانچہ سید محمد سلیمان شاہ پھلواری نے لکھا ہے کہ

> ''حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے غدر کے زمانہ میں انگریزوں سے جہاد کیا تھا۔ مولوی رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خان رحمہما اللہ بھی حضرت کے ساتھ تھے۔ ایک بڑی جماعت ان لوگوں کے ساتھ تھی، مگر شکست ہوئی اور یہ تینوں حضرات راجپوتانہ کے راستہ فرار ہو کر بمبئی پہنچے اور وہاں سے بادبانی جہاز پر سوار ہو کر حجاز گئے۔''(۱)
>
> (خاتم سلیمانی: جلد۲ص۴۰)

حضرت مولانا کیرانویؒ نے جب مدرسہ صولتیہ کی بنیاد رکھی تو حضرت حاجی صاحبؒ بھی مدرسہ کے گرم و سرد مسائل مین آپ کے شریک کار تھے اور مدرسہ کی ترقی میں آپ کا بھی بڑا حصہ ہے۔ اور اس بات میں بھی ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ حضرت مولانا کیرانویؒ اگرچہ اس مدرسہ کے بانی مبانی تھے اور آپ کا دن کا آرام اور راتوں کی نیند مدرسہ کی ترقی کے لیے وقف تھی، لیکن آپ کے بعد مدرسہ کی ترقی کے لیے حضرت حاجی صاحب کا دوسرا نمبر ہے۔ آپ اس مدرسہ کی کامیابی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے۔ آپ کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان سے جو شخص بھی ہجرت کر کے آئے وہ اس مدرسہ میں

۱۔ سید صاحبؒ کی اس بات سے ہمیں اختلاف ہے کہ یہ تینوں حضرات ایک ہی جہاز پر حجاز گئے تھے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ حضرت مولانا کیرانویؒ کے مکہ مکرمہ پہنچنے سے قبل حضرت حاجی صاحبؒ مکہ میں رہ رہے تھے۔ اگر یہ تینوں حضرات ایک جہاز میں جاتے تو مکہ میں اکٹھے پہنچتے۔ پھر یہ تینوں حضرات مختلف شہروں سے مختلف اوقات میں مفرور ہوئے تھے، لہٰذا ان کا اکٹھے ایک جہاز پر حجاز آنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں سید صاحبؒ نے یہ بات کیسے لکھ دی۔

Marfat.com

داخل ہو۔ آپ ہندوستان میں بھی لوگوں کو اس مدرسہ میں داخل ہونے کی ترغیب دیتے۔ چنانچہ آپ نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے فرزند ارجمند حافظ محمد احمد صاحب کے لیے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا رفیع الدین کو خط لکھا کہ انہیں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مکہ مکرمہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ خط کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ

بخدمت بابرکت عزیزم مولوی رفیع الدین صاحب دام مجدہ

بعد سلام مسنون و دعائے خیر کے معلوم فرمائیں۔ خط تمہارا مورخہ یکم رجب عین انتظار میں پہنچا اور سب حال وہاں کا معلوم ہوا۔ حال واقعہ جانکاہ کا خطوط بمبئی اور بھوپال اور میرٹھ وغیرہ سے معلوم ہوا تھا۔ اس صدمہ نے فقیر کو ضعیفی میں بہت کرا دیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

رضا بقضاء بندہ ہیں۔ اس کے جو چاہے کرے۔ ہم سب کو چاہیے جان و دل سے اس کی رضا پر رہیں۔ ہمارے نفع نقصان کو وہ خوب جانتا ہے۔ اس پر سونپ کر اپنے کام میں مصروف رہیں جس سے رضا مندی اللہ و رسول حاصل ہو۔ عزیز من! جو تم میں بڑے سرپرست مدرسہ کے تھے وہ جنت الفردوس کو سدھارے۔ اگرچہ میں چاہتا ہوں کہ تم سب صاحب بدل مدرسہ کی بہبودی میں مصروف ہوں گے۔ فقیر بھی تم کو لکھ کے داخل ثواب ہوتا ہے۔ عزیز من! خصوصاً تم کو کہ مدرسہ کے مہتمم ہو، چند امور کا لحاظ چاہیے۔ اول تو مدرسہ کے کام میں کسی کی رو رعایت نہ کرنی چاہیے۔ بہ امانت و دیانت رہنا چاہیے۔ اگر کسی کے ساتھ بے وجہ رعایت و مروت کرو گے، کل کو جواب دینا ہوگا۔ دوسرے مدرسہ کا مال بیت المال ہے۔ اس سے قرض دام پیشگی مت دیا کرو۔ تم کو

Marfat.com

اس میں تصرف نہیں پہنچتا۔ تیسرے یوں تو سارے مدرس اور اہل مدرسہ فقیر کے عزیز اور پیارے ہیں، مگر عزیزم مولوی محمد یعقوب کا چند وجوہ سے زیادہ واسطہ ہے، لہٰذا اگر وہ مدرسہ کے کسی کام میں کوتاہی کیا کریں تو ان سے بجبر کام لیا کرو۔ انشاء اللہ وہ اس سے ناراض نہ ہوں گے۔ کیونکہ دانا ہیں۔ چوتھے عزیزم مرحوم کے جو شاگرد اور مرید ہیں اور دوست ہیں، سب مدرسہ کی طرف توجہ رکھیں اور عزیزم رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عمدہ یادگاری مدرسہ ہے، اس سے غفلت نہ کریں۔

پانچویں عزیزم مرحوم (یعنی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ) کی اولاد کے ساتھ رعایت اور مروت رکھیں خصوصاً تعلیم علم اور تربیت امور خیر میں لحاظ رکھیں۔ فقیر چاہتا ہے کہ برخودار احمد (حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ) کو یعنی فرزند عزیزم مرحوم کو اپنے پاس بلا کر رکھوں، اور یہاں مدرسہ میں مولوی رحمت اللہ کی خدمت میں تحصیل علم کرے، اور جب تک فقیر جیئے اس سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھے، مگر اس کی والدہ شاید جدائی گوارا نہ رکھیں۔ فقیر کو اس کی خاطر بھی منظور ہے۔ اس واسطے اس امر میں سکوت کیا۔ بہر حال دعا پر اکتفاء کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو سب برائیوں اور تکلیفوں سے محفوظ رکھے اور علم نافع اور عمل صالح نصیب کرے۔'' (آمین)

فقط از حافظ عبداللہ و حافظ احمد حسین مولوی رحمت اللہ سلام مسنون

حضرت حاجی صاحبؒ کے اس خط سے ایک تو حضرت نانوتویؒ اور آپ کے خاندان سے آپ کے تعلقات کی گیرائی اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے اور دوسرے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مدرسہ صولتیہ سے آپ کے تعلق پر روشنی پڑتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند جیسے مدرسہ سے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کو مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ میں آپ انہیں منتقل کرنے کے عزم کا اظہار فرماتے ہیں۔

Marfat.com

حضرت مولانا کیرانویؒ کے انتقال کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب مدرسہ صولتیہ کے سرپرست بنے، اس وقت بھی آپ نے مدرسہ صولتیہ کی ترقی کے لیے بہت کوشش کی اور ہر ایک کو مدرسہ کی امداد اور اس میں داخلہ کی ترغیب دی۔ تو گویا کہ مدرسہ صولتیہ دو بزرگوں کی کوششوں اور دعاؤں کا ثمرہ ہے، ایک مجاہد اسلام حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور دوسرے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ۔

5- مدرسہ صولتیہ کے نظام تعلیم کا ایک اپنا طرز تھا جس کی حجاز میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ چنانچہ مدرسہ صولتیہ کے قیام کے بعد کئی حضرات نے اس طرز پر حجاز میں مدارس قائم کیے۔ ان مدارس کی افادیت کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت قطب الاقطاب حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ نے اپنے خلیفہ ارشد حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو تحریر فرمایا۔ آپ نے اس خط میں لکھا ہے کہ

> ”یہ مدرسہ (مولانا قاری احمد مکیؒ کا مدرسہ) جناب مولوی رحمت اللہ صاحب کی شاخ ہے۔ جناب مولانا مرحوم کی ہمت اور توجہ سے یہ مدرسہ قائم اور اس کا اہتمام قاری حافظ احمد مکیؒ صاحب موصوف کے ذمہ کیا گیا...... ماشاءاللہ ان مدرسوں سے فائدہ عظیم ہوئے ہیں۔“
>
> (مکتوبات امدادیہ: ص ۶ مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

بیماری:

حضرت مولانا کیرانویؒ کا قسطنطنیہ کا دوسرا سفر نہایت اچھا اور کامیاب رہا۔ آپ کے مختلف لوگوں سے تعلقات استوار ہوئے۔ کئی حضرات سے آشنائی ہوئی۔ اور سلطان کے خلعت فاخرہ دینے اور مختلف القابات سے نوازنے کی وجہ سے عمائدین سلطنت کے قلوب میں آپ کی محبت اور مقام پیدا ہوا۔ اور یہ سفر آپ کے تیسرے سفر کی تمہید ثابت ہوا۔ قسطنطنیہ کے دوسرے سفر سے واپسی کے بعد آپ کی مکہ کی مصروفیات میں قدرے اضافہ ہو گیا، لیکن آپ نے خیر الدین پاشا، جناب علی بے اور شیخ الاسلام وغیرہ مقربین سلطنت اور اعیان حکومت سے اپنی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ بلکہ

Marfat.com

آپ اکثر سلطان معظم کو بھی بعض اہم امور کے متعلق براہ راست خطوط تحریر فرماتے رہے۔ اس خط و کتابت سے حضرت مولانا کیرانویؒ کے سلطان اور ارکان حکومت سے تعلقات استوار ہوئے۔

اب حضرت مولانا کیرانویؒ شباب اور جوانی کی منزلوں کو طے کر کے بڑھاپے اور کبرسنی کی منازل میں داخل ہو گئے۔ بڑھاپے کی وجہ سے جہاں آپ کے اور قویٰ مضمحل ہوئے وہاں ضعف بصر کا عارضہ بھی آپ کو لاحق ہو گیا۔ اور 1303ھ میں آپ کو نزول الماء (موتیا بند) کی شکایت ہوگئی۔ جس کی وجہ سے آپ لکھنے پڑھنے سے یک قلم معذور ہو گئے۔ ایک جید عالم دین کے لیے لکھنے پڑھنے سے معذور اور مجبور ہو جانا سب سے بڑا عارضہ ہوتا ہے۔ شاید گورنر حجاز عثمان نوری پاشا یا کسی اور شخص نے حضرت مولانا کیرانویؒ کی اس معذوری اور مجبوری کی سلطان کو اطلاع دی سلطان معظم نے اس محبت و شفقت کے ناطے جو انہیں حضرت مولانا مرحوم سے تھی، فوری طور پر حضرت کو اپنے پاس طلب کیا تا کہ یہاں آپ کا نزول الماء کا علاج کرایا جاسکے، لیکن کچھ تو کبرسنی کی وجہ سے اور کچھ مختلف عوارض کے باعث حضرت مولانا مرحوم نہایت کمزور ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے اب اتنا طویل سفر آپ کے لیے نا قابل برداشت تھا۔ اس زمانہ میں ذرائع مواصلات اتنے تیز نہیں تھے اور نہ ہی سفر میں وہ سہولیات میسر تھیں جو آج کل میسر ہیں۔ وگرنہ مکہ مکرمہ سے استنبول کا سفر کوئی اتنا طویل نہیں ہے۔ اس زمانہ میں ہوائی جہاز تو تھے نہیں۔ بحری جہاز ہوتے تھے، لیکن ان میں بھی وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ آج تو بحری جہازوں میں بھی بڑا آرام و آسائش ہوتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں سمندر میں جہاز کے ہچکولوں کی صعوبت انسان کے ناتواں جسم کو ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ چنانچہ پہلے تو حضرت مولاناؒ نے اتنا طویل سفر کرنے سے معذوری کا اظہار فرمایا، لیکن سلطان معظم کے حکم کا احترام کرتے ہوئے آپ نے عزم سفر کیا۔ رفقائے سفر میں مولانا عبداللہ صاحب عرف عبداللہ جی جو آپ کے شاگرد اور خادم خاص تھے، آپ کے ساتھ تھے۔ قسطنطنیہ کے اس تیسرے سفر کے جو حالات حضرت مولانا کیرانویؒ نے قلم بند فرمائے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

''پورٹ سعید میں روز شنبہ 27 شعبان 1304ھ استنبول کو دو تار

Marfat.com

روانہ کیے۔ ایک بنام میاں بدرالاسلام صاحب کے اور ایک بنام علی بے کے۔ اور اس تار میں ایک گنی عثمانی الادوفرانک خرچ ہوئے۔ اور اسی روز شنبہ بعد عصر آ گبوٹ (جہاز) پورٹ سعید روانہ ہوا اور چہار شنبہ کی رات کو چاند رمضان شریف کا نظر آیا اور روز چہار شنبہ پہلی رمضان المبارک بحساب ہماری رؤیت کے، صبح کے وقت تین بجے ''چناق قلعہ'' میں پہنچے اور وہاں کمندار (فوجی افسر اعلیٰ) تمام قلعوں کا چناق قلعہ کے آ گبوٹ پر آیا۔ اور مولوی صاحب سے ملا اور کہا کہ ''سرائے (محل شاہی) سے حکم آیا ہے کہ مولوی رحمت اللہ صاحب چناق قلعہ میں پہنچے یا نہیں؟ اس سے اطلاع دو، تو میں اس بات کے واسطے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔'' اور بعد ایک ساعت کے پھر آ گبوٹ چلا اور روز پنج شنبہ 2 رمضان المبارک 1304ھ استنبول میں پہنچے اور سرائے یلدیز (قصر یلدز) میں ''چادر کشک'' میں اُترے اور بعد ایک ساعت کے جناب سید احمد اسعد آفندی مدنی تشریف لائے اور کہا کہ ''حضرت سلطان آپ کو بلاتے ہیں۔'' تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک آغا (خواجہ سرا) آیا تو جناب مولوی صاحب حضرت سلطان کے پاس تشریف لے گئے۔ حضرت سلطان بڑی تعظیم سے پیش آئے۔ اور بعد دو ساعت کے پھر جناب مولوی صاحب رخصت لے کر مکان (چادر کشک) میں تشریف لائے۔ پھر قریب مغرب اسی روز پھر سید احمد اسعد آفندی مدنی تشریف لائے۔ اور کہا کہ ''حضرت سلطان بلاتے ہیں۔'' تو مولوی صاحب تشریف لے گئے۔ اور وہیں افطار کیا اور تراویح بھی وہیں پڑھی۔ حضرت سلطان نے اس وقت فرمایا کہ آپ کی آنکھوں کے علاج کے واسطے کل میں ڈاکٹروں کو جمع کروں گا۔ پھر وہاں سے مولوی صاحب مکان پر

Marfat.com

تشریف لائے اور روز جمعہ بعد عصر حضرت سلطان نے اپنے ایک مصاحب کے ساتھ پانچ قابل ترین ڈاکٹروں کو بھیجا۔ انہوں نے آ کے مولوی صاحب کی آنکھوں کو خوب تحقیق سے دیکھا اور کہا کہ ''انشاء اللہ آنکھیں اچھی ہو جائیں گی پر علاج دو مہینہ کے بعد کریں گے، کیونکہ اب تک پانی آنکھوں میں کامل نہیں اترا۔ اور روز پنج شنبہ میں حاجی علی بے قرنائے ثانی بھی بعد ظہر تشریف لائے اور انہوں نے مولوی صاحب سے ملاقات کر کے مولوی بدرالاسلام سے کہا کہ مولوی صاحب کے واسطے کپڑے بازار سے لے آئیں اور جا کے کپڑے بازار سے خریدے اور لیتے آئے۔ اور روز جمعہ جامع حمیدیہ میں پڑھی اور روز شنبہ 5 رمضان المبارک بعد ظہر جناب عبداللہ پاشا نجدی واسطے ملاقات جناب مولوی صاحب کے آئے اور روز دوشنبہ 7 رمضان المبارک شیخ محمد ظافر مع اپنے بڑے بیٹے کے ملاقات کے واسطے تشریف لائے اور بعد اس کے اور چند بار حضرت سلطان نے بلایا اور 15 رمضان روز سہ شنبہ زیارت چادر شریف میں جانے کے واسطے بگی عمدہ بھیجی۔ اور سید احمد اسعد آفندی کو بہ سبب ضعف بصر کے ساتھ کیا اور وہاں جائے زیارت میں اسحاق آفندی اور اکثر قضاۃ عسکر ملے، اور 30 رمضان المبارک کو جناب سید احمد اسعد کو حضرت سلطان نے مولوی صاحب کی خریت دریافت کرنے کو بھیجا اور پہلی شوال روز چہار شنبہ کو ہوئی اور نماز عید کی جامع حمیدیہ میں پڑھی۔''

سلطان کی خواہش تھی کہ حضرت مولانا مرحوم قسطنطنیہ میں ان کے پاس رہیں۔ ایک صحبت میں سلطان نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا، جس کے جواب میں حضرت مولانا کیرانویؒ نے فرمایا:

''اعزاء و اقارب کو چھوڑ کر ترک وطن کر کے خدا کی پناہ میں اس

Marfat.com

کے دروازے پر آ کر پڑا ہوں۔ وہی لاج رکھنے والا ہے۔ آخری وقت میں امیر المومنین کے دروازے پر مروں تو قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گا۔"

قسطنطنیہ کا یہ تیسرا سفر حضرت مولانا کیرانویؒ کے لیے بڑا تکلیف دہ اور گراں تھا۔ مختلف عوارض کے باعث سفر بھی تکلیف دہ اور پھر وہاں کا قیام بھی گراں، اور شاق۔ عمر کی ان آخری منازل کی زندگی میں ایک انقلاب آیا ہوا تھا۔ اب آپ کی زندگی وہ مناظرانہ زندگی نہ رہی تھی بلکہ ایک ذاکرانہ زندگی بن چکی تھی۔ آپ اس حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ یاد خداوندی اور ذکر و فکر میں اللہ کے گھر میں گزار کر اپنی زلات و خطایا کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے اس وجہ سے آپ جلد از جلد قسطنطنیہ سے واپس آنے کے خواہش مند تھے۔ آج تو طبی سائنس بہت ترقی کر گئی ہے خصوصی طور پر سرجری نے تو اس قدر ترقی کی ہے کہ پھیپھڑے، گردے اور دوسرے اعضاء کی پیوندکاری بھی بڑے کامیاب طریقے سے ہونی شروع ہو گئی ہے۔ ہرنیا، اپنڈکس اور آنکھوں کے اپریشن تو معمولی بات ہو کر رہ گئے ہیں، لیکن آج سے سو سال قبل معاملہ ایسا نہیں تھا۔ نہ اس قسم کی ادویات تھیں، نہ وہ اوزار اور نہ ہی ڈاکٹر حضرات کی وہ ٹریننگ۔ اسی زمانہ میں آنکھوں کا اپریشن ایک ہیبت ناک چیز سمجھی جاتی تھی، اس وجہ سے حضرت مولانا کیرانوی کو اگرچہ حکومت کے بہترین ڈاکٹروں نے بہت یقین دلایا کہ آپ کو اپریشن سے کوئی تکلیف نہیں ہو گی اور اپریشن کے بعد آپ کی آنکھیں بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی لیکن آپ کسی صورت آنکھوں کے اپریشن کے لیے تیار نہ ہوئے۔ سلطان معظم کو آپ کی از حد دلداری مقصود تھی۔ اس لیے آپ نے کچھ زیادہ اصرار نہ کیا کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔ کچھ عرصہ قسطنطنیہ میں رہنے کے بعد ذی قعدہ کے مہینہ میں آپ سلطان معظم کی اجازت سے مکہ مکرمہ تشریف لے آئے۔ اور 1305ھ میں ایک مقامی ڈاکٹر سے موتیا بند (نزول الماء) کا مکہ مکرمہ ہی میں اپریشن کرا لیا، جو افسوس ہے کہ کامیاب ثابت نہ ہوا، اور آپ کی بینائی درست نہ ہو سکی۔

معلوم نہیں بڑے آدمی اکثر لاولد کیوں ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا شیخ الہند

Marfat.com

محمود الحسنؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہ کی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بھی انہی بڑے لوگوں کی طرح لاولد تھے۔ بڑھاپے کی منازل گزر رہیں تھیں اور توسن عمر رواں تھمنے کے قریب ہو رہا تھا۔ عمر عزیز برف کی طرح لمحہ بہ لمحہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ لہٰذا آپ اپنا کوئی جانشین جو آپ کا معتمد علیہ ہو، تیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے یہ سب باتیں ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا حکیم علی اکبر مرحوم کے پوتے حضرت مولانا محمد سعید صاحبؒ کو کیرانہ سے بلایا۔ ان کے والد ماجد مولانا محمد صدیق صاحب کیرانہ میں سرشتہ دار تھے۔ ان کے مکان کے بالکل قریب ایک مشن اسکول تھا جس میں منشی نہال الدین صاحب فارسی کے مدرس تھے۔ منشی نہال الدین اور مولانا محمد سعید صاحب کے والد مولانا محمد صدیق کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے۔ ان تعلقات کی بنا پر مولانا محمد صدیق صاحب نے اپنے لڑکے محمد سعید کو مشن اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اس داخلہ کی اطلاع جب حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو ہوئی تو آپ نے سخت رنج اور غصہ کا اظہار فرمایا، اسی وقت اپنے بھتیجے مولانا محمد صدیق صاحب کو بڑی سختی کے ساتھ لکھا کہ ''محمد سعید کو فوری طور پر مشن اسکول سے نکال کر مکہ معظمہ بھیج دو۔ چنانچہ مولانا محمد سعید صاحب اس وقت مکہ مکرمہ پہنچے جب ان کی عمر بارہ برس کی تھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اپنے زیر اہتمام اور اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ ضعف بصارت کے بعد خطوط کی تحریر کا کام بھی ان کے ذمہ تھا۔ دوسری طرف قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خواہش پر بالعموم مغرب اور عشاء کے درمیان مولانا محمد سعید صاحبؒ حضرت حاجی صاحبؒ کے خطوط وغیرہ سنانے اور ان کا جواب لکھنے کے لیے جاتے تھے، اس طرح ان دونوں بزرگوں نے اپنی خاص نگرانی اور تربیت سے مرکز اسلام مکہ مکرمہ کی خدمت کے لیے آپ کو تیار کیا۔

ویسے تو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے کئی یادگاریں چھوڑیں لیکن آپ کی دو یادگاریں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک ''اظہار الحق'' اور دوسری ''مدرسہ صولتیہ'' سرزمین حرم میں آپ کی ''مدرسہ صولتیہ'' کی شکل میں جو دائمی یادگار ہے، اس کی متعدد خصوصیات ہیں۔ ایک خصوصیت اور امتیاز اس کا یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی

Marfat.com

متعدد عمارتیں ہیں اور مدرسہ کے تمام شعبے ان وسیع وعریض عمارتوں میں ہیں جو اسی مقصد کے لیے حضرت مولانا کیرانویؒ، بانی مدرسہ نے بنائی تھیں۔ آپ کے زمانہ میں مدرسہ کی اکثر عمارتیں مکمل اور تیار ہو گئی تھیں۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے کہ محترمہ صولت النساء بیگم صاحبہؒ کی مالی اعانت کے سے 1291ھ میں مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت تیار ہوئی اور مدرسہ کو اس میں جاری کیا گیا۔ اور اس محسن خاتون کے نام سے اس عمارت کو موسوم کیا گیا۔ اس اولین عمارت میں پانچ بڑے کمرے اور تین چھوٹے کمرے، وسیع صحن اور دیگر ضروریات کی چیزیں مہیا کی گئیں۔

مدرسہ کی دوسری مستقل عمارت دارالاقامۃ ہے جو صوبہ بہار کے ایک عالی ہمت اور مخیّر رئیس میر واجد حسین صاحب رئیس پٹنہ کی یادگار ہے۔ اس عمارت کی ابتداء 1293ھ میں ہوئی یعنی مدرسہ کی اصل عمارت سے صرف دو سال بعد۔ مدرسہ کے اس دارالاقامۃ میں پچاس طلبہ کے قیام اور رہنے کی گنجائش ہے جس کا کوئی معاوضہ وغیرہ کسی سے نہیں لیا جاتا۔

مسجد کی تعمیر:

مدرسہ کی مسجد جو مدرسہ سے بالکل ملحق ہے، تاریخی حیثیت کے علاوہ ہندوستانی طرز تعمیر کا واحد نمونہ ہے۔ 1301ھ میں عثمان نوری پاشا گورنر مکہ کے عہد میں صحن حرم میں چاہ زمزم کے سامنے اور باب النبی کے محاذ میں ایک خوبصورت عمارت میں ''سلطانی کتب خانہ'' تھا۔ اس عمارت کی وجہ سے نماز کے اوقات میں حجاج کرام کو تکلیف اور اقامت نماز میں پریشانی کا باعث بنتی تھی۔ حجاز کے گورنر عثمان نوری پاشا نے وزارت اوقاف، قسطنطنیہ کو حجاج کرام کی ان پریشانیوں کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ اگر کتب خانہ کی اس عمارت کو صحن حرم سے اٹھوا دیا جائے تو زائرین حرم اور حجاج کرام کے لیے آسانی اور سہولت کا باعث ہوگا۔ وزارت اوقاف نے یہ مسئلہ سلطان عبدالحمید خان کے سامنے رکھا۔ سلطان نے گورنر حجاز کی اس درخواست کو فوراً منظور فرما لیا۔ چنانچہ کتابیں اور عمارت

Marfat.com

کا دوسرا تمام سامان مسجد حرم سے ملحقہ عمارت میں منتقل کر دیا گیا اور کتب خانہ کی عمارت کو زمین بوس کر دیا گیا۔

منہدم عمارت کے ملبہ کے نیلام کا اعلان حکومت کی جانب سے ہوا۔ اس خبر کو سن کر عاشق دین متین حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بے چین ہو گئے کہ جو پتھر اور سامان عمارت کئی سو سال تک جوار کعبہ اور صحن حرم میں رہا ہو، نیلام کے بعد نہ معلوم خریدنے والے اسے کس جگہ اور کس مقام پر لگائیں۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ یہ سارا سامان کسی پاکیزہ عمارت میں لگے۔ اور مسجد سے زیادہ پاکیزہ اور کوئی عمارت نہیں لہٰذا آپ اس ملبہ سے ایک مسجد تعمیر کرنے کے خواہش مند تھے۔ حضرت مولاناؒ فوراً عثمان نوری پاشا کے پاس گئے اور اس سے اپنی اس دلی خواہش کا اظہار فرمایا۔ فرمایا کہ مدرسہ کو مسجد کی ضرورت بھی ہے لہٰذا اس ملبہ سے مسجد تعمیر کروادی جائے گی جس میں مدرسہ کے طالب علم نماز ادا کیا کریں گے۔

عثمان نوری پاشا نے بلکہ افسران ترکیہ نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ لیکن ملبہ کی قیمت کے تعین میں کچھ ردوکد ہوئی۔ جس پر گورنر نے کہا کہ میں وزارت اوقاف کو لکھتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ آپ کو اس کار خیر کے لیے ملبہ مفت دے دے گی۔ حضرت مولانا کیرانویؒ جانتے تھے کہ حکومت کے ہاں جو معاملات جاتے ہیں، ان کے طے ہونے میں غیر معمولی دیر لگتی ہے۔ اس عرصہ میں یہ ملبہ صحن حرم سے نکل کر باب ابراہیم کے سامنے ڈالا جائے گا اور اس کی بڑی بے حرمتی ہوگی۔ لہٰذا حضرت نے یہ پیشکش کی کہ میں اس ملبہ کی قیمت پندرہ سو ریال دیتا ہوں۔ یہ ایک معقول قیمت تھی، لہٰذا گورنر نے بخوشی منظور کر لیا۔ حضرت مولانا اسی وقت واپس مدرسہ آئے اور مدرسہ کے خازن سے پوچھا کہ خزانہ میں کتنی رقم ہے؟ اس نے کہا کہ پندرہ سو ریال سے زیادہ نہیں ہیں۔ آپ نے فوراً وہ رقم خازن مدرسہ سے لے کر گورنر کو بھیج دی۔ اور کتب خانۂ حرم کا تمام ملبہ مدرسہ لا کر ڈالا جانے لگا۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے جب خازن مدرسہ سے پندرہ سو ریال لے کر گورنر

Marfat.com

[illegible]

[illegible] کرامت

مولانا [illegible] تجارت [illegible] اور [illegible] میں ایک مسجد بنوائی

[illegible] ایک شہر [illegible] ہے [illegible] ہندوستانی مسجد میں تین گنبد ہوتے ہیں [illegible] حضرت مولانا [illegible] ہندوستانیت [illegible] کیونکہ وہ ہندوستانی [illegible] تھے [illegible] ہندوستانی تھا چنانچہ مسجد کی تعمیر کے وقت انہوں نے [illegible] کہ [illegible] مسجد میں بھی ہندوستانی مسجد کی طرح تین گنبد بنائے جائیں لیکن یہاں [illegible] یہ مشکل پیش آئی [illegible] تجارتی کاریگر ہندوستانی طرز کا نہیں بنا سکتے تھے۔ وہ گنبد بنانے کے لیے ہندوستانی معماروں کی ضرورت تھی جو کہ وہ [illegible] مشکل تھے لیکن جب کوئی شخص اللہ کے کام کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ خود اس کے راستہ کی تمام مشکلات کو دور فرما دیتے ہیں کیونکہ وہ "حل المشکلات" ہیں۔

مسجد کی تعمیر کا کام ابھی جاری تھا کہ اسی سال حج بیت اللہ کے لیے ہندوستان سے وہ معمار آ گئے۔ اتفاقاً ان دونوں حضرت کی مولانا سے ملاقات ہو گئی۔ مسجد کی تعمیر کے کام [illegible] انہوں نے دیکھا۔ جب مولانا مرحوم نے تین گنبدوں کے بنانے کے خیال کا اظہار

فرمایا تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔ چنانچہ خود مولانا کیرانوی، مدرسہ کے اساتذہ، طلبا اور مہاجرین حرم اینٹ پتھر، گارہ پورے ذوق وشوق اور ولولہ کے ساتھ اٹھا کر ان معماروں کو دینے لگے۔ نتیجہ اس ساری کاوش اور جدوجہد کا یہ ہوا کہ کتب خانہ حرم کے اس متبرک ملبہ سے 1304ھ میں مدرسہ صولتیہ کی مسجد منصۂ شہود پر آ گئی۔ مسجد کی تکمیل پر حضرت مولانا کیرانویؒ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

اسی زمانہ میں ہرات کے ایک ذی علم اور بزرگ مکہ مکرمہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لائے۔ ان کی حضرت مولانا رحمت اللہؒ سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو مولانا نے مسجد کا ذکر فرمایا۔ مسجد کا ذکر سن کر وہ تشریف لائے۔ نماز پڑھی اور نماز سے فراغت کے بعد ایک طالبعلم سے قلم دوات اور ایک کاغذ لے کر قلم برداشتہ فی البدیہ مسجد کی تاریخ کا ایک قطعہ لکھا جو آج بھی بطور یادگار مسجد کی محراب پر نمایاں اور جلی حروف میں کندہ ہے۔

ایک روایت کے مطابق ہرات کے ایک ذی علم اور خوش قلم وخوش کلام مہاجر جن کو حضرت مولانا کیرانویؒ سے خلوص اور دلی تعلق تھا، انہوں نے مدرسہ کا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ لکھ کر اپنے ہاتھ سے محراب مسجد کی پیشانی پر کندہ کیا، جو آج تک قائم ہے۔

بسکہ خوش منظر است ایں مسجد
ما رأی العین مثلہ الثانی
گشت تاریخ ''خانۂ رحمت''
۱۳۰۴ھ
رحمۃ اللہ قل علی البانی

اس قطعۂ تاریخ میں ''خانۂ رحمت'' سے مسجد کا سن تعمیر نکلا گیا جو کہ 1304ھ ہے۔ مسجد اگرچہ چھوٹی ہے لیکن تعمیر کا بہترین شاہکار ہے۔ اور آج بھی اُسے دیکھ اور نماز پڑھ کر لوگ بانی مسجد پر رحمت خداوندی کی دعاؤں کی سوغاتیں بھیجتے ہیں۔ چند سال قبل موجودہ مہتمم صاحب نے اس مسجد کو شہید کر کے چار منزلہ عالی شان مسجد تعمیر کی ہے۔ جو جدید طرز کی ہے اور اس میں لفٹ بھی لگا دی ہے تا کہ نمازیوں کو سہولت رہے۔

بیت اللہ کی مرمت میں شرکت:

سلطان عبدالحمید خان کے عہد میں خانۂ کعبہ اس وقت کھولا جاتا تھا جب اس میں کچھ مرمت وغیرہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلطان عبدالحمید خان کو پتہ چلا کہ بیت اللہ کے اندرونی حصہ میں مرمت کی ضرورت ہے۔ مرمت ویسے بھی ہو سکتی تھی لیکن سلطان موصوف اس مرمت کو علماء کی نگرانی میں کرانا چاہتے تھے تاکہ احترام کعبہ برقرار رہے۔ چنانچہ اس نیک اور پاکیزہ مقصد کے لیے چھ علماء کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ان چھ میں حضرت مولانا رحمت اللہؒ بھی ایک تھے۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

اس مرمت کے لیے انجینئروں کو طلب کیا گیا۔ انہوں نے ایک مخصوص قسم کا مسالہ تیار کیا جو بہت جلد خشک ہو جاتا تھا۔ اور علماء اور کام کرنے والوں کے لیے احترام کعبہ کے پیش نظر ایک خاص قسم کا عمامہ تیار کیا گیا جس کو پہن کر وہ خانۂ کعبہ میں داخل ہوتے تھے اور اس کی مرمت اور درستی کرتے۔ اس مرمت میں حضرت مولانا کیرانویؒ کا بہت بڑا عمل دخل تھا۔

سیاسی بصیرت:

اسی دور میں انگریزوں نے حکومت ترکیہ سے عدن میں جہازوں کے لیے کوئلہ جمع کرنے کے لیے تھوڑی سی جگہ مانگی تھی۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کو انگریزوں کی اس خواہش کا پتہ چلا تو آپ نے فوری طور پر سلطان عبدالحمید خان کو خط لکھا جس میں بتایا کہ عدن بحری نقطۂ نظر سے نہایت اہم جگہ ہے۔ اگر آپ نے یہاں پر انگریزوں کو تھوڑی سی جگہ بھی دے دی تو وہ بہت خطرناک ثابت ہوگی۔ اور خطرہ ہے کہ اس طرح پورے عدن پر ایک روز انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو جائے گا۔ اور اس کا اثر دوسرے ممالک اسلامیہ کے لیے نہایت خطرناک ہوگا۔ سلطان عبدالحمید خان نے اس مرد درویش کی بات پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور انگریزوں کو عدن میں جگہ دے دی۔ لیکن ''قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید'' حضرت مولانا مرحوم کی بات صحیح نکلی۔ چنانچہ نتیجتاً انگریز پورے عدن پر قابض ہو گیا اور

Marfat.com

عرب ممالک کے لیے نہایت پریشانی کا باعث بنا۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کیرانویؒ کی سیاسی بصیرت بھی نہایت دوررس تھی۔ اور آپ اہل کفر خصوصی طور پر انگریزوں کو عالم اسلام کے لیے نہایت مضر سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ مسلمانوں کی کانگرس میں شمولیت کے بھی سخت مخالف تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ سے کانگرس میں شرکت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں جو فرمایا: اس مجلہ مشیر قیصر، فروری 1890ء کو بدیں الفاظ چھاپا

> ”حاجی نواب عمر علی خان رئیس باسودہ نے مشیر قیصر مطبوعہ 30 جنوری 1890ء میں مولانا رحمت اللہ صاحب مہاجر مقیم مکہ معظّمہ کا ایک خط چھاپا ہے جو کانگرس کی بابت ہے۔ یہ خط نواب صاحب نے مولانا صاحب کو لکھا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے یہ تحریر فرمایا کہ اول تو کانگرس کے اصول سے میں اچھی طرح واقف نہیں۔ تاہم اگر اس کے اصول اچھے بھی ہوں تو بعض وجوہ سے مسلمانوں کے حق میں کانگرس مضر ہے۔“

انیسویں صدی کے آخر میں جب کہ کانگرس کی تنگ نظری ابھی اتنی عیاں نہیں ہوئی تھی، حضرت مولانا کیرانویؒ کی سیاسی بصیرت اسے پہلے ہی بھانپ گئی تھی اور آپ اُسے مسلمانانِ ہند کے لیے سخت مضر خیال فرماتے تھے۔

حضرت مولانا کیرانویؒ سے نواب صاحب نے کانگرس میں شمولیت کے بارے میں جو سوال کیا تھا اس میں جہاں مولانا مرحوم کی سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا ہے وہاں اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ باوجود اس بات کے کہ حضرت مولانا ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ تشریف لے جا چکے تھے لیکن ہندوستان کے مسلمان آپ پر ہر لحاظ سے اعتماد کرتے تھے۔ گویا آپ تمام اہل ہند کی نگاہوں میں عزت و وقار سے دیکھے جاتے تھے اور آپ ایک قابل اعتماد شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ یہاں کے لوگ آپ کے ارشادات اور مشوروں کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دیتے تھے۔ ہمارے اس خیال کی

Marfat.com

حجاز کو ملبہ کی قیمت کے طور پر دیئے تو اساتذہ اور طلبہ میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ مہینے کا اختتام ہے۔ خزانہ بالکل خالی ہو گیا ہے۔ مدرسین کو تنخواہیں اور طلبہ کو وظائف کہاں سے دیئے جائیں گے۔ اور مدرسہ کے اور ضروری کام کہاں سے پایۂ تکمیل کو پہنچیں گے۔ مخالفین نے مدرسین اور طلبہ کی یہ باتیں جب سنیں تو بہت خوش ہوئے کہ اب مدرسہ میں خلفشار اور انتشار پیدا ہو گا۔ مدرسہ ٹوٹے گا۔ مدرسین اور طلبہ بھاگ جائیں گے۔ ادھر دوسری طرف حضرت مولانا نہایت مطمئن تھے۔ کیونکہ وہ متوکل درویش تھے۔ انہوں نے پندرہ سو ریال کی یہ رقم اپنے لیے صرف نہیں کی تھی بلکہ اللہ کا گھر تعمیر کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔ چنانچہ تیسرا دن گزرنے نہ پایا تھا کہ ایک میمن تاجر مکہ معظّمہ آیا ہوا تھا۔ اس نے جب یہ سنا کہ حضرت مولانا مسجد تعمیر کرنے کے لیے حرم کا ملبہ اٹھوا کر لے گئے ہیں تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دس ہزار ریال آپ کی خدمت اقدس میں ان الفاظ کے ساتھ پیش کیے:

”آپ نے بڑا کام کیا۔ اللہ قبول فرمائے۔“

اسلامی ممالک مثلاً حجاز، فلسطین، بغداد، دمشق اور کربلا وغیرہ میں مسجد ایا صوفیہ کی تقلید میں ایک گنبد بنایا جاتا ہے، لیکن ہندوستانی مساجد میں عموماً تین گنبد بنائے جاتے ہیں۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کے رگ و ریشہ میں ہندوستانیت رچی بسی تھی۔ کیونکہ وہ ہندستانی نژاد تھے۔ ان کی تہذیب اور کلچر ہندوستانی تھا۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر کے وقت انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مسجد میں بھی ہندوستانی مساجد کی طرح تین گنبد بنوائے جائیں۔ لیکن یہاں ان کو پھر ایک مشکل پیش آئی وہ یہ کہ حجازی کاریگر ہندوستانی طرز کا گنبد نہیں بنا سکتے تھے۔ وہ گنبد بنانے کے لیے ہندوستانی معماروں کی ضرورت تھی جو کہ وہ ملنے مشکل تھے۔ لیکن جب کوئی شخص اللہ کے کام کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ اس کے راستہ کی تمام مشکلات کو دور فرما دیتے ہیں کیونکہ وہ ”حل المشکلات“ ہیں۔

مسجد کی تعمیر کا کام ابھی جاری تھا کہ اسی سال حج بیت اللہ کے لیے پانی پت کے دو معمار آ گئے۔ اتفاقاً ان دونوں حضرت کی مولاناؒ سے ملاقات ہو گئی۔ مسجد کی تعمیر کے کام کو انہوں نے دیکھا۔ جب مولانا مرحوم نے تین گنبدوں کے بنانے کے خیال کا اظہار

Marfat.com

فرمایا تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔ چنانچہ خود مولانا کیرانوی، مدرسہ کے اساتذہ، طلبا اور مہاجرین حرم اینٹ پتھر، گارہ پورے ذوق وشوق اور ولولہ کے ساتھ اٹھا کر ان معماروں کو دینے لگے۔ نتیجہ اس ساری کاوش اور جدوجہد کا یہ ہوا کہ کتب خانہ حرم کے اس متبرک ملبہ سے 1304ھ میں مدرسہ صولتیہ کی مسجد منصۂ شہود پر آ گئی۔ مسجد کی تکمیل پر حضرت مولانا کیرانویؒ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

اسی زمانہ میں ہرات کے ایک ذی علم اور بزرگ مکہ مکرمہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لائے۔ ان کی حضرت مولانا رحمت اللہؒ سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو مولانا نے مسجد کا ذکر فرمایا۔ مسجد کا ذکر سن کر وہ تشریف لائے۔ نماز پڑھی اور نماز سے فراغت کے بعد ایک طالبعلم سے قلم دوات اور ایک کاغذ لے کر قلم برداشتہ فی البدیہ مسجد کی تاریخ کا ایک قطعہ لکھا جو آج بھی بطور یادگار مسجد کی محراب پر نمایاں اور جلی حروف میں کندہ ہے۔

ایک روایت کے مطابق ہرات کے ایک ذی علم اور خوش قلم وخوش کلام مہاجر جن کو حضرت مولانا کیرانویؒ سے خلوص اور دلی تعلق تھا، انہوں نے مدرسہ کا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ لکھ کر اپنے ہاتھ سے محراب مسجد کی پیشانی پر کندہ کیا، جو آج تک قائم ہے۔

بسکہ خوش منظر است ایں مسجد
ما رأی العین مثلہ الثانی
گشت تاریخ ''خانۂ رحمت''
۱۳۰۴ھ
رحمۃ اللہ قل علی البانی

اس قطعۂ تاریخ میں ''خانۂ رحمت'' سے مسجد کا سن تعمیر نکالا گیا جو کہ 1304ھ ہے۔ مسجد اگرچہ چھوٹی ہے لیکن تعمیر کا بہترین شاہکار ہے۔ اور آج بھی اُسے دیکھ اور نماز پڑھ کر لوگ بانی مسجد پر رحمت خداوندی کی دعاؤں کی سوغاتیں بھیجتے ہیں۔ چند سال قبل موجودہ مہتمم صاحب نے اس مسجد کو شہید کر کے چار منزلہ عالی شان مسجد تعمیر کی ہے۔ جو جدید طرز کی ہے اور اس میں لفٹ بھی لگا دی ہے تا کہ نمازیوں کو سہولت رہے۔

Marfat.com

تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ سو سال قبل عرب میں اور خاص طور پر حجاز میں زبردست قحط پڑا۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمان عربوں کی امداد کرنا چاہتے تھے، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ حجاز میں اعانت اور امداد کس کے ذریعہ کی جائے۔ اس وقت اگر کوئی نام سامنے آیا تو وہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانویؒ کے نام تھے، گویا یہ دونوں بزرگ اپنے علم و عمل اور دیانت و روحانیت کے ناطے سے پورے ہندوستان میں قابل اعتماد سمجھے جاتے تے۔ چنانچہ مشیر قیصر، لکھنو کے ایڈیٹر نے 12 فروری 1890ء کے شمارے میں انہی کے نام شائع کیے۔ اس نے لکھا:

''مکہ معظمہ صانہا اللہ شرفاً وتعظیماً کی تحریرات سے معلوم ہوا کہ ملک عرب قیامت کی مصیبت قحط سالی میں مبتلا ہے۔ انسان و دواب پر فقدان غلہ و حشیش سے عرصۂ عالم تنگ ہو رہا ہے۔ یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ انسان غیر مأکول اللحم جانور مثل گربہ وغیرہ کے کھانے پر بحالت اضطرار مجبور و ناچار ہوئے ہیں۔ کاہ جس میں چند چوب مثل نرکل وغیرہ کے ہوتے ہیں، ایک ریال قیمت پانے لگے۔ غرض ہر چہار طرف شور الغیاث بلند ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

''اس میں شک نہیں کہ ابھی تک ہند کے دولت مند اور عالی ہمت مسلمانوں کو خبر ہی نہیں ہوئی۔ ورنہ ہمسائگان الٰہی و ہموطنان ختمی پناہی کی امداد کے لیے ضرور بضرور کلکتہ، بمبئی، رام پور، جونا گڈھ، ٹونک، بھوپال، بہاولپور، پٹنہ اور دہلی کے علاوہ ہندوستان کے اور بہت سے نامی مقامات سے کافی چندہ جمع ہونا شروع ہوتا۔ اگر چہ عجلت کو کام فرما پائے اور فراہمی چندہ کے لیے جابجا انجمنیں قائم ہوں۔ روپیہ، غلہ کے بھیجنے کا انتظام ہندوستان میں جناب مولوی رحمت اللہ صاحب و جناب حاجی امداد اللہ صاحب کے ذریعہ ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل جود و عطاء کو توفیق خیر عطاء کرے۔ آمین۔''

عرب کے قحط کے بارے میں لوگوں میں کچھ شک پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے

Marfat.com

انگریزی اخبارات اس سلسلہ میں ساکت اور خاموش تھے۔ لیکن حکومت کے اشتہارات سے قحط کی تصدیق ہوگئی تھی تو ایک طبقہ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ارادۂ حج فسخ کردو، مگر اردو اخبارات نے بتایا کہ قحط ضرور پڑا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہا جا رہا ہے۔ اس زمانہ میں ذرائع مواصلات بھی اتنے تیز نہیں تھے۔ اس لیے ایڈیٹر مشیر قیصر نے 9 اپریل 1890ء کے پرچہ میں یہ مشورہ دیا تھا کہ مولانا رحمت اللہ سے حالات معلوم کر کے ان کے مشورہ پر عمل کیا جائے۔ یہ واقعہ بھی حضرت مولانا کیرانویؒ کی شخصیت کو قابل اعتماد ظاہر کرتا ہے۔

مولانا کیرانویؒ کے مشہور تلامذہ:

مسجد حرم میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کا حلقۂ درس مرجع خواص وعوام تھا۔ جس زمانہ میں آپ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور مسجد حرم مین شیخ العلماء دحلانؒ کی وجہ سے آپ کو تدریس کا موقع ملا تو آپ نے دیکھا مسجد حرم میں پہلے سے کوئی نصاب تعلیم نہیں ہے۔ صرف علوم دینیہ اور لغت عربی پڑھائی جاتی ہے اور دوسرے عصری علوم کی طرف کوئی توجہ اور رجحان نہیں ہے۔ آپ ان علوم جدیدہ، ہندسہ، ریاضی، علم المناظرہ، علم المنطق، علم الفلسفہ اور علوم فلکیہ کو بھی نصاب میں داخل کرنے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ ان علوم کی کتابیں بھی چونکہ وہاں نہیں ملتی تھیں لہٰذا آپ نے کتابیں بھی ہندوستان سے منگوالیں۔ اور مسجد حرم کی تدریس کی تاریخ میں وہ دن نہایت یادگار ہے جس روز حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے مسجد حرم میں شاہ ولی اللہ دہلوی حکیم الامتؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ، جو کہ شریعت اسلامیہ کی حکمت کے بارے میں ہے، اور علم فلکیات کی کتاب شرح چغمینی کی اور مقدمہ ابن خلدون کی تدریس شروع کی۔ اس سے قبل علم الصرف اور علم النحو کو اکٹھا پڑھایا جاتا تھا۔ آپ نے ان دونوں کو الگ الگ پڑھانا شروع کیا۔ ان کتابوں کا پڑھانا تھا کہ مسجد حرم کے تمام علمی حلقوں سے طالب علموں نے اٹھنا شروع کر دیا اور چند ہی روز میں وہ حلقے خالی اور آپ کے حلقہ میں ایک ازدحامی کیفیت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں آپ کے ہاں سے بڑے بڑے علماء اور قاضیان عظام پڑھ کر نکلے، اور حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ اپنے رشتہ تلمذ پر فخر

کرنے لگے۔ اس بارے میں تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ہندی عالم کے تلامذہ کا زیادہ حلقۂ عربی تلامذہ پر مشتمل تھا۔ چنانچہ مسجد حرم کی تدریس کے زمانہ میں اور مدرسہ صولتیہ کے ابتدائی دور میں آپ سے جن جید علماء کو شرف تلمذ حاصل ہوا، اس کی فہرست تو بڑی طویل ہے۔ اس طویل فہرست میں سے چند حضرات کے نام حسب ذیل ہیں۔

1- جلالۃ الملک شریف حسین بن علی الہاشمی، بانی دولت ہاشمیہ

2- حجۃ الامۃ قاضی القضاۃ شیخ عبداللہ سراج، مفتی احناف، شیخ العلماء مکہ مکرمہ

3- علامہ شیخ احمد الدین چکوالی، بانی مدرسہ مظہر العلوم، کراچی

4- علامہ شیخ احمد ابوالخیر مرداد، شیخ الخطباء والعلماء، مدرس مسجد حرم۔

5- علامہ شیخ امین محمد علی مرداد، مدرس، امام وخطیب مسجد حرام و نائب رئیس محکمہ شرعیہ، مکہ

6- علامہ شیخ سعد احمد دہان، مدرس مسجد حرم و قاضی محکمہ شرعیہ کبریٰ، مکہ

7- علامہ شیخ احمد علی حسن النجار، قاضی طائف

8- علامہ شیخ احمد ابوالخیر، العطار

9- علامہ شیخ بدر الاسلام کیرانوی، مدیر مکتبہ حمیدیہ، قصر یلدز و مترجم سلطان عبدالحمید خان

10- علامہ شیخ حسن عبدالقادر طیبب، مدرس مسجد حرام

11- علامہ شیخ حسن کاظم، مدرس مسجد حرم

12- علامہ شیخ سید حسن صدقۃ دحلان، مدرس مسجد حرم

13- علامہ شیخ درویش عجیمی، مدرس مسجد حرم

14- علامہ شیخ شرف الحق صدیقی مشہور مناظر اسلام

15- علامہ شیخ شہاب الدین عثمان کیرانوی

16- علامہ شیخ ضیاء الدین عبدالوہاب، مدیر مدرسہ باقیات الصالحات، مدراس

17- علامہ شیخ عبدالرحمٰن احمد دہان، مدرس مسجد حرم و مدرسہ صولتیہ

18- علامہ شیخ عبدالرحمٰن الشیبی، کلید بردار بیت اللہ الحرام و مدرس مسجد حرم

Marfat.com

19- علامہ شیخ عبدالاول جونپوری المشہور بہ "مصلح بنگال"
20- علامہ سید عبداللہ محمد صالح السرداری، مدرس مسجد حرم، مفتی شافعیہ مکہ و رئیس مجلس شوریٰ
21- علامہ سید عابد حسین مالکی مدرس مسجد حرم و مفتی مالکیہ، مکہ مکرمہ
22- علامہ شیخ عبداللہ احمد ابوالخیر، مدرس مسجد حرم و مفتی احناف و قاضی محکمہ شرعیہ، مکہ
23- علامہ شیخ عبدالرحمٰن حسن العجمی، مدرس مسجد حرام و قاضی محکمہ، طائف
24- علامہ شیخ عبداللہ الغمری، مدرس مسجد حرام
25- علامہ شیخ عبدالحمید بخش الفلکی، مدرس مسجد حرم
26- علامہ شیخ عبداللہ محمد غازی مدرس مسجد حرم و مدرسہ صولتیہ و مؤرخ مکہ مکرمہ
27- علامہ شیخ عبدالستار دہلوی، مدرس مسجد حرم
28- علامہ شیخ عبدالرحمٰن بخش ملا، مدرس مسجد حرم و مدرسہ صولتیہ
29- علامہ شیخ عبدالخالق محمد حسین بقالی، مدرس مسجد حرم و بانی مدرسہ "دارالفائزین" مکہ
30- علامہ شیخ قاری عبداللہ، مدرس مسجد حرم و مدرسہ صولتیہ و شیخ القراء، مکہ مکرمہ
31- علامہ شیخ عبدالرحمٰن الہٰ آبادی، شیخ القراء، ہند
32- علامہ شیخ عبدالسمیع رامپوری
33- علامہ شیخ عبدالوہاب مدراسی، بانی مدرسہ باقیات الصالحات، مدراس
34- علامہ شیخ عبداللہ صدقۃ زینی دحلان، مدرس مسجد حرم
35- علامہ شیخ عبدالقادر خوقیر، مدرس مسجد حرم
36- علامہ شیخ قاری عبدالحق، مدرس مسجد حرم و بانی مدرسہ فخریہ، مکہ مکرمہ
37- علامہ شیخ محمد حامد الجداوی، مدرس مسجد حرم و مدیر مدرسہ الفلاح، مکہ مکرمہ
38- علامہ شیخ محمد سعید ابوالخیر مرداد، مدرس مسجد حرم و مدیر الاوقاف، مکہ مکرمہ
39- علامہ شیخ محمد سعید بابصیل، مدرس مسجد حرم
40- علامہ شیخ محمد حسین الخیاط، مدرس مسجد حرم و بانی مدرسہ خیریہ، مکہ مکرمہ
41- علامہ شیخ محمد اسماعیل نواب، مشہور طبیب و شاعر

42- علامہ شیخ محمد علی سلیمان مرداد، مدرس و امام و خطیب مسجد حرم، مکہ مکرمہ
43- علامہ شیخ محمد صالح الیمنی، مؤرخ مکہ
44- علامہ شیخ محمد علی زین العابدین، مدرس مسجد حرم
45- علامہ شیخ محمد علی صدیق کمال، مدرس مسجد حرم
46- علامہ شیخ محمد ہاشم اشعری، بانی جمعیۃ نہضۃ العلماء، انڈونیشیاء
47- علامہ شیخ محمد صالح صدیق کمال، مدرس مسجد حرم
48- علامہ شیخ محمد سلیمان حسب اللہ، مدرس مسجد حرم
49- علامہ شیخ ابوالخیر الفاروقی الہندی، علماء ہند کے معروف مصلح و مربی
50- علامہ جلیل شیخ محمد علی، بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء ہند
51- علامہ جلیل شیخ محمد سعید کیرانویؒ، مہتمم مدرسہ صولتیہ

آپ کے تلامذہ میں سے کچھ حضرات وہ تھے جنہوں نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ سے ہندوستان میں بھی علمی استفادہ کیا تھا اور پھر مکہ معظمہ پہنچ کر بھی حضرت مولانا مرحوم سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

1- مولانا بدرالاسلام کیرانوی عثمانی، مہتمم کتب خانہ حمیدیہ، استنبول
2- مولانا ضیاء الدین عبدالوہاب بانی و مہتمم مدرسہ باقیات الصالحات، مدراس

حضرت مولانا کیرانویؒ کے عہد مبارک کے بعد بھی آپ کی اس مرکزی اور عظیم درسگاہ سے الحمدللہ علمی فیض اور دینی خدمت کا سلسلہ جاری رہا اور آج تک جاری ہے اور انشاءاللہ تا قیامت جاری رہے گا۔

مدرسہ صولتیہ کا نصاب تعلیم:

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے دل میں قرآن حکیم کی ایک خاص محبت موجزن تھی، لہٰذا اس مدرسہ کے قیام سے ان کا مقصد قرآن حکیم کی خدمت تھی۔ اس زمانہ میں فن تجوید و قرأت پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ حضرت مولانا نے تجوید و قرأت پر خاص توجہ دی، کیونکہ آپ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستانی طلبہ حجاز میں رہتے ہوئے تجوید و

قرأت کے اصولوں کے خلاف خاص ہندوستانی لہجہ میں قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں، لہٰذا آپ نے اس زمانہ کے بہترین قاریوں کی خدمات حاصل کر کے طلبہ میں فن تجوید و قرأت کا شوق پیدا کیا۔ علاوہ ازیں قرآن حکیم کے حفظ کی جانب بھی توجہ دلائی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی مکہ مکرمہ کے قیام کے زمانہ میں مدرسہ صولتیہ کے استاذ القراء قاری عبداللہ المکی سے فن تجوید میں مہارت تامہ حاصل کی۔

علاوہ ازیں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے طول وعرض میں جہاں کہیں فن تجوید کا سلسلہ یا قرأتِ سبعہ کا چشمہ صافی جاری دکھائی دیتا ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ ہی کا فیضان ہے۔ مدرسہ صولتیہ کے تعلیم یافتہ طلبہ جنہوں نے برصغیر پاک و ہند میں تجوید وقرأت کی تعلیم وترقی میں خاص حصہ لیا۔ ان میں مندرجہ ذیل قراء حضرات خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

1- قاری مولوی محمد سلیمان صاحب، بھوپال
2- قاری سید حسن صاحب دجانہ، ضلع رہتک
3- قاری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم، احیاء العلوم الٰہ آباد
4- قاری عبدالخالق صاحب، مدرسہ تجوید القرآن سہارنپور
5- قاری ابراہیم رشید صاحب خطیب مکہ مسجد، حیدر آباد
6- قاری عبدالوحید خان صاحب مرحوم، دارالعلوم دیوبند
7- قاری عبدالمالک صاحب، مدرسہ فرقانیہ، لکھنؤ
8- قاری فیض عالم صاحب گولڑا، راولپنڈی
9- قاری محمود یار صاحب، بھوپال
10- قاری مطیع اللہ صاحب، ملتان
11- قاری میزان شاہ صاحب، معلم تجوید دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ
12- مولانا قاری ضیاء الدین صاحب، مدرسہ باقیات الصالحات، مدراس
13- قاری حمید الدین صاحب، بانی مدرسہ تجوید، سنبھل ضلع مراد آباد
14- قاری مولوی سید مرتضیٰ حسینی، بمبئی۔

Marfat.com

قرآنی علوم اور فن تجوید و قرأت کے علاوہ علوم اسلامیہ اور حدیث وفقہ کی تعلیم بھی اس کے نصاب میں شامل کی گئی۔ چنانچہ گذشتہ صفحات میں حضرت مولانا کیرانویؒ کا جو طویل خط ہم نے نقل کیا ہے، اس میں بھی اس بات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

آج کل جو نظامِ تعلیم مدرسہ میں رائج ہے، اس کے پانچ مستقل شعبے ہیں:

1- پہلا شعبہ تحفیری (پرائمری) ہے جس کی مدت تعلیم تین سال ہے۔

2- دوسرا شعبہ ابتدائی (مڈل) اس شعبہ کی مدت تعلیم چار سال ہے۔

اس سات سالہ تعلیم کے بعد مدرسہ کی طرف سے خاص امتحان کے بعد کامیاب طلبہ کو ابتدائی سند دی جاتی ہے۔ اس عرصہ میں طالب علم ابتدائی علوم اور عملی فنون حاصل کر کے عملی زندگی میں اپنا رول ادا کر کے اپنے کو مفید و مستعد ثابت کر سکتا ہے اور اپنے مستقبل کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس ابتدائی شعبہ کی تعلیم کے اختتام کے بعد مدرسہ کی لازمی تعلیم کی مدت پوری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک طالب علم مختار ہے کہ آئندہ اپنی دینی تعلیم کی تکمیل کے لیے شعبہ ثانوی میں داخل ہو یا کاروبار حیات میں مصروف و مشغول ہو۔

3- تیسرا شعبہ ''ثانوی شعبہ'' کہلاتا ہے۔ اس کی مدت تعلیم تین سال ہے۔ ان تین سالوں میں طالب علم دینی علوم و معارف کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اس شعبہ میں ذہین و ہونہار طالب علم لیے جاتے ہیں جن کا علمی ذوق وشوق انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم سے اپنے کو آراستہ و پیراستہ کریں۔

4- چوتھا شعبہ ''عالی'' ہے۔ اس کی مدت تعلیم دو سال ہے۔ اس شعبہ میں کامیاب طلبہ کو سند عالی دی جاتی ہے۔

5- پانچواں شعبہ حفظ و تجوید قرآن کا ہے۔ اس شعبہ کے لیے کوئی خاص مدت مقرر نہیں ہے۔ عمر اور قوت حافظہ اور شوق اور ہمت کا فرق ہمیشہ مدت کے تعین میں حائل رہا۔

ہندوستان کے قریباً تمام مدارس اسلامیہ میں نصاب تعلیم وہ ہے جو ملا نظام الدین

Marfat.com

نے کئی سو سال قبل اپنے اس زمانہ کے حالات کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دیا تھا۔ اس وقت کے مدارس اسلامیہ میں اس کو مفید سمجھ کر اپنا لیا گیا لیکن وہ آج تک نسلاً بعد نسل چلا آرہا ہے، حالانکہ اس وقت سے لے کر آج تک حالات نے کتنی کروٹیں لیں۔ زمانہ نے کتنے نشیب و فراز دیکھے اور اس کے تقاضوں میں کتنا الٹ پلٹ ہوا۔ مدرسہ صولتیہ کا نصاب تعلیم مرکزی ضروریات کے لحاظ سے درس نظامیہ کی اصلاح شدہ صورت ہے جس میں شام، مصر اور عراق وغیرہ ممالک اسلامیہ کے اعلیٰ عربی اور دینی مدارس کے کارآمد طریقے اور ردّ و بدل کے بعد مفید کتابیں داخل ہیں۔ دینی اعلیٰ تعلیم میں ممالک عربیہ میں یہ امتیاز صرف مدرسہ صولتیہ ہی کو حاصل ہے کہ اس کے نصاب میں علم حدیث کی صحاح ستہ اور اس کی متعلقہ کتابیں حضرت مولانا کیرانویؒ کے زمانہ سے آج تک نہایت پابندی کے ساتھ داخل نصاب ہیں۔

گویا مدرسہ صولتیہ کا نصاب عربی اور ہندی نصاب تعلیم کا مغلوبہ ہے جن میں دونوں ملکوں کے اذہان اور تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پاک و ہند کے مدارس اسلامیہ میں عربی ادب کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اپنے ناموافق انتخاب یا بیکار طریقۂ تعلیم کی وجہ سے ادبی قابلیت یا عربی زبان میں مہارت تامہ پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔

چنانچہ اس قسم کی ایسی سب کتابوں کو مدرسہ صولتیہ کے نظام سے خارج کر کے مفید طریقۂ تعلیم کے مطابق عربی ادب کی تعلیم میں فن انشاء، محفوظات ادبیہ، فن خطابت اور تلقین و تطبیق سے مدد لی جاتی ہے۔ ماحول کا اثر اور ان فنون کی باقاعدہ تعلیم، طالب علم میں ادبی مہارت اور عربی زبان میں بہترین استعداد اور قابلیت پیدا کرنے کا سہل اور مفید ترین طریقہ ہے۔

خدمت خلق:

مدرسہ صولتیہ نہ صرف ایک تعلیمی ادارہ ہے بلکہ خدمت خلق کا بھی مرکز ہے۔

حضرت مولانا کیرانویؒ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے۔ ان سے قبل اگرچہ ہندوستان سے کئی لوگ جن میں بڑے بڑے بزرگ حضرات بھی شامل تھے، ہجرت کر کے سرزمین حجاز خصوصی طور پر ام القریٰ مکہ مکرمہ گئے لیکن برصغیر پاک و ہند سے ہر سال ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جانے والے حجاج کرام کے لیے کوئی مرکز نہیں

تھا، جو ان کی خدمت کر سکے یا جہاں جا کر وہ اپنا حال دل کہہ سکیں یا اپنی زبان میں اپنے مسلک نماز اور حج کے مسائل معلوم کر سکیں۔ مدرسہ صولتیہ نے پاک و ہند کے حجاج کرام کی اس کمی کو پورا کیا۔ چنانچہ حضرت مولانا کیرانویؒ، بانی مدرسہ کے زمانہ سے لے کر آج تک وہ مکہ مکرمہ میں پاک و ہند حج وعمرہ کے لیے آنے والے حضرات کی ہر ممکن خدمت کرنے، انہیں آرام وراحت پہنچانے، ان کے مسلک کے مطابق انہیں مسائل حج بتانے اور دیگر مفید مشوروں سے ان کی راہ نمائی کر رہا ہے۔ آج بھی مدرسہ صولتیہ کے کارکنان حسب ذیل خدمات کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ اور سفر حج کے تھکے ماندے اور حج کی تکالیف سے نڈھال، ان پڑھ، مکہ مکرمہ کی زبان سے ناواقف و ناآشنا حضرات جب مدرسہ کی چار دیواری میں پہنچتے ہیں، تو انہیں اپنے گھر کا ماحول میسر آ جاتا ہے جس سے قدرتی طور پر ان کی ساری تھکن اور پریشانی دور ہو جاتی ہے۔ انہیں پھر نہ تو کوئی عربی زبان نہ جاننے کا احساس ہوتا ہے اور نہ عرب لوگوں کی ترش روئی کا خطرہ۔

1- ڈاک: سرزمین پاک و ہند سے جب کوئی حاجی مکہ مکرمہ جاتا ہے تو اپنے گھر سے خط منگوانے کا اس کے پاس کوئی ایڈریس اور پتہ نہیں ہوتا۔ بعض حضرات معلم کے پتہ پر اپنی ڈاک منگواتے ہیں لیکن معلمین کے ڈیروں پر ڈاک کی وہ حفاظت نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں کے خطوط گم ہو جاتے ہیں۔ مدرسہ صولتیہ کے کارکنان نے ڈاک اور خطوط کا قابل اطمینان انتظام کر رکھا ہے تاکہ اس طویل سفر میں ہر شخص اپنے اعزاء واحباب کی مسرت خیز خیریت سے واقف و آشنا ہو سکے، یا اپنی خیریت سے انہیں مطلع کر سکے۔ چنانچہ باہر سے جو ڈاک آتی ہے اس کو نہایت حفاظت سے رکھا جاتا ہے اور نہایت احتیاط کے ساتھ مکتوب الیہ کو اس کا خط دیا جاتا۔ مکہ مکرمہ سے وطن خط لکھنے کے لیے ٹکٹ اور لفافے مدرسہ کے دفتر سے ملتے ہیں چنانچہ حجاج کرام وہیں سے لفافہ اور ٹکٹ لے کر خط لکھتے ہیں اور دفتر والوں کو پوسٹ کرنے کے لیے وہ خط دے دیتے ہیں۔ دفتر سے روزانہ ڈاک جنرل پوسٹ آفس میں

Marfat.com

بھجوائی جاتی ہے تا کہ وہ وہاں سے دوسرے ملکوں کو روانہ کی جا سکے۔ باہر سے خط بھیجنے کا مدرسہ کا پتہ یہ ہے:

مدرسہ صولتیہ، پوسٹ بکس 114، مکہ مکرمہ (سعودی عرب)

2- طبی خدمت: دوران قیام مکہ مکرمہ میں اگر طبی امداد یا علاج کی ضرورت پیش آتی ہے تو مدرسہ صولتیہ کا طبی مرکز (صولتیہ دارالشفاء) زائرین کی خدمت کے لیے تیار رہتا ہے۔ ایلوپیتھی، ہومیو پیتھک اور طب یونانی کی ادویات بلا قیمت اور بلا فیس و معاوضہ ملتی ہیں اور صولتیہ درالشفاء کے اطباء کی خدمات حجاج کرام کے لیے ہر وقت حاضر رہتی ہیں۔ غرضیکہ برصغیر پاک و ہند کے حضرات کو پوری پوری طبی امداد بوقت ضرورت بہم پہنچائی جاتی ہے۔

3- شعبۂ امانت: بیرون ملک سے آنے والے حضرات خصوصی طور پر حج کے دنوں میں آنے والے حضرات کے لیے روپیہ اور قیمتی اشیاء کی حفاظت ایک مسئلہ بن جاتی ہے اور وہ بے فکر ہو کر نہ تو فریضۂ حج ادا کر سکتے ہیں اور نہ ہی کہیں جا سکتے ہیں۔ ایام حج میں تو ویسے ہی لوگوں کا جم غفیر مال و دولت کی حفاظت کے لیے حاجیوں کو پریشان رکھتا ہے کیونکہ اگر خدانخواستہ کسی کی جیب کٹ جائے یا اس کی رقم گم ہو جائے تو دیار غیر میں جہاں ایک ایک قدم پر آدمی کو مال اور روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہایت پریشانی کا باعث بنتا ہے۔ لوگوں کی اس پریشانی کے ازالے اور ان کے روپیہ اور مال و دولت کی حفاظت کے لیے مدرسہ صولتیہ نے ایک شعبۂ امانت قائم کیا ہوا ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ مرکزی دفتر مدرسہ صولتیہ میں ناظم صاحب کو اپنا روپیہ اور قیمتی اشیاء دے کر اس کی رسید حاصل کر لیں۔ دفتر کے اوقات میں آپ اپنی ان محفوظ اشیاء میں سے جو کچھ لینا چاہیں، رسید دکھا کر وہ بآسانی آپ کو مل جائے گی۔

4- رہائش کا انتظام: ہر حاجی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُسے حرم کے قریب رہنے کی جگہ ملے تا کہ وہ حرم میں ہر نماز باجماعت ادا کر سکے اور حرم میں آنے

Marfat.com

جانے میں آرام اور سہولت ہو۔ مدرسہ نے حاجیوں کی اس سہولت کا بھی انتظام کیا ہوا ہے وہ یہ کہ حج کی سالانہ تعطیلات کے زمانہ میں مدرسہ صولتیہ کے کمرے خالی کر دیئے جاتے ہیں اور ان کو حجاج کرام کے قیام کے لیے معقول معاوضہ کے ساتھ وقف کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص مرکزی دفتر کو قبل از وقت مطلع کر دے تو مکہ مکرمہ پہنچ کر اُسے رہائش کی کوئی دقت نہ ہوگی۔ اس میں ایک تو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ حرم کے قریب حاجی کو رہائش کی جگہ مل جاتی ہے اور دوسرے اُسے نہایت اچھا اور وطنی ماحول میسر آ جاتا ہے جہاں اُسے بات چیت کرنے اور ہم وطن لوگوں کو ملنے ملانے میں کوئی دقت اور مشکل نہیں ہوتی۔

-5 شعبۂ مسائل حج: برصغیر پاک و ہند سے جو حجاج کرام آتے ہیں ان کو مسائل حج یعنی قیام منیٰ مزدلفہ، عرفات، رمی جمار، قربانی، طواف زیارت اور دیگر ضروری مسائل کا جاننا نہایت ضروری ہوتا ہے، کیونکہ ان میں بعض رکن فرض، بعض واجب اور بعض سنت ہیں۔ فرائض کی عدم ادائیگی سے حج ہوتا ہی نہیں۔ واجب ارکان کی عدم ادائیگی یا غلط ادائیگی پر دم واجب ہوتا ہے۔ بعض ارکان میں ترتیب واجب ہے، ان ارکان کو ترتیب سے ادا نہ کرنے سے بھی دم واجب ہو جاتا ہے۔ ان سب مسائل سے حاجیوں کی اکثریت ناآشنا ہوتی ہے۔ مدرسہ صولتیہ نے حجاج کرام کو ان مسائل سے واقف کرانے کے لیے تحریری اور زبانی طور پر اچھا خاصا انتظام کر رکھا ہے۔ تحریری طرف پر پمفلٹ وغیرہ چھپوائے جاتے ہیں جن میں حج کے ضروری مسائل درج ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ ان کو پڑھ کر ارکان حج ادا کر لیتے ہیں۔ ان پڑھ حاجیوں کے لیے مدرسہ کے مفتی صاحب یا اور ایک دو علماء کا ہر وقت مدرسہ میں انتظام رہتا ہے جن سے لوگ زبانی مسائل پوچھتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح سے انہیں صحیح حج ادا کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

-6 شعبہ قربانی: گذشتہ پندرہ بیس سال سے حاجیوں کی سہولت کے لیے حکومت نے قربانی کا ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ حاجی حضرات اس ادارہ میں رقم جمع

Marfat.com

کرا کر رسید لے لیتے ہیں اور وہ ادارہ ان کی طرف سے منیٰ میں قربانی کر دیتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک رجمی جمار، قربانی اور حلق میں ترتیب واجب ہے۔ اگر ترتیب قائم نہ رکھی گئی تو ان کے نزدیک دم واجب ہو جاتا ہے۔ برصغیر ہندو پاک کے حاجیوں کی اکثریت حنفی مسلک کی ہوتی ہے لہٰذا انہیں اس معاملہ میں بڑی دقت ہوتی ہے کیونکہ انہیں پتہ نہیں ہوتا کہ وہ ادارہ قربانی کب کرے گا لہٰذا حاجی حلق پہلے کروا لیتا ہے اور قربانی بعد میں ہوتی ہے۔ مدرسہ صولتیہ نے قربانی کے لیے خاص انتظام کیا ہوتا ہے جس سے حاجیوں کی یہ مشکل دور ہو جاتی ہے۔

وفات:

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

ایک مومن تو ہر وقت موت کے لیے تیار رہتا ہے کیونکہ اُس کو بارگاہ نبوی سے یہ حکم ملا ہے کہ تمام لذتوں کو ختم کرنے والی شے موت کو یاد کرتے رہا کرو۔ حضرت مولانا کیرانویؒ بھی ہر وقت اپنے کو موت کے لیے تیار رکھے ہوئے تھے، کیونکہ موت مومن کے لیے نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان کے مطابق ایک تحفہ ہوتی ہے ؎

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست

چنانچہ اسلام کے اس مرد مجاہد نے جس نے علمی اور اسلحی میدان میں کھڑے ہو کر اور مورچے میں سینہ سپر ہو کر دشمنان اسلام سے جہاد کیا، زندگی کے 75 سال یعنی پون صدی اس عدم ہستی نما میں گزارے، جہاد کیا، ہجرت کی، علم دین کی خدمت کی، غرض کہ ہر لمحہ خدمت دین میں گزارا۔ آخر 22 رمضان المبارک یعنی رمضان کے عشرہ اخیرہ 1308ھ مطابق یکم مئی 1891ء میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر ہستی عدم نما کو انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

Marfat.com

حرم کعبہ میں وفات بارگاہ خداوندی سے بہت بڑا انعام ہے۔ چنانچہ انتقال کے بعد اسلام کا یہ سچا خادم اپنی تمنا اور آرزو کے مطابق پیوند زمین حرم محترم ہوا۔ اور جنت المعلاۃ ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کے جوار اور صدیقین وشہداء کے زمرہ میں مدفون ہوئے۔

رحمة الله على رحمت الله

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ جہاں مدفون ہوئے، اس چھوٹے سے احاطہ میں صرف چند قبریں ہیں جن میں اکثر و بیشتر اسی طبقہ کے خاصانِ عالم آخرت میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ محض تاریخی معلومات کے لیے ان بزرگوں کا نام درج ذیل ہیں:

1- حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ
2- قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ
3- نواب عبدالعلی خان صاحب، رئیس چھتاری ضلع بلند شہر
4- شمس العلماء مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی کے والد ماجد
5- حضرت مولانا عبدالحق صاحب شیخ الدلائل، مصنف اکلیل شرح مدارک التنزیل
6- مولانا عزیز بخش صاحب بدایونی
7- مولانا حضرت نور صاحب صدر مدرس مدرسہ صولتیہ
8- مولانا عبداللہ غازی صاحب، سابق مہتمم کتب خانہ مدرسہ صولتیہ

مدرسہ صولتیہ کے مہتممین:

مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے سب سے پہلے مہتمم خود حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تھے، لیکن جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت مولانا کیرانویؒ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ آپ کی قلبی خواہش تھی کہ وہ اپنا کوئی ایسا جانشین اپنی زیر نگرانی تیار کریں جو ان کی وفات کے بعد ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل اور تکمیل شدہ کاموں کی نگرانی کر سکے۔ آپ کا عہد نظامت واہتمام 1308ھ تا 1358ھ یعنی 50 سال ہے۔

Marfat.com

ادھر حضرت مولانا مرحوم کے قلب میں یہ فکر اور سوچ تھی ادھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص بندے کی فکر کو عملی شکل فراہم کر دی۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا حکیم علی اکبرؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد صدیق انبالہ میں سرشتہ دار تھے۔ ان کا ایک بیٹا محمد سعید تھا۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ مولانا محمد صدیق صاحب نے اپنے بیٹے محمد سعید کو مکان کے قریب واقع مشن اسکول میں داخل کروا دیا کیونکہ اس اسکول میں آپ کے ایک عزیز دوست منشی نہال الدین صاحب فارسی کے مدرس تھے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ کی ساری زندگی ردّ عیسائیت میں گذری تھی، وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ان کا پوتا ایک عیسائی اسکول میں تعلیم حاصل کرے، چنانچہ مولانا کو جب پتہ چلا کہ مولوی محمد صدیق نے اپنے بیٹے محمد سعید کو مشن اسکول میں داخل کروا دیا ہے تو حضرت مولانا کو سخت رنج ہوا۔ طبیعت میں جلال آ گیا۔ اسی جلال میں مولوی محمد صدیق صاحب کو خط لکھا کہ محمد سعید کو فوری طور پر مشن اسکول سے نکلوا کر مکہ مکرمہ روانہ کر دیا جائے۔ حضرت کیرانویؒ کا خط جب مولوی محمد صدیق صاحب کو ملا تو انہیں حضرت کیرانویؒ کی خفگی کی وجہ سے بہت پریشانی ہوئی، چنانچہ انہوں نے حضرتؒ کے حکم کی تعمیل میں مولانا محمد سعید کو مشن اسکول سے نکلوا کر مکہ مکرمہ حضرت کیرانوی کے پاس بھیج دیا۔

مولانا محمد سعیدؒ صاحب مکہ مکرمہ پہنچے تو ان کی عمر اس وقت 12 سال کے قریب تھی۔ اس چھوٹی عمر کے بچے کی حضرت مولانا رحمت صاحبؒ نے اپنی زیر نگرانی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ مولانا محمد سعید صاحب نے بھی حضرت مولاناؒ کی نہایت خدمت کی۔ حضرت کیرانویؒ نے مولانا محمد سعیدؒ صاحب کو اپنے بہت قریب کر کے ان کی تربیت کی کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ ایک روز وہ بارگراں جو آج میرے کاندھوں پر مولانا محمد سعید کا باردوش ہونے والا ہے۔ چنانچہ عمر کے آخری ایام میں جب مولانا مرحوم کو ضعف بصارت کا عارضہ لاحق ہو گیا اور مولانا مرحوم کتب بینی، خطوط، جوابات اور دیگر تحریری کاموں سے معذور ہو گئے، آپ نے تحریر کا کام اور خصوصی طور پر خطوط کے جوابات کی ذمہ داری مولانا محمد سعید کے سپرد کر دی۔ ان کے علاوہ شیخ المشائخ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے فرمانے پر آپ مغرب و عشاء کے درمیان ان کے خطوط گوش گزار کرتے اور

Marfat.com

آپ کی طرف سے ان کے جوابات بھی لکھتے۔ گویا کہ ان دونوں بزرگوں نے مدرسہ صولتیہ کے ہونے والے مہتمم کی اپنی نگرانی میں تعلیم و تربیت کی۔ خود مولانا محمد سعیدؒ بھی ان دونوں بزرگوں کی صحبت میں رہ کر کافی تجربہ کار ہو گئے۔

22رمضان المبارک 1308ھ میں جب مولانا کیرانویؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا تو مدرسہ کی نظامت و اہتمام کی ذمہ داری حضرت مولانا محمد سعید کے کندھوں پر ڈال دی گئی اور مدرسہ کے حساب و کتاب اور اس کی مالیات کا نگران حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے برادر زادہ حافظ احمد حسین امین الحجاز کو مقرر کیا گیا۔

حضرت مولاناؒ کی شخصیت بڑی بھاری بھرکم شخصیت تھی۔ ان کا ایک خاص امیج (Image) تھا، چنانچہ ان کے انتقال کے بعد مدرسہ کی حالت خراب ہونے لگی۔ خرچ زیادہ اور آمدن کم ہوگئی۔ جب مدرسہ کی حالت زیادہ خراب ہونے لگی۔ تو مولانا محمد سعید صاحب نے اس وقت کے اہم اور دینی اخبار الوکیل مورخہ 24اپریل 1899ء میں برصغیر پاک و ہند کے لوگوں سے مدرسہ کی اعانت کے لیے ایک اپیل کی جس سے اس زمانہ کے مدرسہ کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت مولانا محمد سعید نے اپنی اسی اپیل میں کہا:

> ''اس اسلامی اور قومی مدرسہ کا بنیادی پتھر اس پاک اور مقدس زمین پر بہت سی امیدوں اور قومی بہبودی کے متبرک خیال کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ اس دن سے دو چار برس اوپر تک کبھی اس مدرسہ نے اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کو عام مسلمانوں پر ظاہر نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہم مدرسہ کے معاونوں اور سرپرستوں کی فہرست میں ہندوستان کے کسی والی ملک یا امیر و متمول شخص کا نام سوائے دو تین کے نہیں پاتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ کے بانی جناب مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے نہ صرف اپنی عمر کا اکثر حصہ مدرسہ کی خدمات میں صرف کر دیا بلکہ اپنا مال بھی وہ بہت خوشی کے ساتھ آخر وقت تک اس نیک کام میں لگاتے رہے۔ مجھے شاید اس موقع پر اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اعلیٰ حضرت سلطان المعظم کی

پیش گاہ سے جو عطیہ یا وظیفہ خاص جناب ممدوح کی ذات کے واسطے مقرر تھا، اس میں سے کبھی انہوں نے اپنی ذاتی ضرورتوں کے واسطے ایک حبہ نہیں لیا۔ اور یہ کئی ہزار روپیہ سال کی رقم مدرسہ کو دیتے رہے کہ حسن اتفاق اور زمانہ کی مساعدت سے ایسے ہی اسباب جمع رہے کہ مدرسہ کی طرف سے نہ کوئی وفد کہیں گیا اور نہ چندہ کے لیے اعلان شائع کیے گئے۔ مدرسہ سترہ اٹھارہ برس تک قوم کی خدمت، علم کی اشاعت اور اپنی اغراض کی تکمیل کرتا رہا، مگر گمنامی اور نہایت استغنا کے ساتھ.......... مدرسۂ صولتیہ کے قائم کرنے کے دو سال بعد ایک صنعت وحرفت کے مدرسہ کی بھی بنیاد رکھی گئی تھی کہ ہماری اولاد اور آئندہ نسلیں تعلیم دینیات کے ساتھ کسب معاش اور رزق حلال کے ذرائع بھی سیکھ لیا کریں تاکہ وہ مدرسہ سے جب فارغ التحصیل و عالم ہو کر نکلیں تو اپنی مدد آپ کر لینے کا مادہ اور استعداد ان میں موجود ہو۔ مولانا نے صنعت وحرفت کے مدرسہ کا بنیادی پتھر بھی رکھ دیا، مگر مدرسہ کی عمارت ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ غیر متوقع موانعات پیش آ جانے اور روپیہ کی کمی نے صنعت و دستکاری کے مدرسہ کا کام پورا نہ ہونے دیا۔ ابھی مولانا کو بہت سے ادھورے کام پورے کرنے تھے کہ قضائے الٰہی نے ان کو ہمیشہ کے لیے ہم سے علیحدہ کر دیا.......... اس وقت تعلیمی مدرسہ ہی کا اجراء مسلمانوں کی بے اعتنائی سے مشکل نظر آ رہا تھا۔ عربی کے تین مدرس تھے۔ مجبوراً اور رکھنے پڑے۔ مہتمم کتب خانہ کو دس روپیہ اور نہ دیا جا سکا اور علیحدہ کر دیا۔ ایک خوش نویس جو طالب علموں کو مشق کراتا تھا، الگ کر دیا گیا۔ اور تین اور ملازم جن کے نہ ہونے سے مدرسہ کا کام بہت ابتر ہو رہا ہے، موقوف کر دیئے گئے۔ مدرسہ کی حالت کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے جو طالب علم

Marfat.com

جس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہ ہو اور داخلہ کا امتحان کافیہ میں دے اور بظاہر شوقین اور ہونہار ہو، وہ قانون مدرسہ کے موافق پانچ سال تک وظیفہ کا مستحق ہے، اب مدرسہ ایسے مستعد طالب علموں کو بھی وظیفہ دینے سے لاچار ہے۔

مدرسہ میں کتب خانہ کے لیے جو کمرہ ہے، وہ بہت تنگ ہے، اور صبح کے وقت روشنی پورے طور پر اس میں نہیں آتی۔ دو سال سے کتب خانہ کی تعمیر کے لیے ایک تجویز ہو چکی ہے اور تخمینہ صرف ڈیڑھ ہزار روپیہ اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپے ہے۔ اس وقت تک باوجود کوشش اور انتہائی درجہ کی جانفشانی کے اس قدر روپیہ بھی جمع نہیں ہو سکا کہ سال بھر کا پورا خرچ نکال کر کتب خانہ کی تعمیر کر دی جاتی۔

عربی کے دو مدرس پورے سبق نہیں پڑھا سکتے، اس وجہ سے دو اور مدرس جن میں سے ایک کے ذمہ صرف ونحو اور فقہ میں قدوری اور منطق میں قطبی تک سبق ہوں اور ایک اوپر کی کتابیں پڑھا سکے...... ابتداء سال 1317ھ سے مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ سب سے پہلے اس قومی خدمت کو مولوی حاجی ریاض الدین احمد صاحب بریلوی نے بطیب خاطر خوشی کے ساتھ قبول کیا ہے۔ مغربی شمالی ہند میں حاجی ریاض الدین احمد صاحب کی خدمت میں مدرسہ کی طرف سے ایک وکالت نامہ روانہ کیا جاتا ہے جس میں ان کو تمام ہندوستان میں مدرسہ کے واسطے دورہ اور چندہ بھی جمع کر کے مکہ معظّمہ پہنچنے کی اجازت مدرسہ کی طرف سے دی گئی ہے۔''

یہ وہ خط ہے جو حضرت مولانا محمد سعید صاحب کیرانویؒ نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے بعد مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ، کے پہلے مہتمم ہونے کی حیثیت سے برصغیر پاک و ہند کے اخبار ''الوکیل''، امرتسر، میں اس غرض سے چھپوایا تا کہ مدرسہ کی اصلی صورت حال لوگوں کے سامنے آئے اور مدرسہ کی کچھ مالی امداد ہو سکے اور مدرسہ حضرت

Marfat.com

مولانا رحمت اللہ کی وفات کے بعد جس بحرانی کیفیت میں سے گزر رہا ہے، وہ ختم ہو جائے۔ اس خط کی تشہیر سے مدرسہ کو مالی طور پر کیا فائدہ ہوا، اس کی کچھ تفصیل تو معلوم نہیں ہو سکی لیکن واقعات کے نشیب و فراز بتاتے ہیں کہ لوگوں نے مدرسہ کی اچھی خاصی مالی امداد کی اور مدرسہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔

حضرت مولانا محمد سعید کے اہتمام کے زمانہ میں مدرسہ صولتیہ نے بہت ترقی کی اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے وہ تمام ذہنی خاکے جو مدرسہ کے بارے میں انہوں نے سوچے تھے، حضرت مولانا محمد سعیدؒ نے انہیں کافی حد تک عملی شکل دے دی۔ تعلیمی معیار نہایت بلند ہو گیا۔ چار دانگ عالم سے طالب علم اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے جوق در جوق یہاں آنا شروع ہو گئے۔ مدرسہ کی اس روز افزوں ترقی کو دیکھ کر علمی، تعلیمی اور دینی طبقوں میں یہ خیال گردش کرنے لگا کہ مدرسہ صولتیہ کو ترقی دے کر اسے ایک مکمل اسلامی یونیورسٹی بنا دیا جائے۔ ان خیالات کا سب سے پہلے اظہار علامہ شبلی نعمانیؒ نے کیا۔ پھر امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنے اخبار الہلال مورخہ 30 اپریل 1913ء میں اس کی تائید میں یوں لکھا:

> ''15 اپریل 1913ء کے روزنامہ زمیندار میں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی طرف سے ایک آرٹیکل شائع ہوا ہے جس میں علامہ موصوف نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کا اندازہ فرماتے ہوئے دردمند دل سے یہ مبارک تجویز پیش کی ہے کہ مکہ معظّمہ میں ایک جامعہ اسلامیہ قائم کیا جائے جس میں تمام مذہبی اور دنیوی (جس میں علوم جدید بھی شامل ہوں) علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہو۔ محترم ناظرین یہ آواز ہے جس پر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو صدائے لبیک بلند کرنا ضروری ہے اور خیر مقدم واجب ہے، کیونکہ جب اسلامی پبلک کو اس واجب التکریم اور اس عظیم الشان معبد سے وہی تعلق اور کشش ہے جو کاہ اور کہربا میں دیکھی جاتی ہے تو اس اعلیٰ مقصد کے لیے مکہ معظّمہ سے بہتر اور مقام

Marfat.com

موزون نہیں ہو سکتا۔

''لیکن ایسی یونیورسٹی کے قائم ہونے میں جہاں یہ وقت ہے کہ ترکی گورنمنٹ مشکل سے اجازت دے گی، یہ بھی دقت ہے کہ عرب کے دیندار قبائل ایسی یونیورسٹی کی طرف بمشکل متوجہ ہوں گے بلکہ اکثر قبائل اس روشن خیالی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے، اور دہریت کا پیش خیمہ سمجھ کر مانوس نہ ہوں گے۔ میرے خیال میں دونوں دقتیں رفع ہونے کی سہل صورت یہ ہے کہ ''مدرسہ صولتیہ کو ترقی دے کر ایک مکمل اسلامی یونیورسٹی اور عظیم الشان دارالعلوم بنایا جائے۔''

''مدرسہ صولتیہ جو 38 سال سے مرکز اسلام میں قائم ہے اور جس کا سنگ بنیاد نیک سیرت بزرگ و دور اندیس (فاضل ہند مولانا رحمت اللہ مرحوم) نے ہندوستان کو خیر باد کہہ کر حرم محترم میں بڑی اوالوالعزمی اور جوش کے ساتھ 1292ھ میں اس ارادے سے رکھا کہ اس کے ذریعہ علوم ربانی کی اشاعت صحیح اصول اور اعلیٰ پیمانہ پر جاری ہو۔''

''مدرسہ نے اپنے بانی کی نیک نیتی اور خلوص سے بتدریج اتنی ترقی کی کہ وہ جامعہ اسلامیہ بننا چاہتا ہے۔ خود اس کے مہتمم محمد سعید صاحب 1329ھ کی روئیداد میں تحریر فرما چکے ہیں کہ مدرسہ کے شاندار مستقبل کے لیے مسلمانوں کو اپنی متفقہ کوشش سے کام لینا چاہیے۔ اور جس طرح علم مذہبی دارالعلوم خالص مرکز اسلام میں قائم کرنے کا ولولہ اور خیال پیدا کیا جائے۔ مسلمانوں کو اگر اپنا مذہب عزیز ہے اور اپنی حالت سنبھالنا چاہتے ہیں تو اس وقت اور اس موقع کو غنیمت سمجھیں اور یاد رکھیں کہ جس طرح اصلاح کی بنیاد مذہب کے اعظم ترین مقدس مقام پر رکھی جائے گی اس کا اثر تمام اسلامی دنیا میں پڑے گا۔ اس اصول پر کاربند ہو جاؤ کہ جڑ کو سرسبز

Marfat.com

رکھنے سے شاخیں ہمیشہ تروتازہ اور بار آور ہو سکتی ہے۔''

مدرسہ صولتیہ کا یہ تعلیمی معیار اور مقام جس کی وجہ سے علامہ شبلی مرحوم جیسے علم دوست حضرات کے قلوب میں اس کو یونیورسٹی بنانے کا جذبہ اٹھکیلیاں لینے لگا، اس میں حضرت مولانا محمد سعیدؒ کا اچھا خاصا حصہ ہے۔ آپ نے مدرسہ کی ترقی کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ مجلس عاملہ اور مجلس مشاورت میں قابل اور علمی حضرات کو رکھا تا کہ وہ اپنے علم و فن کی روشنی میں مفید مشورے دے سکیں۔ 1935ء میں مدرسہ صولتیہ میں کام کرنے والے کے عہدے داران اور اراکین حسب ذیل تھے:

1- مولانا محمد سعید صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ
2- شیخ محمد عبداللہ صاحب صدر شعبۂ مالیات (زمین المدرسۃ) وصدر مجلس مدرسہ
3- مولانا محمد سلیم صاحب (ابن مولانا محمد سعید صاحب) نائب ناظم مدرسہ
4- شیخ محمد علی الیاس، مراقب عام (رجسٹرار) دامین مجلس مدرسہ
5- مولانا محمد اسماعیل صاحب سر دفتر ومحاسب وممبر مجلس مدرسہ
6- مولانا محمد عبداللہ غازی صاحب مہتمم کتب خانہ
7- مولانا عبداللطیف صاحب مددگار مہتمم کتب خانہ ونگران دارالمطالعہ
8- شیخ احمد ملیباری، محضر ومفتش اقسام علمیہ
9- عبداللہ ملیباری، محافظ دارالتدریس ومفتش شعبۂ تحفیری وشعبہ تجوید القرآن
10- عبدالسبحان البہاری، محافظ دارالتدریس
11- محمد عمر سوڈانی، محافظ مدرسہ (عمارت قدیمہ)
12- حافظ محمد قربان محافظ مسجد مدرسہ ومؤذن
13- محمود بخاری، حجام دارالاقامۃ
14- عبدالرحمٰن بخاری محافظ دارالاقامۃ (ہوسٹل)
15- عبدالرزاق ہندی سقہ دارالتدریس

ان حضرات کے علاوہ حضرت مولاناؒ نے مختلف شعبوں میں بھی مختلف حضرات کو تعلیم کے لیے مقرر فرمایا ہوا تھا۔ چنانچہ

Marfat.com

شعبہ تجوید القرآن میں مندرجہ ذیل اساتذہ تھے

1- قاری عبداللطیف صاحب صدر مدرس شعبۂ تجوید القرآن
2- قاری فتح اللہ مصری، مدرس قرآن
3- قاری عبدالعزیز حجاز مصری، مدرس حفظ و تجوید القرآن
4- قاری محمد مظہر رضا، مدرس قرآن و تجوید

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی طرح حضرت مولانا محمد سعید صاحب کیرانویؒ کے دل میں بھی یہ خواہش ہر وقت موجزن تھی کہ قرآن حکیم کو تجوید سے پڑھا جائے اور عربی لہجہ میں پڑھا جائے۔ اس لیے آپ نے مصری اور عربی قاری حضرات کو تجوید کے لیے مدرس رکھا جس کا اثر ہوا کہ مدرسہ صولتیہ کے ہندی نژاد طلبہ بھی جب قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مصری قاری تلاوت کر رہا تھا۔ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ تلاوت کرنے والا کوئی ہندی نژاد ہے۔

تجوید القرآن کے شعبہ کے علاوہ شعبہ تحفیری اور ابتدائی (پرائمری و مڈل) میں مندرجہ ذیل حضرات اپنے فرائض سرانجام دیتے تھے۔

1- سید احمد بن عبداللہ مکی نگران شعبۂ تحفیری سیرۃ نبویہ وممبر مجلس مدرسہ
2- مولانا عصمت اللہ صاحب مدرس فقہ حنفی و علوم ابتدائیہ
3- سید ہاشم شی شبطا مکی، مدرس اول عربی و ادبیات
4- محمد عاصم آفندی ترکی، مدرس ریاضیات
5- شیخ علی محمود یمانی مدرسہ فقہ مالکی و قرآن حکیم (تفسیر)
6- شیخ زکریا بیلا، مدرس اخلاق و حفظان صحت
7- سید محمد ناصف مغربی، مدرس فقہ مالکی و تفسیر قرآن
8- مولانا خلیل الرحمٰن، مدرس علوم ابتدائیہ
9- شیخ عبدالقادر الیاس، مدرس تاریخ اسلام و انشاء عربی
10- شیخ داؤد رمانی، مدرس اختصامی فن خطوط عربیہ
11- شیخ عثمان تونکل، مددگار مدرس خط و محضر نویس، مجلس مدرسہ

Marfat.com

12- حافظ سراج الحق، مدرس ہجا (سال اول)

اسی طرح شعبہ ثانوی و عالی میں مندرجہ ذیل سات اساتذہ متعین تھے۔

1- سید عمر حمدان، استاذ الحدیث وعلوم عالیہ و نائب صدر مجلس مدرسہ
2- شیخ محمد حسن مشاط، مدرس التفسیر فقہ مالکی و اصول فقہ وعلوم عالیہ
3- شیخ عبدالحمید یمانی، مدرس فقہ شافعی
4- مولانا عبداللہ بخاری، مدرس فقہ حنفی و اصول فقہ وعلوم عالیہ
5- مولانا محی الدین، مدرس علوم عالیہ و تاریخ اسلام
6- سید محمد زین العابدین، مدرس ریاضیات
7- شیخ مختار مخدوم، مدرس قواعد لغت عربیہ

مدرسہ صولتیہ جن حالات میں جاری کیا گیا تھا، کتاب کے قارئین ان کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حضرت مولانا کیرانویؒ حجاز کے مدارس کے نصاب تعلیم سے مطمئن نہ تھے اور آفاقی اور ہندی طالب علموں کے لیے وہ نصاب اتنا مفید نہ سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے اس مدرسہ کی بنیاد رکھی جس کو وہ اپنے نظام اور نصاب تعلیم کے تحت چلا سکیں۔ چنانچہ اس کے لیے انہوں نے اپنی حین حیات میں بہت کچھ کیا لیکن جب زندگی نے ان کا ساتھ نہ دیا تو حضرت مولانا محمد سعیدؒ نے جو ان کے مزاج اور ان کے منصوبے سے واقف و آشنا تھے، اس کی تکمیل کا عزم کیا اور کافی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ یہ ایک قدرتی قانون ہے کہ جب تک کسی کام کو ضابطہ کے تحت نہ کیا جائے وہ اچھے نتائج اور اثرات سے محروم رہتا ہے۔ اگرچہ نظام قانون کو تیار کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا لیکن کسی ضابطے اور قانون کی پابندی کروانی اس سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ مدرسہ صولتیہ کو اپنی طویل زندگی کے ہر دور میں مختلف حالات سے دوچار ہونا پڑا ہر زمانہ کی ضروریات علیحدہ ہوتی ہیں۔ ان کا عملی معیار ایک جیسا رکھنا جوئے شیر لانے کے برابر ہوتا ہے۔ مدرسہ کا نظام عام مسلسل جدوجہد اور پیہم کوششوں کا نتیجہ ہے، مگر یہ نتیجہ سفید کاغذ پر سیاہ لکیروں کی شکل میں نہیں بلکہ عام زندگی میں عملی شکل میں موجود ہو۔ عام مدارس اور تعلیمی اداروں میں سب سے اہم اور بنیادی چیز نظام تعلیم ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ

Marfat.com

پرانے اور نئے طرز تعلیم یا قدیم اور جدید سلیبس کے ملانے کے بعد جو تجربے حاصل ہوئے، ان کی قدر و قیمت اس دور میں نا قابل انکار ہے۔ جدید و قدیم کی یہ آمیزش اکثر دفعہ جدید وقدیم کے تقاضوں کی آویزش کو ختم کر دیتی ہے۔

حضرت مولانا محمد سعید صاحب کیرانویؒ نے تعلیمی، تدریسی اور انتظامی قابلیت کے جو نقوش و آثار چھوڑے، بعد کے کارکنان مدرسہ انہی کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں کیونکہ آپ نے اپنی خداداد قابلیت و بصیرت سے مدرسہ کے لیے نہایت محکم اور دیرپا اصول مرتب فرمائے۔ مدرسہ صولتیہ کے لیے آپ نے اپنے دور نظامت و اہتمام میں جو نصاب تعلیم آج سے پون صدی قبل مرتب فرمایا تھا وہ اس دور میں ایسا بابرکت اور عجیب نظام تعلیم تھا جس نے مدرسہ کو چار دانگ عالم میں ایک عظیم اور ارفع مقام بخشا۔ نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کو چلانے اور اس نصاب تعلیم کے اعلیٰ نتائج حاصل کرنے کے لیے آپ نے ہندوستان سے جلیل القدر علماء کو بلا کر مدرسہ صولتیہ میں انہیں درس و تدریس کے لیے مقرر فرمایا، کیونکہ عربی علماء اس نظام تعلیم کو کما حقہ رائج نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں قابل ذکر حضرات عارف باللہ حضرت مولانا شاہ احمد مشتاق احمد صاحب کانپوریؒ اور حضرت مولانا مفتی عبداللطیف رحمانی صاحبؒ جو بعد میں نظام دکن کے حکم سے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے شعبۂ تفسیر کے صدر مقرر ہوئے۔ اور حضرت مولانا شیخ عبدالحق مدنی الہ آبادیؒ، حضرت مولانا ملا محمد اصغر و ملا محمد اکبر صاحبان جو افغانستان اور صوبہ سرحد کے علماء میں سے تھے۔ اس دور میں جب کہ حجاز مقدس کی علمی دنیا اور علماء وطلبہ منطق، فلسفہ، ہیئت اور اقلیدس وغیرہ علوم سے بالکل تہی دست اور نا آشنا تھے۔ حضرت مولانا محمد سعید صاحبؒ نے ان علوم کو جاری و ساری کر کے اور ان کو پڑھانے کے لیے قابل ترین اساتذہ ہندوستان کی زرخیز سرزمین سے منگوا کر نہ صرف مہاجرین کے بچوں کو ان سے روشناس کرایا بلکہ خود عربی علماء بھی ان علوم کے بارے اپنی تشنگی بجھانے کے لیے مدرسہ صولتیہ کا رخ کرنے لگے۔ اگرچہ منطق و فلسفہ کی تعلیم و تدریس کا آغاز بانیٔ مدرسہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے دور میں ہو چکا تھا، لیکن حضرت مولانا محمد سعیدؒ کے دور نظامت میں یہ علوم اپنے نقطۂ عروج پر تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آپ کے عہد نظامت و

Marfat.com

اہتمام میں جو طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے، اور انہوں نے حرمین شریفین کی علمی اور تدریسی دنیا میں جو مقام حاصل کیا اس سے حرمین کی علمی تاریخ معمور ہے۔ چنانچہ حرمین کی تاریخ لکھنے والوں نے یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے ہیں کہ ''صولتیہ نے رجال علم و تدریس کی جو نسل پیدا کی ہے، اس نے علمی تاریخ کی خشت اول رکھی ہے۔''

دو چیزیں ہمیشہ ملک کی جغرافیائی اور طبعی حیثیت اور مقامی صورتوں کے لحاظ سے بنائی جاتی ہیں............ایک ملکی قانون............ اور ....دوسرا نظام تعلیم، لیکن مدرسہ صولتیہ کے اراکین کو مدرسہ کی حدود میں جن مشکلات اور تعلیمی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا اس کا اندازہ ایک آدمی کے لیے انتہائی مشکل ہے۔ کنارے پر شوق نظارہ میں بیٹھے ہوئے لوگ منجدھار میں پھنسے ہوئے لوگوں کے مصائب اور ان کی مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ سبکساران ساحل تو انہیں صرف ڈوبتے اور ابھرتے دیکھتے ہیں۔ ایک نظام تعلیم اور نصاب اور ضابطہ کے اندر ہندوستانی، پاکستانی، بخاری، یمنی، صومالی، جاوی، فارسی، حجازی، چینی، سوڈانی وغیرہ مختلف الاوطان، مختلف الخیال اور مختلف زبانوں کے حامل طلبہ کو بیک وقت تعلیم و تربیت کی بے پناہ دشواریوں نے کبھی اراکین مدرسہ کو اس طرف سے بے نیاز نہیں رکھا اور وہ ان مسائل کے حل میں متفکر رہتے ہیں۔

اس زمانہ میں مکہ معظمہ ایک بین الاقوامی شہر تھا۔ مختلف ممالک کے لوگ وہاں ہجرت کر کے آئے ہوئے تھے۔ خصوصی طور پر ہندوستان کی جنگ آزادی 1857ء کے بعد کئی لوگ وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے جن میں ایک خود مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ تھے۔ اس وجہ سے آفاقی اور پردیسی طلباء کے لیے اس کے حسب مزاج نظام تعلیم رائج کرنا نہایت ضروری تھا جو ان کے لیے مفید بھی ہو اور با اثر بھی۔ دوسری طرف مقامی طلباء کو بھی داخلہ سے نہیں روکا جا سکتا تھا، لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر مقامی اور پردیسی (بدیشی) طلباء کے خیالات و نظریات میں بھی بعض دفعہ زمین و آسمان کا فرق ہوتا تھا۔ مقامی طلباء اور مہاجرین حرم کی اولاد کے لیے تعلیمی غرض و غایت یہ تھی کہ وہ پڑھ کر کچھ کریں۔ دوسری طرف دنیائے اسلام سے آنے والے فارن طلباء اس مقصد کے لیے آتے تھے کہ کچھ کام کرنے کے لیے پڑھیں۔ ان دونوں مقاصد کو ایک

مرکز پر اکٹھا کرنے کے لیے حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ نے بہت کام کیا، اور مدرسہ کے نظام تعلیم کے مطابق اسے کئی شعبوں میں تقسیم کیا، اور یہ بات کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ موجودہ نظام تعلیم ان خطوط پر چل رہا ہے، جو حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ نے وضع کیے تھے۔ چنانچہ مدرسہ کا موجودہ نظام تعلیم کے لحاظ سے مدت تعلیم و تحصیل بارہ سال ہے جو تحفیری (پرائمری) سے لے کر قسم عالی تک ہے۔

کسی مدرسہ سے فراغت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فارغ التحصیل ہونے والا مکمل عالم بن گیا ہے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس سند یافتہ طالب علم میں علم کو سمجھنے کی استعداد پیدا ہوگئی ہے، اور اب اگر یہ کتب کا مطالعہ کرے تو ایک جید عالم بن سکتا ہے۔ اکثر طالب علم مدرسہ کی سند ہی کو کافی سمجھتے ہوئے بعد میں کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے۔ مطالعہ علم کو جلا بخشتا ہے، اس لیے ذہین طالب علم دورانِ تعلیم ہی مختلف شروحات اور دوسری متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ کا بھی عرصہ سے یہ ارادہ تھا کہ مدرسہ کے کتب خانہ کو وسعت اور ترقی دی جائے تاکہ عام اہل علم اور شائقین علوم اور مدرسہ کے طلبہ کو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملے اور طلبہ میں مطالعہ اور کتب بینی کا شوق پیدا کیا جائے، اور ان میں علمی ذوق کو بڑھایا جائے۔ اس ارادہ کی تکمیل اور اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے 1352ھ میں مدرسہ کی نئی عمارت میں دارالمطالعہ کا افتتاح کیا جس کا دروازہ مدرسین اور طلباء اور دوسرے شائقین علم کے لیے ہر وقت کھلا رکھا گیا۔ چنانچہ 1935ء میں اس کتب خانہ میں آٹھ ہزار کتابیں تھیں جب اس وقت ان کی تعداد 25 ہزار سے تجاوز کر گئی ہیں۔ مولانا محمد سعید صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت مولانا محمد سلیم قدس سرہ نے بھی کتابوں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ کیا، اور روز بروز مزید اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

مدرسہ کی معنوی ترقی اس کے نصاب تعلیم سے ہوتی ہے جس کو حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ نے محکم بنیادوں پر استوار کیا۔ اس مدرسہ کی روحانی ترقی کی بنیادیں شیخ المشائخ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب فاروقی مہاجر مکی کی زیر سرپرستی استوار ہوئیں۔ اب اس کی ظاہری شکل و صورت بھی پختہ اور محکم کرنا تھی۔ اس کے لیے حضرت

Marfat.com

مولانا محمد سعیدؒ نے ایک پلان تیار کیا جس کے تحت مدرسہ کی عمارت کو تین منزلہ بنایا گیا اور ظاہری زیبائش و آرائش سے بھی اُسے آراستہ کیا گیا، یہ آپ کا ایک نہایت شاندار اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے کیونکہ گذشتہ پون صدی سے مدرسہ کی تعلیمی اور تدریسی خدمات اسی میں انجام دی جا رہی ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کے انتقال کے بعد مدرسہ کے مالی حالات نہایت ناساعد ہو گئے تھے۔ خود حجاز مقدس کے مالی و معاشی حالات بھی اس وقت ایسے نہ تھے جیسے تیل کے خزانے زمین سے نکلنے کے بعد ہوئے ہیں۔ آپ نے اس عمارت کی تعمیر کا آغاز ربیع الاول 1329ھ میں کیا اور اس کی تکمیل آپ ہی کے ہاتھوں 1348ھ میں ہوئی۔ گویا یہ عمارت 19 سال کے عرصہ میں مکمل ہوئی۔ یہ ساری تعمیر گھر بیٹھے نہیں ہوئی بلکہ اس کے لیے آپ کو مختلف لوگوں کے پاس سفر کر کے جانا پڑا۔ چنانچہ آپ نے 1346ھ میں ہندوستان کا سفر کیا۔ اس کی تکمیل کے بارے میں مختلف حضرات سے بات کی۔ سب احباب اور اہل تعلق کے مشورہ سے تاجدار دکن میر عثمان علی خان مرحوم سے ملے اور تکمیل عمارت کے لیے توجہ فرمائی کا ارادہ فرمایا۔ اس غرض کے لیے قریباً چار ماہ کا طویل عرصہ حیدر آباد میں قیام فرمایا۔ جن دردمند اصحاب خیر اور نیک ہستیوں کا تعاون اس کار خیر میں شروع سے آخر تک ممد و معاون رہا، ان میں سرفہرست عالی جناب سر راس مسعود اور نواب حبیب الرحمٰن خان شیروانی کا نام نامی کا وجود گرامی ہے۔ مسلسل چار ماہ کی صبر آزما محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد آج سے قریباً 70 سال قبل ریاست حیدر آباد کی 25 ہزار روپے کی گرانقدر مالی امداد کا مرحلہ طے ہوا۔ ان حالات میں اور اس زمانہ میں یہ بیش قدر عطیہ نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا جس سے قریباً 15 سالہ غیر مکمل سہ منزلہ عمارت کی تکمیل ہو کر تدریسی، علمی اور تعلیمی مشاغل اس عمارت میں جاری و ساری ہوئے اور اب تک الحمدللہ جاری و ساری ہیں۔ عطیہ کی منظوری کے بعد بھی آپ نے مدرسہ صولتیہ کے بعض اغراض و مقاصد کے لیے اپنے وطن مولوف کیرانہ میں قیام فرمایا اور عمارت کی تعمیر و تکمیل کے لیے اپنے فرزند ارجمند حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کیرانویؒ کو مکہ مکرمہ بھیجا جنہوں نے ایک سال کے شبانہ روز جدوجہد سے اس عمارت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

Marfat.com

آپ صرف مدرسہ صولتیہ کے منصرم و منتظم کی حیثیت ہی سے مکہ مکرمہ میں نہ رہ رہے تھے بلکہ پورے شہر میں آپ کی ذات ستودہ صفات اور آپ کی بھاری بھرکم شخصیت مرجع خلائق تھی۔ یہاں سماجی، فلاحی اور معاشرتی زندگی میں آپ نے جو خاموش مقام حاصل کیا اس کی فہرست بے حد طویل ہے۔ جس شخص کو جو بھی مشکل پیش آتی وہ اس کے حل کے لیے آپ کے پاس آتا۔ چنانچہ مکہ معظّمہ میں پہلا سرکاری پوسٹ آفس (ڈاکخانہ) ترکی عہد حکومت میں آپ کی مساعی جملیہ سے قائم ہوا۔

حضرت مولانا محمد سعید صاحب کیرانوی قدس سرہ ''نہر زبیدہ'' کے پراجیکٹ کے قریباً 15 سال تک صدر رہے، اور پورے شہر مکہ میں تمام سال اور ایام حج میں خصوصی طور پر آب رسانی کے لیے آپ نے جس حسن تدبیر کے ساتھ پانی کی سپلائی کا انتظام کیا وہ ناقابل یقین حد تک صحیح اور درست تھا۔ آپ مہینہ میں ایک بار اونٹ یا گھوڑے پر سوار ہو کر متعلقہ عملہ کے ساتھ نہر زبیدہ کے چشموں، نالیوں اور زمین دوز آبی ذخیروں کے معائنہ اور نگرانی کے لیے مکہ مکرمہ کے اطراف اور میدان عرفات سے بھی آگے وادیٔ نعمان تک تشریف لے جاتے۔ اس سخت مشقت طلب کام میں اپنی صحت کی بھی پروانہ کرتے۔ دھوپ اور گرمی کے دنوں میں جب مکہ کے پہاڑ آگ اگلتے ہوتے، آپ گھوڑے یا اونٹ پر کئی کئی میل ریت کے لق و دق صحراؤں اور پہاڑی اور سنگلاخ راستوں پر آب رسانی کے کاموں کی نگرانی اور دیکھ بھال، چشموں اور نالیوں کی صفائی وغیرہ، مزید برآں مدرسہ کی ذمہ داریوں، درس و تدریس اور طویل خط و کتابت اور متعدد سماجی اور فلاحی کاموں میں انہماک اور مصروفیت اس کے علاوہ تھی۔

یہ کوئی مبالغہ آرائی اور بے جا مدح سرائی نہیں بلکہ واقعہ کا اظہار ہے کہ حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ کی پوری زندگی عزیمت و استقلال، مسلسل قربانیوں اور اخلاص و ایثار سے بھرپور تھی۔ آپ صبر و استقامت کا ایک کوہ گراں تھے۔ بڑے بڑے خطرات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کا مقابلہ کرتے۔ اسی وجہ سے آپ نے نہایت نامساعد اور ناسازگار حالات میں دو چار سال نہیں بلکہ پوری نصف صدی مدرسہ صولتیہ جیسے ادارہ کو محض توفیق ایزدی اور تائید و نصرت خداوندی سے چلایا اور اپنی جان تک کو بھی

Marfat.com

جوکھوں میں ڈالنے سے دریغ نہ کیا۔ آپ نے اپنی جان ناتوان پر ہر قسم کے مصائب اور تکالیف جھیل کر سینکڑوں طلبہ کی پرورش ایسے حالات میں کی جب کہ گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے اور ہزاروں انسان ''چہ خورد بامداد فرزندم'' کے مصداق صرف زمزم پر گزارہ کرتے تھے۔ آج کا مدرسہ صولتیہ ان کی ہمت و پامردی اور مسلسل جدوجہد کی منہ بولتی تصویر ہے۔

عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید خان مرحوم کو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ سے آپ کی علمی فضیلت اور دین اسلام کے لیے اخلاص و ایثار اور ان کی ہمت و استقلال کی وجہ سے ایک خاص عقیدت اور محبت تھی۔ آپ کی وفات کے بعد سلطان عبدالحمید خان مرحوم کی عقیدت کا مرکز اب مولانا محمد سعید مرحوم تھے۔ اسی محبت اور عقیدت کی وجہ سے سلطان نے آپ کو خاص شاہی مہمان کی حیثیت سے قسطنطنیہ (استنبول) آنے کی دعوت دی۔ آپ سلطان مرحوم کی دعوت کو قبول فرماتے ہوئے قسطنطنیہ تشریف لے گئے۔ سلطان نے آپ کو شاہی مہمان کی حیثیت اپنے ہاں رکھا اور بطور شاہی اعزاز ''تحفۂ مجیدی'' سے نوازا۔

حجاز میں عرب لوگوں کا یہ الزام تھا کہ ہندوستان کے مسلمان قرآن حکیم صحیح نہیں پڑھتے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کے مدرسہ صولتیہ کے قیام کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے عرب مسلمانوں کے اس تاثر کو ختم کیا جائے۔ یہ الزام ہر ہندوستانی مسلمان پر عائد تو نہیں ہوتا لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ پاک و ہند کے مسلمان عجمی زبانوں اور ان لہجے کے اثر سے صحیح مخارج کے ساتھ عربی کے مابہ الامتیاز حروف کی ادائیگی کی صلاحیت بہت کم رکھتے ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

1- برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی عجمیت
2- عربی زبان سے بُعد
3- غیر مسلم ماحول اور ان کی ہندی اور سنسکرت آمیز زبان کا پڑوس
4- پاک و ہند کے ہر صوبہ کی الگ زبان اور اس زبان کے اثرات

-5 عجمی زبانوں اور ان کے لہجوں کے اثرات سے نطق و تکلم اور سماعت کے اثرات تلاوت پر

-6 سابقہ ادوار میں فارسی زبان کا بطور سرکاری زبان نافذ ہونا اور اس کا صحیح مخارج کے ساتھ عربی کے مابہ الامتیاز حروف کی ادائیگی کی صلاحیت پر اثر انداز ہونا۔

یہ سب عوامل و اسباب تھے جن کی وجہ سے پاک و ہند کے مسلمان عربی لہجے میں درست نطق اور صحیح مخارج سے حروف کی ادائیگی کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں سے یہ الزام ہٹانا چاہتے تھے چنانچہ مدرسہ صولتیہ کے اغراض و مقاصد میں غیر منقسم ہندوستان کے طلبہ کو عربی لہجہ میں قرآن حکیم کی صحیح تلاوت کرنے کے لائق بنانا بھی اولین مقصد تھا۔ ہماری اس بات کی تائید شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کا وہ مکتوب بھی کرتا ہے جو آپ نے مورخہ 14 رجب المرجب 1310ھ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو لکھا اور برصغیر پاک و ہند میں تجوید و قرأت کی طرف بے توجہی کی شکایت کی: فرمایا

> ''مدرسہ میں مولانا رحمت اللہ کی زیادہ توجہ تجوید و قرأت کی طرف ہے۔ کیونکہ علم تجوید کا رواج بہت کم ہو گیا ہے، خصوصاً ہندوستان میں بہت کم ہے۔ ماشاء اللہ مدرسہ صولتیہ کے مدارس سے فائدہ عظیم ہوئے ہیں۔ ہندیوں کو اس فن میں عرب وغیرہ حقیر سمجھتے تھے بلکہ بعض عرب ہندی علماء کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے، مگر بفضلہ تعالیٰ صولتیہ مدارس کے ذریعہ سے بہتیرے کامل قاری ہو کر نکلے ہیں، اور حرمین شریفین میں بعض ہندی قاری تعلیم یافتہ ان مدرسوں کے اب استاد ہیں اور عرب بچوں کو پڑھا رہے ہیں۔''

اس سلسلہ میں حیدر آباد دکن کی ایک علمی شخصیت کرنل سلامت اللہ بیگ کی ایک تالیف ''تذکرۂ قاریانِ ہند'' کا ایک اقتباس پیش کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ تجوید و قرأت کے بارے میں مسلمانانِ ہند سے یہ تغافل کیوں ہوا

تھا اور اس کے اسباب کیا تھے۔ فرماتے ہیں:

"1273ھ مطابق 1857ء کے بعد روز بروز انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا۔ مغلیہ شہنشاہیت کا واسطہ جو برائے نام تھی، وہ بھی باقی نہ رہا۔ تاہم یہ نام نہاد شہنشاہیت قدیم طرز کی تعلیم کی برقراری، دفتری زبان کی حیثیت سے فارسی زبان کے بقاء، شائقین کے لیے تحصیل علم کے مواقع اور سہولت کی فراہمی اور اسلامی تمدن وثقافت کی ترویج میں بڑی مدد ومعاون ثابت ہوئی۔ انگریزی پالیسی یہ تھی کہ زبان انگریزی کو دفتری زبان کا درجہ دیا جائے، اور اس غرض کی تکمیل کے لیے انگریزی کو عام کر دیا جائے۔ اس حکمت عملی کو روبہ عمل لانے کے لیے انگریزی اسکول کھولے گئے۔ تقریباً پچاس سال تک تو مسلمانوں نے اس کی پروا نہ کی، مگر پرانی روش آخر کب تک نبھ سکتی۔ نئے خیال کے لوگ نئی تعلیم کے حامی ومددگار ہو گئے۔ سرسید احمد خان کا خیال تھا کہ طالب علموں پر دو بڑی غیر زبانوں یعنی عربی اور انگریزی سیکھنے کا بار بہت زیادہ ہے، لہٰذا ایک ہی زبان کو اختیار کیا جائے۔ انگریزی کے ساتھ ریاضی وجغرافیہ تاریخ وغیرہ جیسے مضمون شامل ہوں، مگر عربی کو اختیاری زبان سے زیادہ اہمیت نہ ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نصف صدی تک علم تجوید وقرأت غیر اہم ہو کر رہ گیا۔

دوسری وجہ تجوید سے بے اعتنائی کی یہ تھی کہ جو خوش الحان نہ ہوتے ان کو کم سنتے۔ اس لیے ایسے لوگوں میں تجوید کا شوق باقی نہ رہا۔ مدرسہ وکالج کے نصاب تعلیم میں تجوید وقرأت کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ اس لیے جدید تعلیم سے آراستہ ہونے والے نوجوانوں کو اس سے دور کی نسبت بھی باقی نہ رہی۔ اس لیے وہ اس کے حسن وقبح کو پرکھ نہیں سکتے تھے۔ عربی مدارس میں بھی اس کا کوئی خاص لحاظ نہیں

Marfat.com

رکھا گیا۔ ان وجوہ کی بنا پر چودھویں صدی کے آغاز میں رفتہ رفتہ اس فن سے توجہ ہٹ گئی تا آنکہ تجوید وقرأت کی عام غیر مقبولیت ہو گئی اور خاص خاص افراد کے حلقوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔''

جب اسلام کے بنیادی کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگئی اور تجوید وقرأت کو بے پناہ نقصان پہنچا اور ہندوستانیوں کے بارے میں عربوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ ہندوستانی حفاظ قرآن حکیم غلط پڑھتے ہیں اور حجاز مقدس میں ہندوستانیوں کی ہیٹھی ہونے لگی تو حضرت العلامہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ نے مکہ معظمہ میں 1292ھ میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا اور اس کے اغراض و مقاصد میں ایک اہم غرض یہ بھی تھی۔ چنانچہ مدرسہ صولتیہ کے قیام کے ساتھ ہی حضرت مولانا مرحوم نے مصر کے بہترین قاری بلکہ استاذ القراء ابراہیم سعد کو تجوید وقرأت کی تعلیم دینے کے لیے مقرر فرمایا۔ اس کے بعد قاری عبداللہ صاحب جیسے ماہر فن تجوید وقرأت کو مقرر کیا۔

1308ھ میں حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ مدرسہ صولتیہ کے ناظم ومنصرم مقرر ہوئے۔ آپ نے بھی اپنے دور انصرام میں فن تجوید وقرأت کو ترقی دی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ 1319ھ میں حجاز مقدس پہنچے۔ آپ حضرت حاجی صاحب کی وجہ سے قریباً روزانہ مدرسہ صولتیہ تشریف لاتے۔ شیخ القراء اور استاذ الاساتذہ حضرت قاری عبداللہ صاحب کی شخصیت اور قرآن حکیم سے ان کے والہانہ تعلق اور سب سے بڑھ کر حضرت قاری صاحب کی بے مثال تلاوت وقرأت نے حضرت حکیم الامت تھانویؒ جیسی عظیم المرتبت شخصیت کے دل میں یہ داعیہ پیدا فرمایا کہ قاری عبداللہ صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے ان کے صحیح عربی لہجہ میں قرآن حکیم دوبارہ تجوید کے ساتھ دہرایا جائے۔ چنانچہ وقت مقررہ پر روزانہ حضرت اقدس تھانویؒ مدرسہ صولتیہ میں تشریف لاتے اور عربی لہجہ میں تجوید کی مشق فرماتے۔ اس کا ذکر حضرت تھانویؒ نے اپنے ملفوظات میں فرمایا ہے کہ

''جب میں بالا خانے میں تلاوت کرتا تو نیچے سے گزرنے والے لوگ سمجھتے کہ قاری عبداللہ صاحب تلاوت فرما رہے ہیں۔''

حضرت مولانا محمد سعید صاحبؒ کو علم تجوید و قرأت کے فروغ کا اتنا خیال تھا کہ آپ کی فرمائش پر مدرسہ صولتیہ کے لیے حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے اپنا تجوید و قرأت کا پہلا رسالہ "تجوید القرآن" اپنے قیام مکہ مکرمہ کے دوران مدرسہ صولتیہ میں بیٹھ کر تالیف فرمایا جس پر مہتمم مدرسہ حضرت مولانا محمد سعید صاحبؒ نے حسب ذیل مقدمہ تحریر فرمایا:

"ارباب علم اور علم دوست حضرات پر یہ امر مخفی نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں عموماً اسلامی اور قومی مدارس اور مکتبوں میں فن تجوید کی طرف جو واقعی بہت بڑا مہتم بالشان امر ہے اور جس کی نسبت ورتل القرآن ترتیلاً کا حکم ہو چکا ہے، بڑی بے اعتنائی ہو رہی ہے۔ اور علماء امت کا اس وقت فرض ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کا مدارس میں بہت جلد انتظام فرمائیں۔ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں اس فن کی تکمیل دیکھنے سے خوشی ہوئی کہ مدرسہ کے تعلیم یافتہ طالب علموں کی قدر و منزلت ملک میں کما حقہ ہوئی ہے۔ اور ہندوستان کے اکثر اسلامی مدارس نے اس بات کی خواہش ظاہر کی ہے کہ اس فن کے ماہر استادوں کی خدمات ان کو دی جائیں۔ یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے میرے واجب الاحترام دوست مولانا محمد اشرف صاحب تھانویؒ نے قیام مکہ مکرمہ ادام اللہ شرفا کے ایام میں مدرسہ صولتیہ کے طالب علموں کے واسطے نظم فرما دیا تھا، اس وقت مدرسہ کے نصاب میں داخل ہے، عام فہم ہے اور اردو میں ہونے کی وجہ سے یہ مبتدی طلبہ اور کم عمر بچوں کے لیے نہایت مفید اور کار آمد ہے۔

مجھے امید ہے کہ شائقین علم اس کتاب کی قدر کریں گے اور ہندوستان کے اس الزام کو دور کریں گے کہ ہندی قرآن مجید غلط پڑھتے ہیں۔"

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ اور حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ کے جاری کردہ علم و عرفان اور تجوید و قرأت قرآن کے اس چشمہ سے بے شمار آفتاب و

Marfat.com

ماہتاب ہستیاں فیض یاب ہوئیں۔ وہ ہستیاں اپنے وطن سے مکہ مکرمہ آکر مدرسہ صولتیہ سے علوم وفنونِ قرآنی کی لازوال دولت لے کر گئیں اور پھر اپنے اپنے علاقوں میں تجوید و قرأت قرآنی کے نور کی روشنی پھیلائی اور پھر ان کے تلامذہ آج تک پھیلا رہے ہیں۔ ان بزرگ اور مبارک ہستیوں کی فہرست نہایت طویل ہے لیکن یہاں صرف چند مشہور و معروف قراء کرام کے اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں:

1- استاذ القراء حضرت مولانا قاری عبداللہ صاحب مکی
2- شیخ القراء قاری عبدالرحمٰن صاحب الہ آباد
3- حکیم الامت حصرت مولانا اشرف علی تھانوی
4- قاری عبدالوحید صاحب، دارالعلوم دیوبند
5- قاری میران شاہ صاحب، ندوۃ العلماء لکھنوء
6- قاری محمد صدیق صاحب، دہلی
7- قاری محمد میاں صاحب، لدھیانہ
8- قاری عبدالخالق صاحب، بانی مدرسہ تجوید القرآن، سہارن پور
9- قاری عبدالمالک صاحب، مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ
01- قاری سید محمد بن سید حسینؒ، مدرسہ الباقیات الصالحات، دیلور، مدراس
11- قاری محمد سلیمان صاحب علوی ڈائریکٹر محکمہ تعلیم بھوپال
12- قاری محمد دیار صاحب مہتمم وصدر مدرس مدرسہ عبیدیہ تجوید القرآن بھوپال
13- قاری ابراہیم رشید صاحب، خطیب مکہ مسجد، حیدرآباد دکن
14- قاری سید مرتضیٰ حسینی، بمبئی
15- قاری خلیل الرحمٰن صاحب، ڈھاکہ
16- حافظ قاری محمد سیکر صاحب، مکرلہ، بنگال
17- قاری محمد اکرم نعمانی صاحب، کابل
18- قاری فیض الحسن صاحب، دوجانہ
19- قاری بدرالاسلام صاحب، کیرانہ ضلع مظفرنگر

Marfat.com

20- قاری فیض عالم صاحب، گولڑہ، راولپنڈی
21- قاری مطیع اللہ صاحب، ملتان
22- قاری حمید الدین صاحب، بانی مدرسہ تجوید القران، سنبھل، مراد آباد
23- قاری عبداللہ رشید صاحب، خطیب جامع مسجد، رنگون، برما

حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ اردو، فارسی اور عربی کے اعلیٰ اور عمیق قابلیت کے حامل تھے اور اعلیٰ پایہ کے صاحب قلم ادیب اور مقالہ نگار بھی۔ آپ کے قلم سے نکلی ہوئی مدرسہ کی روئیدادیں دینی انفرادیت اور زبان وادب کی ندرت کی وجہ سے اس زمانہ کے بہترین صاحب قلم ادیب اور ارباب صحافت جیسے حضرت مولانا محمد علی جوہر، مدیر کامریڈ، مصور فطرت خواجہ حسن نظامی، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی، بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان وغیرہم سے داد تحسین وصول کرتی تھیں۔ مدرسہ کی روئیدادوں میں منفرد اور پر مغز مضامین پر ان حضرات کے جذبات تحسین وتعریف سے معمور خطوط آج تک محفوظ ہیں۔ قارئین کی ضیافت طبع کے لیے ایک روئیداد کا تھوڑا سا حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے جس سے حضرت مولانا مرحوم کی زبان و ادب کی ندرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ نے مدرسہ صولتیہ کے جائے وقوع اور عمارتوں کے متعلق تاریخی تذکرہ فرماتے ہوئے 1357 ھ میں مدرسہ کی ایک تعارفی رپورٹ ''ندائے عام'' میں یوں تحریر کیا ہے:

> ''مدرسہ صولتیہ کی عمارتیں جس جگہ واقع ہیں اس کا عہد جاہلیت سے قدیم تاریخی نام ''خندریسہ'' ہے، اور عربی میں پرانے تند وتیز شراب کا نام ''خندریس'' ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہاں شراب کی بھٹیاں تھیں۔ اعلیٰ قسم کی دو آتشہ وسہ آتشہ شراب کے متلاشی یہاں پہنچتے تھے۔ میخانے آباد تھے اور جھومتے جھامتے مخموروں سے اس آبادی کی رونق تھی، لیکن اب الحمدللہ یہاں علوم نبویہ اور معارف الٰہیہ کی دو آتشہ وسہ آتشہ شراب حقیقت تشنگانِ علم کو پلائی جا رہی ہے۔ اور اب ہاتھوں میں بجائے ساغر و مینا کے معصوم بچے اور

Marfat.com

دنیائے اسلام کے شائقین علم درس قرآن و حدیث میں منہمک نظر آتے ہیں۔ مدرسہ کی چاروں عمارتیں مکہ معظمہ میں اسلام کی ان تاریخی یادگاروں کے درمیان واقع ہیں جن سے ایک طرف جبل کعبہ، وہ مقدس پہاڑ ہے جس کے پتھروں سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے کعبہ کی تعمیر فرمائی۔ دوسری طرف جبل عمر وہ پہاڑ ہے جس پر اسلام کے عظیم المرتبت خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے بعد سب سے پہلے وحدہ لاشریک لہ کے نام کی آواز بلند کی اور اپنے اسلام لانے کا اعلان فرمایا۔ کفرستان عالم میں خدائے ذوالجلال کے لیے یہ پہلی آواز حق مکہ کے پہاڑوں میں گونجی تو کفار مکہ کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا۔ مدرسہ کی تیسری عمارت بورڈنگ ہاؤس (دارالطلبہ) سے متصل وہ قطعۂ زمین ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے روپیہ سے خرید کر مسلمانوں کے لیے ان کی آخری آرام گاہ قبرستان کے لیے وقف فرمایا تھا۔ جب عہد اول میں کفار قریش نے اسلام کے ان سابقین اولین کو اپنے قبرستان میں دفن ہونے سے روک دیا تھا۔ ''مقبرہ شبکیہ'' کے نام سے یہ بابرکت قطعہ زمین اب تک موجود ہے۔ 1310ھ تک میں اس میں تدفین جاری تھی اور ایک صدی قبل کے اکثر و بیشتر صلحاء و اتقیاء اور اہل مکہ اس قطعۂ زمین میں اپنا مدفن ہونے کے لیے عہد اول کے ان نفوس قدسیہ کے قرب و پڑوس کے لیے متمنی رہتے تھے۔ جو اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے اس میں مدفون ہیں۔ آج کے مدرسہ صولتیہ کی عمارتیں اسلام کی ان پرانوار یادگاروں کے قریب ہیں۔ جن کو بصارت اور بصیرت کی آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔''

یہ تھی ایک مختصر سی داستان حیات مدرسہ صولتیہ کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ کی۔ ان کے تفصیلی حالات ''تاریخ مدرسہ صولتیہ'' میں بیان کیے جائیں گے کیونکہ جس ہستی نے نصف صدی مدرسہ صولتیہ کی خدمت کی، مدرسہ کی تاریخ ان کے حالات زندگی کے بغیر نامکمل ہے۔

حضرت مولانا محمد سعیدؒ کی پہلی شادی حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی حقیقی نواسی سے ہوئی جو قریباً دس سال رشتۂ ازدواج میں منسلک رہ کر اس دار فانی سے انتقال فرما گئیں۔ آپ کی دوسری شادی مجاہد اعظم مولانا حکیم عبدالحکیم تھانویؒ کے فرزند مولانا عبدالحلیم تھانوی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ یہ حضرت تھانویؒ کے عزیزوں میں سے تھے۔ حضرت اقدس مولانا تھانویؒ نے جب اپنے والد مرحوم کی طرف سے اپنی والدہ کا حق مہر ورثاء میں تقسیم کیا تو حضرت مولانا محمد سعیدؒ کی اہلیہ کے شرعی حصہ اڑھائی روپے ہندی بطور خاص لفافہ میں مہر بند کر کے مکہ مکرمہ ارسال فرمائے تھے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ آپ کے دور نظامت میں مدرسہ صولتیہ کی مالی پوزیشن کچھ اچھی نہ تھی۔ مدرسہ کی ضروریات روز بروز بڑھ رہی تھیں اور آمدن اس کے لحاظ سے کم تھی۔ چنانچہ مدرسہ کی ضرورتوں اور اغراض و مقاصد کی وجہ سے آپ کا اپنے وطن کیرانہ میں قیام طویل ہوتا گیا آخر بروز دوشنبہ یا سہ شنبہ 17 ذی قعدہ 1358ھ کو چند روز کی مختصر علالت کے بعد آپ میرٹھ میں صبح کی اذان کے وقت اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انتقال سے چند روز قبل آپ کو بغرض علاج میرٹھ لایا گیا، لیکن موت کا وقت مقرر ہوتا ہے لہٰذا آپ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکے۔ وفات سے تھوڑی دیر قبل تیسرا کلمہ زبان پر جاری ہو گیا۔ وفات کے بعد جنازہ بذریعہ ٹرک کیرانہ لایا گیا اور نماز مغرب سے قبل محلہ دربار کی تاریخی مسجد کے خاندانی قبرستان میں حضرت شاہ نظام الدین خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اور حضرت شاہ ولایت کے بالکل قریب دفن کر دیا گیا۔ نماز جنازہ کیرانہ کے مشہور و معروف عالم دین اور جامع مسجد کے خطیب حضرت

Marfat.com

مولانا مسیح الزمان صاحب نے پڑھائی اور نماز مغرب سے قبل کیرانہ، کاندھلہ، تھانہ بھون، جھنجھانہ، دہلی اور سہارنپور کے سینکڑوں علماء اور اہل اللہ کی موجودگی میں مکہ مکرمہ کی یہ مقدس امانت اپنی ابدی آرام گاہ میں استراحت کرنے لگی۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

نماز جنازہ میں ایک بیکراں ہجوم تھا۔ کچھ تو مکہ مکرمہ کے تعلق اور کچھ حضرت مولانا رحمت اللہؒ کے تعلق اور کچھ اپنی علمی و دینی مجاہدانہ شخصیت کی وجہ سے ہر شخص جنازہ کو کاندھا دینے کے لیے بے قرار تھا۔ اور کیرانہ کی سرزمین نے ایسا عظیم الشان جنازہ نہ اس سے قبل اور نہ اس کے بعد دیکھا۔

حضرت مولانا محمد سلیم کیرانویؒ:

1358ء میں حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ مقرر ہوئے۔ مولانا محمد سلیمؒ اپنے والد کی زندگی ہی میں بطور نائب ناظم مدرسہ کا کام کر رہے تھے جس کی وجہ سے آپ کو نظامت و اہتمام کا اچھا خاص تجربہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ جب آپ ناظم مدرسہ مقرر ہوئے تو آپ نے اپنے والد محترم محمد سعید صاحبؒ کے زیر تکمیل پروگراموں کو مکمل فرمایا۔ آپ نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ زراعت، صنعت اور بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری فرمایا جو بڑی کامیابی کے ساتھ چلا، لیکن ابھی ان نئے سلسلوں کو جاری ہوئے نو سال نہ گزرے تھے کہ مدرسہ ایک بہت بڑے مالی بحران کا شکار ہوگیا۔

یہ مدرسہ کئی سال سے عرب کے شہر مکہ مکرمہ میں اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کر رہا تھا لیکن پھر بھی ایک ہندی مدرسہ تھا۔ اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ ہندوستانی مسلمانوں کے چندوں کا مرہون منت تھا۔ ہوا یہ کہ 1947ء میں ہندوستان کا بٹوارا ہوا۔ بٹوارا ویسے تو سرحدوں میں ہوا تھا لیکن بعض وطن دشمن عناصر کی وجہ سے آبادی بھی کافی حد تک تقسیم ہوئی۔ تقسیم آبادی کے ساتھ ساتھ تباہی و بربادی اور قتل و غارتگری کی ایک قیامت صغریٰ برپا ہوگئی۔ جس سے مدرسہ کی آمدنی میں بہت فرق پڑا۔ تمام نظام مدرسہ درہم برہم ہوگیا۔ کیونکہ ہر مدرسہ کی ساری پالیسیاں اور شعبے نظام مالیات پر چلتے ہیں۔ مالی کی ہر

Marfat.com

شعبہ کو متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ مولانا محمد سلیم صاحبؒ نے اس کا تذکرہ مدرسہ کی 1368ھ کی روئیداد میں ان الفاظ میں کیا ہے:

”دار العلوم حرم صولتیہ اپنی عمر کے ہر دور میں جن دشوار گزار مراحل سے گزرا ہے ان میں یہ آخری افتاد شاید سب سے زیادہ سخت اور بہت زیادہ صبر آزما ہے، جسے دنیا کی تاریخ انقلاب 1947ء کے نام سے یاد رکھے گی۔ اس براعظم کی تقسیم کے ضمن میں لاتعداد انسانوں کی خوں ریزی، شہروں اور آبادیوں کی ویرانی، لاکھوں بے خانماں افراد کی تباہ حالی اور انسانی درندگی و بہیمیت کے ہوش ربا واقعات نے نہ صرف وقتی طور پر عام سکون و دل جمعی کا خاتمہ کر دیا بلکہ مابعد کی صورت حال سے جو مشکلات پیدا ہوئیں اور ہر قدم پر دقتوں کا جو غیر مختتم سلسلہ قائم ہے ان کی وجہ سے ہر شخص اپنے ماحول میں غیر مطمئن اور مستقبل کی طرف سے پریشان نظر آ رہا ہے۔“

دہلی کی بربادی کا تصور سب کے لیے اگر عام طور پر افسوس ناک ہے تو خصوصیت کے ساتھ دار العلوم حرم کے ہر خادم و کارکن کے لیے صدر دفتر دہلی کا چند لمحات کے اندر وحشیانہ غارت گری کی نذر ہونا ایک ایسا اندوہناک حادثہ ہے جس کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی اور یہ المناک اثر مشکل سے اہل حرم کے قلوب سے زائل ہوگا۔ صدر دفتر دہلی ملک کے طول و عرض میں مکہ معظمہ کا ایک امدادی مرکز تھا جس کی غیر متوقع طور پر تباہی نے اس مرکزی دار العلوم کو موت و حیات کی کشاکش میں مبتلا کر دیا۔ ملک کے ہر گوشہ میں دار العلوم حرم صولتیہ کے مخلص معاونین اور سراپا خیر و برکت محسنین کی الحمد للہ کمی نہیں۔ اس قیامت صغریٰ سے قبل ان میں سے ہر شخص اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ موجود تھا، مگر آج ہزاروں پرانے معاونین لاپتہ ہیں۔ بہت سے محسن ہمدردوں کی خبر نہیں۔ یہی

Marfat.com

دارالعلوم حرم کا وہ مایۂ ناز سرمایہ تھا جس پر خدا کے بعد تمام کارکنان و خادمان دارالعلوم حرم صولتیہ کو پورا اعتماد تھا۔ دائرۂ معاونین کا یہ وسیع حلقہ گردش زمانہ سے جس قدر محدود و مختصر ہو گیا آج اسی قدر اہل حرم کی مشکلات اور ذمہ داریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ افراد کے تعاون اور شخصی امداد اور اعانت سے محرومی کا گلہ ہی نہیں بلکہ افسوس اس امر کا ہے کہ صولتیہ ان مقررہ عطیات سے بھی محروم ہوتا جا رہا ہے جن کو بظاہر مستقل سمجھا جاتا تھا۔ دولت آصفیہ حیدرآباد دکن کی مقررہ ماہانہ امداد بند ہو چکی اگرچہ سرکار نظام کے خزانہ سے دارالعلوم کی کوئی بیش قدر امداد معین نہ تھی، مگر پھر بھی دو سو روپیہ ماہانہ اور وقتاً فوقتاً دیگر عطیات کی بندش معنوی حیثیت سے پریشان کن ہے۔ بہار کے بعد خزاں کا یہ دور مستقبل کے لحاظ سے یقیناً سب کے لیے ایک مستقل اندیشہ کا باعث ہے۔“

چنانچہ 1947ء کے بٹوارے سے مدرسہ صولتیہ کو کافی شدید مالی نقصان پہنچا جس کی وجہ سے کئی منصوبوں اور شعبوں میں ترامیم کرنا پڑیں۔ 1947ء سے قبل کے اساتذہ کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مدرسہ بام ترقی پر تھا۔ کن کن شعبوں میں کتنے کتنے اساتذہ تھے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے اور ایک قاری ان کی تعداد کو دیکھ کر ہی مدرسہ کی ترقی کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

1- شعبہ عالی وثانوی:

1- شیخ زکریا بیلا، نگران شعبہ
2- علامہ شیخ عمر حمدان
3- شیخ حسن مشاط
4- شیخ سید ابوبکر بکر المبار
5- شیخ محی الدین بخاری
6- شیخ مولانا ابراہیم ابوالفضل
7- شیخ علی بکر
8- شیخ عبداللہ فدا

Marfat.com

2- مدرسہ ابتدائی:

1- شیخ داؤد ربانی، نگرانِ مدرسہ
2- شیخ مصطفٰے مختار
3- شیخ عبدالعزیز رباعی
4- شیخ احمد خلاقی
5- شیخ احمد عثمانی فلمبان
6- سید محمد ناصف المراکشی

3- مدرسہ تحضیری:

1- شیخ محمد حسین مشاط، نگران مدرسہ
2- شیخ عبداللہ خوجہ
3- شیخ سید ہاشم شطا
4- شیخ امین نیاز
5- شیخ اسماعیل عبداللطیف

4- شعبۂ زراعت:

1- شیخ عبدالقیوم خان، نگران شعبہ
2- دلاور خان رامپوری
3- محمد سندھی

5- شعبۂ صنعت:

1- ماسٹر محمد صدیق معلم خیاطی
2- شیخ محمد علی بخاری معلم فنون جمیلہ
3- شیخ احمد جنیدی معلم جلدیہ
4- حاجی مشتاق احمد بنارسی، پارچہ بافی

6- شعبۂ تعلیم بنات:

1- خدیجہ صیرفیہ، نگران شعبہ
2- فاطمہ قاریہ
3- خدیجہ قاریہ

7- شعبہ حفظ و تجوید:

1- قاری محمد رضا، نگران شعبہ
2- حافظ رشید احمد صدیقی جوالاپوری
3- حافظ محمود بخاری

8- مدرسہ دار الفائزین:

1- شیخ فتح اللہ، نگران
2- شیخ محمود دہان
3- سید حسن جعفری
4- شیخ عبداللہ فارسی

9- دار الشفاء:

1- مولانا حکیم محمد یامین صاحب، نگران
2- حکیم حافظ محمد نعیم
3- محمد امین دواساز

10- شعبۂ لیلہ (شبینہ)

1- شیخ محمد امین
2- مولانا ریاض الحسن باغپتی

11- مرکزی دفتر مکہ مکرمہ:

1- شیخ الیاس، صیغہ عربی
2- شاہ زین العابدین محاسب ونگران
3- عبدالصمد ہاشمی معاون تحریرات
4- احمد عبداللہ ملیباری، مراسل

12- کتب خانہ مدرسہ:

1- مولانا سید خادم حسین
2- محمد بن محی الدین

13- دار الاقامہ:

1- حافظ محمد مہدی انصاری
2- محمود بخاری

14- ملازمین ماتحت:

1- عبدالرحمٰن یلدرش
2- عبدالرحمٰن مالاباری
3- عبدالرزاق محمد حسین
4- جریع معتوق
5- عبداللہ عوض

صدر دفتر کراچی:

1- حافظ ضیاء الدین احمد معتمد عمومی

Marfat.com

2- منشی عبدالولی صاحب معاون تحریرات
3- منشی انوارالحق معاون تحریرات
4- سید دبیر احمد، رفیق دائرہ معاونین
5- منشی رحمت علی محافظ دفتر
6- عبدالکریم، مراسل

1367ھ میں طلباء کی کل تعداد 677 تھی جن میں 232 مقامی طلباء اور 110 طالبات تھیں۔ اور خارجی طلبا 335 تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1-	پاکستان و ہندوستان	64
2-	بخارا اور ترکستان	18
3-	افریقہ و سوڈان	76
4-	جزائر جاوا وغیرہ	77
5-	انڈونیشیا	24
6-	ملایا و جزائر ماتحت برطانیہ	42
7-	چین	6
8-	جنوبی افریقہ	10
9-	حضرموت	4
10-	یمن	10
11-	یمن	2
12-	افغانستان	2

ان میں سے 85 طلبہ کو مدرسہ کی طرف سے ماہانہ وظائف استحقاق لیاقت کے مطابق دیئے جاتے تھے۔ اندازہ فرمایئے کہ یہ کل کتنا خرچہ ہوگا۔ لیکن یہ کام نہایت اچھے طریقہ سے چل رہا تھا کہ پاک و ہند کے بٹوارے نے تمام نظام کو تہ و بالا کر دیا۔

حضرت مولانا محمد سلیم صاحب مرحوم نے ایک تنگدستی اور صبر آزما زمانے کو

Marfat.com

برداشت کیا اور نہ صرف برداشت کیا بلکہ اپنی شبانہ روز کوششوں اور ہمت و جرأت اور ثابت قدمی سے مدرسہ کے تمام کاموں کو جاری رکھا۔ انتظام و اہتمام میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ آنے دیا اور جہاں تک ممکن ہو سکا مدرسہ کی شان و شوکت میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ آنے دی۔

مدرسہ صولتیہ نہ صرف علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت کرتا ہے بلکہ مولانا محمد سلیم صاحب کیرانویؒ نے اسے مسلمانان پاک و ہند کا قومی مشترک ادارہ اور مرکز بنا دیا۔ ویسے یہ پہلے بھی یعنی حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کے زمانہ ہی سے حجاج پاک و ہند کے ایام حج میں مختلف خدمات انجام دیتا تھا لیکن حضرت مولانا محمد سلیم صاحبؒ نے مدرسہ کے اس شعبہ کو بہت ترقی دی۔ اور آپ کے طرز عمل سے کارکنان دارالعلوم صولتیہ مختلف طریقوں سے پاک و ہند اور دیگر ممالک کے حجاج کرام کو راحت و آرام اور ان کی خدمات کو اپنے لیے نہ صرف، باعث سعادت بلکہ فریضۂ دینی تصور کرنے لگے۔ چنانچہ اپنے قیام سے لے کر آج تک مدرسہ حجاج کرام کی مندرجہ ذیل خدمات سرانجام دیتا ہے:

1- مسائل حج:

ایک مسلمان پر ساری زندگی میں صرف ایک دفعہ حج بیت اللہ فرض ہے۔ اس وجہ سے بہت کم لوگ مسائل حج سے واقف و آشنا ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ تو علمائے کرام بھی بعض مسائل بھول جاتے ہیں۔ پھر بعض مسائل میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ پاک و ہند کے حاجی صاحبان کی اکثریت مسلک حنفی سے تعلق رکھتی ہے جب کہ مکہ مکرمہ کی حکومت کا مسلک حنبلی ہے۔ اس وجہ سے منیٰ، عرفات، مزدلفہ، قربانی، شیاطین کو کنکریاں مارنے کے ارکان اور طریقے، طواف و سعی کا طریقہ، ان مسائل کا جاننا ہر حاجی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ پھر ان ارکان حج کی حیثیت کا جاننا بھی ضروری ہے کہ ان میں فرائض، واجبات اور سنن کون کون سے ہیں۔ کن کن ارکان کے خلل سے دم واجب ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مدرسہ صولتیہ نے ان چیزوں سے لوگوں کو آشنا کرانے کے لیے دو طریقے اختیار کیے ہیں۔ ایک تو ایک چھوٹا سا کتابچہ بعنوان ''حج کے پانچ روز'' تقسیم کیا جاتا ہے جس سے لوگوں کو

Marfat.com

مسائل حج سمجھنے میں بہت فائدہ ہوتا ہے اور وہ حج کی غلطیوں سے کافی حد تک محفوظ و مصئون ہو جاتے ہیں۔ دوسرے زبانی بھی بعض لوگوں کو مسائل بتائے جاتے ہیں۔

2- ڈاک:

حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کے دور نظامت میں پاک و ہند سے ہوائی جہاز کے ذریعہ بہت کم حاجی جاتے تھے۔ اکثر حجاج کرام بحری جہازوں کے ذریعہ جاتے تھے۔ اس وجہ سے انہیں تین سے چار ماہ تک حجاز مقدس میں قیام کرنا پڑتا۔ اس طویل قیام میں ہر شخص اپنے اعزاء واقرباء کی خیر و عافیت کا منتظر رہتا تھا۔ اس وجہ سے اکثر حضرات اپنے خطوط المطوف کے بجائے مدرسہ صولتیہ کے پتہ پر منگواتے جو کہ حسب ذیل ہے:

مرکزی دفتر، مدرسہ صولتیہ

پوسٹ بکس (صندوق البرید) جارۃ الباب مکہ معظمہ، سعودی عرب

دوسرے حج کے ایام میں سعودی ڈاک خانوں سے لفافہ جات اور ڈاک کے ٹکٹ ملنے بہت مشکل ہوتے تھے۔ کارکنان مدرسہ حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کے حکم پر ٹکٹ اور لفافے حاصل کر کے دفتر مدرسہ میں جمع رکھے جاتے جو حجاج کرام کو ضرورت پڑنے پر فراہم کیے جاتے۔ چنانچہ زائرین حرم بیرون حجاز والی ڈاک خود یہاں دے بھی جاتے اور اپنے اعزاء واقرباء کے آئے ہوئے خطوط لے بھی جاتے۔ ڈاک کا یہ انتظام حاجیوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

3- امانت

خدمت کے اس شعبہ کی طرف بھی حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کے دور نظامت میں خاص توجہ دی گئی۔ گویا کہ برصغیر پاک و ہند کے حاجیوں کے لیے بنک کی حیثیت مدرسہ صولتیہ کو دی گئی۔ اگرچہ مکہ مکرمہ میں چوری چکاری کا خطرہ کم ہے لیکن پھر بھی ہر حاجی کے دل میں روپیہ کی حفاظت کا خیال ہر وقت رہتا ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔ اس وجہ سے مولانا مرحوم نے زائرین حرم کو روپیہ کی حفاظت کی طرف سے بے فکر بنانے

Marfat.com

کے لیے مدرسہ کے مرکزی دفتر میں شعبہ امانت کو ترقی دی۔ مرکزی دفتر میں رقم دے کر ناظم صاحب سے رسید حاصل کی جاتی ہے اور پھر دفتری اوقات میں اس رقم میں سے جس قدر رقم آپ لینا چاہیں وہ بآسانی مل جاتی ہے۔

4- طبی خدمات:

اس شعبہ کو بھی حضرت مولانا محمد سلیم صاحب نے بہت ترقی دی۔ اور زائرین حرم کو یونانی اور ہومیو پیتھک ادویات بلا قیمت و بلا فیس دی جاتیں۔

5- زائرین کے قیام کا انتظام:

زمانۂ حج میں چونکہ مدرسہ کی سالانہ تعطیلات ہوتی ہیں، اس وجہ سے کچھ تو زائرین کی سہولت کے لیے اور کچھ مدرسہ کی آمدنی میں اضافہ کے لیے تمام خالی کمرہ جات میں معقول معاوضہ کے ساتھ زائرین کے قیام کا انتظام کیا جاتا جس سے زائرین کا سامان بھی محفوظ رہتا اور زائرین کو خود بھی بہت سہولت اور آرام ہوتا ہے کیونکہ مدرسہ صولتیہ حرم شریف کے بالکل قریب ہے۔

مدرسہ صرف چار دیواری اور بلڈنگ کا نام نہیں ہوتا بلکہ مدرسہ ان کارکنان کا نام ہوتا ہے جو اس کے اغراض و مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں۔ اور ان کارکنان کی کارکردگیوں کا محور ناظم مدرسہ ہوتا ہے جس کی وضع کردہ پالیسیوں کے تحت وہ کام کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں مدرسہ کی ترقی کا انحصار زیادہ تر ناظم مدرسہ پر ہوتا ہے۔ بعض ناظم مدرسہ کو ایک ادارہ کی بجائے ایک تحریک بنا دیتے ہیں۔ ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نے اپنے دور نظامت میں ایک تحریک بنا دیا تھا۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد سلیم صاحب نے بھی اپنے دور اہتمام میں مدرسہ صولتیہ کو ایک ادارہ سے ترقی دے کر ایک تحریک کی شکل دے دی تھی۔ اگرچہ یہ تحریک کی شکل حضرت مولانا محمد سعید کیرانویؒ کے زمانہ ہی میں شروع ہو چکی تھی لیکن مولانا محمد سلیم صاحب کے زمانہ میں اس کو فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ 1935ء میں مشرقی جزائر (جاوا سماٹرا) کے

Marfat.com

مسلمانوں میں علمی اور تعلیمی ضرورت کا جو احساس پیدا ہوا تھا یہ سب مدرسہ صولتیہ کے طالب علموں کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مدرسہ کے قدیم طلبہ نے جاوا کے مختلف علاقوں میں جا کر مسلمانان جاوا ء سماٹرا کے جمود و سکوت میں ایک حرکت اور ہلچل پیدا کی۔ چنانچہ اسی تحریک کی وجہ سے ان لوگوں میں دینی اور دنیوی تعلیم کا بہترین انتظام ہوا۔ تعلیم کے فروغ کے لیے مختلف انجمنیں، سوسائٹیاں اور جماعتیں ملک بھر میں قائم ہوئیں۔ جاوا میں مدرسہ کے طلبہ کی اس جماعت جس نے ملک میں تعلیم کے فروغ اور ترقی کے لیے تحریک پیدا کی، اس کے روح رواں اور ممتاز افراد حسب ذیل ہیں جن کی علمی اور عملی خدمات کسی طرح فراموش کرنے کے قابل نہیں۔

1- شیخ محمود زاہدی، مشیر ریاست سلانگور
2- شیخ راج عثمان، مفتی شہر کلاغ
3- شیخ عبدالمجید مہتمم مدرسہ جوہرین شہر جمبی
4- شیخ حسن یحییٰ، مہتمم مدرسہ نورالایمان، شہر جمبی
5- شیخ کمال عبدالصمد، بانی مدرسہ نورالایمان، جمبی
6- شیخ عبدالمجید ابوالحسن، مدرس اول، مدرسہ نورالایمان، جمبی
7- شیخ ابوبکر مکرین، صدر مدرس، مدرسہ اسلامیہ، فلمیان
8- شیخ محمد مرزوقی، مفتی فلمیان
9- شیخ عبداللہ مغزلی، مہتمم مدرسہ ادریسیہ، کوالہ شہر فیرا
10- شیخ محمد علی منصور، صدر مدرس، مدرسہ ادریسیہ، کوالر شہر فیرا
11- قاری شیخ علاؤ الدین بانی مدرسہ التجوید، شہر فیرا
12- شیخ حامد قاری مہتمم مدرسہ عربیہ بنجر
13- شیخ زین الدین امپنان، مدرس مدرسہ العلم، امپنان
14- شیخ عبدالغنی مواری، بانی مدرسہ عربیہ شہر موار
15- شیخ عبدالرشید بن محمد طیب مہتمم مدرسہ فولو

Marfat.com

16- شیخ محمود میدان شیخ عبدالحلیم، خطیب بانیال، مدرسہ عربیہ، قدح

یہ ہے وہ مختصر سا تذکرہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے دوسرے ناظم و مہتمم حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی قدس سرہ کا۔

مولانا محمد سلیمؒ کا انتقال 2 شعبان 1397ھ کو ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد مسعود شمیمؒ مدرسہ کے منصرم ہوئے۔ آپ نے مدرسہ کو اپنے زمانہ اہتمام میں بہت زیادہ ترقی سے ہم کنار کیا۔ لیکن کل من علیھا فان کے حکم کے تحت مولانا محمد مسعود شمیمؒ 1412ھ کو اس عالم فانی سے عالم باقی کو انتقال فرما گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے مولانا ماجد سعید حفظہ اللہ والحال اللہ بقاء ۃ نے مدرسہ کی زمام اہتمام اپنے ہاتھ میں لی۔ اور اس وقت اس مدرسہ کے مدیر یہی ہیں۔ آپ شب و روز مدرسہ کی خدمت اہتمام انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے دور اہتمام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مدرسہ کی اس بلڈنگ کو جس کو مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ نے مدرسہ کے لیے بنایا تھا، اس کو منہدم کر کے وہاں ایک شاندار جدید طرز کی کئی منزلہ عمارت بنا دی ہے جس میں دفتر کے علاوہ ابتدائیہ اور متوسطہ کی کلاسیں بھی ہوتی ہیں۔ پھر آپ نے 1422ھ میں مدرسہ کی مسجد کو جو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے بنوائی تھی اور مرور ایام کی وجہ سے بہت پرانی ہوگئی تھی مکمل طور پر شہید کروا کر اس کو چار منزلہ بنا دیا ہے۔ جس کی پہلی دو منزلوں میں نماز ہوتی ہے اور تیسری اور چوتھی منزل میں طالب علموں کی درس و تدریس کا کام ہوتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا ماجد سعید صاحب کو حیات دراز ارزانی فرمائے اور انہیں اس یادگار مدرسہ کی خدمت کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

Marfat.com

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ

اور ان کے معاصرین

حکیم محمود احمد ظفر

Marfat.com